۱۶/۱

خدا بخش لائبریری

# جرنل

۱۹

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری

رجسٹریشن نمبر ۳۳۴۲۴/۷۷





انیسواں شمارہ : ۱۹۸۱ء

اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : پندرہ روپے

سالانہ زرِ خریداری

| | | |
|---|---|---|
| اندرونِ ملک | : | ۶۰ روپے |
| پاکستان | : | ۱۲ ڈالر |
| یوروپ | : | ۸ پونڈ |
| امریکا اور دیگر ممالک | : | ۲۴ ڈالر |

• محبوب حسین نے اُردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین پٹنہ میں اور انگریزی حصہ ہندوستان پرنٹنگ ورکس دلی پور، دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا۔

# فہرست



---

# اس شمارے کے لکھنے والے

- ڈاکٹر مسعود حسین : (پ ۱۹۱۸ء تقریباً) ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے، پیرس سے ڈی۔لٹ۔ سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ، سابق پروفیسر لسانیات عثمانیہ و مسلم علی گڑھ۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۴ ملاحظہ ہو۔
- جناب خورشید عالم خاں : (پ ۱۹۱۹ء) ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد، وزیر مملکت برائے سیاحت و شہری ہوابازی حکومتِ ہند، تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶ ملاحظہ ہو۔
- بیگم صالحہ عابد حسین : (پ ۱۹۱۳ء) جامعہ میں ذاکر صاحب کی ہمکار، خواجہ غلام الثقلین کی صاحبزادی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی بیگم، اردو کی مشہور ادیب، و افسانہ نگار۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۳۶ ملاحظہ ہو۔
- جناب عبداللطیف اعظمی : (پ ۱۹۱۷ء) ڈاکٹر ذاکر حسین کے شاگرد اور جامعہ میں ان کے رفیق کار، سابق ایڈیٹر ماہنامہ صبح وغیرہ، ماہنامہ جامعہ کے مدیر (اور پھر مدیر معاون)، تفصیل کے لیے اسی شمارے کا صفحہ ۴۸ ملاحظہ ہو۔
- بیگم انیس قدوائی : (۱۹۰۸ء - ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء) انگریزی اور اردو کی ممتاز ادیبہ، مولانا محمد علی کے جواں مرگ رفیق ولایت علی بمبوق کی صاحبزادی اور رفیع احمد قدوائی کی بھاوج : سابق ممبر راجیہ سبھا ... تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۶۶ ملاحظہ ہو۔
- حکیم محمد عمران خاں : (پ ۱۹۲۹ء تقریباً) ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی ٹونک (راجستھان) سے وابستہ ہیں۔
- جناب وسیم احمد : (پ ۱۹۵۶ء) بی۔ یو۔ ایم۔ ایس (لکھنؤ طبیہ کالج)، خدا بخش لائبریری میں لٹریری ریسرچ یونٹ (طب یونانی) سے وابستہ۔
- جناب احمد یوسف : (پ ۱۹۳۲ء تقریباً) اردو کے معروف افسانہ نگار اور ناقد۔ افسانوی مجموعہ "ریگستان کی کشتیاں"
- جناب رئیس نعمانی : (پ ۱۹۵۰ء تقریباً) پرشین اکیڈمی لکھنؤ کے بانی، "بھارت" فارسی مجلہ کے مدیر۔
- ڈاکٹر کلیم سہسرامی : (پ ۱۹۳۲ء تقریباً) تہران سے ڈی۔لٹ، راجشاہی یونیورسٹی (بنگلہ دیش) میں شعبۂ لسانیات کے پروفیسر۔
- جناب مسرت حسین آزاد : (پ ۱۹۵۰ء تقریباً) سکریٹری صولت پبلک لائبریری رامپور، سابق ایڈیٹر "الا دجوہر"۔ ادارہ فروغ اردو (اب شاد عارفی) لائبریری کے مالک۔
- جناب محمد عمر سیفی ٹونکی : (پ ۱۹۳۰ء تقریباً) ادبی ذوق کے حامل، ٹونک کے نجی کتابی ذخیرہ میں آدبا و شعرا کے خطوط اور رسائل کا اچھا کلکشن ہے۔

بقیہ کے لیے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱، ۱۲ اور ۱۶

# ذاکر صاحب - ذاتی یادیں

## پیش گفت

ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۵ - ۱۹۶۹ء) کے اقوال و افعال کے بارے میں قریبی لوگوں کی ذاتی یادوں کا ایک مرقع پیش کیا جا رہا ہے، اس میں نظر کے گوناگوں زاویے ملیں گے لیکن ہر زاویے سے تصویر کا ایک ہی رنگ اُبھرتا دکھائی دے گا، خلوص اور لگن سے کاڑھی ہوئی اخلاقی شخصیت کا رنگ جس نے اخلاق الٰہی تک پہنچنے کے لیے ابن آدم کا تایا ہوا راستہ اختیار کیا تھا، خدمت سے عظمت کا راستہ!

بڑی شخصیتوں کے افعال و اقوال، ان کے بعد آنے والے اپنے بعد آنے والوں کے لیے، مرتب کر جاتے ہیں کہ انھیں سُن کے، پڑھ کے، اگر اپنے اندر اہلیت اور صلاحیت ہو تو، ایک شخصیت برتر وجود میں آسکے۔ یہ برتر سے برترین تک حصول شخصیت کا سفر ہی ساری انسانی تگ و دو کا ماحصل ہے۔

اب تک صوفیہ کے ملفوظات بکثرت سامنے آتے رہے ہیں متصوفانہ شخصیت میں بھی ایک عظمت ہے لیکن وہ سامنے اس طور سے لائے گئے ہیں کہ پوجتے نیاز دینے کے رہ گئے ہیں۔ کوئی نقش قدم ایسا نہیں جس پر کوئی دوسرا بھی چلنے کی جرأت کر سکے، ہمت لا سکے۔ اخلاقی شخصیت، اسی ہماری آپ کی بھلی بُری دنیا میں رُلی ملی شخصیت ہوتی ہے جو زندگی کے ہر اُونچ نیچ سے گزرتی، اپنا احتساب کرتی، اعتدال لاتی، دوسروں کے لیے بھی کر خدمت کے راستے، اپنے کو گوندھتی کاڑھتی اور خدائی اخلاقی سانچے میں ڈھالتی ہوئی، ارد گرد کو نکاشتی کے سیلاب میں بہا جاتی ہے۔

مشہور صوفی حضرت عبدالقدوس گنگوہی کا ایک قول ہے کہ محمد عربی معراج میں آسمانی بلندیوں کے آخری نقطے تک پہنچ کے لوٹ آئے، قسم خدا کی

ان کی جگہ میں ہوتا تو ہرگز واپس نہ آتا۔ اقبالؔ نے یہ قول دہراتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک صوفی اور ایک نبی میں یہی فرق ہے کہ صوفی اپنا تجربہ اپنے تک محدود رکھ کر خود لطف اندوز ہونا کافی سمجھتا ہے، پیغمبر اپنے تجربے کی روشنی اور حرارت کو لیکر پھر زمان و مکان کی دنیا میں واپس آتا ہے کہ تاریخ سازی کر سکے۔ رسول اللہؐ کی ذات میں متصوفانہ شخصیت اور اخلاقی شخصیت کا حسین ترین امتزاج مل جاتا ہے۔

○

ذاکر صاحب کی شخصیت ایک اخلاقی شخصیت تھی، جو متصوفانہ شخصیت کے عناصر اپنے اندر سموتی جاتی تھی کہ بلاوا آگیا اور شخصیت سازی کا یہ سفر ادھورا رہ گیا! ایک حقیر زندگی میں یہ سفر کس نے پورا کیا ہے!! لیکن اسی انسانی بے بسی میں انسانی عظمت کا اشارہ پنہاں ہے: محدود کا لامحدود کو چھو لینے کا عزم بھی! بے بس ہوتے ہوئے انسان کیسا عظیم الشان ہے: کتنا حقیر اور کیسا عظیم!

○

جامعہ اور علیگڑھ کو حیات نو بخشنے کے بعد لکھا یوں ہی تھا کہ بہار کے عظیم ترین ملی علمی ادارے خدا بخش کو بھی ذاکر صاحب کے ہاتھوں نئی زندگی ملے۔ وہ ۱۹۵۷ء میں گورنر ہو کر آئے اور جب ۱۹۶۲ء میں بہار چھوڑا تو خدا بخش کو ایک مضبوط بنیاد فراہم ہو چکی تھی۔

ذاکر صاحب کہا کرتے تھے جو ملت اپنے محسنوں کے احسانات کو بھلا دیتی ہے، خدا اس پر محسن اتارنا بند کر دیتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کبھی اس بشارت کے مخاطب ہم بنیں۔

خدا بخش لائبریری نے اپنے محسن کی یاد میں ذاتی یادوں کو منضبط کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جنھیں رفتہ رفتہ ایک مرتب شکل دی جاتی رہے گی۔

عابد رضا بیدار ●●

ڈاکٹر مسعود حسین

● ڈاکٹر مسعود حسین (پ ۱۹۱۸ء) پیرس سے ڈی لٹ، علی گڑھ کے طالب علم رہے اور پھر وہیں لکچرار اور ریڈر ہوئے؛ پھر لسانیات کے پروفیسر ہو کر عثمانیہ چلے گئے جس کے بعد جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے۔ پھر علیگڑھ سے لسانیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل کشمیر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزیٹنگ پروفیسر

اہم تالیفات: (۱) رقعات رشید احمد صدیقی، (۲)؛ اردو کا المیہ (۳) قدیم اردو (تین جلدوں میں)؛ (۴) شعر و زبان؛ (۵) قصہ مہر افروز و دلبر از عیسوی خاں بہادر (۶) مقدمہ تاریخ زبان اُردو (۷) دکنی اُردو کی لغت (۸) دو نیم (کلام کا مجموعہ) (۹) کوی مسعود کا گیت (ہندی میں کلام کا مجموعہ)، (۱۰) اُردو کی لسانیاتی تاریخ: خدابخش لکچر (زیر طبع)

ذاکر صاحب پر سلسلۂ خطبات کا افتتاح ۲۳ اپریل ۱۹۸۰ء کو ڈاکٹر مسعود حسین کے اس خطبہ سے ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب، ذاکر صاحب کے بڑے بھائی مظفر حسین صاحب کے بیٹے ہیں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ خطبہ زبانی جس طرح بولا گیا، من و عن اسی طرح نذر قارئین شائع ہو رہا ہے، کسی جگہ کسی ذرا سی بھی لفظی یا اسلوبی ترمیم کے بغیر۔

●● تکلف سے بری ہے حسن ذاتی ۔ قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

عزت مآب ڈاکٹر قدوائی صاحب، بیدار صاحب، بزرگو اور دوستو!

میں دراصل، جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، پٹنہ آیا تھا کسی اور کام کے لئے، لیکن جب بیدار صاحب نے مجھ سے یہ خواہش کی کہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے سلسلے میں خطبات اور تقاریر کا ایک سلسلہ خدا بخش لائبریری میں شروع کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ میں اس سلسلہ کی پہلی تقریر کروں، تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور یہ تھوڑی سی ہراسانی بھی! ہراسانی اس لئے کہ ذاکر صاحب سے نہ صرف میری قرابت ہے بلکہ قرب بھی رہا ہے اتفاق سے، اپنی اسکول کی تعلیم سے شروع سے، میں چونکہ جامعہ کا طالب علم رہا، تو اس لحاظ سے مجھے، کم و بیش دس بارہ سال تک ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ کچھ عرصے تک بورڈنگ میں رہا لیکن بورڈنگ بہت پاس تھا، اور ہر وقت اُن کے یہاں آنا جانا تھا اور کچھ عرصے خود ان کے مکان پر ان کے ساتھ رہا۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ قرابت کے علاوہ قرب بھی رہا ہے۔ اکثر ہوتا ہے کہ قرابت داری میں قرب نہیں ہوتا ہے، فاصلے ہوتے ہیں۔

لیکن تھوڑی سی پریشانی مجھے اس لئے محسوس ہوتی ہے کہ جس طریقہ سے کہ کسی اچھی تصویر کو فوکس میں لانے کے لئے ایک فاصلۂ مکانی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طریقے سے کسی بھی عزیز شخصیت کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے اس پر بولنے یا لکھنے کے لئے، یقیناً ایک فاصلۂ زمانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آپ نہ تو شبلی کے الفاظ میں، مدلل مداحی کریں نہ آپ قرابت داری کے زیر اثر کچھ ایسی عقیدت مندانہ باتیں کہہ جائیں جو کہ عام پبلک، عام لوگوں، کا ذہن قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں، آپ اس شخصیت سے بھی انصاف کریں، اپنے سے بھی انصاف کریں اور جنھیں مخاطب کر رہے ہیں ان سے بھی انصاف کریں۔ اس لئے میں نے بیدار صاحب سے عرض کیا کہ میں اس وقت ان کے کمالات، ان کے کام، وہ چاہے تعلیمی میدان میں ہوں، سیاسی میدان میں ہوں، ان سے میں بحث نہیں کروں گا، چونکہ اس بارے میں لوگ لکھتے رہے ہیں، لکھتے رہیں گے اور وہ چیزیں سب کے سامنے

ہیں ـــ ، میں اپنی اس تقریر کو ان چند یادوں سے موسوم کروں گا جو میرے ذہن میں ان کی شخصیت کے تاثر کے طور پر محفوظ رہ گئی ہیں؛ یا چند ایسے واقعات، چھوٹے چھوٹے واقعات، گھریلو واقعات، جن سے ان کی شخصیت کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور جو غالباً تاریخ کا حصہ نہ بن سکیں گے اگر میں انھیں نہ کہوں کہ وہ میرے ساتھ ختم ہو جائیں گے۔

ذاکر صاحب سے میرا پہلا سابقہ اس وقت ہوا جب سن ۱۹۲۶ء میں وہ برلن سے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری لے کر اپنے وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد واپس آئے۔ اس وقت میری عمر غالباً چھ، سات برس کی تھی۔ اس سے قبل کے ذاکر صاحب میرے ذہن میں نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ تین سال، چار سال یورپ میں رہ کر آئے تھے۔ اور اس سے قبل میں اتنا چھوٹا تھا کہ کوئی تصویر میرے ذہن میں نہیں بنتی۔ اس دن قائم گنج کے قصبے میں دھوم تھی کہ پہلا پٹھان اور پہلا قائم گنجی باہر سے ایک ڈگری لے کر آ رہا ہے۔ چنانچہ نہ صرف اہل خاندان بلکہ اور بھی دور کے عزیز اور قرابت دار سب لوگ، اسٹیشن پر موجود تھے۔ بلکہ، ایک عزیز تو کچھ شادیانے بھی لیکر پہنچ گئے تھے، اس قسم کی چیزیں جو عام طور سے شادی کے موقع پر کرایہ پر لے لی جاتی ہیں، اس کا انتظام کر لیا تھا۔ میں ایک ملازم کی گود میں تھا، اس وقت؛ کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا کہ گاڑی کا انجن دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر میں گاڑی آئی، ٹھہری اور اس کے بعد ذاکر صاحب اُترے تو لوگوں نے گھیر لیا۔ ان کے چہرے پر کالی زرق داڑھی تھی۔ معلوم نہیں انھوں نے بمبئی یا کہاں سے ایک سفید شیروانی حاصل کر لی تھی، وہ پہنے ہوئے تھے، اسی شیروانی کے کپڑے کی ٹوپی بھی تھی، ان کے سر پر۔ غالباً بمبئی میں کچھ قیام کیا تھا، وہاں بنوائی ہوگی یا کسی سے حاصل کی ہوگی۔ اور وہ ہر ایک سے مل رہے تھے، اپنے مخصوص انداز سے؛ ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ گویا ذاکر صاحب اُسی کے لئے مخصوص ہیں اور سارا خلوص جو ہے اسی کے لئے وقف ہے۔ میں ملازم کی گود میں اس لئے تھا کہ مجمع بہت زیادہ تھا اور اُن تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ تو، کچھ ایک معاندانہ کیفیت میرے دل میں پیدا ہوئی کہ لیجئے 'صاحب' چچا ہمارے ہیں اور ہمیں ان تک پہنچنے کی بھی اجازت نہیں! ـــــ ایک چھ سات سال کے بچے میں جس قسم کی ایک نفسیاتی لہر آتی ہے! وہ بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے؛ مجمع تمام کھڑا ہوا تھا؛ کوئی ہاتھ ملا رہا تھا، کوئی کچھ کہہ رہا تھا، کوئی ہار پھول ڈال رہا تھا۔ پھر انھوں نے کسی سے پوچھا یہ بچہ کون

اِس لئے کہ وہ بھی مجھے اتنا چھوٹا دیکھ چکے تھے کہ کوئی تصویر ان کے ذہن میں میری محفوظ نہیں رہی تھی، لیکن قیاس کر رہے تھے۔ خیر، کسی نے بتایا تو وہ مجمع کو چیرتے ہوئے فوراً میری طرف آئے، مجھے گود میں لیا۔ اور اُس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے لئے مخصوص یا وقف نہیں ہیں بلکہ یہ میرے لئے وقف ہیں اس لئے کہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز اس کے بعد میں ہی بن گیا، اور مختلف قسم کے سوالات انھوں نے کرنا شروع کئے۔ غالباً اس میں ان کا یہ جذبہ بھی تھا کہ میں ان کے بڑے بھائی کا بچہ تھا اور چونکہ میرے والد کا انتقال دو تین برس کی عمر میں ہو چکا تھا، اسی حالت میں وہ مجھے چھوڑ گئے تو ایک تمام قسم کا جذبہ جو جذبہ فطری ہوتا ہے، پدری، یا کچھ ہوتا ہے وہ اُمنڈ آیا۔

پھر وہ چند روز رہنے کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے، جہاں انھوں نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے جامعہ کا چارج لیا۔ کیونکہ آتے ہی وہ شیخ الجامعہ بنا دیے گئے تھے۔ اب اُن کو فکر یہ ہوئی کہ قائم گنج کے چھوٹے سے قصبے میں، جہاں نہ کوئی اچھا اسکول تھا، نہ کچھ تھا، میری تعلیم اچھی نہیں ہو رہی ہے اور بقول اُن کے میں وہاں پہ ڈنڈے بجاتے پھر رہا ہوں، مجھے کسی طریقے سے یہاں سے منتقل کیا جائے۔ چنانچہ اگلے سال میں سن ۱۹۲۷ء میں ان ہی کی تحریک پر میں جامعہ ملیہ کے درجہ دوم میں داخل ہوا۔ اُس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی۔ ذاکر صاحب کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ اُس وقت جامعہ ملیہ کا ادارہ مختلف کرایہ کی عمارات میں منتشر تھا۔ کہیں پہ کالج تھا، کہیں پہ اسکول تھا، کہیں پہ ایک بورڈنگ ہاؤس تھا، کہیں پہ دوسرا تھا۔ اس وقت کا قرول باغ شہرِ دلی کی بہت ہی ایک دور افتادہ جگہ تھی، اور ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج کل ہے۔

مجھے بورڈنگ میں ڈالا گیا، چونکہ خیال یہ تھا کہ جامعہ کے بورڈنگ ہاؤس کی تربیت بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ تمام اثرات جو قائم گنج کی فضا کے ڈنڈے بجانے کے میرے اُوپر پڑے تھے وہ دھل جائیں۔ پٹھانوں کی بستی تھی، تو وہاں پٹھانوں کے بچے ڈنڈے ہی بجاتے پھرتے تھے، اور کوئی کام پڑھنے لکھنے کا کرتے نہیں تھے! میں اکثر شام کو، دوسرے دن، تیسرے دن مکان پر بھی جاتا رہتا تھا، اور بورڈنگ میں تو رہتا تھا ہی۔ یہ ذاکر صاحب کے عزم کا زمانہ تھا، اس کے ساتھ ساتھ افلاس کا زمانہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سو، سوا سو، اور بعد کو پچھتر روپے ان کی تنخواہ تھی اور یہی وہ زمانہ تھا جب جامعہ کے تمام کارکنوں نے یہ طے کیا تھا —— کارکن گیا، مولانا محمد علی (وغیرہ) اور حکیم اجمل خاں

خاں نے ــــــ کہ ہمیں جامعہ کو اب بند کر دینا چاہیئے اس لئے کہ ہم اس کے بڑھتے ہوئے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے ہیں ! تو اس وقت ذاکر صاحب کی تحریک پر بندرہ، بیس جاں بازوں کے ایک قافلہ، ایک ٹولی نے عزم کیا کہ جامعہ کو بند نہیں ہونے دیں گے اور اس عزم کے ساتھ، وہ حکیم جامعہ کے مربی تھے ان سے ملا۔ اُس وقت حکیم اجمل خاں اور دوسروں نے یہ سوال اٹھایا کہ بھائی کام کیسے چلے گا، کیلئے کچھ دینے کو اب تیار نہیں ہے؛ ہمارے ذرائع بھی محدود ہیں ! اخراجات بڑھ رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہم اپنی تنخواہیں بند کر لیں گے، لیکن جامعہ کو بند نہیں ہونے دیں گے۔ اس بندرہ بیس اشخاص کی ٹولی میں چند نام تو آپ کے بھی ذہنوں میں ہوں گے۔ پروفیسر محمد مجیب ڈاکٹر عابد حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی صاحب جو کہ ڈاکٹر قدوائی کے خالہ زاد بھائی تھے جو بعد کو جامعہ کے بڑے سرگرم رکن رہے ؛ حامد علی خاں صاحب، مکتبہ جامعہ کے مینیجر اور چند اور استاد اور شاگرد تھا بہرحال جامعہ بند نہ ہوئی اور ہم لوگ مکانوں اور گھروں کو واپس نہ کئے گئے۔ تو، کہہ میں یہ رہا تھا کہ یہ ذاکر صاحب اور جامعہ کے تمام اساتذہ کے اخلاص کا زمانہ تھا؛ عزم کا زمانہ تھا، اخلاص کا زمانہ تھا، تنظیم، عمل اور کام کا زمانہ تھا؛ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کہیں بھی جائیے، کسی کے مکان پر جائیے، ہمارے بورڈنگ کے وارڈن ارشاد الحق صاحب تھے، میں ان کے کمرے میں لٹکا دیکھتا تھا، ذاکر صاحب کے کمرے میں لگا دیکھتا تھا ؛ یہ اقبالؒ کا ایک شعر تھا، جو اُس عہد کے بڑے اچھے کاتب رستم قلم علی محمد خاں صاحب فرخ آبادی کا جو جامعہ کے اسٹاف میں تھے، لکھا ہوا تھا جس کو طبع کیا گیا تھا۔ اس وقت اُردو ہی نہیں آتی تھی، فارسی کیا آتی۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اچھی شاعری وہ شاعری ہے جو کسی زندہ تحریک میں تبدیل ہو جائے۔ اس کے اثرات ایسے ذہن پر بھی مرتب ہو سکتے ہیں جو زبان کی پوری تفہیم نہ کرتا ہو لیکن ایک دو لفظ بھی یہاں وہاں سے چمک جائے تو وہ نشتر بن کر اس کے دل میں اُتر جاتا ہے۔ وہ شعر یہ تھا:

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم ❋ از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

تو اس میں تخلیق، مقاصد، آرزو، زندہ، یہ چند لفظ تھے جس سے کہ مجھے آج محسوس ہوتا ہے کہ میں اس وقت بھی اس شعر کی جو اسپرٹ ہے؛ جو روح ہے اُس کو سمجھ رہا تھا، گو کہ میں فارسی بالکل نہیں جانتا تھا۔ اس وقت میری عمر ہی کیا تھی اور یہ شعر گنگناتے تھے ہم لوگ اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم

اس کے اثر کو پڑھ رہے ہیں! ایک اور تختی جو کہ ہر جگہ جلی اور نستعلیق کی لکھی ہوئی ملتی تھی اس سے بھی جامعہ کی اس ٹولی کے عزم کا پتا چلتا۔ شفیق صاحب کے یہاں جائیے اُن کے یہاں لکھا ہوا ملے گا، مکتبہ میں جائیے وہاں بھی یہ ٹنگا ہوا ملے گا، وہ حالی کا یہ قطعہ تھا:

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

اس رباعی اور اس شعر کے اندر جامعہ کی وہ جو ۱۵، ۲۰ پر مشتمل سر سے کفن باندھے ہوئے ٹولی تھی، اس کے عزم کا اور جامعہ کے اس طریقہ سے ایک بڑے پیمبری وقت سے نکل جانے کا پورا اثر ملتا ہے اور ہر شخص اس قسم کے جذبات اور خیالات سے سرشار تھا۔

یہی افلاس کا دور تھا جب ذاکر صاحب کا حسِ مزاح (Sense of Humour) بروئے کار آتا تھا۔ ذاکر صاحب کو اپنی آخری عمر میں کچھ صحت کی خرابی کی وجہ سے کچھ اس کڑھن کی وجہ سے جو سن ۴۷ کے واقعات سے تھی، جامعہ پہ جو افتاد گزری علی گڑھ کے حالات سے ہر طرف کے طعن وتشنیع نے جس کا شکار ہر اس شخص کو کسی بھی بھلے آدمی کو ہونا پڑتا ہے، وہ کافی جھول سے گئے تھے؛ ڈھل گئے تھے۔ لیکن یہ زمانہ تھا جب، میں نے دیکھا ہے کہ، اُن کے ہاں مزاح اور شمول بہت ہی شائستہ قسم کا مزاح بات بات سے ٹپکتا تھا۔ وہ بہت اچھے کنورسیشنلسٹ (Conversationalist) تھے مقرر تو تھے ہی، آپ نے سنا ہوگا، لیکن ان کی ٹیبل ٹاکس (Table talks) اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ اپنے مخصوص حلقوں میں جب کھلتے تھے تو واقعی ان کی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور ہم لوگوں کو رشک ہوتا تھا تو یہی زمانہ اُن کے حسِ مزاح کے کلائمکس کا ہے وہ مجلس میں، دوستوں میں، رشتہ داروں میں، عزیزوں میں چہکتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سارا دباؤ اور تناؤ جامعہ کی مالی پریشانی کی وجہ سے، یا ایک نئے ادارے کو تنظیم دینے کی وجہ سے ان کے ذہن پہ دن بھر میں رہتا تھا وہ گفتگوؤں میں اس کو خرچ کر دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گھر میں یہ حال تھا کہ اگر ایک یا دو مہمان کسی وقت ٹپک پڑیں تو بیگم صاحبہ، بیگم ذاکر حسین جن سے کہ اُن کی ہمیشہ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی، ان کے پاس واحد ترکیب یہ تھی کہ سالن جو پکا ہو اس میں ایک لوٹا پانی اور ڈال کے اور تھوڑا سا نمک ڈال کے، اس کو ذرا سا بڑھا دیا یہ ترکیب چلتی تھی

وہ ہیں جو ایک گھریلو عورت کو کرنا پڑتے ہیں اور سبھی واقف ہیں، جو اس دور سے گزر چکے ہیں انہیں سب کو کرنا
پڑتے ہیں، ان کو اکثر کرنا پڑتے تھے۔ چنانچہ جب وہ سالن بڑی قاب میں، جس میں کہ شوربا ہی شوربا ہوتا تھا،
بھر کر دیا جاتا تھا اور باہر آتا تھا تو جو کوئی مہمان ہوئے، میں بھی موجود ہوا تو فوراً مجھ سے کہتے: میاں مسعود!
لانا میرا لنگوٹ، باندھ کر ماردوں غوطہ، اِدھر سے اُدھر نکل جاؤں اور اُدھر سے اِدھر نکل جاؤں !!

اتفاق سے گھر میں چھتو نام کا ایک چھوٹا سا لڑکا بھی تھا، دس بارہ برس کا ـ وہ فوراً وہاں
سے جاتا، اور بیگم صاحبہ کے کان میں ڈال دیتا کہ صاحب یہ کہہ رہے ہیں۔ پھر مہمان تو چلا جاتا، اب جو یہ اندر
آتے تو مسکرا رہے ہیں ـــــ اور وہ جوش میں گرم! کیا میرا مذاق اڑایا جاتا ہے، اور یہ ہے اور وہ ہے۔ خیر
بات آئی گئی ہو جاتی!

یہی زمانہ ہے جب اور یہ عجیب و غریب چیز ہے، کہ ان کی فیاضی اور دوسروں کو مدد کرنے
کی، مالی مدد کرنے کی حِس اس زمانے میں میں نے زیادہ پائی، بہ نسبت کسی اور زمانے کے جبکہ وہ خوشحال
تھے۔ اس زمانے میں یہ اکثر ہوا ہے کہ کئی برس کے انتظار کے بعد نیا لحاف یا نیا گدّا، جڑاول بنائی
گئی اور بعد کو معلوم ہوا کہ ایک دن وہ جڑاول ابھی سردیاں آبھی نہیں پائی تھیں، اس کا استعمال بھی نہیں
شروع ہوا تھا کہ گھر سے غائب ہو گئی۔ تمام شور مچ رہا ہے، کون لے گیا، کہاں لے گیا، تو معلوم ہوا انھوں نے
کسی غریب طالب علم کو جو سردی میں اکڑ رہا تھا یا کسی اور غریب ساتھی کو اُڑھا دی ـــــ اور خود اپنے
پرانے لحاف میں، گدّے میں پڑے رہتے تھے!

مجھے اچھی طرح یاد ہے، ایک دفعہ جب جڑاول غائب ہو گئی، میں شام کو پہنچا تو ہماری چچی صاحبہ
واویلا کر رہی تھیں کہ انہیں کیا ہو گیا ہے ـــــ ـــــ خواتین انہیں ہی کہتی ہیں ـــــ انہیں
کیا ہو گیا ہے، ابھی میں نے بنایا تھا، خود اپنا لحاف پرانا ہو گیا ہے اور کسی طالب علم کو دیدیا، کیرالا سے
یا کہاں سے آیا تھا، سردی کے کپڑے نہیں تھے۔ اس پر انھوں نے جو لطیفہ سنایا مشہور فلسفی کانٹ کا، اس
لطیفے سے میں تو محظوظ ہوا اگر میری خیال ہے چچی صاحبہ پہ کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا: کانٹ ہر سال
سردیوں میں یہ خیال کرتا تھا کہ میں اپنا پرانا اوورکوٹ ابھی الگ کر دوں گا، نیا اوورکوٹ خریدوں گا
اور اس کے لئے کچھ پیسے سال میں بچاتا رہتا تھا۔ اور جب اس کی عمر ساٹھ سے تجاوز کر گئی تو ہر سال وہ یہ
کہتا تھا کہ اگلی کرسمس کے موقع پر میں شادی کر لوں گا، اور اس کے لئے وہ پیسے بچانا شروع کرتا

شادی کا منصوبہ اس نے اپنی زندگی میں کئی بار بنایا اور اس کے بعد جب پیسے اتنے ہو جاتے تھے اور سردیاں آتیں تو کہتا تھا یہ میرا اوورکوٹ جو ہے پرانا ہو گیا ہے، شادی تو اگلے سال میں ہو جائے گی اس کا بدلنا ضروری ہے؛ انھیں پیسوں سے وہ اوورکوٹ اور گرم سوٹ وغیرہ بنا لیتا تھا اور شادی اس طریقے سے ملتوی رہتی تھی۔

یہ لطیفہ سنا کر اپنی بیگم سے بولے کہ بھئی میں یہ تو نہیں کرتا ہوں، خدا کا شکر ادا کرو، شادی تو نہیں کرتا ہوں۔ میں صرف یہی کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر بیٹھوں تو کیا کرو گی۔

غرضیکہ حسِ مزاح (sense of humour) میں زندگی کے وہ نشتر، وہ چھوٹی چھوٹی تلخیاں جو بعض اوقات گھریلو زندگی میں بڑھ جاتی ہیں، انھیں وہ نہ صرف خود گوارا کر لیتے تھے، بلکہ دوسروں کے لئے گوارا بنا دیا کرتے تھے۔

جامعہ کی جو خدمات کی ہیں اور کڑے وقت میں جس قربانی کے ساتھ انھوں نے جامعہ کو چلایا ہے اس کی تفصیلات میں، میں نہیں جاؤں گا لیکن، اس زمانے میں جو جامعہ برادری کہلاتی تھی اس میں جو ان کے چلنے پھرنے کا ڈھنگ تھا، برتاؤ تھا، سلوک تھا اس کی ایک دو یادیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

جامعہ ملیہ واقعی ایک سرپھروں کا مجمع تھی۔ ذاکر صاحب کی قیادت میں ان سرپھروں میں سے کسی کو یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ ہم جامعہ کے لئے اسی قدر مفید نہیں ہیں، یا قربانی نہیں کر رہے ہیں جتنی کہ ذاکر صاحب کر رہے ہیں، اور ذاکر صاحب انھیں باور کراتے رہتے تھے کہ بھئی میں تو صرف منتظم ہوں، دیکھتا ہوں اصل قربانیاں تو آپ کی ہیں۔ آپ اس ادارے کو چلا رہے ہیں۔ انھیں آدمی سے کام لینے کا ہنر آتا تھا، اس کی تعریف کرتے تھے، اس کے کاموں کی تحسین کرتے تھے اور اسے کام کرنے کے لئے گرما دیتے تھے۔ کسی کے ہاں کھانے کا انتظام نہیں ہے تو ڈائننگ ہال سے کھانا جاری کروا دیا، وہاں تھوڑے سے پیسے میں کام چل جاتا تھا۔ اس طریقے سے وہ مختلف لوگوں کی جو ضروریات ہیں ان کو پورا کرانے کی کوشش کرتے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے کچھ دلوا دیا، کچھ کام دلوا دیا۔

اس انداز کی قیادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ذاکر صاحب کے زمانے کے ایک چپراسی جو کہ اتفاق سے جب میں کچھ عرصہ شیخ الجامعہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا، تو وہ میرے بھی ذاتی سٹاف تھے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس منصب کے وقت ہو گیا تھا۔ لیکن وہ زیادہ پڑھے لکھے ہونے کے لئے زیادہ نہیں تھے

کہتے تھے کہ ذاکر صاحب کی جامعہ میں کوئی شخص ریٹائر ہوتا ہی نہیں تھا؛ مرجائے، گم ہوجائے، کچھ ہوجائے، یا خود کسی مجبوری سے چلا جائے —— ورنہ وہاں ریٹائرمنٹ کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس لیے کہ یہ تو سب قربانی کرنے والوں، ایثار کرنے والوں کا مجمع تھا! یہ آپ مجھے ریٹائر کیسے کر رہے ہیں۔ میں نے کہا بھئی جامعہ کے رول بدل چکے ہیں، وہ جامعہ سرکاری مدد نہیں لیتی تھی، اب ہم سرکاری مدد لیتے ہیں، ہمیں کچھ ریٹائرمنٹ کے رول بنانے پڑتے ہیں، اس کے مطابق آپ کو ایک ایک سال کی تین توسیعات دی جا چکی ہیں، اب کہاں تک دی جائیں گی؛ اور آپ کی عمر پہلے سے میں نے معلوم کرلیا، پانچ سال کم ہے؛ تو تین توسیعات اور پانچ سال آپ نے عمر کم لکھائی ہے، ساٹھ کے بعد آپ نے آٹھ سال سروس کرلی ہے، اڑسٹھ برس کے ہوگئے اب آپ آرام فرمائیے! بہت ناراض ہوئے!! ایک دن میرے سکریٹری سے کہنے لگے کہ صاحب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے جامعہ کیوں نہ چھوڑ دی۔ بہت پہلے ہی ہمیں چھوڑ دینا چاہیے تھی، دیکھیے جا کے جو بھی نکل گیا وہ کچھ نہ کچھ بن گیا؛ ذاکر صاحب نکلے، وائس چانسلر ہوگئے، گورنر ہوگئے، صدر جمہوریہ ہوگئے۔ فلاں صاحب نکلے، فلاں جگہ جاکے پروفیسر ہو گئے، ہو گئے، اگر اس وقت نکل جاتے تو آج کچھ ہوجاتے۔ یہ سن کر میں ہنسا۔ مجھے ان کی نفسیات معلوم تھی ... جامعہ برادری کے فرد تھے جس میں ہر شخص برابر تھا اور کوئی شخص زیادہ برابر ... نہیں تھا۔ ہر شخص برابر تھا، ہر شخص دوسرے کو ٹوک دیتا تھا۔ چپراسی ہو، کلرک ہو ... جب مجلس شوریٰ ہوتی تھی تو ہر شخص شیخ الجامعہ سے یا دوسرے کسی عہدیدار سے، خازن سے، برابری کی گفتگو کرتا تھا اور اپنی تجاویز پہ اٹھ کے واک آؤٹ (walk out) بھی کر جاتا تھا۔ یہ تمام تماشے ہوتے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب نے اسے انگیز کیا۔ یہاں ایک جمہوری نظام تھا جہاں پہ ہر چھوٹے بڑے کی رائے کا احترام کیا جاتا تھا اور ہر ایک کو اپنی بات کہنے کی جرأت ہوتی تھی، ذاکر صاحب کہتے تھے کہ ان لوگوں کو خفا ہونے دو، میں مناؤں گا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ ہر مہینے ایک نہ ایک استاد یا ایک کلرک ان سے خفا ہوجاتا تھا اور پھر وہ تاسف یا افسوس ظاہر کرنے کے لئے نہیں آتا تھا، ذاکر صاحب اس کے مکان پر دوسرے یا تیسرے دن پہنچتے تھے اور اظہار افسوس کرتے تھے اور پھر تعلقات قائم ہوجاتے تھے۔ جب وہ شیخ الجامعہ تھے، ذاکر صاحب کے ایک پرسنل اسسٹنٹ تھے الیاس مجیبی مرحوم، جنھوں نے کہ "سرکار دو عالم" "سرکار کا دربار" اور بہت سی کتابیں لکھی ہیں، بچوں کے ادیب کہلاتے تھے، سکریٹری تو وہ نام کے تھے، ادیب زیادہ تھے، سارا وقت ان ہی چیزوں میں صرف کرتے تھے، خط و کتابت اور

مراسلت کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔ کام پڑا رہتا تھا اور ہمیشہ ذاکر صاحب ان سے شاکی رہتے تھے۔ لیکن اُن سے خفا ہونے کی ان میں ہمت نہیں تھی اس لئے کہ وہ برابر کے مشیر تھے ! سکریٹری یا اسسٹنٹ نہیں، مشیر تھے ! اور مشیرِ اوّل کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو اُن کی رائے کا احترام کرنا ضروری تھا۔ زیادہ سے زیادہ جب بہت تنگ آجاتے وہاں سے لوٹ کر ذکر آتا تو، کہتے تھے بھئی ہماری زندگی، ہماری تخلیق کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم الیاس مجیبی صاحب بنجائیں ؛ بس ہمارا دنیا میں اور کوئی مقصد نہیں ! اس سے آگے کبھی اُنھوں نے ان کی شکایت نہیں کی۔

اسی طریقے سے، ان کے ایک اور عقیدت مند تھے جو دہلی کالج کے پرنسپل تھے۔ چونکہ ذاکر صاحب ۴۷ء کے بعد دہلی کالج کی گورننگ باڈی کے صدر ہو گئے تھے تو ـــــ اس سے پہلے تو وہ انہیں پہچانتے بھی نہیں تھے لیکن جب وہ گورننگ باڈی کے صدر ہو گئے تو ـــــ اس کے بعد ان کے مکان کی دہلیز پے ڈالی؛ صبح شام کھڑے ہوئے ہیں۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ اپنے کالج کے مسائل کم لاتے تھے، اپنے مسائل زیادہ لاتے تھے اور عقیدت کا یہ اظہار کہ انھیں نفر اد کھلا کہتے تھے اور جب ذاکر صاحب ڈرائنگ روم سے یا کہیں بیٹھ کے نکل رہے ہیں تو فوراً جسے کہتے ہیں جوتیاں لا کے سیدھی کر دیں؛ ہر قسم کی ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب میں ضبط و برداشت کا عالم تھا ـــــ اور میں جب ان کی سیرت کے بارے میں کچھ کہوں گا، تو میں بتاؤں گا کہ سب سے بڑی ان کی اخلاقی صفت جو تھی وہ تحمّل تھا، برداشت تھی۔ وہ خود اپنی جان پر عذاب لیتے تھے لیکن دوسروں کے لئے عذاب نہیں بنتے تھے۔ یہ عجیب و غریب چیز تھی ! تو، یہ پرنسپل دلی کالج، اتفاق سے پاکستان بننے کے ایک دو سال کے بعد انھیں وہاں کوئی ملازمت مل گئی اور وہ پاکستان چلے گئے۔ جب ذاکر صاحب کو خبر ملی تو مسکرا کے کہنے لگے کہ بھئی ہمیں بھی پاکستان بننے سے ایک فائدہ ہوا کہ خورشید چشتی صاحب سے ہمیں نجات مل گئی۔ ان کا اس قسم کا انداز تھا ! لیکن جب خورشید چشتی صاحب آجاتے تھے تو، تو چل میں چل، بھئی چائے لانا، یہ لانا وہ لانا، اور، وہ جب آتے تھے تو پورے آدھے دن کے لئے آتے تھے۔ اگر دوپہر کو بارہ بجے نمودار ہو جائیں، تو شام کو چھ، سات، آٹھ سے پہلے نہیں جاتے تھے۔ کھانا بھی وہیں، چائے بھی وہیں، ہو جانے والے آدمی تھے۔

اس تربیت اور اس انداز کی زندگی گزارنے کے بعد مولانا آزاد اور پنڈت

جامعہ لال نہرو وغیرہ کے اصرار پر انھوں نے سن ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری قبول کی۔ میں اس وقت وہاں لکچرر استاد کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی جب شام کو جانا ہوتا تھا تو مجھ سے پوچھتے تھے کہ بھئی آپ کے یہ علی گڑھ کیسا ہے؟ تو میں ہمیشہ یہ کہتا تھا اور تو کچھ میں نہیں کہہ سکتا ہوں لیکن آپ کی جامعہ سے بالکل مختلف ہے۔ کہنے لگے بھئی ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا، اس لئے کہ آپ نے زندگی کے ۲۰ سال ایک ایسے ادارے میں گزارے ہیں جسے آپ نے بنایا ہے اور جہاں آپ نے قرون اولیٰ کی جمہوریت قائم کر دی ہے جہاں آپ کا چپراسی، آپ کا کلرک، کوئی آداب ملازمت نہیں رکھتا ہے اور بآواز بلند ہر بات کہہ سکتا ہے؛ ظاہر ہے وہاں پر اپنی جان کھپاتے رہے ہیں آپ۔ کہنے لگے ہاں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، مجھے زیادہ بات کرنے کی عادت جو ہے وہ بھی جامعہ میں پڑی۔ کہتے تھے وہاں اپنے کلام اور اپنی گفتگو ہی سے تو لوگوں کو آمادہ اور زیادہ آمادہ کرتا تھا! اگر میرے پاس یہ بھی وصف نہ ہوتا، صفت نہ ہوتی، تو لوگوں کو جھیز کیسے لگاتا! ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا، غلطی وہ کرتے تھے، معافی میں مانگتا تھا! یہاں پر تو بڑے بڑے استاد ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں ایک استاد کے بارے میں میں آپ کو بتاؤنگا، بغیر نام لئے ہوئے، کہ جب آپ نے چارج لیا ہے تو —— مجھ سے ان کے تعلقات ہیں چونکہ باہر کے آدمی ہیں —— مجھ سے کہنے لگے کہ مسعود صاحب یہ بتائیے کہ ذاکر صاحب کی ہابی (Hobby) کیا ہے؟ میں نے کہا بھئی آپ کو ان کے علم و فضل، کام، سے دلچسپی ہونی چاہیئے؛ ہابی سے کیا دلچسپی ہے؟ جب وہ چلے گئے تو ہمارے ایک اور دوست جو بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگے کہ یہ ہابی کے ذریعہ سے داخل ہونا چاہتے ہیں۔ خیر، میں نے تو مذاق میں ان سے کہا کہ ان کی ہابی جو ہے وہ صرف کام ہے۔ مگر بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے کسی اور سے ان کی ہابی گلاب کی معلوم کر لی اور گلابوں کے نئے نئے قسم کے پودے لے کر انھوں نے رسوخ حاصل کر لیا۔ ایک دن جب ذاکر صاحب شام کو اپنے گلابوں میں ٹہل رہے تھے تو کہنے لگے بھئی دیکھئے یہ گلاب کی قسم! اس کا رنگ تم نے دیکھا ہے! یہ ابھی فلاں صاحب نے لاکر دیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ میں بنگلور گیا تھا وہاں سے یہ لایا ہوں۔ میں نے کہا جی ہاں وہ ایک دن آپ کی ہابی مجھ سے پوچھ رہے تھے تو میں نے گلاب کا پتا نہیں دیا لیکن انھیں پتا انھیں مل گیا —— کہنے لگے بھئی عجیب و غریب دنیا ہے۔ میں نے کہا دیکھئے صاحب، یہاں پر آپ کو

ایڈمنسٹریٹر بنتا ہے۔ ایڈمنسٹریشن میں اور تالیف قلب میں، بھائی چارے میں میاں بھائی کہہ کر بات کرنے میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔! یہ بڑا ادارہ ہے، اس کی روایات بن چکی ہیں، یہاں لوگ جو ہیں وہ وائس چانسلر کے بٹن کی فکر میں رہتے ہیں کہ کونسا بٹن دبائیں تو کہاں پر کیا پریشر (pressure) پڑے گا۔ یہ وہ ادارہ ہے جہاں ہر ایک اس کے فیس ویلو (Face value) پر جیسا کہ وہ ہے اس کو نہیں لینا ہے۔ بلکہ اس کے بارے میں معلوم کرنا پڑے گا اور کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔ کہنے لگے بھئی یہ کام تو ہم نے کبھی کیا ہی نہیں ہے۔ میں نے کہا جی ہاں کیا تو نہیں ہے مگر علی گڑھ میں جب آپ آئے ہیں تو میں علی گڑھ کا طالب علم بھی رہ چکا ہوں، طالب علم تو خیر آپ بھی رہ چکے ہیں، بہت نمایاں طالب علم تھے، لیکن اسے بہت عرصہ ہو چکا۔ میں یہاں پچھلے بارہ پندرہ سال سے ملازم بھی ہوں، بحیثیت لیکچرر کے، اب وہ نسل علی گڑھ کی نہیں رہی ہے جو اپنے ادارے سے والہانہ محبت رکھتے ہوں یا قربانی و ایثار کا جذبہ رکھتے ہوں۔ نہ یہاں کے سماج یا برادری کی وہ صورت ہے جو جامعہ ملّیہ کی ہے جہاں پر ہر شخص اپنے آپ کو سمجھتا ہے کہ میں معمارِ اعظم ہوں اس جامعہ ملّیہ کا! چنانچہ رشید صاحب نے ذاکر صاحب پر جو مضامین لکھے ہیں ان میں ایک بڑا اچھا جملہ لکھا ہے کہ میں جب جامعہ ملّیہ جاتا ہوں، یہ انھیں کے الفاظ ہیں، تو مجھے جتنا شیخ الجامعہ سے ڈر لگتا ہے اتنا ہی مجھے چپراسی سے ڈر لگتا ہے اس لئے کہ دونوں خادمِ قوم ہیں۔ تو رشید صاحب نے بھی اس نکتے کو پا لیا تھا کہ وہاں کی فضا کیا تھی۔

علی گڑھ میں ذاکر صاحب کے مشیرِ خاص رشید صاحب تھے جن پر وہ پورا بھروسا اور اعتماد کرتے تھے۔ لیکن ایک دن! رشید صاحب میرے استاد بھی رہے تھے، میں نے ایم۔اے اُردو میں کیا تھا۔ ایک دن اچانک مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی آپ کے استاد، یعنی رشید صاحب، کا واقعات کی طرف اخلاقی ردِّعمل تو بہت صحیح ہوتا ہے لیکن عقلی اور استدلالی ردِّعمل بہت غلط ہوتا ہے۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام، وہاں وہ تقریباً سات سال رہے، میں نے مسلسل دیکھا کہ کھانے اور ناشتے کی میز پر کھیل کے میدان میں جوان کا اسٹیمیٹ (estimate)، اور ان کی جو میزان ہے ہر شخص کے لئے، ہر استاد اور اہم شخصیت کے لئے بڑی صحیح ہوتی تھی، اور ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان سے زیادہ مردم شناس وائس چانسلر علی گڑھ کو کبھی نہیں ملا۔ جو استادوں کے کاموں کو جانتا ہے، استادوں کی صلاحیت کو جانتا ہے، یہ جانتا ہے کہ کون سا استاد جو ہے وہ گپ کر رہا ہے کون سا! لیکن مجھے آج تعجب ہے ذاکر صاحب پر کھل کر تو بادجود قرابت داری کے ان کا ذکر کرنا چاہئے۔۔۔۔ اور ۔۔۔ مجھے کہنا نہیں بلکہ

بیشتر وہ لوگ جو اس زمانے میں ان کے قریب آئے اور انھیں کام کرتے ہوئے دیکھا اس بات پر متفق ہیں کہ علی گڑھ میں غلط آدمیوں نے ان سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ اور' جو اچھے لوگ تھے اپنے کام سے کام رکھتے تھے' صحیح معنوں میں علم سے محبت رکھتے تھے' وہ آتنا فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ خود ان کی نظر کبھی پڑ جاتی تھی تو وہ کھینچ کر اُسے باہر لانے کی کوشش کرتے تھے لیکن چونکہ وہ زیادہ گھُستے نہیں تھے' لہٰذا علی گڑھ میں جابجا اچھے آدمیوں کو فائدہ پہنچا' اس سے زیادہ غلط آدمیوں کو ترقیاں ملیں' اور جس سے نقصان پہنچا۔

میں' تھوڑا سا! میں نے آپ کو بتایا کہ میرا اُن کا رشتہ' قرابت داری کا نہیں تھا' بلکہ گھر کے بچے کی حیثیت سے قریب رہنے کا جو تھا' تنہائی میں' میں ان سے خاصی کھُلی گفتگو کر لیتا تھا۔ میں ان سے ہمیشہ کہتا تھا کہ صاحب علی گڑھ کو آپ اس انداز سے نہ چلایئے جس انداز سے کہ جامعہ ملیہ چلائی ہے۔ کہنے لگے میں کیا کرتا ہوں؟ میں نے کہا کہ آج ہی میں نے دیکھا کہ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے فلاں صاحب سے دو گھنٹے تک تقریر کر رہے تھے اور سمجھا رہے تھے اور نکتہ صرف یہ تھا کہ وہ آپ کے پاس کوئی کام لے کر آئے تھے اور آپ نے معذرت کر لی تھی کہ بھئی یہ قاعدے قانون کے مطابق میں کر نہیں سکوں گا' اور پھر تالیفِ قلب کے لئے دو گھنٹے اس پر صرف کئے کہ کیوں نہیں کر سکوں گا۔ تو کہنے لگے واہ' یہ کوئی بات ہوئی کہ آپ انکار بھی کر دیں اور پھر بیچارے کی تالیفِ قلب بھی نہ کریں! میں نے کہا آپ کی صحت اس قابل نہیں ہے ——— کیونکہ علی گڑھ کے پہلے ہی سال ۱۹۴۹ء میں قلب کا پہلا حملہ ہوا تھا' اور اس کے بعد سے' وہ ظاہر ہے کہ ہمیشہ ہی علیل ہو گئے تھے۔ اسٹرین (strain) کچھ نہ کچھ پڑتا ہی رہتا ——— نہ تو طبی نقطۂ نظر سے' نہ تقسیم اوقات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو ہوتا ہے؛ کیوں آخر آپ! آپ بتا دیجئے'' آپ تو بڑی نرمی کے ساتھ ملائمت کے ساتھ بات کرتے ہیں' کہ میں نہیں کر سکتا ہوں۔ تو آپ مطمئن کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ دیکھئے' انسان کی فطرت ہے' اور علی گڑھ کے انسانوں کی فطرت کو میں جانتا ہوں کہ آپ دو گھنٹے تک persuade کرنے کی کوشش کریں اس کے لئے کہ آپ کا فیصلہ صحیح ہے' لیکن باہر وہ غیر مطمئن ہی جائے گا۔ وہ تو مطمئن اس وقت ہوگا جب کہ اس کا غلط کام کر دیا جائے تو اس طریقے سے انرجی ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ الٹا بحث کرتا ہے' آپ اس کا جواب دیتے ہیں' آپ کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔

ان کا انداز یہ تھا کہ جب کوئی بات ان کے دل میں اُترتی تھی تو خاموش ہو جاتے تھے

لگتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات آپ کہ رہے ہیں وہ ان کے دل میں اُتر رہی ہے۔ کہنے لگے: مجھے تو عادت ہے، جامعہ سے، اور میں نے تو زندگی اسی طریقے سے گزاری ہے، کہ لوگ مجھے بُرا بھلا کہتے ہیں میں ان سے معافیاں مانگتا ہوں۔ میں نے کہا صاحب، یہاں تو جامعہ سے دس گنا بیس گنا زیادہ اسٹاف ہے۔ یہاں کس کس کے گھر جائیں گے اور معافی مانگیں گے۔ وہاں ایک تیس چالیس، پچاس آدمی ہیں، اس میں دس بیس خراب آ گئے، تو آپ یہ کر سکتے تھے!

علی گڑھ میں انھیں دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ جتنا ضبط و تحمّل ان کے پاس تھا وہ واقعی بہت کم لوگوں کے پاس ہوگا اور، غالباً، یہ صرف ان ہی کے پاس نہیں تھا۔ یہ کرداری خصوصیت اس پوری نسل کی تھی جس نے قومی آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ گاندھی جی کے بارے میں بھی اسی قسم کے واقعات اور روایتیں سُننے اور پڑھنے میں آئی ہیں۔ وہ ہر چیز سُنتے تھے اور اپنے اُوپر سہ لیتے تھے، دوسرے کو تکلیف یا گزند یا دُور سے بھی کوئی رنج پہنچانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

ظاہر ہے یہ یادوں کا جو سلسلہ ہے ایک لکچر نہیں پوری ایک تصویر کا موضوع بن سکتا ہے۔ میں اس وقت زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا، یہ تو واقعات تھے جن سے کہ میں نے ان کی فیملی تصویر کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہے ان کی شخصیت کے بارے میں میرے تاثرات، ان کے بارے میں چند کلمات اور کہنا چاہتا ہوں:

○

میرا خیال یہ ہے کہ شخصیت کے جو تین بنیادی فلسفیانہ عناصر ہیں، خیر، صداقت اور عشق، ان کی شخصیت ان تینوں سے عبارت تھی۔ آخری عمر میں ان کا رجحان مذہب کی طرف ہو گیا تھا، ویسے وہ مذہب کے خلاف کبھی بھی نہیں رہے۔ اور اسلام کی جو بھی عبادات ہیں ان میں حسب توفیق حصّہ بھی لیتے رہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ ایک اخلاقی آدمی تھے اگر کوئی مذہب یا مذہبی شخص اخلاقی اقدار کی پابندی نہیں رکھتا تو اس کا مذہب اور ساری عبادتیں اور ریاضتیں، بیکار ہو جاتی ہیں۔ یہ اخلاقیات یا اخلاقی اقدار یا خیر پر زور میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے ماخذ یا سوتے انھوں نے کہاں سے لئے تھے۔ لیکن دو سوتوں کا میں قیاس کر سکتا ہوں ـــــ ایک تو قائم گنج کا وہ

پٹھانی سماج جس کے یہاں اخلاقی قدر ہوتی ہے تو راسخ ہوتی ہے —— اور بداخلاقی قدر ہوتی ہے، تو وہ بھی راسخ ہوتی ہے —— لیکن ہوتی لامتناہی ہے! تو، کچھ اقدار تو وہاں سے انھیں ملی تھیں ورثے کی اقدار! بات کا پاس ہے، دوسرے کی مدد کرنا نیکی، دوسرے کا احترام اپنے احترام کے ساتھ! یہ قبائلی اور سماجی وراثت کے طور پہ چلیں۔

لیکن غالباً جب وہ جرمنی میں تھے اس وقت کی فکر میں کئی ایسے فلسفی پیرس میں، برلن میں، انگلستان میں موجود تھے جو اخلاقی اقدار کو ایک طرح سے مذہبی عبادات اور رسومات سے بھی برتر مانتے تھے کہ اگر اس کے بغیر مذہب ہے تو کچھ نہیں ہے۔ بعض لوگ تو خیر، مذہب کو مانتے ہی نہیں تھے اخلاق کو ہی مذہب مانتے تھے۔ لیکن کچھ لوگ جو کہ کسی چیز کے لئے گنجائش نکال لیتے تھے، وہ بھی اس لازم وملزوم کے ساتھ کہ کوئی مذہبی شخصیت بغیر اخلاق کے لائقِ اعتنا نہیں ہے۔ چنانچہ ایسی مذہبی شخصیتیں جن کا ظاہراً اعتبار سے بہت مذہبی ہے اگر وہ بداخلاقی کی حد تک گرتے تو اس وقت انھیں جلال آتا تھا، غصہ آتا تھا۔ صحیح غصہ ذاکر صاحب کا، لوگوں نے بہت کم دیکھا ہے 'وہ ہمیشہ آیا ہو کسی اخلاقی قدر پر! اس وقت وہ بے آپے ہو جاتے تھے اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور شستہ زبان میں جتنے سخت کلمات وہ کہہ سکتے تھے کہہ دیتے تھے۔

گو کہ تھوڑا سا تصوّف کی طرف بھی رجحان تھا، ابتدائی زندگی میں اس کے سرچشمے ملتے ہیں۔ مگر وہ تصوّف بھی جو کہ اخلاق سے عاری ہو ان کے لئے قابلِ تقلید نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی چند اخلاقی قدروں کے گرد بنائی تھی۔ وہ اخلاقی قدریں کچھ تو انھیں خود مذہب اسلام میں ہی مل گئی تھیں؛ کچھ انسانیت دوستی کی تحریک میں مل گئی تھیں جس سے کہ یورپ کی فضا معمور تھی؛ اور کچھ ان عملی اقدار میں مل گئی تھیں جن سے کہ ہماری قومی تحریک عبارت تھی۔

اسی ضمن میں، میں یہ بھی آپ کو بتادوں کہ جن شخصیتوں نے ذاکر صاحب کو سب سے زیادہ متاثر کیا؛ ایک تو گاندھی جی کی شخصیت تھی۔ میں نے کبھی انھیں گاندھی جی پر تنقید کرتے نہیں سنا، بجز ایک موقع کے؛ اور، اس کا پس منظر کیا تھا میں نہیں کہہ سکتا ہوں۔ گاندھی جی یہ بات ہو رہی تھی کہ ان کی زبان سے نکلا کہ "آخر لوگ سیاست سے ریٹائر کیوں نہیں ہو جاتے ہیں۔ ریٹائر ہونا کیوں نہیں چاہتے ہیں"! گاندھی جی کی طرف اشارہ تھا۔ اب مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ کس سلسلے کا یہ موضوع تھا۔ میں ایک دم تھوڑا سا بھونچکا ہو گیا،

اور میرے ذہن پر یہ جملہ اب تک مرتسم ہے۔

دوسری بڑی شخصیت جس سے کہ وہ متاثر تھے اور جوان کی ذہنی ساخت کے بہت قریب تھی وہ اقبال کی شخصیت تھی۔ اقبال کا جادو سر پر بہت پہلے چڑھ گیا تھا، نہ صرف ذاکر صاحب پہ، بلکہ مولانا محمد علی پہ! یہ عجیب و غریب چیز ہے کہ اقبال کی بانگ درا ابھی شائع بھی نہیں ہوئی تھی صرف اسرار خودی ہی شائع ہوئی ہے اور رموز بیخودی: پہلی جنگ عظیم سے پہلے ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۴ء میں، اگر تاریخیں مجھے صحیح یاد ہیں۔ اسرار خودی کے شائع ہوتے ہی مولانا محمد علی کو تو ایک صحیفۂ آسمانی مل گیا تھا۔ اس کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنسو بہتے جاتے تھے۔ ابتدائی جامعہ ملیہ میں جب وہ علی گڑھ میں درس دیا کرتے تھے ـــ وہ پہلے شیخ الجامعہ بھی تھے ـــــ تو اُن کا درس ایک دن اگر قرآن کریم پہ ہوتا تھا تو دوسرے دن اقبال پہ جو اسلام کا exposition ہے اس پہ۔ (جن لوگوں نے یہ درس سنے ہیں ان پہ جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہی جانتے ہیں) ذاکر صاحب کا اقبال کے ساتھ جو غلو و شغف ہے (اس کا یہ پس منظر ہے)۔ اُنہیں اقبال کے اشعار بے شمار یاد تھے۔ اچھے اشعار رستم قلم محمد علی فرخ آبادی کو جو جامعہ میں خوش نویسی کے اُستاد تھے، وہی چھانٹ کر دیا کرتے تھے؛ ان سے لکھواتے تھے۔ پھر مکتبہ جامعہ انھیں اہتمام کے ساتھ شائع کرتا تھا اور جگہ جگہ جاتے تھے۔ اب میں یہ تو نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کی فکر سے وہ سو فیصد کہاں تک ہم آہنگ تھے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ مثلاً اقبال کا جو تصور نسواں ہے ذاکر صاحب اس سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کیونکہ انھوں نے کچھ لکھا نہیں ہے اقبال پر، نہ کوئی خاص تقریریں ہوئی ہیں۔ لیکن مجموعی طور سے اقبال کے کلام کا وہ حصہ جو کہ عمل کی آواز دیتا ہے، انسان کی خودی کو بیدار کرتا ہے، جو نفس کو مارتا ہے، اوپر لے جاتا ہے اور انسان کو خدا صفت اور خدا نما بنانے کی کوشش کرتا ہے، یہ تمام چیزیں یقیناً ان کے (مزاج سے ہم آہنگ تھیں)۔

آخری دور میں جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو اُن کا محبوب بند مسجد قرطبہ کا ایک بند تھا، جیسے کہ میں دیکھتا تھا کہ شام کو کھانے کے بعد ـــــ ان کے سرہانے اس قسم کی کتابیں رکھی رہتی تھیں ـــــ ہمیشہ گنگنا کر اسے پڑھا کرتے تھے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ ✧ غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز الخ

یہ اُن کا محبوب بند تھا۔

مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ بند انھیں بہت پسند ہے کہ اس میں مردِ مومن یا انسانِ کامل کے نقوش اقبال نے اُبھارے ہیں۔ تو جب ذاکر صاحب نے علی گڑھ کی وائس چانسلری کا چارج لیا، اُس وقت میں شعبۂ اُردو میں لکچرر تھا اور ایک ہوسٹل کا وارڈن بھی تھا۔ وہ ہوسٹل وی ایم ہال میں تھا، جہاں چار پانچ اور ہوسٹل تھے۔ اس کے پرووسٹ صاحب، ڈاکٹر طاہر رضوی، اب بھی حیات ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا "مسعود صاحب، ہم نئے وائس چانسلر کو ایک ریسپشن (Reception) دینا چاہتے ہیں جس میں خالی چائے وائے ہی نہ ہو، بلکہ ایک تحریر بھی ہو، کچھ لکھ کر انھیں دیا جائے۔ اور چونکہ باقی تو سائنس کے لوگ تھے۔ میرے سپرد ہوا کہ آپ لکھ لائیے۔ وہ پریزنٹیشن (Presentation) جو فریم کر کے انھیں دیا گیا تھا اس میں اس بند کے حوالے سے بہت سی چیزیں کہی تھیں اور میں نے بتایا تھا کہ ذاکر صاحب کا کردار اور ان کی سیرت کس طریقے سے اس کا اکتساب کرتی رہی ہے اور کس طریقے سے وہ اس کی جھلک اپنے میں اور اپنی جھلک اس میں دیکھتے رہے ہیں۔

یہ وہاں پڑھ کر سنایا گیا، اور بہت اس پہ! چھپے ہوئے چور نکل رہے ہیں!! ذاکر صاحب کا چہرہ میں دیکھ رہا تھا کہ : رنگ آ رہا تھا، جا رہا تھا!! اس کے بعد جو کھڑے ہو کر اُنھوں نے جوابی تقریر کی ہے —— پڑھا ایک طالبِ علم تھا، میں تو بیک گراؤنڈ میں تھا —— تو اس میں انھوں نے بتایا کہ یہ بالکل صحیح ہے کہ یہ بند مجھے بہت پسند ہے۔ لیکن میں تو، اس بند میں اس شاعرِ اعظم نے جو فکر ظاہر کی ہے اس کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ اور پھر جو اپنی انکساری اور حلم اور "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" والے مضمون سے جو انھوں نے شروع کیا ہے، تو ! ذاکر صاحب کی بہترین خطابت، بہترین گفتگو اس وقت ہوتی تھی جب آپ چیلنج کرتے تھے، اگر اُن سے اچھی تقریر کروانا ہے تو آپ دکھتی رگ چھیڑ دیجیے۔ وہ، ان کی بہترین تقریروں میں سے ایک تھی۔

شام کو جو میں پہنچا، تو مجھ پر ڈانٹ پڑی کہ حضرت آپ یہ کیا کرتے رہتے ہیں؟ میں نے کہا صاحب میرا کیا تعلق؛ یہ لڑکوں نے کیا تھا، میں تو خود وہاں مہمان کی حیثیت رکھتا تھا "نہیں، یہ کوئی بیت سکتا ہے، یہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ میں دیکھ رہا تھا آپ کا قلم اس میں! لاحول ولا قوۃ! اور یہ کہ اس قسم کی چیزوں میں آپ نہ پڑا کیجیے"!! خیر وہ بات آئی گئی ہوئی۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اقبالؔ کے فلسفے نے نہ صرف مولانا محمد علی کو، بلکہ ذاکر صاحب، عابد صاحب، اس پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ایک زمانہ تھا جب ہماری فکر کے سانچے اقبال نے اپنے قبضے میں کر لئے تھے ۔۔ یہ نفسیاتی لسانیات کا ایک مسئلہ بھی ہے ـــــ اس وقت تو نہیں لیکن اس وقت یہ بات میں زیادہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں ـــــ کہ جو بھی نعرے یا تراکیب یا کلیشے (CLICHES) کسی بھی تحریک کے لئے ہوں، شاعر تراکیب ایجاد کرتا ہے، نعرہ یا کلیشے استعمال کرتا ہے۔ وہ سب اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ آپ کی ذہنی صلاحیتوں کو از خود سوچنے اور سمجھنے کو ماؤف کر دیتے ہیں۔ شاعر کا طلسم یہی ہے کہ جو بڑا شاعر ہوتا ہے وہ آپکے ذہن کو اپنی زبان کے سانچے میں پکڑ لیتا ہے۔ اس سے آزاد کرانا، اس سے چھٹکارا پانا ہر شخص کے لئے آسان نہیں ہے۔ اقبالؔ نے بھی ایک نسل کے ذہن کو اپنی تراکیب میں، اپنے مصرعوں میں، اشعار میں، فکر کے سانچوں میں ایسا گرفتار کیا تھا کہ اگر کوئی اس سے ہٹ کر کوئی بات کہتا تھا تو بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ ذاکر صاحب مکمل طور سے اقبالؔ کی گرفت میں تھے لیکن اقبال کا اثر ذاکر صاحب پر بہت تھا۔ تیسری شخصیت مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی ہے، جن کی شرافت، نیکی اور دوسری صلاحیتوں سے وہ بہت زیادہ متاثر تھے۔

اب میں زیادہ طول نہیں دوں گا۔ ان کے سلسلہ میں مسجد قرطبہ کا وہی بند جسے کہ وہ اکثر گنگناتے تھے، اسی کے ایک شعر پر میں آج کی گفتگو کو ختم کرنا چاہوں گا، جو ذاکر صاحب کی شخصیت کی پورے طریقے سے ترجمانی اور عکاسی کرتا ہے۔ بندۂ مومن کی تعریف کرتے ہوئے اقبال بند میں لکھتے ہیں:

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل ✤ رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ذاکر صاحب کی شخصیت بھی اسی سے عبارت تھی، جو رزم اور بزم میں دل پاکباز کے ساتھ رہے۔ اور اس کا شہادت میں اس لئے دے سکتا ہوں کہ ایک انسان باہر کے لوگوں کے لئے تو بہت کچھ بڑا انسان نظر آتا ہے، لیکن میں نے ذاکر صاحب کو جیسا باہر دیکھا، مجمع میں دیکھا، ویسا ہی گھر میں دیکھا۔ اور، مجھ پر ان کی شخصیت کا سب سے گہرا اثر یہ ہے ـــــ میں معروضی انداز میں آپ سے کہہ رہا ہوں ـــــ کہ کوئی شخص چوبیس گھنٹے ایک ہی انداز میں رہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پاکبازی اس کی سرشت کا حصہ بن گئی ہے۔ ورنہ آپ نے اکثر دیکھا ہے کہ باہر تو ہم تم لوگ بزرگ بنے پھرتے ہیں اور گھر میں جائیے تو بیوی بچوں سے، چھوٹوں سے، قرابت داروں سے جو سلوک ہے وہ بالکل دوسرے انداز

کا ہوتا ہے۔ ڈاکر صاحب کا اندر، باہر ایک تھا! اسی لئے پاکباز اور پاکبازی کی ترکیب ان کی شخصیت پر پوری پوری صادق آتی ہے۔ باہر کی شہادت تو آپ لوگ بھی دے سکیں گے، لیکن اندر کا شاہد میں ہوں۔

میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جناب بیدار صاحب کا کہ انھوں نے مجھے موقع دیا ایک ایسے موضوع پر جس پر میں ابھی ختم نہیں ہوا ہوں، ابھی ایک گھنٹہ اور بول سکتا ہوں لیکن آپ کے صبر و تواں ختم ہو چکے ہوں گے اور ایسے ذی علم حضرات کے سامنے بولنے کا موقع دیا جن میں بہتوں نے ڈاکر صاحب کو قریب سے دیکھا ہے اور جو بہت سی باتوں کی تائید کر سکیں گے۔

●●

ڈاکٹر مسعود حسین

# گفتگو

(سوال و جواب)

**وائس چانسلری چھوڑنے پر :** ذاکر صاحب نے جب علیگڑھ کی وائس چانسلری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تو رشید صاحب نے اس وقت جو کچھ کہا وہ دوسرے تیسرے دن جب میری ملاقات ان سے ہوئی تو دوہرایا۔ کہنے لگے : مجھ سے اور ان سے بہت کھل کر گرما گرمی سے بات ہوئی اور میں نے صاف کہدیا کہ جناب آپ یونیورسٹی کو رف رئیف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں، یہ بہت غلط بات ہے اور میں یہ کہکر اٹھ کر چلا آیا۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار ذاکر صاحب پر رشید صاحب کا غصہ دیکھا۔

**مولانا آزاد اور ذاکر صاحب :** جب ذاکر صاحب وائس چانسلری چھوڑ کے گئے، اس زمانے میں اس کے آس پاس مولانا آزاد نے انھیں بلایا اور کہا کہ یو جی سی کی چیرمینی خالی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کو سنبھالو۔ ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا کہ میں نے اپنی عمر میں پہلی بار بغیر سوچے سمجھے یا اپنی سادہ لوحی سے (ہاں کہدیا)۔ اس کے بعد وہ سمجھے کہ معاملہ طے ہو گیا ہوگا۔ منسٹر آف ایجوکیشن کا کہنا، میرا قبول کرنا، اب formalities ہی کی آفر آئے گی کہ: معلوم ہوا دیشن مکھ (چیرمین مقرر کر دیئے گئے)۔ دیش مکھ کا معاملہ یہ تھا کہ اور تو جو سیاسی مصالح ہے ہوں، ایک بات جس کا مولانا نے کسی سے ذکر بھی کیا یہ تھی کہ وہ کام بڑا Strenuous ہے اور انہیں ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے؛ پہلے تو میرا یہی خیال تھا کہ کام چل جائے گا، لیکن بعد میں یہ خیال آیا کہ اس کے لیے ہمیں ایک Administrator چاہیے ! مگر انھوں نے ذاکر صاحب سے Consult کیے بغیر (طے کر لیا)۔ ذاکر صاحب کہتے تھے کہ میں نے اپنی پوری عمر میں، ہاں، کہنے کا گناہ صرف ایک بار کیا ـــ

مولانا آزاد یہ چاہتے تھے کہ وہ آئیں تو انھیں وجہ بتائیں کیوں ایسا کیا۔ لیکن ذاکر صاحب ! (پھر نہیں ملے)، پھر ایک دن ! ـــــــ ذاکر صاحب نے خود سنایا کہ اجمل خاں صاحب جو مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری تھے وہ ٹیلیفون پر ان کا پیچھا کرتے رہے لیکن ذاکر صاحب نے یہ کہہ رکھا تھا کہ کہہ دیجیے گا (کہ کہیں چلے گئے)۔ ایک دن بالآخر اجمل خاں صاحب نے پکڑ لیا؛ ٹیلی فون ایسے وقت میں کیا کہ انھوں نے خود ہی اٹھایا۔ اجمل خاں صاحب نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب، مولانا آپ سے ملنا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں۔ بہت عرصے سے مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ آپ سے contact ہی نہیں ہو تا تھا۔ آپ کس وقت آ سکتے ہیں ؟" ذاکر صاحب نے کہا۔ "مولانا سے کہہ دیجیے گا کہ ان کے گھر کا فاصلہ میرے گھر سے جتنا ہے اسی قدر میرے گھر کا فاصلہ ان کے گھر سے ہے۔" اجمل خاں صاحب گھبرا سے گئے، "جی جی جی ! کیا مطلب ؟" کہنے لگے "میں پھر دوہرا رہا ہوں، میرے یہ الفاظ مولانا سے

آپ کہا دیجیے گا کہ میرے گھر سے ان کے گھر کا جتنا فاصلہ ہے اُن کے گھر سے میرے گھر کا بھی اتنا ہی فاصلہ ہے ۔" جی میں ابھی کہہ دوں ! یا — یہ پیغام !" " جی ہاں آپ میرے یہ الفاظ مولانا سے دوہرا دیجیے، یہ میرا جواب ہے ۔"
پھر اس کے بعد معلوم نہیں اجمل خاں نے مولانا سے یہ کہا یا مصالح کی بنا پر ! ( بچا گئے )۔ بہرحال، ذاکر صاحب کچھ عرصے کے بعد بغرض علاج جرمنی چلے گئے ۔ مغربی جرمنی میں وہ کسی ہسپتال میں داخل تھے کہ انھیں پنڈت جی کا پیغام ( سفارت خانہ کے توسط سے ) ملا کہ بہار کی گورنری ( قبول کر لیجیے ) ۔ یہ بعد کو معلوم ہوا کہ اس میں مولانا آزاد کا بہت بڑا ہاتھ تھا ؛ وہ کمپنسیٹ ( compensate ) کرنا چاہتے تھے ۔ مگر خود کہہ ہی نہیں سکتے تھے، ذاکر صاحب ان سے مل ہی رہے تھے ؛ تو پھر شاید انھوں نے پنڈت جی سے کہا ہوگا ، پنڈت جی خود بھی ان کے قائل تھے ۔ پنڈت جی نے ایمبیڈر ( Ambassador ) سے کہا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ان کی کنسنٹ ( consent ) جو ہو، ہو ؛ لیکن میری طرف سے کہہ دیجیے کہ یہ نہرو کا فیصلہ ہے ۔

**مذہب کی طرف رویّہ :** وہ مذہبی انسان بھی تھے اور آزاد خیال بھی ۔ ان کی آزاد خیالی اور آزاد فکر کے سارے سوتے مغرب میں ہیں ۔ اور، آزاد خیالی ان میں اتنی تھی کہ نہ تو ان کی داڑھی اسے چھپا سکتی تھی نہ شیروانی ۔ مذہب کی جو ریاضتیں ہیں ، عبادات ہیں انھیں وہ ادا کر لیتے تھے لیکن بہت اسٹیڈی ( steady ) نہیں تھے ، فجر کی نماز اکثر پڑھ لیتے تھے اس لیے کہ تنہائی ہوتی تھی ۔ لیکن فجر کی نماز سے زیادہ وہ مست نظر آتے تھے جب کوئی انھیں قرآن سناتا تھا ۔ چنانچہ جب ان کا ہارٹ فیل ہوا ہے تو اس زمانہ میں ڈاکٹروں کے ساتھ قاری بھی مسلسل آتے تھے ۔ وہ گپ چپ لیٹے رہتے تھے ۔ ذاکر صاحب کی عربی دانی ایسی تھی کہ وہ قرآن کو سمجھ لیتے تھے ، گو ہر لفظ نہ سہی ۔ جب وہ پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہے تھے تو، ایک بیرونی زبان بھی لینی پڑتی ہے' وہ عربی لی تھی ۔ ان کے اس وقت کے عربی کے نوٹس میری نظر سے گزرے ہیں ۔ قرات کا اپنا حسن الگ رہا !

لیکن میرا خیال ہے کہ معتقدات میں بھی وہ خاصے کریٹیکل ( critical ) تھے، لیکن مصلحتاً اظہار نہیں کرتے تھے ۔ اس لیے کہ انھیں اس کمیونٹی میں کام کرنا تھا ! وہ خاصا ماڈرن مائنڈ رکھتے تھے ، بڑے ریشنل تھے ، میرے خیال میں سر سیّد سے بھی آگے ! اس لیے کہ سر سیّد تو پھر بھی ان چیزوں کو ریشنلائز ( Rationalise ) کر کے اس ڈھانچے میں لانا چاہتے تھے تاہم، انھیں ایگناسٹک ( Agnostic ) نہیں کہا جا سکتا ۔ میرے خیال میں وہ مسٹک ( Mystic ) تھے، اس کی ریاضتوں کے بغیر ! لیکن انھیں چونکہ قیادت کرنا تھی اس لیے جو کچھ سوچتے تھے ، محسوس کرتے تھے ، اسے کہہ نہیں سکتے تھے ، انھیں بہت کچھ چھپانا پڑتا تھا ، اپنی پرسنیلٹی کی چھاپ دینی پڑتی تھی !

●●

خورشید عالم خاں

● **جناب خورشید عالم خاں** (پ ۱۹۱۹ء) آگرہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری لی اور امریکا سے منیجمنٹ کورس کا ڈپلوما؛ ڈاکٹر ذاکر حسین میموریل کالج دہلی کی مجلس انتظامیہ کے وائس چیرمین، آل انڈیا کانگریس کمیٹی (کانگریس آئی) کے اقلیتی شعبہ دہلی اسٹیٹ جج کمیٹی اور اُردو ایڈوائزری کمیٹی (دہلی) کے چیرمین اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ جامعہ ملّیہ اسلامیہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

۱۹۷۴ء پھر ۱۹۸۰ء میں راجیہ سبھا کے ممبر منتخب ہوئے۔ اسی سال وزارت تجارت (حکومت ہند) کے وزیر مملکت مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۸۲ء سے مرکزی حکومت میں سیاحت اور شہری ہوابازی کے وزیر مملکت کے عہدے پر فائز ہیں۔

خورشید صاحب، ذاکر صاحب کے بڑے داماد ہیں۔ ذاکر صاحب سے قرابت داری اس رشتے سے قبل کی ہے، قائم گنج آپ کا بھی وطن ہے۔

●●

O

ذاکر صاحب کے انتقال پر ان کے دیرینہ ہمدم اور ساتھی پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا "ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے"۔ رشید صاحب نے جو عنوان مضمون کا تجویز کیا تھا وہ بذات خود ایک مکمل اور جامع مضمون بن جاتا ہے مگر ہم ذاکر صاحب کی زندگی اور سیرت پر گہری نظر ڈالیں۔ انہیں کے الفاظ میں "اس حادثہ اور ایسے حادثہ کے بعد اپنی تمام خوبیاں متاع کا سد اپنے تمام کارنامے بے نور، وہ تمام تعمیریں مسمار، وہ سبز اور شاداب باغ جھلس گیا ہو اور نہریں خشک ہو گئی ہوں اور امید اور حوصلے کے وہ سفینے غرق ہونے لگے ہوں، جن سے کبھی ذہن اور تخیل کی فضا منور اور معطر تھی"۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ احساس اور ردّ عمل نہ صرف رشید صاحب کا تھا بلکہ پورے ملک اور ملت نے کچھ اسی طرح سے محسوس کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی بلند نظری، قومی دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انہوں نے بلا پس و پیش بڑے خلوص سے ان کی مدد کی اور کبھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ انہوں نے کسی طرح کا احسان کیا تھا۔

مجھے پھر یہاں پروفیسر رشید احمد صاحب مرحوم کے ایک دوسرے مضمون سے سہارا لینا پڑتا ہے انہوں نے لکھا تھا:

"ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لیے جامعہ کی بنیاد ڈالی۔ محنت سہی، بیکسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار کھینچا۔ لیکن نہ منہ موڑا، نہ مسکرانے سے باز آئے۔ دشمن نے گھسا اور اسے دھتکارا؛ اس نے مانگا تو دیا، اس نے چھین لیا تو جانے دیا۔ خود بھوکے رہے، جامعہ کو سیر رکھا۔ اس کو صرف سنوارا اور انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں اس لیے کہ اچھے لوگ مجھ سے کام کرنے میں انتقام کی منزل سرے سے مفقود ہو رہی ہے۔ انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام اور انجام لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کام جس کا انجام یا انتقام کا جویا رہا ہو تا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ ایمان سے کچھ [illegible] اچھا [illegible] دوسرے سے ملے۔"

ذاکر صاحب کی شخصیت اور کردار کی عکاسی اس سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک بار جب ذاکر صاحب بغیر وسائل اور کسمپرسی کی حالت میں جامعہ ملیہ کی جان کھپا رہے تھے تو ان کے ایک دوست نے بطور تنبیہ ان سے کہا تھا کہ ذاکر صاحب جن حالات میں آپ کام کر رہے ہیں اور جامعہ کو زندہ رکھنے کی کوشش میں لگے ہیں اس کی مثال تو میں صرف یہ دے سکتا ہوں جیسے ریگستان میں آپ کنواں کھود کر پانی نکالنے کی امید میں زندہ ہوں۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا تھا کہ ہاں آپ کو بھی محسوس ہوتا ہوگا کہ میں ریگستان میں کنواں کھود رہا ہوں جہاں پانی نکلنے کی کوئی امید نہیں لیکن مجھے یقین اور اعتماد ہے کہ اس ریگستان سے اپنوں اور غیروں کی آبیاری کے لیے صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے پھوٹ نکلیں گے۔

شاید کم لوگوں کو اب یاد ہوگا کہ ۱۹۴۷ء میں جب فرقہ واریت نے تمام ملک کو جھلس دیا تھا، اس زمانہ میں ذاکر صاحب کی صحت اچھی نہ تھی اور ڈاکٹروں کے مجبور کرنے پر چند آرام کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے جالندھر اسٹیشن پر ٹرین رک گئی جہاں خونریزی کا جنون انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ بلوائی ذاکر صاحب کو گاڑی سے اتار کر اسٹیشن سے باہر لے جانا چاہتے تھے لیکن جو لوگ اس وقت اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہوں نے بعد میں بتایا کہ ذاکر صاحب ہونے کو ایسی دلجمعی سے جا رہے تھے جیسے جمہوریۂ ہند کے معزز صدر کسی علمی، ثقافتی یا کسی اور اسی طرح کی تقریب کا افتتاح کرنے انتہائی بے نیازی کے ساتھ جا رہے ہوں۔

ذاکر صاحب کی زندگی اور شخصیت پر سب سے زیادہ اثر ان کی والدہ اور ان کے محترم استاد سید الطاف حسین کا تھا۔ ذاکر صاحب کی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے میں سید الطاف حسین کی تربیت اور توجہ کا بہت حصہ تھا؛ اور اس بات کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر شاید باعث دلچسپی ہو۔ ذاکر صاحب نے جب میٹرک کا امتحان دیا تھا اور تعطیلات میں وطن جانیوالے تھے تو ایک شام اسید الطاف حسین صاحب نے ذاکر صاحب کو اور چند اور طلبا کو کھانے پر بلایا۔ کھانے پر بیٹھنے سے پہلے ان کے استاد محترم نے پیالے میں جو سالن رکھا تھا اس میں کافی ڈھیر سا پانی ملا دیا۔ ظاہر ہے کہ پانی ملے ہوئے سالن سے دوسرے طالب علم کھا نہ سکے لیکن ذاکر صاحب نے پوری دلجمعی کے ساتھ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ جب وہ کھانا ختم کر چکے تو سید الطاف حسین نے فرمایا "ذاکر خدا کا شکر ہے تم امتحان میں پورے اترے اور زندگی میں کوئی کسی بات کی تمہیں پروا نہ کرنی ہوگی" جامعہ نے ۱۹۴۴ء میں جب اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کیے تو اس کی خدمات کا اعتراف میں

گھر سے جانے کے لیے پہنچ گئے اور جب وہ نتیجہ سنا چکے تو اُن کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے ۔ یہ پوچھنے پر کہ آپ اطلاع لینے پہلے گھر کیوں نہ پہنچے تو ذاکر صاحب نے فرمایا' جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا' لیکن میں بچوں کا نتیجہ سنائے بغیر ان کو واپس کر کے کیسے چلا آتا۔

ذاکر صاحب اپنے چھوٹے سے چھوٹے محسن کو بھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ شاید باعثِ دلچسپی ہو جو میں بتانا چاہتا ہوں۔

جامعہ ابتدائی دور میں قرول باغ میں تھی اور سخت مالی مشکلات سے دوچار تھی۔ اس وقت وہاں کے کام کرنے والوں کو معمولی سا معاوضہ بھی وقت پر نہ مل پاتا تھا۔ ذاکر صاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وہیں قرول باغ میں ایک شخص جس کا نام شبّا تھا' چھوٹی سی پرچون کی دکان کا مالک تھا۔ گو بہت چھوٹا دوکاندار تھا مگر اس کی فراخدلی اور شرافت کا آج بھی وہ لوگ احترام کرتے ہیں جنھوں نے اُسے دیکھا ہے۔ ذاکر صاحب اور دیگر جامعہ والوں سے اس نے کہہ رکھا تھا کہ آپ لوگ آٹا' دال وغیرہ حسب ضرورت لے جایا کیجیے اور جب آپ کے پاس پیسے ہوں ادا کر دیجیے۔ زمانہ گزرتا گیا' جامعہ قرول باغ سے منتقل ہو گئی لیکن جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تو شبّا نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا' جس میں تحریر تھا "شاید آپ مجھے بھول چکے ہوں' لیکن میری قرول باغ میں پرچون کی دوکان تھی اور میں آپ سب کے کھانے پینے کی چیزیں بیچا کرتا تھا"۔ پوسٹ کارڈ دیکھتے ہی تیس چالیس سال پیشتر کی زندگی کی تصویر ذاکر صاحب کے ذہن میں آئی۔ فوراً ADC کو بلا کر کہا' گاڑی لے کر جایئے اور گردوارہ روڈ پر شبّا جی کی دوکان ہے اس کو احترام کے ساتھ مجھ سے ملانے کے لیے لایئے۔ جب یہ پیغام شبّا کو ملا' وہ انتہائی خوش ہوا اور تھوڑی ہی دیر بعد راشٹرپتی بھون پہنچ گیا۔ ذاکر صاحب اپنے دفتر سے باہر آئے اور اس کو ساتھ لے کر اندر گئے' چائے پلائی اور گذشتہ زمانے کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔ جب شبّا اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو وہ اس کو اپنے ساتھ لے کر دفتر سے باہر لائے' گاڑی میں بٹھایا اور دروازہ اپنے ہاتھ سے بند کیا۔ اس کے جانے کے بعد ملٹری سکریٹری صاحب نے کہا کہ جنابِ والا! یہ ہمارے پروٹوکول کی خلاف ورزی ہے کہ آپ اس طرح کسی کو لینے اور چھوڑنے آئیں' آنا مناسب نہ تھا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا' آپ کا پروٹوکول آپ کی جگہ پر ہے لیکن میرا پروٹوکول تو میری زندگی کا ایک حصہ بن چکا ہے' کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ شخص کون تھا۔ ملٹری سکریٹری نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ذاکر صاحب بولے "اگر یہ وسیع القلب انسان ہماری زندگی میں نہ آ

ہوتا تو وہ شخص جو آج آپ کا راشٹرپتی بنا ہوا ہے، وہ اور اس کا خاندان فاقوں سے دوچار ہوئے ہوتے۔ ہم کس طرح سے اس کا احسان بھول سکتے ہیں؟" وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جو ملت اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر محسن اُتارنا بند کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو صوفیوں اور بزرگوں سے ہمیشہ عقیدت رہی۔ انہوں نے بزرگوں کی تعلیمات اور زندگی کے حالات سے سبق سیکھا، وہ انسان کی محبت تھی جس میں نہ مذہب اور ملت کا امتیاز تھا، نہ رنگ و نسل کا لحاظ۔ یہی عقیدت تھی جس کی بنا پر وہ جامعہ کے قیام میں اکثر کئی میل کا پیدل سفر کر کے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر حاضری دے کر فجر کی نماز ادا کرتے تھے۔

ان کی عقیدت مندی اور مہمان نوازی کا ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا آزاد سبحانی بڑے صوفی منش انسان تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر ان کے یہاں آکر قیام کرتے تھے۔ مولانا آزاد سبحانی کو حقہ پینے کی بہت عادت تھی۔ اکثر رات کے وقت ڈاکٹر صاحب خود اٹھ کر چلم بھر کر ان کے لیے حقہ پیش کیا کرتے تھے۔

جامعہ ملیہ کی اوکھلا میں عمارت کا جب سنگِ بنیاد رکھا جانے والا تھا، تو انہوں نے اس تقریب کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا:

"اس مبارک رسم کو انجام دینے کے لیے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمانرواؤں میں سے ہے اور نہ ارکانِ سلطنت میں، نہ صاحبانِ دولت میں، نہ اربابِ علم میں، نہ رہبرانِ ملک میں، نہ اکابرِ قوم میں! جو کچھ بھی نہیں ہے مگر سب کچھ ہو سکتا ہے! یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ اربابِ نظر اس انتخاب کی داد دیں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لیے کہیں زیادہ موزوں ہے۔"

سنگِ بنیاد رکھنے میں جو یہ جدت اختیار کی گئی وہ صرف ڈاکٹر صاحب کا حصہ تھی کیونکہ ان کی نظر حال سے زیادہ مستقبل پر رہا کرتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب ہر شخص کو عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے، ہر مذہب اور ملت کے لوگ ان سے ملتے اور ان کے سلوک اور تعلق میں کوئی فرق نہ پاتے۔ وہ انسانوں سے کبھی مایوس نہ ہوتے تھے اور بڑی سے بڑی خطاؤں سے چشم پوشی کرتے اور تجربے سے [illegible] میں رہتی۔ ان کا

قول تھا "آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے لیکن ہر وقت نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے"

وہ ایک مذہبی انسان تھے۔ لیکن مذہب کو قطعی شخصی معاملہ سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں نمود اور نمائش سے سخت نفرت تھی۔ اکثر ایسا دیکھا گیا کہ ۲۴ گھنٹے کے اندر کلام پاک کی تلاوت پوری کرتے اور رات کو سوتے وقت ہمیشہ قرآن پاک کی مختلف سورتوں کے ریکارڈ سنا کرتے۔ اگر اس وقت گھر کا کوئی فرد ان کے کمرہ میں موجود ہوتا تو فرماتے 'بھائی اب ہمیں اکیلا چھوڑ دیجیے'۔ ایک مرتبہ میری بیوی سے فرمایا کہ نماز کے بعد تم کیا دعا کرتی ہو۔ انہوں نے جواباً کہا میں آپ کی درازیٔ عمر اور اپنے خاندان کی بہتری کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتی ہوں۔ سن کر فرمایا "بھائی تم تو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں مداخلت کرتی ہو۔ دعا میں صرف یہ کہنا چاہیے: اے خدا اپنی مرضی بتا دے۔ اپنی مرضی پر راضی کر دے اور اپنی مرضی پر چلا دے"

بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ راتوں کو وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے، کافی وقت نمازوں میں گزارتے۔ وہ کبھی اپنی عبادت کو ظاہر نہ ہونے دیتے، زیادہ تر تنہائی میں اپنے معبود حقیقی سے لو لگاتے۔ ان کی زندگی کا یہ رخ دنیا والوں سے تو کیا گھر والوں سے بھی بڑی حد تک پوشیدہ تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے میری بیوی سے فرمائش کی کہ ایسی ٹوپی سی دو جو پیشانی کو چھپا لے۔ یہ عجیب و غریب فرمائش اس لیے کی گئی تھی کہ ماتھے پر سجدوں کا نشان ان کی عبادت کا راز افشا نہ کر دے۔

ذاکر صاحب پہلی جنگ عظیم کے بعد جب یورپ اعلیٰ تعلیم کے لیے جانا چاہتے تھے تو اس وقت کی انگریز حکومت نے ان کو بڑی دقت سے پاسپورٹ دیا اور شرط یہ لگا دی کہ وہ صرف انگلستان میں ہی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ بظاہر ذاکر صاحب اس قسم کی شرط کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن وہ سفر پر تیار ہو گئے اور جب جہاز اٹلی کے بندرگاہ پر رکا تو وہ وہاں اتر پڑے اور سیدھے بذریعہ ریل برلن چلے گئے۔ کیونکہ ان کے پاسپورٹ میں اجازت صرف انگلستان جانے کی تھی۔ لہٰذا ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ انگلستان جائیں۔ مگر ذاکر صاحب نے قطعی انکار کر دیا اور مجبوراً جرمن حکومت کو برلن میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دینی پڑی۔

ذاکر صاحب نے جب صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر حلف لیا تھا تو ان کے یہ تاریخی [illegible] کہ میں گونج اٹھے تھے "سارا بھارت میرا گھر ہے اور اس کے رہنے والے میرا پریوار"

ذاکر صاحب ان قومی رہنماؤں میں تھے جنہوں نے ہمیشہ بھید بھاؤ، پھوٹ اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کی مذمت کی اور ان کی جگہ اتحاد، اتفاق، محبت، اخوت اور رواداری کی تعریف کی۔ ان کی ہر تقریر، تحریر اور کردار سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، جذباتی ہم آہنگی اور آپسی میل ملاپ کے لیے بے لوث محبت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ سماج میں ذہنی تعاون کی راہیں وسیع اور وسیع تر ہوتی جائیں تاکہ اس سے محبت اور بھروسے کے ایسے سوتے پھوٹیں کہ ساری قومی زندگی اس سے سیراب ہو، جو ہماری سماجی زندگی کا رنگ ہی بدل دے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا قول تھا کہ آپسی اعتماد کے لیے ہمیں سچائی اور احترام اور رواداری برتنا ضروری ہے تاکہ انسان، انسان میں فرق نہ رہے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں تو ہم نہ صرف اپنے رب کے حضور سرخرو ہوں گے، بلکہ ذہنی سکون اور قلبی راحت میسر ہوگی۔

ذاکر صاحب کا شعر و ادب کا ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا اور اردو، فارسی کا مطالعہ وسیع تھا۔ فارسی اور اردو کے پسندیدہ اشعار اپنی بیاض میں لکھتے رہتے تھے۔ ذاکر صاحب اقبالؒ کی شاعری اور ان کے فلسفہ سے بھی بہت متاثر تھے اور میں سمجھتا ہوں اقبال کے یہ چند اشعار ان کے کردار اور شخصیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں:

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز — اس کے دنوں کی تپش اس کی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم — اس کا سرور اس کا شوق، اس کا نیاز اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب و کارآفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات — ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب، اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

ذاکر صاحب کو پھولوں سے اور باغبانی سے زیادہ دلچسپی تھی اور خاص طور سے گلابوں سے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں قدیم اور نادر پتھروں کے جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایک مرتبہ میری بیوی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کو پتھروں سے اتنی کیوں دلچسپی ہے تو فرمایا پتھر باتیں نہیں کرتے اور ضرورت پڑنے پر مدد نہ کرنے کا
[illegible] ایک مرتبہ چند دنوں تک میری بیوی ان سے ملنے کچھ مصروفیات کی وجہ سے نہ جا سکیں

تو ٹیلیفون پر خیریت دریافت کی اور پوچھا آنا کیوں نہیں ہوا، تو انھوں نے کہا اماں نے بلایا ہی نہیں ورنہ میں ضرور آتی۔ ذاکر صاحب نے جواب دیا "بھائی جس مجرم کو احساس جرم ہی نہ ہو اس سے شکایت کیسی؟"

ذاکر صاحب کی زندگی اور خدمات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور غالباً ابھی اور لکھا جائے گا۔ دراصل ان کی شخصیت ایسی جاذب اور ہمہ گیر تھی کہ وہ تو ریسرچ کا ایک بہت اچھا موضوع بن سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان کی زندگی کے ابھی بہت سے گوشے ابھر کر سامنے آئیں گے، اگر کسی نے دلجمعی کے ساتھ اس سلسلہ کا کام اپنے ہاتھ میں لیا۔

جس روز ذاکر صاحب کا انتقال ہوا میں تنہا ان کے کمرے میں میت کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر ان کی میز کی طرف دیکھا جو پلنگ کے پاس رہتی تھی اور عموماً اس پر بہت سی کتابیں رکھی رہتی تھیں جن کا وہ مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے پاس ایک چھوٹے سے پرچہ پر یہ مصرعہ لکھا تھا:

ع میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

شاید ہی اس سے بہتر اور موزوں کوئی تحریر اس گوہر نایاب کے کھو جانے کی ترجمانی کر سکے۔

(۲۸ اپریل ۱۹۸۱ء کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا)

● ●

بیگم صالحہ عابد حسین

● **بیگم صالحہ عابد حسین** : (پ۔ پانی پت ۱۹۱۳ء)۔ خواجہ غلام الثقلین کی صاحبزادی، خواجہ غلام السیدین کی ہمشیرہ، ڈاکٹر سید عابد حسین کی بیگم، تقریباً چالیس کتابوں کی مصنفہ، آٹھ ناول (آتشِ خاموش، اُلجھی ڈور وغیرہ)، چھ افسانوں کے مجموعے، دو ڈراموں کے مجموعے، انیس پر تین کتابیں، خواجہ الطاف حسین حالی پر تین کتابیں، ذاکر صاحب پر ایک اہم کتاب، خواجہ غلام السیدین پر ایک کتاب، معاصر مشاہیر پر ایک کتاب اور تقریباً ایک درجن سے زائد بچوں کے لئے کتابیں۔

ڈاکٹر عابد حسین، جامعہ کی تین اہم بنیادی شخصیتوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ ۱۹۳۰ء سے صالحہ عابد حسین بھی اپنے شوہر کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نظریات اور ان کی پوری سرگرمیوں میں عملی طور پر شریک رہیں۔

●●

قدرت بعض وقت بے پناہ فیاضی پر اُتر آتی ہے اور کسی ایک آدمی کو اتنی صفات عطا کر دیتی ہے کہ وہ مظہرِ شانِ حسنِ فطرت بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین انھیں اِنی گنی ہستیوں میں سے ایک تھے، نہیں — ہیں کہ ایسی شخصیتیں کبھی ماضی میں غروب نہیں ہوا کرتیں۔ حسنِ صورت اور حسنِ اخلاق، ذوقِ جمال اور غیر معمولی ذہانت، سچی خدا پرستی اور گہری انسان دوستی، ظرافت اور شرافت، سادگی اور معصومیت ان سب کا اس خوبی سے ایک انسان میں امتزاج نظر آتا کہ دیکھنے والے ششدر رہ جاتے تھے اور جب ان کے زیادہ قریب آتے، تو ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتے۔ ان کی شخصیت کی رنگا رنگی اور سیرت کی گہرائی کو پرکھنا آسان کام نہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معمار اور رہنما، ماہرِ تعلیم، مدبّر، عالم، ادیب، جنگِ آزادی کے سپاہی اور صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کے کارناموں پر روشنی ڈالنا میرا منصب نہیں ہے۔ ہاں، ۳۴ برس ان کی دوستی اور قربت کا شرف مجھے ضرور حاصل رہا ہے اور ان میں سے ۱۵ سال تو ایسے گزرے جب روزانہ کا ملنا جلنا رہا۔ میں نے انھیں رنج و راحت میں، تنگ دستی اور مشکلات میں، گھر میں اور جامعہ میں بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کے کاموں میں ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ذاکر صاحب صرف ہمارے تھے — جامعہ والوں کے۔

یہ جامعہ کی زندگی کا وہ زمانہ تھا، جب مالی پریشانیاں بہت بڑھی ہوئی تھیں۔ کئی کئی مہینے جامعہ کے کارکنوں کو وہ قلیل تنخواہ بھی نہیں ملتی تھی جو جسم و جان کے رشتے کو جوڑے رکھنے میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہوتی تھی۔ مگر میں نے اس زمانے میں بھی جامعہ کے خادموں میں سے کسی کو بددل، بیزار، ناراض یا پریشان نہیں پایا اور سب سے خوشدل ہستی تھی جامعہ کے کرتا دھرتا خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی، جن کی حیثیت جامعہ کے لیے گویا روحِ رواں کی تھی۔ وہ ہمعصر رفیقوں کے دوست اور بھائی تھے تو نو عمر ساتھیوں اور جامعہ کے بچوں کے باپ — ایسے باپ جن کی شفقت میں اکثر ماں کی ممتا کا رس اور مٹھاس نظر آتی تھی۔

ذاکر صاحب جامعہ کے لیے چندے کی مہم میں شفیق قدوائی مرحوم اور حافظ فیاض مرحوم کے ساتھ اکثر

خود بھی جایا کرتے تھے ـــــ مگر کیا انداز تھا، چندہ مانگنے کا۔ کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی۔ چاہے جامعہ میں فاقے ہو رہے ہوں مگر اس کے وقار اور خودداری کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اکثر کہا کرتے تھے "جو جامعہ کو چندہ دیتا ہے وہ احسان نہیں کرتا بلکہ یہ خود اس کے لیے سعادت ہے۔ دیکھنا وہ دن آئے گا جب لوگ خود آئیں گے اور خوشامد کر کے اسے چندہ دیا کریں گے۔ ویسے ان کی طبیعت میں بہت انکسار تھا۔ اپنے سے، بڑوں سے، چاہے وہ عمر میں بڑے ہوں، یا حیثیت میں، یا (ان کے خیال میں) علم و عقل میں بڑے ہوں، وہ ان سے بڑی عزت اور ادب سے ملتے تھے، مگر یہ جھک کر ملنا کسی غرض کے لیے ـــــ خواہ وہ جامعہ ہی کی غرض کیوں نہ ہو، نہیں ہوتا تھا۔ اپنے ساتھیوں سے وہ بے تکلف بھی تھے۔ ان سے محبت بھی کرتے تھے۔ کبھی کبھی انھیں ڈانٹتے اور چھیڑتے بھی تھے اور بضرورت انھیں ہدایتیں اور مشورے دیتے اور ان کی سنتے بھی تھے۔ پھر کبھی کبھی وہ ان سے روٹھ بھی جاتے تھے اور اگر کبھی وہ روٹھ جائیں، تو ان کو بڑی محبت سے منا بھی لیتے تھے۔ ان سے لوگوں کو شکایتیں ضرور پیدا ہوتیں، مگر بس ذرا دیر کو ان کا مسکراتا چہرہ یا دلداری کا ایک فقرہ سب گلے ختم کر دیا کرتا تھا۔ انھیں اپنے ساتھیوں کی مالی پریشانیوں اور کٹھنائیوں کا بڑا احساس تھا۔ ان سب کے ساتھ وہ خود بھی بڑی سادگی اور تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ اس سادگی میں بھی ہمیشہ پرکاری کی شان نظر آتی۔ ان کا گھر نفاست، صفائی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ان کے کھانے میں چاہے صرف گو بھی گوشت یا ارد کی دال ہی ہوتی، مگر اتنی مزیدار کہ عمدہ سے عمدہ قورمہ اور پلاؤ، زردہ، اس پر قربان۔ لباس سفید کھدّر کا ہوتا، مگر اتنا شفاف اور بے داغ اور سجل سلا ہوا جس سے ان کی جامہ زیبی اور بڑھ جاتی۔ اسی کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے گھروں میں اگر سلیقہ اور صفائی دیکھتے، خوش ذوقی اور نفاست پاتے تو بہت خوش ہوتے، ہمت بڑھاتے اور سراہتے تھے۔ کہیں سے چندے کا روپیہ ملتا، تو سب سے پہلے چپراسیوں، منشیوں اور استادوں میں تقسیم ہوتا۔ پھر ان ساتھی پروفیسروں کو دیا جاتا جو گھر سے بھی آسودہ حال نہ تھے۔ اور سب سے آخر میں کبھی کبھی خود شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھی ان کی تنخواہ کی "خطیر" رقم ۵۰ روپے مل جاتے۔ مگر یہ غریبی اور مفلسی مجبوری کی نہ تھی بلکہ اسے ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر ذاکر صاحب اور ان کے رفیقوں نے خود بطیب خاطر اپنایا تھا۔ اسی لیے یہ لوگ اپنے پر رحم نہیں کھاتے تھے بلکہ ملک کے بڑے سے بڑے امیر سے امیر آدمی سے آنکھ ملا کر بات کرتے، سر اٹھا کر چلتے؛ خودداری اور احساس کمتری ایسے جذبے تھے، جن سے یہ اولوالعزم مجاہد کبھی آشنا ہی نہیں ہوئے۔

مجھے جامعہ جوبلی کا وہ زمانہ یاد آرہا ہے، جب ذاکر صاحب اور ان کا ایک ایک ساتھی، جامعہ کا ایک ایک بچہ، جامعہ کی عورتیں تک سبھی اس جشن کو کامیاب بنانے اور بہترین طریقے سے سرانجام دینے میں دل وجان سے جٹے ہوئے تھے۔ کیونکہ ذاکر صاحب نے عمر بھر ان کو یہی درس دیا تھا کہ "جو کام کرنے کے لائق ہے، وہ اس قابل بھی ہے کہ اسے اچھی طرح سے کیا جائے۔" اور اس وقت ذاکر صاحب کا ہر ایک ساتھی اسی زریں قول پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ہزاروں کام تھے اور اس پر ہزاروں جھگڑے اور ہر ایک مدد، مشورے، شکایت یا ہدایت کے لیے ذاکر صاحب کے پاس دوڑا جاتا تھا۔ ان کے دو ایک دوست بہت چاہتے کہ ذاکر صاحب کو اتنے کاموں کے بوجھ سے بچائیں، مگر اس کا کیا علاج کہ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنا دکھ درد خود ذاکر صاحب سے کہے، وہی اس کی مشکل کا حل نکالیں، اور اس بہانے اس محبوب ہستی سے بار بار ملاقات ہو، باتیں ہوں، ان کی تنبیہ اور پھر دلداری نصیب ہو۔

ٹریننگ کالج اور ذاکر صاحب کے گھر سے جو سڑک جامعہ کی مرکزی عمارتوں کی سمت جاتی ہے، جوبلی سے پہلے وہ کچی اور اونچی نیچی تھی اور بیچ سڑک پر ایک بہت بڑا گڑھا تھا جس سے بڑی مشکل سے گزرا جا سکتا تھا۔ طے ہوا کہ اسے خود جامعہ کے کارکن اور طالب علم بنائیں گے اور جو بات اکثر تنہا ذاکر صاحب طے کرلیں، یہ گویا ضمانت تھی اس کی کہ اب یہ ہو کر رہے گی۔ ایک صبح کھڑکی سے میں نے جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ اس بڑے گڑھے پر کھڑے جامعہ کے استاد اور پروفیسر اور طالب علم ہاتھوں میں پھاوڑے اور ٹوکریاں لیے سڑک کی مرمت کی ابتدا کر رہے ہیں اور نکلتے سورج کا منور چہرہ ان کے چہروں کی سچی مسرت کے نور سے مقابلہ نہیں کر پا رہا۔ ذاکر صاحب وسط میں کھڑے تھے، ان کے برابر ان کے رفیق کار عابد صاحب تھے کہ اتنے میں سامنے سے دلّی کے ایک معزز، مہذب رئیس آتے نظر آئے، وہ ان صاحبانِ علم وفضل کو پھاوڑے چلاتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن ٹھہرے خلیق اور مہذب آدمی، موٹر روکی، اُترے، صاحب سلامت ہوئی اور ذرا سا عابد صاحب کی طرف جھک کر اخلاقاً بولے: "ڈاکٹر صاحب! یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں — یہ کام آپ کا نہیں، ہمارا ہے۔" عابد صاحب نے انھیں اپنی روایتی بذلہ سنجی اور ظرافت کا ثبوت دیتے ہوئے پھاوڑہ ان کی طرف بڑھایا اور فرمایا: "تو لیجیے، بسم اللہ" ذاکر صاحب کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور نواب صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ غرض چند دن میں لڑکوں اور مزدوروں کی ان تھک کوشش سے یہ سڑک بن گئی۔

جوبلی میں چند ہی دن رہ گئے تھے۔ کاموں میں تیزی آگئی تھی۔ ذاکر صاحب اپنا خطبہ لکھنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جی ہاں کوشش۔ وہ جتنا اچھا لکھتے تھے، اتنا ہی لکھنے سے کتراتے اور پڑجائے سر پہ مصیبت تو بگڑتے، اُلجھتے، گھبراتے اور کبھی کبھی تو بیمار ہو جاتے تھے۔ یہاں ان چیزوں (مثلاً بچوں کی کہانیوں) کا ذکر نہیں، جو انھوں نے اپنی خوشی سے لکھی تھیں۔ اور مزے کی بات یہ کہ جب یہ تحریر مکمل ہو کر سامنے آتی، تو اُردو ادب کا ایک جواہر پارہ ہوتی تھی۔ ان کی یہی وہ تقریر تھی جس کو سُن کر سارے دیس کے وہ بڑے بڑے لوگ، لیڈر، رہنما، رئیس، امیر اور ہزاروں عام لوگ اور صاحبانِ علم و فضل زار و قطار رونے لگے تھے، جس میں انھوں نے اپنے ساتھیوں کی کچھ اس انداز سے مدح کی تھی، جیسی شاید ہی کسی سربراہ نے کی ہو۔ ہاں، تو ذاکر صاحب اس خطبے کو لکھنے کی اُلجھن میں تھے کہ صبح صبح ان کے ایک بزرگ ساتھی جو چندہ جمع کرنے کا کٹھن کام بھی کر رہے تھے کسی سلسلے میں ان سے مشورہ کرنے پہنچے۔ غالباً مالی مشکلات کا ذکر ہوگا۔ ذاکر صاحب کچھ اُلجھے ہوں گے، کچھ اکھڑے اکھڑے جواب بھی دیے۔ کیونکہ چھیڑ کر، ستا کر لوگوں کی قوتِ عمل کو اُکسانے کا کام انھیں بہت مرغوب تھا۔ میں اپنے اوپر کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی، کھڑکی میں سے دیکھا کہ آگے آگے مرحوم روتے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ذاکر صاحب صرف کرتا، پاجامہ اور سلیپر پہنے اپنے بھاری بھرکم جسم کے ساتھ بھاگ رہے ہیں۔ میرے گھر کے سامنے پہنچتے پہنچتے ذاکر صاحب نے اُن کو آ لیا، اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر کھینچ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ اس پر وہ صاحب روتے روتے ہنس پڑے اور ہم لوگ اس دلچسپ منظر کو اور ان محترم اور بزرگ ہستیوں کی یہ سادہ اور بھولی ادائیں دیکھ کر ہنستے رہے۔

جامعہ کے لوگوں کی بیویاں ذاکر صاحب کو اپنا جیٹھ اور بزرگ سمجھتیں اور ان کا بہت احترام کرتی تھیں۔ مگر ان سے تھوڑا ڈرتی اور کبھی کبھی شکایت بھی کر لیا کرتیں —— ذاکر صاحب کی کم، جامعہ کی زیادہ۔ ان میں سے اکثر یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے شوہر جو اس قلیل تنخواہ پر جامعہ میں پڑے ہیں، تو یہ ذاکر صاحب ہی کی محبت میں تو ہے۔ کبھی کبھی خود ذاکر صاحب بھی انھیں چھیڑنے کے لیے کوئی ایسی بات کہہ دیتے، جس سے یہ بیچاریاں گھبرا جاتیں۔ جامعہ نگر آنے کے بعد جگہ کی قلت تھی۔ بعض گھرانے تو جامعہ کی عمارتوں ہی میں ایک ایک دو دو کمروں میں رہنے لگے تھے، بعض نے کسی دوسرے کے گھر میں ایک آدھ کمرہ لے لیا تھا، کچھ نے اپنے رہنے کو ذاتی گھر بنوا لیے تھے۔ باقی لوگ ذاکر صاحب سے جگہ کے لیے کہتے، سمجھتے تھے کہ تھوڑی

ی آمدنی میں اُن کے لیے دو دو جگہ کا خرچ اٹھانا مشکل تھا۔ ایسے ہی کسی وقت میں ذاکر صاحب نے کہیں کہہ دیا کہ میں
جن لوگوں کے بال بچے یہاں ہیں، ان سب کو ان کے وطن بھیج دوں گا اور سب گھر خالی کرا لوں گا۔ مجھے بچوں
کے لیے جگہ کی ضرورت ہے۔ جامعہ کی عورتوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لیجیے! یہ جامعہ کا سردار تو اب ہمارے
گھریلو معاملات" میں بھی دخل دینے لگا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ ان کے شوہر اپنے ذاکر صاحب کا کوئی حکم
بھی ٹال نہیں سکتے۔ کچھ خواتین نے آکر مجھ سے فریاد کی۔ میں نے انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی کہ یہ تو
ذاکر صاحب کا مذاق کا انداز ہے۔ مگر پھر ان کے اصرار پر کچھ ڈرتے ڈرتے میں نے ہنسی کے پردے میں چھپا کر
ذاکر صاحب سے یہ بات کہی۔ پہلے تیوری پر ذرا سے بل اُبھرے، لہجہ بھی تیز تھا: "ہاں، ہاں، میں آپ
سب کو اپنے اپنے گھر بھیج دوں گا ــــ اپنی بیوی کو بھی ــــ مجھے مکانوں کی ضرورت ہے۔" بیگم ذاکر
دلیں: "لے ہے، سنا کرو ان کی باتیں! بھیج دیں گے۔" میں نے ہمت کر کے کہا: "اپنے گھر کہاں بھیج
دیں گے؟ کون سا گھر؟ ہمارا گھر تو اب یہی ہے ــــ یہی آپ کی جامعہ۔ ہم اب اور کہاں جائیں گے؟" ہنس
پڑے اور اس کھلے دل کی بے ریا ہنسی نے سب کے اندیشے دور کر دیے۔

جامعہ کی خواتین، جو سامنے آتیں وہ بھی، جو پردہ کرتیں وہ بھی، ان کی بھابیاں تھیں، نہیں نہیں،
ان کی لڑکیوں، ان کی بیٹیوں کی طرح تھیں۔ اکثر ملنے جاتے۔ بیگم ذاکر سے وہ لوگ ملنے آتیں، تو ذاکر صاحب بھی
بڑے اخلاق سے ان سے ملتے۔ کوئی بیمار ہوتا، تو دوا دارو کی فکر ہوتی۔ کسی کے ہاں بچہ ہوتا تو مبارک باد
دینے پہنچ جاتے۔ شادیوں میں شریک ہوتے، تحفے دیے جاتے۔ کوئی غمی ہو جاتی تو ذاکر صاحب کی ہمدردی غمی
دلوں پر مرہم کا کام کرتی۔ مجھے یاد ہے، ابھی چند سال پہلے کی بات ہے، جامعہ کے ایک پرانے کارکن
دلی سے باہر کہیں انتقال ہو گیا۔ اچانک خبر سے ان کے بیوی بچوں پر قیامت ہی تو گزر گئی۔ ذاکر صاحب اس زمانے
میں نائب صدر تھے۔ سنتے ہی پہنچے۔ مرحوم کی لڑکیوں کو گلے لگایا، دلاسا دیا۔ ان کے چہرے کی یہ کیفیت
دیکھی نہ جاتی تھی اور جب بیوہ کے پاس پہنچے تو وہ عالمِ بےقراری میں ذاکر صاحب سے لپٹ کر یوں بلک بلک
کر رو اور چیخ رہی تھیں جیسے ذاکر صاحب اس کے سگے بڑے بھائی ہوں۔ ذاکر صاحب خاموش کھڑے
تھے اور ان کی آنکھوں سے برکھا ہو رہی تھی۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جامعہ کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے کا عظیم کام انجام دینے کے بعد ۱۹۴۸ء میں
ذاکر صاحب کو جامعہ سے جانا پڑا۔ اب قوم نے ان کے کندھوں پر اور بڑی بڑی ذمہ داریاں ڈالیں: مسلم یونیورسٹی

پھر بہار کی گورنری، نائب صدر جمہوریہ کے منصب کی ذمّہ داری اور آخر میں صدر جمہوریۂ ہند، ملک کے سب سے بڑے عہدے کی ذمّہ داری اٹھانے پر مجبور کیا گیا۔ جی ہاں، یہ سچ ہے کہ ان میں سے کوئی جگہ خود انھوں نے کوشش کر کے حاصل نہیں کی تھی۔ یہ اعزاز انھیں پیش کیے جاتے تھے، اصرار کیا جاتا تھا، تب کہیں وہ اپنے ساتھیوں کے مشورے سے انھیں قبول کرتے تھے اور کون نہیں جانتا کہ ہر عہدے کو انھوں نے چار چاند لگا دیے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں، وہ جامعہ سے کبھی دور نہیں ہوئے۔ ان کا دل جامعہ ہی میں دھڑکتا رہا اور جامعہ کا دل ان کے سینے میں۔ علی گڑھ تو چار قدم پر ہے، لوگ جب چاہتے ان سے ملنے پہنچ جاتے۔ ان کی چھوٹی لڑکی صفیہ کی شادی ہوئی، تو آدھی جامعہ مہمان تھی اور ذاکر صاحب ایسے خوش کہ گویا اب آئے ہیں۔ ان کے خاندان والے۔ طرح طرح سے خاطر داریاں ہو رہی ہیں۔ قائم گنج کے باورچیوں سے مانڈے اور یخنی پکوا کر کھلائی جا رہی ہے۔ بہار میں بھی لوگ ملنے پہنچ جاتے تھے۔ وہ خود دہلی آتے، تو جامعہ ضرور آتے۔ پھر نائب صدر ہو کر تو دلّی ہی آگئے تھے اور جامعہ والے جب چاہیں اپنے اس بزرگ دوست اور ساتھی کے پاس جا سکتے تھے، اگرچہ ذاکر صاحب کی کمزور صحت اور مصروفیت کو دیکھتے ہوئے ان کے اکثر دوست ہمیشہ یہی کوشش کرتے کہ جہاں تک ممکن ہو، ذاکر صاحب کو زحمت نہ دیں، ان سے کم سے کم ملیں۔ مگر پھر بھی اپنی ہر خوشی میں انھیں شریک کیے بغیر چین نہ آتا۔ کٹھنائیوں میں مشورہ، ان سے نہ لیتے تو اور کس سے لیتے! غم میں شرکت کرنے تو وہ خود ہی پہنچ جاتے تھے۔ جامعہ والے ملنے جاتے (اور اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ وائس چانسلر اور پروفیسروں سے لے کر چپراسی، منشی تک سبھی شامل ہیں) تو معمول سے زیادہ وقت انھیں دیتے۔ ان کی باتیں سنتے، اُن سے باتیں کرتے، دل کھول کر جیسے بچھڑے بھائیوں سے کی جاتی ہیں۔ تھوڑا سا بھی وقت ہوتا تو ان کو اٹھنے سے روکتے۔ ان کی خاطر داریاں ہوتیں۔ پھر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے امیر یعنی چانسلر منتخب ہوئے، تو سارے جامعہ میں سچّی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب ذاکر صاحب پھر ہمارے ہیں، جامعہ کے سب سے بڑے سردار! وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے، تو معلوم ہوتا تھا یہ اعزاز ذاکر صاحب کو نہیں خود جامعہ کو ملا ہے۔ ذاکر صاحب سارے دیس کے ہوں، ساری دنیا کے ہوں، مگر سب سے قریبی اور قدیم رشتہ تو ان کا جامعہ ہی سے ہے نا۔ اب بھی جامعہ والے اس عظیم الشان عمارت میں ان سے ملنے جا سکتے تھے، جہاں ایک مسکراتا چہرہ دلی خوشی کے ساتھ ان کا استقبال کرتا، باتیں کرتا، وقت سے زیادہ بٹھاتا اور رخصت

زینے دروازے یا لفٹ تک آتا۔ وہ چھوٹا سا خوب صورت پھولوں سے گھرا حسین گھر جو ذاکر صاحب نے جامعہ نگر میں بنایا تھا، انتظار کر رہا تھا کہ کب ذاکر صاحب ان جلیل القدر عہدوں سے سبکدوش اور فارغ ہو کر پھر آکر اُسے بساتے ہیں۔ جامعہ کے لوگ اس سنہرے دن کے منتظر تھے۔ ایک ایک گھڑی گن گن کر کاٹ رہے تھے کہ کب ذاکر صاحب یہاں آکر رہیں گے۔ ان کے پرانے رفیق اور گہرے دوست اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بیس برس کی پرانی بے تکلف صحبتیں اور ذاکر صاحب کی قربت کی نعمت پھر سے انھیں نصیب ہوگی۔ مگر آہ، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! مگر ذاکر صاحب جامعہ کو بھولے نہیں۔ جس ننھے پودے کو انھوں نے خونِ جگر سے سینچا تھا، جس کی دن رات خدمت میں انھوں نے اپنی عمرِ عزیز کے ۲۲ برس کھپائے تھے، اُسے کیسے بھول سکتے تھے! آج ان کی آخری آرام گاہ کے دونوں طرف جامعہ کی عمارتیں ہیں۔ پہلو میں جامعہ کی مسجد بن رہی ہے۔ دوسری طرف گلابوں کا تختہ ہے اور ان سب کے درمیان ہمارے ذاکر صاحب ابدی نیند سو رہے ہیں۔

## (۲)

ذاکر صاحب بہت اچھا لکھتے تھے، بہت تیز لکھتے تھے مگر بہت کم لکھتے تھے۔ کسی کام سے اتنا نہ گھبراتے تھے، جتنا لکھنے سے۔ اکثر مجبوراً کہیں کچھ لکھنا ہوتا یا بولنا ضروری ہوتا تو کسی دوست سے بھی لکھوا لیتے تھے۔ دوست منہ سے نہ نکالتے مگر وہ خود بے تکلف لوگوں سے اس کا اقرار کر لیتے تھے۔ ان کا انداز اتنا منفرد ہوتا تھا کہ صاحبانِ ذوق خود بھی پہچان لیتے تھے۔

ایک بار میں نے کہا: "ذاکر صاحب! آپ جیسا عمدہ لکھنے والا، اور لکھنے سے اتنا گھبرائے۔ سمجھ میں نہیں آتا!" کچھ مسکرائے۔ شرمائے۔ جھنجھلائے، اور بولے "مگر مجھے تو لکھنا آتا نہیں"۔ ان کی سب سے معرکتہ الآرا تقریر وہ تھی جو انھوں نے جوبلی کے جلسے میں کی تھی۔ کس قدر الجھے تھے، گھبرائے تھے۔ اور پھر دو تین دن گھر میں بند ہو کر یہ تقریر تیار کی تو ایسی کی کہ آج تک سننے والے سر دھنتے ہیں اور اُس وقت سر نہیں دھن رہے تھے، سارا جلسہ چشم پُر آب تھا۔

دراصل جم کر بیٹھنا ان کا بس نہ تھا اور کچھ عادت بھی بن گئی تھی۔ یا خود اپنے کو یقین دلا دیا تھا کہ مجھے لکھنا نہیں آتا۔ اس ضمن میں اپنا ایک ذاتی قصہ یاد آتا ہے۔ کشمیر میں ان سے تقریر لکھوانے کا قصہ۔ وہ تقریر

بھی میرے پاس موجود ہے ۔

(۳)

ذاکر صاحب کا یہ ایک نادر اور نرالا خط ہے ۔ اس وقت وہ جنیوا کے ایک اسپتال میں داخل تھے جہاں ان کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ۴۷ء کی قیامت کے بعد عابد صاحب دلّی سے نئی روشنی نکالنے کی تیاری کر رہے تھے ۔ ذاکر صاحب نے جس حالت اور جس انداز میں 'نئی روشنی' کی پذیرائی کی اور جس طرح یہ خط لکھا وہ ان ہی کا کام تھا ۔ یہ خط 'نئی روشنی' نکلنے کے زمانے میں عابد صاحب کو وصول ہوا تو انھوں نے ۲۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کے 'نئی روشنی' کے پرچے میں "نورِ بصیرت" کے عنوان سے اس نوٹ کے ساتھ اسے شائع کیا تھا :

" یہ ذاکر صاحب کا مکتوب گرامی ہے ، جو انھوں نے آنکھوں کے آپریشن کے بارھویں دن لکھا تھا ۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی ، مگر دل کی آنکھیں روشن تھیں ۔ ہاتھ کی جنبش بصارت کی مدد کے بغیر بصیرت کا پیام پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی ۔ کاغذ پر ٹیڑھے میڑھے نقش بنے اور آپس میں گڈمڈ بھی ہو گئے ، بڑی مشکل سے پڑھے گئے ، مگر پڑھ لئے گئے ..... " اس نوٹ کے تحت ذاکر صاحب کا یہ خط درج ہے ، جو میں اس وقت آپ کو سنا رہی ہوں ۔ اصل خط غالباً اسی زمانے میں اِدھر اُدھر ہو گیا کہ اس وقت ان کی ڈاک نئی روشنی کے دفتر میں آتی تھی ، ورنہ میرے پاس ذاکر صاحب کے بیشتر خطوط محفوظ رہتے تھے :

بیمارستان " لاکولین "

جنیوا ۱۶ جون (۱۹۴۸ء)

عابد صاحب !

آج شاید بارھواں دن ہے کہ دونوں آنکھیں بند اس بیمارستان میں بستر پر پڑا ہوں ۔ کروٹ لینے کی بھی اجازت نہیں ۔ اس وقت رات ہے ، نہ جانے کیا بجا ہوگا ۔ تاریکی اور روشنی کے ادل بدل سے ناآشنا کو اس کا پتا سنّاٹے سے چلتا ہے جس میں قریب کا دریا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے کمرے کے نیچے آگیا ہے اور بس مجھی سے باتیں کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی سنتا رہوں ۔ مگر میرا جی چاہتا ہے کہ اس وقت آپ سے باتیں کروں ۔ بستر سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی میز ہے جسے چھو سکتا ہوں اور ٹٹول کر اس پر سے چیزیں اٹھا سکتا ہوں ۔ اس کی دراز میں آپریشن سے پہلے ایک پنسل اور کاغذ کا ایک پیڈ رکھ دیا تھا وہ اس وقت کام آیا ۔ نابینا آنکھوں کے بغیر یہ لکھنے کی پہلی کوشش ہے ۔ سطر پر سطر تو شاید چڑھ جائے مگر کچھ نہ کچھ تو پڑھا جائے گا ضرور !

ایسی حالت میں خط لکھنے کو جی یوں چاہا کہ شام ہوتے آپ کا خط ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ شاید نئی روشنی نکل آئے گا۔ ۹ بجے سے جب سونے کا وقت مجھ کو سب رفیق و مددگار چلے جاتے ہیں کچھ اسی کا دھیان بندھا ہے۔ آج وہ پرچہ نکلا ہوگا اور میں نہ جانے اسے کب دیکھ سکوں گا۔ نہ جانے کب اس کے لیے کچھ لکھ سکوں گا؟ پر کیسی پریشانی کے وقت نکلا ہے۔ آپ کے اپنے اور سب کاموں کی طرح اس کی بے سروسامانی کا حال بھی جانتا ۔ چل بھی سکے گا یا نہیں؟ کیا پیسہ بنانے کا کام کیے بغیر رائے بنانے کا کام ہو سکے گا؟ لوگ اسے غدار دل ازش سمجھیں گے، یا ساتھیوں، ہمسفروں کی آواز؟ یہ عام مذاق کو سدھار سکے گا یا عام بدمذاقی کا شکار ۔ئے گا؟ یہ حق کی تلخی سے گھبرائے گا تو نہیں؟ نشہ پلا کے لوگوں کو بدحواسی اور بے عقل بنانے کا چلتا کاروبار ۔یں کرنے لگے گا؟ نہ جانے کیا کیا سوال دل میں اٹھتے ہیں۔ مایوس کن سے مایوس کن خیال دل میں آتا مگر ٹھہرتا نہیں، جمتا نہیں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ اس وقت کے حالات کا، میرے اپنے ذاتی اور وطن کے قومی ت کا تقاضا یاس افزا ہونا چاہیئے، اپنے سینے کو امید سے معمور پاتا ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا عابد صاحب کہ پچھلے بارہ دنوں میں جاگتے میں مجھے ایک لمحے کو تاریکی کا احساس نہیں ہوا۔ دن ہو یا رات میری بند آنکھیں بر کمرے کو روشن پاتی ہیں۔ اس روشنی کی کچھ بے ربطیاں بھی محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً میرے کمرے کا دروازہ یرے بائیں جانب دیوار کے بیچ میں ہے، مجھے دور کونے میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ روشنی اسی ح روشن ہے۔ البتہ جیسے دھیمی دھیمی جیسی کھلی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ اس روشنی میں دیہات کھیت ۔تا ہوں، ہل کی لیک صاف دکھائی دیتی ہے، اس کے ایک طرف روشنی، ایک طرف سایہ تک محسوس ۔ا ہے۔ بڑے بڑے مکان بنتے دیکھتا ہوں۔ آس پاس کثرت تعمیر کا سامان۔ اس کی ظاہری وجہ مجھے معلوم ۔ں، نہ اس کے پتا چلانے کی مجھے فکر ہے۔ آپ سے اس کا ذکر اس لیے کیا کہ حالات کی تاریکی میں میرے دل کا ۔ی یہی حال ہے۔ اس لیے کہ اس امید کی وجہ بھی مجھے معلوم نہیں۔ غ(؟) کا شعر وجہ نہیں بتاتا لیکن کیفیت ۔یح تصویر ضرور پیش کرتا ہے:

دلم بکوسہ تو با صد ہزار نومیدی ۔ بہ این خوش است کہ امیدواری گزرد

مجھے یقین ہے کہ آزمائش کا یہ وقت بھی گزر جائے گا اور ہندی سماج کو ایک اخلاقی سماج بنانے کا کام آپ کے سے ۔یسے کڑ ند ہاتھوں ہی کریں گے اور ایک صالح، عادل سماج بنانے کی کٹھن مہم سر کرنے کی کوشش ہی میں ہم سب کو اپنی ۔فیت کو ایک آزاد اخلاقی شخصیت بنانے کا موقع بھی ہاتھ آئے گا۔ اس مہم میں راہ نما روشنی کی ہر قدم

پر ضرورت ہوگی۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کا پرچہ یہ روشنی مہیّا کرے، جی کہتا ہے کہ یہ ایسا کرے گا۔ آپ نے اس کا نام "نئی روشنی" خوب رکھا ہے۔ میری دُوری اور بے بسی سے یہ نہ سمجھیے گا کہ اس دیئے کی لَو روشن رکھنے کے لیے میں اپنے آپ کو پگھلانے سے بچ نکلوں گا۔ سمجھتا ہوں کہ اب بس کردوں۔ شاید اب صبح ہونیوالی ہے
ابھی کچھ دیر ہوئی مرغ نے بانگ دی تھی۔ اب وہ چڑیا بولی جو روز میری کھڑکی کے قریب درخت پر بولتی ہے۔ پہلے ذرا آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر، جیسے آزماتی ہو کہ اور بھی جاگتے ہیں یا نہیں۔ پھر چند منٹ بعد جہاں کوئی اور ہمنوا نہ ملا، تو ذرا جلد جلد اور تیز تیز؛ کوئی آدھ گھنٹے میں سارا باغ گونج اٹھتا ہے اور نغمے کا ایک ایسا طوفان ہوتا ہے کہ بیان نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوتا ہے چڑیاں ہی نہیں درختوں کی ہر پتّی، چمن کا ہر پھول بھی اسی کورس میں شریک ہوگیا ہے۔ مگر جب دن چڑھے آدمیوں کا شور غل، ڈاکٹروں کی آمد، نرسوں کی مستعدی، اس جشن موسیقی کو دبا دیتی ہے اس وقت بھی اس چڑیا کی آواز بار بار آتی ہے، سنائی دیتی ہے؛ جو پہلے رُک رُک کر، ذرا آہستہ آہستہ بولتی تھی اور آج ایسا لگتا ہے کہ شاید اسی چڑیا ہی کا نام "نئی روشنی" ہے۔ بس، خدا حافظ!

آپ کا : ذاکر

●●

(۱۲ مارچ ۱۹۸۱ کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا)

عبداللطیف اعظمی

جس طرح کسی مخصوص خاندان، ماحول، ملک اور زمانے میں کسی شخص کی پیدائش غیر اختیاری اور جبری ہوتی ہے، اسی طرح بہت سے لوگوں کی تعلیم بھی غیر اختیاری اور جبری ہوتی ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اپنی تعلیم اور درس گاہ کو اختیار یا منتخب کرے۔ زیادہ تر والدین کی مرضی اور خواہش کو ان کی تعلیم اور درس گاہ کے انتخاب میں دخل ہوتا ہے، مگر خوش قسمتی سے مجھے کم از کم اعلیٰ تعلیم کے انتخاب میں آزادی حاصل تھی۔

میرا تعلق یو پی کے ایک زمیندار خاندان سے ہے۔ میرے والد کا میری پیدائش سے قبل ہی ہیضے کی وبا میں عین جوانی میں انتقال ہو گیا، اس لیے والد کے بڑے بھائی نے مجھے تعلیم دلائی — میں، میرے بڑے بھائی اور دوسرے چچا زاد بھائی ان کو یعنی چچا کو ابا کہتے تھے۔ ہماری طرف عام طور پر والد کو ابا کہتے ہیں اور چونکہ ان کی حیثیت والد کی سی تھی، اس لیے سبھی بھائی —— چاہے ان کے حقیقی لڑکے ہوں یا ان کے بھتیجے بلا تخصیص انھیں 'ابا' ہی کہتے تھے۔ ان میں وہ تمام باتیں موجود تھیں جو ایک زمیندار میں ہوتی تھیں، سخت قدامت پرست اور کٹر قسم کے مذہبی تھے۔ مذہبی بھی ایسے جنھیں عرف عام میں 'وہابی' کہتے ہیں۔ انھوں نے خاندان کے کچھ بچوں کو انگریزی تعلیم دلائی اور کچھ کو مذہبی تعلیم، میں ان لوگوں میں سے تھا جن کو عربی مدرسے میں بھیجا گیا۔ جو انگریزی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان سے وہ توقع رکھتے تھے کہ آگے چل کر وہ یا تو ایڈووکیٹ ہوں گے یا منصف اور جج اور جو مذہبی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کو ایک بہت بڑا عالم دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے ضلع اعظم گڑھ کی مشہور درس گاہ مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں حاصل کی تھی۔ تین چار سال کے بعد ملک کی مشہور عربی و مذہبی تعلیم گاہ، دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) چلا گیا، وہاں عالم کا امتحان پاس کرنے کے بعد، فاضل کے آخری سال میں پڑھ رہا تھا کہ بعض مخصوص حالات کی بنا پر ندوہ کو چھوڑنا پڑا۔ ابا چاہتے تھے کہ عالم اسلام کی مشہور مذہبی یونیورسٹی جامعہ ازہر (مصر) پڑھا جاؤں، چنانچہ میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دیدی، مگر اسی درمیان میں مولانا

حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری سے ملاقات ہوئی، جو گرمیوں کی تعطیلات میں گھر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مصر جانے کے بجائے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ دہلی جانے کے بعد تم کو خط لکھوں گا۔ چنانچہ جامعہ سے ان کا خط آیا کہ تمہارا داخلہ ہو گیا ہے، جلد سے جلد آجاؤ۔ ابا کو جب معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ کو حکومت تسلیم نہیں کرتی اور اس کے فارغ التحصیل طلبا کو سرکاری ملازمت نہیں ملتی، تو انھوں نے فرمایا کہ ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس سے نہ تو دین ملے اور نہ دنیا ملے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے نو بیٹے ہیں (یعنی بھتیجے وغیرہ سب ملا کر)، ایک بیٹے کو زکوٰۃ کے طور پر قوم کو دیدیجیے۔ مذہبی آدمی تو تھے ہی، زکوٰۃ والی بات شاید دل میں بیٹھ گئی، چنانچہ اجازت دیدی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود میں نے جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے پر اس قدر اصرار کیوں کیا، جبکہ میری تمام تعلیم و تربیت مذہبی فضا میں ہوئی تھی اور میرا خاندانی ماحول بھی انتہائی قدامت پسند تھا اور نہ میں نے جامعہ دیکھی تھی اور نہ اس کے کسی استاد سے، مولانا اسلم جیراجپوری کے علاوہ، اس وقت تک ملا تھا۔ اس کی وجہ صرف جامعہ کے رسالے، پیام تعلیم اور جامعہ تھے اور اس وقت کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور ان کے ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب تھے۔ ان رسالوں اور ان اساتذہ سے میں بے حد مرعوب اور بن دیکھے ان تینوں شخصیتوں کا گرویدہ تھا، بالخصوص ذاکر صاحب کا۔

جب جامعہ پہنچا تو وہ پسند نہیں آئی۔ کالج میں بہت کم طالب علم تھے اور ان میں اچھی خاصی تعداد جاہل طالب علموں کی تھی اور ان کا علمی و ادبی معیار پست تھا۔ ہوسٹل میں سب سے پہلے جن استاد سے ملاقات ہوئی وہ ہکلے تھے اور جب کلاس میں گیا تو وہاں سب سے پہلے جن استاد سے واسطہ پڑا، وہ بھی ہکلے نکلے۔ دل میں خیال آیا کہ جامعہ نے صرف ہکلوں کو بھر رکھا ہے، مگر بعد میں جامعہ کا کچھ ایسا اسیر ہوا کہ پوری زندگی صرف اسی کی ہو کر رہ گئی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی "علی گڑھ پرستی" اور ذاکر صاحب کے جا و بیجا ذکر اور ان کی تعریف کی وجہ سے خوش نام اور یہ راقم الحروف جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب، دونوں کی جا بیجا مدافعت کی وجہ سے بہت زیادہ بدنام ہے۔ ظاہر ہے، میرا اور رشید صدیقی صاحب کا کیا مقابلہ، مگر ذاکر صاحب اور اپنی اپنی محبوب درسگاہوں کے معاملے میں، ایک نیک نامی اور دوسرا بدنامی میں، یکساں شہرت رکھتے ہیں۔

جامعہ آنے سے پہلے میں صرف ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب سے واقف تھا، مگر یہاں آنے کے بعد ایک اور دلچسپ، دلکش اور انتہائی مخلص اور ایثار پیشہ شخصیت کا اضافہ ہوا، وہ تھے

شفیق الرحمن قدوائی ۔ دراصل جامعہ ملیہ اسلامیہ ان ہی چار شخصیتوں کا مجموعہ تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نہ ہوتے تو جامعہ ملیہ بھی نہ ہوتی اور نہ وہ بنتی جو بعد میں بنی ۔ اس کے ساتھ اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کے سردار اور جامعہ کے حقیقی قائد جناب ذاکر صاحب ہی تھے ۔ جامعہ کے بانی تو بہت سے ہیں، ان میں ذاکر صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے مگر اس کا حقیقی معمار اگر کوئی ہے تو وہ ذاکر صاحب ہیں ۔

ابھی پٹنہ آنے سے ایک دو روز قبل اور آج کے مضمون کے لیے بیدار صاحب کے دعوت نامہ ملنے کے بعد، اتفاقیہ طور پر ایک جگہ پروفیسر مجیب صاحب سے ملاقات ہوگئی ۔ یہ تو غالباً آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ جن چار شخصیتوں کا مجموعہ میں نے جامعہ ملیہ قرار دیا ہے ان میں اب صرف مجیب صاحب حیات ہیں، باقی تین اللہ کو پیارے ہوگئے ۔ اس ملاقات میں جہاں جامعہ کے چند اور حضرات تھے، اسموکنگ کا ذکر آگیا ۔ میں نے مجیب صاحب سے پوچھا کہ پہلے آپ سگار بہت پیتے تھے اور اب ڈاکٹر کی ہدایت پر چھوڑ دیا ہے، مگر کبھی کبھی سگریٹ پیتے ہیں، لیکن کبھی ہم نے ذاکر صاحب کو سگریٹ یا سگار پیتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ کیا یورپ میں بھی اسموکنگ کا شوق نہیں رکھتے تھے یا بعد میں جامعہ کے ماحول اور حالات کی وجہ سے چھوڑ دیا؟ یہ مجلس خاصی بے تکلف اور غیر سنجیدہ تھی، ذاکر صاحب کا نام آتے ہی مجیب صاحب سنجیدہ ہوگئے اور فرمایا: ارے وہ؟ وہ تو صحیح معنی میں سردار تھے، واقعی بڑے آدمی تھے، اسموکنگ کو بہت برا سمجھتے تھے، شراب کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، دلآویز شخصیت کے مالک تھے، ان کی گفتگو میں بھی بڑی دلکشی ہوتی تھی، لیکن عورتوں سے ملنے جلنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور ان سے بہت زیادہ خلط ملط کو پسند نہ کرتے تھے ۔

میں نے طالب علمی کے زمانے میں، خاص طور پر، محسوس کیا ہے کہ وہ نصیحت یا پند و وعظ کے قائل نہ تھے، وہ طالب علموں میں جو بات پیدا کرنی چاہتے تھے، اس کو اپنے عمل سے ان کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کرتے ۔ مثلاً کالج کی عمارت میں ایک اتحادی دوکان تھی، وقفہ (انٹرول) میں طالب علم اس سے ٹافی وغیرہ خرید کر کھاتے اور اس کا کاغذ وہیں پھینک دیتے ۔ ذاکر صاحب کو یہ بات بہت ناپسند تھی، مگر زبان سے کبھی کچھ نہ کہتے بلکہ جب کبھی ادھر سے گزرتے، تمام کاغذ چن چن کر اٹھاتے اور ردی کے ٹین میں ڈال دیتے ۔ ان کے اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی طالب علم کوئی ردی چیز سڑک پر یا دوکان کے سامنے پھینک دیتا، تو دوسرے طالب علم اس کو ٹوکتے اور اگر وہ خود نہ اٹھاتا تو دوسرے طلبا اٹھا کر ردی کے ٹین میں ڈال دیتے ۔ اسی طرح کی ایک اور مثال لیجیے ۔ ان کا مکان کالج کے کمپاؤنڈ کے بالکل پاس تھا، صرف ایک گلی دونوں کے

درمیان حدِ فاصل تھی۔ طالب علموں کی مذہبی زندگی کیسی ہوتی ہے، خصوصاً نماز کی پابندی وہ کس حد تک کرتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں میں سے کتنے لوگوں کو اس کا تجربہ یا مشاہدہ ہے، مگر میں نے دو عربی اور مذہبی درسگاہوں کے ہوسٹل میں ۸۔۱۰ سال زندگی گزاری ہے اور دو سال مسلم یونیورسٹی کے ہوسٹل میں اور پانچ سال جامعہ کے ہوسٹل میں۔ ان میں سے سبھی کی حالت قریب قریب یکساں ہے، میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی اپنے شوق سے نہیں پڑھتا، صرف احتساب اور سزا کے ڈر سے پڑھتا ہے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ذاکر صاحب اس معاملے میں بھی اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر محض اپنے عمل سے طالب علموں میں احساس پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اکثر خاص طور پر صبح کی نماز کے وقت، چپکے سے نماز کے ہال میں آکر بیٹھ جاتے تھے، بس پھر کیا ہے، ہر طرف بھاگ دوڑ شروع ہوجاتی تھی اور لوگ بستروں سے اٹھ اٹھ کر ہال کی طرف دوڑ پڑتے۔ ایک مرتبہ ہوسٹل کے صحن میں ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے، وہ اپنے مکان سے نکل کر اُدھر سے گزر رہے تھے، اتفاقاً نظر پڑ گئی اور صحن میں آ گئے۔ ہم سب گھبرا کر اُٹھ گئے۔ اُنہوں نے کسی قسم کی خفگی یا تنغص کا اظہار کیے بغیر فرمایا! کھیلیے، کھیلیے، افسوس کہ مجھے نہیں آتا، ورنہ میں بھی شریک ہوجاتا۔ ان کے اس ارشاد پر ہمیں اس سے کہیں زیادہ شرمندگی ہوئی، جتنی کسی نصیحت یا خفگی سے ہوتی۔

نماز کا ذکر آگیا ہے تو اس سلسلے کی کئی باتوں کا ذکر کردوں۔ میرا تعلق ذاکر صاحب سے تقریباً بارہ[۱۲] سال رہا ہے، اس میں سے پانچ سال بحیثیت طالب علم کے اور سات سال بحیثیت کارکن جامعہ کے۔ اس کے بعد ذاکر صاحب جامعہ سے چلے گئے، مگر جامعہ آتے رہے اور ملاقات ہوتی رہی۔ اس بارہ[۱۲] سال کی مدت کے بارے میں تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے اور شعائرِ اسلام کا بےحد احترام کرتے تھے، مگر غلو سے کبھی کام نہ لیتے، ایسی باتوں سے بچتے، جس سے ریاکاری کا شبہ ہو، اور عبادت کو اپنی شہرت اور دوسروں کی زحمت کا باعث نہ بناتے۔ ایک مرتبہ، جب وہ نائب صدر جمہوریہ تھے، جامعہ کے کسی جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ جلسے کے بعد جانے لگے، تو مجیب صاحب نے چائے کے لیے اصرار کیا، انھوں نے معذرت کی اور فرمایا کہ بہت ضروری کام ہے، میرا جانا ضروری ہے! اسی درمیان میں زیدی صاحب آ گئے (کرنل بشیر حسین زیدی) اور ان سے کچھ باتیں ہونے لگیں، یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مغرب کی اذان ہوگئی، اسی وقت جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور نماز میں شریک ہوگئے۔ میرا ذاتی احساس ہے کہ کوئی دوسرا ہوتا تو چلا جاتا اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ کوئی کچھ نہ کہتا، وہاں کوئی مولانا ماجد نہیں تھا، مگر ان کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ اذان کے بعد وہ بغیر نماز ادا کیے چلے

سے چلے جائیں۔ نائب صدر جمہوریہ ہی کے زمانے کا ایک اور واقعہ ہے۔ وہ تو نائب صدر جمہوریہ ہی تھے مگر رادھاکرشنن
دلی سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور ذاکر صاحب ان کے قائم مقام تھے۔ ذاکر صاحب نے اپنے نائب صدر جمہوریہ
کی مدت میں بارہا قائم مقام کی حیثیت سے فرائض انجام دیے ہوں گے، مگر یہ پہلا موقع تھا کہ وہ قائم مقام
کی حیثیت سے راشٹرپتی تھے۔ جب جمعہ کا دن آیا تو غالباً کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ وہ جمعہ کی نماز دلی کی
جامع مسجد میں ادا کریں۔ مشورے کی بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ اس میں ظاہرداری کا نمایاں پہلو ہے اور
یہ بات ذاکر صاحب کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہے۔ ممکن ہے یہ مشورہ زیدی صاحب نے دیا ہو یا کم از کم مشورہ
دینے والوں میں وہ بھی رہے ہوں، کیونکہ راشٹرپتی بھون سے زیدی صاحب ہی کا جامعہ فون آیا تھا کہ ذاکر صاحب
جامع مسجد میں جمعہ پڑھنے جائیں گے، لوگوں کے ہجوم سے بچانے کے لیے جامعہ کے کچھ لوگ وہاں پہنچ جائیں۔ جو لوگ جامعہ
سے گئے تھے، ان میں ایک یہ خاکسار بھی تھا۔ وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ جامع مسجد کا مشرقی دروازہ عام
پبلک کے لیے بند کر دیا گیا ہے، صرف ذاکر صاحب اس سے داخل ہوں گے۔ ہم نے ذاکر صاحب کی جگہ کے لیے یہ
انتظام کیا تھا کہ پہلی صف میں، عین پیش امام کے پیچھے، جامعہ کے بہت سے لوگوں کو بٹھا دیا تھا تاکہ جب وہ آجائیں
تو ان کو جگہ دیدیں۔ مشرقی دروازے پر ذاکر صاحب کے خیر مقدم کے لیے پیش امام صاحب بنفس نفیس موجود تھے، ان کے ساتھ
میں بھی موجود تھا۔ وہ دروازے کے اندر تشریف رکھتے تھے اور میں باہر زینے پر کھڑا تھا۔ باہر سڑک پر انتظام کے
لیے پولیس تھی۔ عام لوگوں کو شاید سرکاری انتظام کا علم تھا یا پولیس کے اشاروں پر لوگ جنوبی اور شمالی دروازوں
سے مسجد میں، بہت ہی سکون کے ساتھ آ رہے تھے۔ مگر حافظ علی بہادر خاں صاحب خاص طور پر مشرقی دروازے کی
طرف بڑھے۔ ان کے لیے قریب ترین راستہ شمالی دروازہ تھا، لیکن ان کا مقصد تو سرکاری انتظام کی خلاف ورزی تھا
اس لیے قریب کا راستہ چھوڑ کر انھوں نے دور کا راستہ اختیار کیا۔ ممکن ہے پولیس نے ان کو نرمی کے ساتھ روکنے
کی کوشش بھی کی ہو، لیکن جب انھوں نے ایک خاص مقصد کے ساتھ ایک ارادہ کر لیا تھا تو سختی کے ساتھ انھیں
روکنے میں بدمزگی پیدا ہونے کا امکان تھا، اس لیے بغیر کسی روک ٹوک کے وہ مشرقی دروازے سے مسجد میں
داخل ہوئے۔ ذاکر صاحب نے حسب پروگرام نماز ادا کی، مگر نماز سے تمام انتظامات کے باوجود واپسی میں دقت
پیش آئی؛ ہر شخص ان کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا اور بہت سے لوگ مصافحہ کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ اس کے
بعد اردو اخبارات کے ایک مخصوص حلقے میں بڑی لے دے ہوئی۔ کسی نے لکھا کہ مسجد کی بے حرمتی ہوئی اور
عین نماز کے وقت فوٹو لیے گئے، کسی نے اعتراض کیا کہ مشرقی دروازہ عام نمازیوں کے لیے بند کر کے [illegible]

کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ذاکر صاحب نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی جوبلی کے موقع پر، مغرب کی نماز، صحن کے آخری حصے میں نمازیوں کے جوتوں کے قریب ادا کی تھی، اس وقت بھی وہ نائب صدر جمہوریہ تھے اور نماز میں اس وقت پہنچے تھے جب جماعت کھڑی ہو گئی۔ مولانا عبدالماجد صاحب نے لکھا کہ ہم تو قائم مقام صدر جمہوریہ سے یہی توقع رکھتے تھے کہ اعظم گڑھ کی طرح؟ جہاں انھیں جگہ مل جاتی وہیں نماز ادا کر لیتے، چاہے وہ جامع مسجد کی سیڑھیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں نے دلی کے اخبارات کے اعتراضات کا تفصیل سے جواب لکھا تھا جو روزنامہ 'الجمعیۃ' میں چھپا تھا، فوٹو کے بارے میں لکھا تھا کہ میں نے خود اوّل صف میں نماز ادا کی ہے، نماز کے دوران کوئی فوٹو نہیں لیا گیا، ثبوت یہ دیا تھا کہ کسی اخبار میں کوئی ایسا فوٹو شائع نہیں ہوا ہے جو نماز کے دوران لیا گیا ہو؛ جتنے فوٹو شائع ہوئے ہیں، وہ اس وقت کے ہیں جب وہ مسجد میں یا تو داخل ہو رہے ہیں یا نماز کے بعد واپس آ رہے ہیں اور ہجوم ان کو دیکھنے یا ان سے ہاتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس واقعہ کے بعد جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے دوبارہ جامع مسجد میں نماز ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عیدین کی نماز وہ ہمیشہ جامعہ میں پڑھا کرتے تھے۔ آخری نماز جو انھوں نے ادا کی ہے، وہ بیٹھ کر پڑھی ہے، کیونکہ ان کے گھٹنے میں درد تھا، کھڑے ہو کر پڑھنا ممکن نہ تھا اور مجیب صاحب کے ارشاد، ان کی بغل میں ایک صف میں بھی تھا۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو: ذاکر صاحب آسام کے سرکاری دورے پر تشریف لے گئے تھے، مجھے اس وقت یہ یاد نہیں کہ اس وقت وہ نائب صدر جمہوریہ تھے یا صدر جمہوریہ۔ میرے ایک کلاس فیلو، اس ریاست کی جماعت اسلامی کے امیر تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر، میری موجودگی میں، ذاکر صاحب سے شکایت کی کہ وہ نماز جمعہ کے لیے مسجد تشریف نہیں لائے، ان کے جواب میں پہلی بات یہ کہی کہ میں مسافر تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا فرائض میں داخل نہیں ہے، دوسری بات یہ فرمائی کہ میرے گھٹنے میں درد تھا، یہ مجبوری بھی تھی۔ میرے دوست اور ساتھی نے فرمایا کہ آپ بیٹھ کر پڑھ لیتے۔ انھوں نے فرمایا کہ لوگوں کے سوالات کے جوابات کہاں تک دیتا، اور نہ جانے مطمئن بھی کر پاتا یا نہیں۔ میرے خیال میں انھوں نے شرعی عذر محض ریاستی امیر جماعت اسلامی کے خیال سے فرما دیا، ورنہ اصل وجہ وہی رہی ہوگی جو انھوں نے بعد میں کہی تھی۔

ذاکر صاحب کا خصوصی مضمون معاشیات تھا اور وہ مشہور ہوئے ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے، مگر میرے خیال میں ان دونوں خصوصیات کے علاوہ ان میں ایک اور خصوصیت تھی جسے ماہر نفسیات کے لفظ سے ادا کر سکتے

ب۔ وہ انتہائی ذہین تھے اور ان کی نظر بڑی دوررس تھی۔ کوئی جاننے والا ملنے کے لیے آتا تو اظہارِ مدعا سے پہلے
عموماً اس کا مقصد سمجھ جاتے اور اگر کوئی نیا شخص ہوتا تو ایک دو جملے کے بعد ہی اصل غرض سمجھ جاتے اور اسی
ازسے گفتگو کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیتے۔ اگر ملنے والا جامعہ کا طالب علم یا اُستاد یا کارکن ہوتا تو عام
رپر وہ اپنی گفتگو میں مخالف پہلو اختیار کر لیتے اور ایسی بحث کرتے کہ آدمی زچ ہو جاتا۔ ایک واقعہ ہے کہ
بائے کالج کی یونین 'انجمن اتحاد' کا سالانہ جلسہ تھا۔ میں جس پارٹی سے تعلق رکھتا تھا' وہ الکشن میں کامیاب
ئی تھی، میں سکریٹری منتخب ہوا تھا اور میرے ایک دوسرے ساتھی علوی صاحب صدر۔ اس سے پہلے ہم لوگوں
تعلق حزبِ اختلاف کی حیثیت سے تھا۔ اس لیے زیرِ تذکرہ سالانہ جلسے میں ہم لوگوں نے خوب خوب اعتراضات
ے اور کوشش کی کہ سالانہ رپورٹ منظور نہ ہو۔ ذاکر صاحب بحیثیت شیخ الجامعہ جلسے کے صدر تھے' انھوں نے
ی ایک بجے چلنے دس بجے اور منتخب صدر علوی صاحب کو اسی رات کو ایک آل انڈیا ڈبیٹ میں شرکت کے
علی گڑھ جانا تھا۔ ہم نے جب دیکھا کہ خواہ مخواہ کی تاخیر ہو رہی ہے' جب تک اعتراضات کا سلسلہ جاری رہے گا
پنی گدیاں سنبھال نہ سکیں گے' دوسرے اگر بہت تاخیر ہوئی تو ہماری ٹرین چھوٹ جائے گی' اس لیے یکلخت
نے اپنا رویہ بدل دیا۔ ذاکر صاحب فوراً سمجھ گئے' اب تک وہ اعتراضات کی حوصلہ شکنی کر رہے تھے' اب اعتراضات
لیے دعوت دینے لگے۔ ہم نے گھبرا کر عرض کیا کہ جلسے میں خواہ مخواہ کے لیے دیر ہو رہی ہے رپورٹ کے بارے
اب کوئی خاص بات کہنے کے لیے نہیں' کہنے والے اب تک کہنے کے لیے کونسی بات تھی کہ آپ لوگ خواہ مخواہ کی
وٹیں ڈال رہے تھے۔ بہرحال رپورٹ منظور ہوئی' نئے صدر نے اپنا خطبہ پڑھا' میں نے نئے سکریٹری کی
یت سے حاضرینِ جلسہ اور صدرِ جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔ جب ہم لوگ وہاں سے روانہ
نے لگے' تو ذاکر صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ علوی کے پائجامے کی میانی پھٹی ہوئی ہے' ان سے کہیے کہ پائجامہ بدل
' ورنہ علی گڑھ کے طلبا بڑا مذاق اڑائیں گے۔

یہ واقعہ تو اس وقت کا ہے جب ہم لوگ یونین میں برسرِ اقتدار آ گئے تھے' اب ایک واقعہ اس وقت
ن لیجیے جب ہم اقتدار سے الگ رہے تھے' اس سے ذاکر صاحب کی سوجھ بوجھ اور تدبر کا اندازہ ہوتا ہے۔
ے ایک دوست اور کلاس فیلو' ہم سے پہلے یونین کے سکریٹری منتخب ہوئے تھے اور کسی بات پر ناچکر
ن مہینے کے بعد ہی' ہماری خواہش کے علی الرغم استعفا دے دیا۔ اب ہم لوگ دوبارہ ان کو سکریٹری بنانا چاہتے
کہ یونین کے دستور کے مطابق سکریٹری کے عہدہ کے لیے وہ امیدوار نہیں ہو سکتے تھے' البتہ صدر کے عہدے

کے لیے کھڑے ہو سکتے تھے، مگر اس کے لیے ان کی کامیابی کی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ دستور میں ایسی تبدیلی کر دی جائے کہ سکریٹری کے عہدے کے لیے وہ الکشن میں کھڑے ہو سکیں۔ دستور میں دو دفعات تھیں، ایک یہ کہ جو سکریٹری کم از کم چھ ماہ کام کرے گا، وہ یونین کا لائف ممبر ہوگا، دوسری دفعہ تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ سکریٹری منتخب ہو چکا ہے، وہ دوبارہ سکریٹری کے عہدے کے لیے امیدوار نہیں ہو سکتا، صرف صدارت کے لیے امیدوار ہو سکتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ دوسری دفعہ کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص لائف ممبر ہو گیا ہے، وہ دوبارہ سکریٹری کے عہدے کے لیے الکشن نہیں لڑ سکتا۔ مگر اس دفعہ کے الفاظ اس مطلب کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، اس لیے مجھے یقین تھا کہ الکشن کے موقع پر ہمارے دوست کا نام سکریٹری کے لیے نامنظور ہو جائے گا، اس لیے الکشن سے پہلے ان دونوں دفعات میں مناسب ترمیم ضروری تھی مگر دقت یہ تھی کہ ہاؤس میں ہماری اکثریت اقلیت میں بدل گئی تھی اس لیے کوئی اہم ترمیم ہاؤس سے منظور کرانا مشکل تھا، مگر اس کے علاوہ اور کوئی شکل بھی نہیں تھی، اس لیے ہم نے ہمت کر کے دستور پر نظر ثانی کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کے لیے ہاؤس میں تجویز رکھی۔ چالاکی یہ کی کہ کمیٹی میں مخالفین کی تعداد زیادہ رکھی تاکہ کسی کو کوئی شبہہ نہ ہو اور یہ تجویز اور کمیٹی دونوں منظور ہو جائیں۔ ہاؤس میں نظر ثانی کی تجویز کی مخالفت کی گئی، مگر میری احتیاط کام آئی اور دونوں تجاویز منظور ہو گئیں۔ کمیٹی کا کنوینر ظاہر ہے میں تھا، صدر مخالف گروپ کا رکھا اور اراکین میں بھی ان ہی کی اکثریت تھی۔ میں نے نظر ثانی شدہ دستور کا مسودہ تیار کر کے کمیٹی میں پیش کیا اور اس کے بعد ہاؤس میں پیش ہوا اور بالآخر منظور ہو گیا۔ میں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں دفعات کو باقی رکھتے ہوئے اس اضافے کے بعد ان کا تضاد دور کر دیا کہ: بشرطیکہ سکریٹری لائف ممبر ہو گیا ہو۔ اس طرف کسی کا ذہن نہیں گیا اور جوں کا توں دستور منظور ہو گیا۔ مگر ابھی مشکل باقی تھی، وہ یہ کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہاؤس کا کوئی فیصلہ بدلا جا سکتا تھا۔ الکشن کا زمانہ آگیا اور چھ ماہ کی مدت ابھی باقی تھی، اس لیے میں نے اس ترمیم کا کسی سے ذکر نہیں کیا اور حزب خلاف سے کوشش کرتا رہا کہ وہ میرے دوست کی تجویز پر اعتراض نہ کریں، مگر وہ لوگ تیار نہیں ہوئے، بالآخر ہاؤس میں نئے انتخابات کے لیے تجاویز پیش ہوئیں اور جب اس تجویز پر اعتراض کیا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ دستور کی ترمیم شدہ دفعہ کے مطابق اگر کوئی شخص لائف ممبر نہ ہوا ہو تو وہ امیدوار ہو سکتا ہے۔ جب لوگوں کو اس ترمیم کا علم ہوا تو لوگوں نے دستور کی اس ترمیم پر دوبارہ غور کرنے کے ... ہاؤس کا جلسہ بلانے کا مطالبہ کیا، ہم نے بلانے سے انکار کر دیا۔ اب لوگوں نے شیخ الجامعہ سے شکایت کی، اس [illegible] ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور پروفیسر محمد مجیب صاحب قائم مقام شیخ الجامعہ تھے۔ مجیب صاحب

بحیثیت شیخ الجامعہ حکم دیا کہ ہاؤس کا جلسہ بلایا جائے اور قاعدے کے مطابق ترمیم پر دوبارہ غور کرنے کا موقع
جائے۔ ہم نے اس حکم کو ماننے سے انکار تو نہیں کیا مگر جلسہ بھی نہیں بلایا۔ اس عرصے میں ذاکر صاحب واپس
ئے اور ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا۔ اب دونوں بزرگوں کے سوچنے کا فرق ملاحظہ ہو، مجیب صاحب نے
تور کے صرف الفاظ دیکھ کر ایک حکم دیا اور جمہوریت کی اسپرٹ پر غور نہیں کیا اور ذاکر صاحب نے جمہوریت کی
ح اور مقصد کو سامنے رکھ کر ایک فیصلہ کیا۔ انھوں نے دو باتیں فرمائیں : ایک یہ کہ واقعی ان دونوں
بات میں تضاد تھا اور اس کو دور کرنا ضروری تھا؛ انھوں نے مزید فرمایا کہ اگر ایک شخص سکریٹری منتخب ہو
، مگر مدت پوری نہ کرنے کی وجہ سے وہ لائف ممبر نہیں ہو سکا، تو آخر وہ دوبارہ الکشن میں امیدوار ہونے
ے کیوں محروم کر دیا جائے۔ دوسری بات انھوں نے یہ فرمائی کہ یہ ترمیم کسی شخص کو منتخب نہیں کرتی صرف کھڑے
نے کا حق دیتی ہے، اگر اکثریت کسی شخص کو سکریٹری بنانے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ بہر حال منتخب نہیں
گا۔ ان دو مختلف رولنگ میں جو بنیادی فرق ہے اس سے دو عظیم شخصیتوں کے طریقِ فکر کا اندازہ کر سکتے
یں؛ جہاں تک میرا سوال ہے، دونوں میرے استاد ہیں اور میرے لیے دونوں یکساں محترم اور معزز۔

ذاکر صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے اعتراضات کا جواب نہیں دیتے تھے۔ وہ کہتے
، اس سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا، بلکہ ضد اور بدمزگی میں اور اضافہ ہوتا ہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں جب بنیادی
ی تعلیم کی اسکیم شائع ہوئی جسے عرفِ عام میں "وردھا اسکیم" کہتے ہیں، تو ذاکر صاحب اور جامعہ پر مسلم لیگ
طرف سے سخت اعتراضات کیے گئے، مگر ذاکر صاحب بالکل خاموش رہے اور جامعہ کے لوگوں کو سخت ہدایت کر دی
وئی شخص جواب نہ دے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو بھی اعتراض کیا جائے، اس پر غور ضرور کرنا چاہیے، اگر کوئی اعتراض
یح ہو تو اسے مان لینا چاہیے مگر بحث سے بچنا چاہیے۔ جس طرح پورے ملک میں یہ اسکیم مابہ النزاع تھی، اسی
ح جامعہ کے طلبا اور اساتذہ میں بھی تھی۔ اس زمانے میں غلام احمد پرویز صاحب "طلوعِ اسلام" کے نام سے
ماہانہ رسالہ نکالتے تھے، اس میں انھوں نے وردھا اسکیم کے خلاف مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا
ر انھیں اور ان کے حلقے کو شکایت تھی کہ اگر یہ اعتراضات غلط ہیں تو ذاکر صاحب جواب کیوں نہیں دیتے؟ اسی
ح کی باتیں جامعہ کے وہ طالب علم بھی کہتے تھے جن کے والدین پرویز صاحب کے حلقے اور حکومتِ ہند کے سکریٹریٹ
تعلق رکھتے تھے اور مجھ جیسے لوگ ذاکر صاحب کے اس عبد فلسفے سے متفق نہیں تھے؛ اس لیے میں نے
ویز صاحب کے اعتراضات کے جواب میں ایک طویل مضمون لکھا اور وہ حضرت جوش کے ماہانہ رسالہ "کلیم" میں

شائع ہوا۔ میں نے یہ مضمون یہ سمجھ کر لکھا تھا کہ پرویز صاحب ایک طالب علم کا جواب نہیں دیں گے۔ ذاکر صاحب نے ایک روز مجھے دیکھ لیا تو بلا کر فرمایا کہ اس مضمون کی ضرورت کیا تھی، اس طرح کی بحثوں میں اُلجھنا نہیں چاہیے، اس کے علاوہ اعتراض کرنے والوں کو مخالفت کو جاری رکھنے کا موقع ملتا ہے، اگر آپ جواب میں ایک صفحہ لکھیں گے وہ دس صفحے لکھیں گے، آپ خاموش رہیں گے تو کچھ دنوں میں وہ بھی خاموش ہو جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ اطمینان رکھیں کہ پرویز صاحب مجھ جیسے چھوٹے آدمی کو جواب نہیں دیں گے اور مجھے اپنے ساتھی طالب علموں کو خاموش کرنے کے لیے یہ مضمون لکھنا ضروری تھا۔

ذاکر صاحب میں مروّت بہت تھی، اتنی زیادہ کہ کبھی کبھی محض مروّت میں وہ کر گزرتے جو ان کے اصول اور طبیعت کے بالکل خلاف ہوتا۔ دلّی میں ایک مشہور انجینئر تھے، جنھوں نے دِلّی کے فسادات کے بعد مہاجروں کے کاموں میں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس زمانے میں بھی جب لوگ ان کے خلوص پر شبہہ کرتے تو ذاکر صاحب کہا کرتے کہ میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی ایک جیب میں پاسپورٹ اور دوسری جیب میں پاکستان کا ویزا تیار رکھا رہتا ہے، وہ کسی وقت بھی پرواز کر سکتے ہیں، مگر جب تک وہ اس کٹھن کام میں ساتھ دے رہے ہیں میں انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ بعد میں انھوں نے اپنی اس "خدمت" کی دوگنی قیمت وصول کرنی شروع کی تو اس سے ذاکر صاحب پریشان بھی ہوئے اور ان کی اچھی خاصی بدنامی بھی، مگر جب ان کے بے تکلف دوست احباب ذاکر صاحب سے اس کی شکایت کرتے تو فرماتے: "اچھوں کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں، بُروں کا بھی تو کوئی ہو۔"

ذاکر صاحب کے پاس سفارش کے لیے بہت سے لوگ آتے: ان کے ساتھ ان کا سلوک یا ہوا کبھی کچھ ہوتا، کبھی کچھ مگر شاذ ہی ان کی مدد کرتے۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے لیے سفارش کی جنھوں نے دلّی کی ایک جگہ کے لیے درخواست کی تھی اور ذاکر صاحب اس کی سلکشن کمیٹی کے چیرمین ہوا کرتے تھے۔ میں نے امیدوار کے بارے میں کہا تھا کہ وہ بہت قابل ہیں۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ کا امیدوار یقیناً اتنا ہی اچھا ہوگا، جتنا آپ نے فرمایا ہے، مگر دعا کیجیے کہ دوسرے امیدوار گدھے ہوں، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی امیدوار آپ کے امیدوار سے بھی زیادہ قابل ہو۔ ایک صاحب نے جو میرے ہم وطن اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے تھے، ذاکر صاحب کی وائس چانسلرشپ کے زمانے میں علی گڑھ سے ایم۔ ایس سی کیا تھا، انھوں نے ذاکر صاحب سے، جب اب صدر جمہوریہ تھے، یہ شکایت کی کہ فلاں پوسٹ کے لیے ان کا سلکشن ہو گیا تھا، مگر محض تعصب میں

میں مجھے اَن فٹ کر دیا گیا، اگر آپ فلاں سے اشارۃً بھی فرما دیں تو میرا بگڑا کام بن سکتا ہے، ذاکر صاحب نے پوری شدت سے ان صاحب کے کہنے سے انکار کر دیا۔ وہ جذبات میں بہت کچھ کہہ دیتے تھے۔ اگر مخاطب جامعہ کا یا علی گڑھ کا طالب علم رہ چکا ہو۔ یہ صاحب بہت مایوس آئے اور ہر ایک سے ذاکر صاحب کی بُرائی کرتے تھے، مگر ذاکر صاحب نے کیا کیا؟ انھیں یہ بات یاد تھی، جب متعلق افسر سے کسی موقع پر ملاقات ہوئی تو صرف اس قدر فرما دیا کہ ذرا فلاں معاملے کو دیکھ لیجیے گا؛ ان کے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں ہوئی۔ اتنا اشارہ ہی کافی تھا، ان کا کام بن گیا۔ ایک صاحب ذاکر صاحب کے پاس سفارش کے لیے آئے، اس وقت ذاکر صاحب کو سخت بخار تھا اور موسم بھی اچھا نہیں تھا۔ انھوں نے ذاکر صاحب سے ملنے کی خواہش کی؛ جو لوگ وہاں موجود تھے، انھوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اس وقت ملاقات مناسب نہیں ہے، مگر وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھے، یہ گفتگو برآمدے میں ہو رہی تھی اور ذاکر صاحب لیٹے ہوئے کمرے میں تھے، جب انھوں نے دیکھا کہ آنے والے صاحب اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں، تو اسی بخار کی حالت میں باہر آ گئے اور فرمایا کہ چلیے کہاں چلنا ہے میں تیار ہوں۔ ذاکر صاحب کی یہ کیفیت اس وقت ہوتی تھی جب وہ انتہائی غصّے میں ہوں، کبھی تو ان کی یہ کیفیت سمجھ میں آ جاتی تھی اور کبھی بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی اور مخاطب اس غلط فہمی میں ہوتا تھا کہ وہ نارمل حالت میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔

ذاکر صاحب کے غصّے پر ایک اور بات یاد آ گئی۔ غالباً ۶۵ء کی جنگ کا زمانہ تھا اور وار فنڈ کے لیے چندے وصول کیے جا رہے تھے، ایک جلسے میں ذاکر صاحب کو شرکت کے لیے دعوت دی گئی جس میں بڑے چندوں کے اعلانات کیے جانے والے تھے۔ نہ جانے کیسے اس جلسے میں میں بھی پہنچ گیا۔ جلسے کی کارروائی بہت تاخیر کے ساتھ شروع کی گئی۔ جلسہ ایک وسیع شامیانے کے اندر رکھا گیا تھا اور جو اسٹیج تیار کیا گیا تھا کچھ اس قسم کا تھا جیسا رام لیلا کے لیے گاؤں وغیرہ میں بنایا جاتا ہے، منتظمین بھی کچھ اچھے ذوق کے نہیں تھے، مجھے حیرت تھی کہ ذاکر صاحب جیسا خوش مذاق آدمی یہاں کیسے آ گیا۔ یہ صحیح تھا کہ وہ حکومتِ ہند کے ایک اہم عہدہ دار تھے، "وار فنڈ" کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم، مگر ذاکر صاحب کی شخصیت بھی تو کوئی چیز ہے؟ میں اسی قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ جلسے کی کارروائی ختم ہوئی اور منتظمین جلسہ نے ذاکر صاحب سے کچھ فرمانے کی درخواست کی۔ ذاکر صاحب بادلِ ناخواستہ اٹھے اور اسٹیج کی طرف روانہ ہوئے۔ ہر پروگرام کے بعد اسٹیج کا پردہ کھینچ دیا جاتا تھا، یہاں لطیفہ پیش آیا کہ جب ذاکر صاحب زینہ چڑھ کر اسٹیج کے دروازے پر پہنچے تو وہ صاحب جو آگے آ گئے تھے، انھوں نے

پردہ ہٹانے کی کوشش کی، نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی کہ اسٹیج والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی، اس پر تھوڑی سی کشمکش ہوئی جس کو دیکھ کر جلسے والے ہنس پڑے۔ خیر جب پردہ ہٹا اور ذاکر صاحب اسٹیج پر پہنچے اور تقریر شروع کی تو ان کا چہرہ دیکھنے اور تقریر سننے کے قابل تھی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس شرط پر آیا تھا کہ مجھے کچھ کہنا نہیں ہوگا، مگر اب جب مجھ سے کچھ کہنے پر اصرار کیا گیا ہے تو جو کچھ میں کہوں گا اسے سننا پڑے گا۔ اس کے بعد جلسے کی تاخیر اور نہایت بھونڈے انداز میں چندوں کے اعلانات پر بڑی کھری کھری سنائی۔ ان کی ایسی تقریر میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔

ذاکر صاحب میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ الم غلم ہر چیز پڑھتے تھے، اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود نہ جانے کہاں سے اس کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ پروفیسر مجیب صاحب، جو ذاکر صاحب کے گہرے اور مخلص دوستوں میں سے ہیں اور جامعہ سے جانے کے بعد وہی ذاکر صاحب کے جانشین مقرر ہوئے، ان کے بالکل برعکس تھے اور ہیں۔ وہ سوائے کسی ایک انگریزی روز نامے کے کوئی اخبار یا رسالہ نہیں پڑھا کرتے تھے، خاص طور پر اردو کے اخبارات و رسائل تو بالکل نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر میں پوری آزادی کے ساتھ جو چاہتا تھا لکھا کرتا تھا۔ اگر کوئی میری شکایت کرتا تو مجھ سے پوچھتے تھے اور مشورہ دیتے تھے کہ اختلافی اور نزاعی امور پر نہ لکھوں۔ مگر یہ ناممکن تھا کہ جامعہ کا کوئی شخص کوئی چیز لکھے اور ذاکر صاحب کو فوراً اس کی اطلاع نہ ہو جائے۔ ذاکر صاحب نے جب جامعہ کی باگ ڈور سنبھالی تو ایک شرط یہ رکھی تھی کہ اب کوئی شخص عملی سیاست میں حصہ نہیں لے گا؛ اگر کسی کو حصہ لینا ہو تو جامعہ سے استعفا دے کر حصہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے ایسا کیا بھی۔ مگر بالکل ابتدا میں جب کچھ لوگ جامعہ کو تعلیمی ادارے سے زیادہ تحریک خلافت کا ایک ذیلی ادارہ سمجھتے تھے۔ مگر بعد میں یہ خیال لوگوں کے ذہن سے نکل گیا اور سبھی لوگ تعلیمی خدمت میں لگ گئے اور عملی سیاست کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ ۴۲ء کی تحریک میں کچھ لوگوں نے گاندھی جی سے شکایت کی کہ اتنے اہم موقع پر جامعہ ملیہ کے لوگ جنگ آزادی سے بالکل بے تعلق ہیں۔ گاندھی جی نے جامعہ کی پالیسی کی تائید کی اور فرمایا کہ وہ لوگ جو کام کر رہے ہیں وہ بھی جنگ آزادی کا ایک اہم حصہ ہے، اگر وہ سیاست میں شریک ہو جائیں گے تو تعلیم کا یہ ضروری اور مفید کام تباہ ہو جائے گا۔ ۱۹۳۶ء کے عام انتخابات میں ریاست بہار کے موجودہ گورنر جناب قدوائی صاحب کی خواہش پر میں نے مسلمان کے ایک چچا کے الکشن میں کچھ کام کیا تھا، میں نے اخفا کی پوری کوشش کی تھی، رخصت کی درخواست میں لکھا تھا کہ ایک ضروری کام سے وطن جا رہا ہوں۔ مگر ذاکر صاحب کو اطلاع مل گئی اور جب میں واپس آیا تو بڑی محبت سے سمجھایا اور الکشن جیسی سرگرمیوں کے ضرر رساں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ جب وہ

ریاست بہار کے گورنر کی حیثیت سے پٹنہ آ گئے، تو میں سمجھا تھا کہ اب فضول چیزیں پڑھنا چھوڑ دی ہوں گی، مگر مجھے تعجب ہوا جب اسی زمانے میں کسی موقع پر جامعہ گئے اور ایک عصرانے میں ان سے ملاقات ہوئی تو فوراً ہی سوال کیا کہ کہیے، آج کل کون سے مسائل زیرِ غور ہیں؟ اس زمانے میں میں نے ہفتہ وار اخبار "ہماری زبان" میں "عام فہم زبان"، "اُردو میں انگریزی الفاظ کا استعمال" اسی قسم کے بعض مسائل پر بحث چھیڑ رکھی تھی۔ ذاکر صاحب کا اشارہ ان ہی بحثوں کی طرف تھا۔ یہاں کا حال تو مجھے معلوم نہیں، مگر نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ کے زمانے کا مجھے اچھی طرح علم ہے کہ ان کے پاس جو اخبار، رسالے اور کتابیں جاتی تھیں، جب تک ان پر ایک نظر ڈال نہیں لیتے یا ان کے مطالعہ سے وہ ہٹائی نہیں جاتی تھیں، بہت سے لوگ اپنی تصانیف اور تخلیقات پر ان کی رائے بھی معلوم کرتے تھے اور عام طور پر وہ لوگوں کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے بعض لوگ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے اور بعض لوگ ان کی ایسی رایوں سے انعامات یا ترقی یا کسی اور قسم کی منفعت کے مواقع پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ذاکر صاحب عام طور پر لوگوں کے خطوط کے جوابات ضرور دیتے تھے اور نائب صدر جمہوریہ ہونے تک وہ خود اپنے ہاتھ سے جواب لکھتے تھے، اس کے بعد چونکہ خطوط کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے سکریٹری کو خطوط لکھا دیتے یا ہدایت دیدیتے مگر دستخط خود کرتے تھے، ان کے سکریٹری کو یہ اختیار نہیں تھا کہ مولانا اجمل خاں صاحب کی طرح یہ لکھ دیتے کہ مولانا نے آپ کا خط دیکھ لیا ہے، انھوں نے یہ فرمایا ہے، وہ فرمایا ہے۔ میری معلومات کے مطابق اس کے خلاف صرف ایک مثال ہے جو بذاتِ خود بڑی دلچسپ مثال ہے اور اس سے ذاکر صاحب کی مخصوص مزاجی کیفیت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک صاحب نے ذاکر صاحب کو لکھا کہ میرے پاس آپ کے اتنے خطوط ہیں، آپ اجازت دیں تو انہیں شائع کرا دوں۔ ذاکر صاحب نے اپنی عادت کے خلاف اس خط کا جواب لکھا نہیں لکھوایا، اور اس پر خود دستخط نہیں کیے، سکریٹری کے دستخط سے بھیجا گیا۔ ذاکر صاحب نے جہاں یہ لکھا کہ ان خطوط کے جو وہ بھیج چکے، اب مالک وہ نہیں ہیں، مکتوب الیہ خود ہیں، وہ جو چاہیں کریں، وہاں یہ وضاحت بھی کر دی کہ یہ خط وہ خود اس لیے نہیں لکھ رہے ہیں کہ ان کے پاس یعنی مکتوب الیہ کے پاس جس قدر خطوط ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ نہ ہو جائے۔

ذاکر صاحب کی زندگی اور عمل میں بعض لوگوں کو تضاد نظر آتا ہے، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ایسا نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ کبھی وہ ایک بات پر زور دیتے ہیں اور کبھی دوسری بات پر، اور یہ غلط فہمی بھی صرف ان کو ہوتی ہے جو ذاکر صاحب کے مزاج، ان کی طبیعت اور ان کے چند خیالات سے پوری

طرح واقف نہیں ہوتے اور وہ بظاہر دو متضاد باتوں میں مطابقت یا تطابق پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علی گڑھ کا ایک واقعہ پیش کرتا ہوں: وہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ تشریف لے گئے، تو کچھ دنوں کے بعد ہوسٹلوں کا معائنہ کیا اور طالب علموں سے باتیں کیں۔ وہ ایک کمرے میں گئے، تو اس کی دیواریں تصاویر سے بالکل خالی تھیں۔ انھوں نے فرمایا کہ بھئی، کچھ تو ان دیواروں پر لگائیے، کچھ نہیں تو کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویر ہی لگا لیجیے یا ایسا کلنڈر لٹکا لیجیے جس میں تصاویر ہوں۔ کسی اور کمرے میں گئے، تو وہاں سستے قسم کا کوئی کلنڈر تھا جس پر بازاری یا بھونڈی تصویر بنی ہوئی یا کسی ایکٹر یا ایکٹریس کی تصویر لگی ہوئی تھی تو وہاں فرمایا: یہ کیا بدمذاقی ہے، اگر آپ کو ایسا ہی شوق ہے تو کوئی اچھی سی تصویر لگائیے، کسی آرٹ کا نمونہ ہو، یا کسی مشہور ادیب یا لیڈر کی یا کسی سائنس داں کا فوٹو لگائیے۔ ان کے ان مشوروں کو بہت سے لوگوں نے متضاد قرار دیا، لیکن اگر غور فرمائیے تو ایسا نہیں ہے۔

مجیب صاحب کے زمانے میں جامعہ میں ایک بحث یہ چھڑی تھی کہ ذاکر صاحب بہت زیادہ جمہوریت پسند تھے اور مجیب صاحب ایسے نہیں ہیں۔ خود مجیب صاحب کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ ذاکر صاحب کے زمانے میں مجلس تعلیمی (اکیڈمک کاؤنسل) اور مجلس منتظمہ (اگزیکیوٹو کمیٹی یا گورننگ باڈی) کے جلسے بمشکل سال میں ایک دو ہوتے تھے اور میرے زمانے میں ہر ماہ پابندی سے ہوا کرتے ہیں اور اس میں جو فیصلے ہوتے ہیں ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ مجیب صاحب کا یہ ارشاد بالکل صحیح تھا، مگر جو لوگ یہ بات کہتے تھے اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ ذاکر صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ وہ جامعہ کی اہم شخصیات سے تمام اہم معاملات میں مشورہ کرتے تھے اور اس کے لیے اکثر ان کے گھروں پر چلے جاتے تھے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ کرتے وہی تھے جو مناسب سمجھتے تھے۔ لیکن وہ اشخاص جن سے وہ مشورہ کرتے تھے، یہ تو بھول جاتے تھے کہ ذاکر صاحب نے کیا کیا، ان کی خوشی اور اطمینان کے لیے اس قدر کافی تھا کہ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ میرا مشورہ لیا اور اس کے لیے میرے غریب خانے پر تشریف لائے۔ اولاً تو مجیب صاحب کے زمانے میں جامعہ کے حالات بھی بڑی حد تک بدل گئے تھے اور مسائل میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا، اس کے علاوہ ان کے مزاج اور طبیعت کے خلاف تھا کہ ائتلافی اور اختلافی لوگوں کے گھروں کا چکر لگائیں یا انفرادی طور پر مشورہ کریں، اور اگر ایسا وہ کرتے تو اتنی کتابیں اور مضامین نہ لکھ پاتے جو انھوں نے لکھی ہیں۔ جامعہ تو بہر حال اسی طرح چلتی جس طرح ان کے زمانے میں چلی، مگر علمی و ادبی دنیا ان کتابوں اور مضامین سے محروم رہ جاتی جو

مجیب صاحب کی دین ہیں۔

ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد، بہت دنوں تک یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ انہوں نے جامعہ کو کیوں چھوڑا اور علی گڑھ کیوں گئے؟ بعض لوگ ان پر الزام لگاتے تھے کہ انھوں نے جامعہ کے ساتھ بیوفائی کی ہے اور بعض طنز کرتے تھے کہ ارے صاحب، وہ تو شروع ہی سے علی گڑھ جانے کے لیے بے چین تھے، اب تک اس کا موقع نہیں ملا تھا، جب دیکھا کہ میدان صاف ہے تو چلے گئے، مولانا آزاد کا تو محض بہانہ ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ذاکر صاحب نے جو کچھ کیا اپنے ذاتی مفاد کے لیے نہیں کیا، بلکہ قوم، ملک اور تعلیم کے وسیع تر مفاد کی خاطر کیا اور اپنے ساتھیوں کی مرضی اور مشورے پر علی گڑھ گئے۔ یہ بات میرے نزدیک صحیح ہے کہ جامعہ کے حالات سے کسی حد تک بیزار اور اس کے بڑھتے ہوئے مسائل سے کسی قدر دل برداشتہ ہو گئے تھے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، انسان تھے "پیالہ و ساغر" نہیں تھے۔ تقریباً چوتھائی صدی تک جامعہ کی سربراہی کی تھی اور انتہائی نازک حالات میں اس کی رہنمائی کی تھی اور ایسے لوگوں کے نخرے برداشت کیے تھے جن کی بازار میں کوئی قیمت نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ جامعہ میں کام کرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی، ان میں سے بہت سے لوگ علی گڑھ چھوڑ کر آئے تھے، ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تنخواہیں سب کی کم تھیں، مالی پریشانیاں سب کو تھیں، مگر شکایت وہی زیادہ کرتے تھے جو بہت معمولی اور چھوٹے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابتدائی اسکول کے ایک استاد نے عید کے موقع پر ذاکر صاحب کو بہت سخت خط لکھا اور اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا۔ یہ پریشانیاں کس کو نہیں تھیں، مجھے جامعہ کے کاغذات میں مجیب صاحب کا ایک پرچہ ملا۔ جس میں انھوں نے جامعہ کے خازن کو لکھا تھا کہ مجھے فوری طور پر دس روپے کی سخت ضرورت ہے۔ مجیب صاحب گھر کے بہت امیر تھے، ان کے والد جب تک زندہ رہے ان کی مالی امداد کیا کرتے تھے: ان کی زندگی کا ایک معیار تھا، جس کو ہر حالت میں برقرار رکھا، مگر کبھی ایسا موقع بھی آ جاتا تھا کہ دس روپے کے لیے انھیں پرچہ لکھنا پڑتا مگر ذاکر صاحب کی شرافت اور ذمہ داری کا احساس دیکھیے کہ ابتدائی اسکول کے استاد صاحب کی شکایت کا بظاہر ذرا بھی بُرا نہ مانا اور ان کے گھر جا کر ان کی خدمت میں کچھ رقم پیش کی۔ ایسے واقعات اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کام کی یکسانیت بھی انسان کے قویٰ کو شل کر دیتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ان کے معتمد علیہ ساتھیوں نے اس کی ذمہ داری لی تھی کہ وہ جامعہ کو اسی طرح چلاتے رہیں گے اور مستقبل نے یہ ثابت کر دیا کہ ذاکر صاحب کے جانے کی وجہ سے جامعہ پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ مجیب صاحب کو ذاکر صاحب کے مشورے برابر حاصل ہوتے رہے، خصوصاً جب تک وہ علی گڑھ میں رہے۔ بعد میں

وہ امیر جامعہ مقرر ہو گئے تھے، اس طرح جامعہ سے ان کا تعلق پھر قائم ہو گیا تھا۔
ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کچھ لوگوں نے مجیب صاحب اور ذاکر صاحب کے درمیان غلط فہمی پیدا کر دی اور
دونوں دوستوں کے درمیان تعلقات کسی حد تک کشیدہ ہو گئے۔ غالباً میرے یہ الفاظ، صحیح صورت حال کے اظہار
کے لیے صحیح نہیں ہیں؛ مجھے کہنا یہ چاہیے کہ کچھ لوگوں نے کوشش کر کے ذاکر صاحب کو مجیب صاحب کی طرف سے
بدظن کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باہر کے کچھ لوگوں نے جامعہ کے اندرونی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی اور مجیب
صاحب پر کچھ الزامات لگائے۔ ان لوگوں میں ریاست بہار کے ایک ایم۔ پی بھی تھے، جو سب سے زیادہ سرگرم تھے۔
ان الزامات کی وجہ سے مجیب صاحب نے استعفا دیدیا تھا، مگر تحقیقاتی کمیٹی نے ان کو تمام الزامات سے بری کر دیا اور
انھوں نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔ اس وقت مجھے یاد نہیں کہ ذاکر صاحب کو جو شکایت پیدا ہوئی تھی، وہ ان الزامات
سے پہلے کی تھی یا بعد کی۔ بہرحال جامعہ میں جب یہ خبر پھیلی کہ ذاکر صاحب کو مجیب صاحب سے شکایت ہے اور خوش
نہیں ہیں تو میں نے اسے بالکل بے بنیاد سمجھا، کیونکہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان دو مخلص دوستوں کو ایک دوسرے
سے کوئی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر جب ذاکر صاحب کا مجیب صاحب کے نام خط آیا تو اس افواہ کی تصدیق کرنی
پڑی۔ ذاکر صاحب نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ جامعہ کے اہم معاملات میں مجیب صاحب ان سے کوئی مشورہ
نہیں کرتے اور جامعہ سے ان کو بالکل بے تعلق کر دیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح تھی، لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی
کہ مجیب صاحب ذاکر صاحب سے مشورہ کرنا اپنے لیے کسر شان سمجھتے تھے یا ڈرتے تھے کہ ان کے اقتدار میں کوئی کمی
آجائے گی، یا یہ کہ ذاکر صاحب جامعہ کے معاملات میں مداخلت کریں گے۔ ان میں سے کوئی بات نہیں تھی، بلکہ اس کی
صرف دو وجہیں تھیں اور یہی وجہیں مجیب صاحب نے ذاکر صاحب کو لکھی تھیں۔ ایک یہ کہ مجیب صاحب جامعہ کے حالات کو
اور نزاعی مسائل میں ان سے مشورہ مانگ کر خواہ مخواہ کے لیے ان کو پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ظاہر ہے
اتنے فاصلے سے ذاکر صاحب مجیب صاحب کی پریشانیوں میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے اور جو مسائل وہاں
پیدا ہوتے تھے ان میں کوئی مشورہ دینا بھی ان کے لیے مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ دوسری وجہ کا تعلق خود ذاکر
صاحب کے ایک اصول سے تھا جسے ہم عدم مداخلت کا نام دے سکتے ہیں۔ ذاکر صاحب کا یہ بنیادی اصول
تھا کہ جب وہ کسی کو کوئی کام سپرد کر دیتے تھے تو پھر اس میں کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے، بلکہ اس پر مکمل اعتماد
اور بھروسا کرتے تھے۔ یہی اصول مجیب صاحب کا بھی تھا؛ ممکن ہے انھوں نے یہ بات ذاکر صاحب سے
سیکھی ہو، مگر انھوں نے بھی اس پر مکمل طور پر عمل کیا۔ اسی وجہ سے یہ سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے کہ

ب نے جب جامعہ کی ذمہ داری مجھے سپرد کر دی ہے تو وہ یہ پسند نہیں کریں گے کہ اس کے معاملات میں کسی قسم کا
دیں۔ اس لیے اس خارزار میں انھیں گھسیٹنا مناسب نہیں ہے۔
اس میں شبہہ نہیں کہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کی دوستی اخلاص اور اصول پر تھی، مگر دونوں کے مزاج اور
ت میں کسی نہ کسی حد تک فرق تھا۔ اس لیے کبھی کبھی غلط فہمی کی صورتیں پیدا ہو جاتی تھیں یا دونوں کے خوشگوار
ات میں عارضی طور پر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ مثلاً مجیب صاحب سرکاری عہدہ داروں سے بہت
ہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے یا کم از کم ملاقات کے لیے خود اپنی طرف سے اقدام کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔
ہ جب ذاکر صاحب صدر جمہوریہ مقرر ہوئے اور وہ راشٹرپتی بھون میں منتقل ہو گئے تو ایک عرصے تک مجیب
ب ان سے ملنے کے لیے نہیں گئے۔ وہ ذاکر صاحب کو رفیق کار اور دوست سے کہیں زیادہ اونچا مرتبہ
تے تھے، ان کے انتہائی عقیدت مند تھے اور ان کی حیثیت مجیب صاحب کے دل میں ایک مرشد کی سی تھی۔
اشٹرپتی ہونے کے بعد وہ کہتے تھے کہ اب وہ حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، جب وہ بلائیں گے، تبھی جاؤں گا۔
مر ذاکر صاحب نہ جانے کیا سوچتے تھے، بہرحال کچھ عرصے کے بعد ذاکر صاحب نے خط لکھا کہ یہ گومگو کی حالت
تک رہے گی، نہ آپ آتے ہیں، نہ بلاتے ہیں۔ اس خط کا آنا تھا کہ برف پگھل گئی اور مجیب صاحب کا
ں ختم ہو گیا۔ مگر ابھی ایک واقعہ ہونا باقی تھا!
کوئی بیرونی مہمان دلی تشریف لائے تھے اور راشٹرپتی بھون میں ان کے ایٹ ہوم کا پروگرام ایمرجنسی
ے طے پایا کہ دعوت نامہ چھپوا کر بھیجنا ممکن نہیں تھا، اس لیے مدعوئین کو فون پر اطلاع کی گئی۔ مجیب صاحب کو
ا بشیر زیدی صاحب نے راشٹرپتی بھون ہی سے اطلاع کی اور یہ بھی وضاحت کر دی کہ ریسپشن آفس کو اس کی اطلاع ہو گی
ر انھیں کوئی زحمت نہیں ہو گی۔ مجیب صاحب وہاں پہنچے تو غلطی سے فہرست میں ان کا نام نہیں تھا، وہ فوراً واپس
گئے۔ ذاکر صاحب کو فوراً ہی اس حادثے کی اطلاع ملی اور انھوں نے فوراً ان کی تلاش میں گاڑی دوڑائی، مگر
یب صاحب ہاتھ نہیں لگے، اس کے بعد راشٹرپتی بھون کے تمام ذمہ دار افسروں کو حکم دیدیا گیا کہ مجیب صاحب جب بھی
ر جس وقت بھی آئیں انھیں روکا نہ جائے۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے مجیب صاحب سے فرمایا کہ جب بھی آنا چاہیں
شتے کے وقت بلا تکلف آجایا کریں، یہ وقت میرا اپنا ہوتا ہے، اطمینان سے بات ہو سکتی ہے۔
مجھے اس وقت جو باتیں یاد آرہی ہیں، ان میں صرف ایک ہی قابل ذکر بات رہ گئی ہے، وہ یہ کہ وہ کیا
سباب تھے جن کی بنا پر ذاکر صاحب کو قبل از وقت علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔

ذاکر صاحب جب علی گڑھ گئے تھے تو یونیورسٹی کے انتظام کو بہتر بنانے اور اس کے علمی و تعلیمی معیار کو بڑھانے کے لیے ان کے ذہن میں بہت سی اسکیمیں تھیں۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یونیورسٹی پہ فرقہ پرستی کا جو الزام ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ صحیح ہے یا نہیں، مگر ایسی فضا پیدا کی جائے کہ کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے لیے وہ چاہتے تھے کہ چوٹی کے پروفیسر رکھے جائیں جو اپنے میدان کے فرد وحید ہوں۔ اسی سلسلے میں دو غیر مسلم پروفیسر رکھے گئے، ایک معاشیات کے اور ایک فزکس کے۔ اس کو سب نے تسلیم کیا ہے کہ یہ دونوں پروفیسر اپنے اپنے مضمون کے مانے ہوئے تھے، مگر بعد میں ان میں فزکس کے پروفیسر، شدید اختلافات کا باعث ہو گئے۔ ان اختلافات نے ایسی ناگوار شکل اختیار کر لی کہ ذاکر صاحب بالکل مایوس ہو گئے اور مجبور ہو کر استعفا دیدیا۔ ان کے استعفا کے بعد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ایک طویل اور بہت ہی جذباتی خط ذاکر صاحب کو لکھا تھا، جسے میں نے ذاکر صاحب کے کاغذات میں دیکھا ہے۔ انھوں نے بڑی ہی لجاجت اور اصرار کے ساتھ درخواست کی تھی کہ ذاکر صاحب اپنا استعفا واپس لے لیں اور یونیورسٹی کو چھوڑ کر نہ جائیں، انھوں نے تمام اساتذہ کی طرف سے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے اور آئندہ ان کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ مگر دل ایک ایسا نازک شیشہ ہے جو ایک مرتبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ اس کا جڑنا ناممکن ہے۔ اسی طرح ذاکر صاحب راجیہ سبھا کی صدارت سے مایوس اور بیزار ہوئے تو نائب صدر جمہوریہ کی مدت کے ختم ہونے کے بعد دوبارہ اس کے لیے کسی حالت میں تیار نہیں تھے۔ ذاکر صاحب گاندھی جی کے معتمد علیہ ساتھیوں میں سے تھے۔ علمی و تعلیمی میدان میں ان کا مرتبہ بڑا اونچا تھا، بین الاقوامی حیثیت کے مالک تھے۔ مگر سیاسی اختلافات کی سطح افسوسناک حد تک پست تھی، خود اس پارٹی کے اندر بھی جس کی راجیہ سبھا میں بھاری اکثریت تھی۔ ذاکر صاحب شاید سب کچھ برداشت کر سکتے تھے، مگر پست ذہنیت اور خود غرض لوگوں کو برداشت کرنا ان کے لیے قطعاً ناممکن تھا۔ ان نامساعد حالات میں ذاکر صاحب نے جو کچھ کیا، وہ ان کی عظمت، بلندی اور خلوص کا نتیجہ تھا، ورنہ ہمارا سماج ایسا نہیں کہ ذاکر صاحب جیسا حساس اور نازک مزاج اتنے سارے کام کر سکتا جو انھوں نے انجام دیئے ہیں، صرف تعلیم کے میدان ہی میں نہیں، جو ان کا اپنا میدان تھا، سیاست کے میدان میں بھی جس سے وہ دور بھاگتے تھے!

(۴ نومبر ۱۹۸۰ء کو خدا بخش لائبریری میں سنایا گیا) ●●

# بیگم انیس قدوائی

● بیگم انیس قدوائی (پ ۱۹۰۶ء) اُردو کی ممتاز ادیبہ جو انرگ
ولایت علی بمبوق" کی صاحبزادی اور رفیع احمد قدوائی کی چچا زاد بہن اور بھاوج —
رفیع احمد قدوائی کے بھائی شفیع احمد قدوائی سے شادی ہوئی جو ۱۹۴۷ء میں مسوری کے
فرقہ وارانہ فساد میں شہید ہوئے۔ شوہر کے انتقال کے بعد فرقہ وارانہ فساد سے متأثر لوگوں
کی خدمت میں مشغول ہوگئیں اور ۱۹۵۶ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر راجیہ سبھا کی ممبر نامزد ہوئیں۔
راجیہ سبھا کے لئے پھر دوبارہ نامزد کیا گیا۔ انور جمال قدوائی (شیخ الجامعہ) ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔
"آزادی کی چھاؤں میں"؛ "اب جن کے دیکھنے کو" اور "نظرِ خوش گزرے"
ان کی اہم تصانیف ہیں۔ ذاکر صاحب پر یہ مضمون ان کی آخری تحریری یادگار ہے۔
۱۶ جولائی ۸۲ء کو ۷۵ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

○

مرحومہ کے دو یادگار خطوط جو اس مضمون سے متعلق ہیں، اقتباساً نقل کیے جاتے ہیں:

"سلام علیک: اپنے پیر کے درد کی وجہ سے کسی طرح طبیعت ہی حاضر نہ ہوئی۔ پرسوں
سے بہتر ہوئی تو لکھنا شروع کیا۔ مسودہ صاف کرنے کا بھی وقت نہ تھا۔ یونہی بھیج رہی ہوں۔ ذاکر
صاحب پر تو بہتر سے بہتر مقالے پڑھے جائیں گے۔ میری یادداشت بھی اب پہلے جیسی نہیں رہی۔
بڑا پھیکا اور سطحی مضمون ہے۔ پھر بھی نذرِ عقیدت تو ضرور ہی ہے۔ شریک نہ ہو سکی اس کا افسوس ہے۔"

"اخلاق میاں نے بھی مجھے بلایا تھا۔ لیکن اپنے پیر کے درد اور آنکھ کی کمزوری کی وجہ سے اب
میں سفر سے بہت گھبراتی ہوں۔ ویسے بھی بقول حافظ شیرازی:

چون پیر شدی حافظ از میکدہ بیرون شو

پر اپنی عمر کی وجہ سے عمل کرنے لگی ہوں۔ اگر جمال آرہے ہوتے تو شاید میں بھی ارادہ کر لیتی۔
اکیلے ہمت نہ پڑی۔ اخلاق کو دعائیں اور معذرت کہہ دیجیے۔ اللہ بلانے والوں کو سلامت
رکھے۔ آپ سب کا شکریہ۔"

خیر طلب
انیس قدوائی

●●

○

خُدا شرے برانگیزد کہ خیرے مادراں باشد، جب میری بدقسمتی مجھے دہلی لائی تو اتنی خوش قسمتی بھی ساتھ ساتھ چلی آئی کہ ان سب قدآور شخصیتوں کو جن کے دُور کے جلوے نے ساری عمر مرعوب رکھا تھا اپنی آنکھوں سے اُنھیں دیکھ لوں اور ان کے ساتھ چھوٹا موٹا کام بھی کرلوں۔ اس لئے:

نازم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ان اہم ترین ہستیوں میں ایک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی تھے جو اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم کی چندہ جمع کرنے والی سفارت اور بادہ بکی کے بہت سے لوگوں کے جامعہ ملیہ میں کام کرنے کی وجہ سے شمالی ہند کے قصبات میں عام طور پر جامعہ ملیہ اور شیخ الجامعہ متعارف تھے۔

مجھے تو خیر رفیع بھائی کی دی ہوئی ایک دعوت میں خود اپنے گاؤں 'میسوی' میں انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس لئے صورت آشنا بھی تھی۔ ان دنوں سخت پردہ کی وجہ سے محفل میں شریک ہونا کیا' کھلے عام بالاخانے سے دیکھنا ناممکن تھا۔ خدا بھلا کرے بزرگوں کا ——— انھوں نے کوٹھے پر کچھ جھلی والی کھڑکیاں لگوا دی تھیں۔ جانتے ہوں گے کہ یہ عورتیں بغیر تاک جھانک کے تو رہ نہیں سکتیں۔ کبھی جھلی کی جھری سے باہر کا نظارہ کرلیں تو کچھ حرج نہیں اور واقعی مردانے میں کوئی مجمع ہو تو بغیر دیکھے ہمیں چین نہیں آتا تھا۔ یوں میں نے ذاکر صاحب کو بھی دیکھ لیا تھا۔

کئی سال بعد دہلی میں پہلی بار گاندھی جی کے یہاں ان کو دیکھا تو پہچان گئی۔ گاندھی جی کہہ رہے تھے: ذاکر صاحب قرول باغ جا کر دیکھ لو، کچھ سامان تمہارے جامعہ کا لوگوں نے بچا لیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ پھر گئے' یا نہیں گئے۔ البتہ گاندھی جی کے کہنے پر جب پناہ گزینوں کے کیمپ گئی تو وہاں ایک دن بپھرے ہوئے مجمع میں گھرے ہوئے حیران پریشان کھڑے تھے۔ پرانے قلعہ میں دو ایک بار اور جلسوں جلوسوں میں اکثر ملنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن دُوری و اجنبیت برقرار رہی۔

مقبرہ میں ذاکر صاحب کی بھیجی ہوئی طالب علم اور ٹیچروں کی ایک پوری ٹیم کام کر رہی تھی۔ صبح جامعہ کی ایک وین نوجوان کی پوری کیمپ پہنچا جاتی، دوپہر میں کچھ بالٹیوں میں دال اور گٹھڑ میں بندھی روٹیاں لے کر آتی اور شام کو ان سب تھکے ہاروں کو واپس لے جاتی تھی۔

ہم اناڑی سوشل ورکر اس وقت گھبرا اٹھے جب کہرا اور سردی بڑھی۔ بارش نے بے سروسامانو کو ٹھٹھرا دیا اور یہ فکر ہوئی کہ ان کے لئے گدّے کمبل کہاں سے لادیں گے۔ ایک روز دیکھا کہ اسی وین میں جوٹ کے گدّے پیال بھر کے چلے آ رہے ہیں۔ اس انتظام نے دل خوش کر دیا۔ انھیں دنوں چند لاوارث بچّوں کی رہائش و تربیت کا سوال پیدا ہوا اور مجھے جامعہ ملیہ جانا پڑا۔

اوکھلے کے اوبڑ کھابڑ میں درختوں اور پھول پتیوں سے گھرا ہوا جامعہ ملیہ اسکول بہت اچھا لگا۔ ذاکر صاحب کے گھر گئی۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر جس سادہ زندگی کا تصور کیا تھا بالکل ویسے ہی دیکھا۔ فرش پر ایک نمدہ بچھائے کاغذات میں گھرے بیٹھے تھے۔ تخت پر مخملیں قالین بچھائے گاؤ تکیہ سے لگی بیگم تشریف فرما تھیں اور پاس میں ان کا تو مند بلا جو خوب کوفتے کھا کھا کر موٹے ہوا تھا گھر کا نگہبان بنا ہوا آرام کر رہا تھا۔ گھر میں فرنیچر نام کی بس چند چیزیں تھیں۔ بیگم نے ذاکر صاحب کی مدد وقت سے بے نیاز ہو کر مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا اور اس مخلصانہ انداز سے کچھ میری ہمت اور بڑھ گئی۔ اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔ پڑھائی اوڑھائی تو ان دنوں تقریباً بند تھی۔ اس لئے ذاکر صاحب نے ایک گھر ماسٹر اور چپراسی کا انتظام کر کے مجھے دوسرے ہی دن بچوں کو لانے کے لئے کہہ دیا۔

ظاہر ہے اپنی امانت رکھانے کے بعد اکثر جانے آنے کا سلسلہ رہا اور ہر بار اس خانقاہ کے مکینوں سے متأثر ہو کر لوٹی۔

ذاکر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مغل اعظم کی طرح انھوں نے بھی اپنے گرد کچھ نورتن اکٹھے کئے تھے۔ وہ جرمن خاتون جو آپا جان کہلاتی تھیں اور اسکول کے بورڈنگ کی نگراں تھیں چند ہی دن پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ مگر بچّوں کے ٹیچر اور مصنّف مدعولوی صاحب موجود تھے۔ بچّوں کے شاعر شفیع الدین نیّر، آرٹ اینڈ کرافٹ کے دیولے، کلام صاحب جامعہ کے ارکنک ہائیڈ۔ فاؤسٹ کے مترجم عابد صاحب اور بہت سے لوگ جنھوں نے اپنی زندگیاں جامعہ کو دے رکھی تھیں۔ پوری مستعدی سے جامعہ ملیہ کو حیات و موت کی کشمکش سے نکالنے پر لگے ہوئے تھے۔

اور خود ذاکر صاحب جامعہ کے احاطہ میں گشت کرتے ہوئے کوڑا کرکٹ کلاس میں پھٹے ہوئے کاغذ سب اپنی جیب میں ٹھونستے جاتے تھے۔ جب جیب بہت بھر جاتی تو کوڑے کو بالٹی میں لوٹ دیتے۔ جسے دیکھ کر طلبا اور ٹیچر بھی شرمندہ ہو جایا کرتے تھے۔

ایک خاص بات ان میں یہ تھی کہ وہ پٹھان سے زیادہ انسان نظر آتے تھے۔ مجھے معاف کیجئے، پٹھانوں کے بارے میں اودھ کے شیخ زادوں کا نظریہ ۔۔۔ تنا ہوا گھونسا، اٹھا ہوا ڈنڈا اور کڑی کمان سے ملتا تھا۔ کیونکہ ملیح آباد کے پٹھانوں نے کچھ ایسا تاثر ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کو دیکھ کر تعجب ہوا، وہ تو ایسے دھیمے، میٹھے، پرسکون تھے کہ مجھے بھی سنے سنائے نظریہ کو بدلنا پڑا۔ بلکہ جو بچا تھا اس پر سے بھی یقین اُٹھ گیا۔ نہ اُن کی چڑھی ہوئی مونچھیں تھیں نہ بیچ سے مانگ نکلی ہوئی طرار ڈاڑھی۔ چہرہ پر خشونت کا کیا ذکر، یہاں تو رحم و مروّت کی بارش ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر برسبیل تذکرہ جب انہوں نے بیگم کو کھری پٹھانی کہا، تب خیال آیا کہ ارے یہ بھی تو اسی قبیلہ سے اور جنگجو خاندان کے فرد ہیں۔

ایک بار فریدآباد کے سرحدی پناہ گزینوں کے لئے جھونپڑیوں میں انہوں نے آٹھ اسکول شروع کرائے۔ لیکن شورش پسندوں نے ذراسی بات لے کر ان کے دروازہ پر مظاہرہ کرا دیا۔ میں نے سوچا کہ آج تو اُن کی پٹھانی رگ ضرور پھڑک اٹھے گی۔ لیکن حیرت پڑ گئی جب انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور پوری خاموشی سے سب کچھ سُنتے رہے۔ نہ سرزنش کی اور نہ بُرا بھلا کہا۔ شانتی ہونے پر سمجھا بجھا کر معاملہ رفع دفع کر دیا۔

ہندوستان کی صدارت دو معلّموں کے حصہ میں آئی اور دونوں نے اپنی علمی قابلیت سے دنیا کو متاثر کیا۔ لیکن پتا نہیں یہ کیسے نئی نسل کے معمار سیاسی جھمیلوں میں پھنس گئے۔ ذاکر صاحب علی گڑھ کے وائس چانسلر بنے تو خیر ٹھیک تھا۔ ایک ایجوکیشنسٹ کی پارلیمنٹ کی ممبری بھی غیر مناسب نہ تھی۔ لیکن گورنر، وائس پریسیڈنٹ اور پھر صدر جمہوریہ بننا ہم سب کے لئے تو فخر کا باعث ہوا مگر خود ان کو پٹری بدلنا راس نہ آیا اور اُبھرتا ہوا تعلیمی معیار ایک دم لڑکھڑا کر تنزل کی طرف مائل ہو گیا۔

سب سے پہلے جامعہ ملیہ کے ذریعہ ان کے دور میں بچوں کا لٹریچر، بچوں کا تعلیمی میلہ، بچوں کے پارک کا نمونہ ملک کے سامنے آیا۔ بالغ آدمیوں کا پورا کورس عوام تک پہنچا۔ بچوں کے بینک اور بچوں کی پارلیمنٹ کا نظریہ جامعہ ملیہ ہی نے پیش کیا۔ بلکہ ایک دن کی حکومت نے ان کے اندر احساس ذمہ داری کی داغ بیل ڈال دی۔

وہ سادے یارانِ نجد کے گرد سے تھے اس لئے ان سے مل کر بہت کچھ میں نے سیکھا۔ سوشل ورک
میں تعلیم، خوش سلیقگی اور خلوص کے سبق لینے کے ساتھ ساتھ تجربوں کی قدامت۔ خطاطی کے نمونے
ہر ٹیڑھی میڑھی چیز کے اندر تلاشِ حسن کی تعلیم بھی ان سے ملی اور ۱۹۵۰ء کے بعد اپنی آئندہ زندگی میں ان
سب سے مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہت مدد ملی۔

ذہنی وسیع القلبی اور جذبۂ خلوص کی بدولت وہ ہر کام کرنے والے کے لئے نشانِ راہ
بن جایا کرتے تھے۔

اتنی مرنجان مرنج طبیعت کی وجہ سے کسی بات پر اٹھانا اور بہ جبر دھر دل سے منوا لینا ان کے
لئے ناممکن ہو جایا کرتا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ اردو کے لئے بیس لاکھ دستخط انہیں کے ذریعہ پیش کرانے
کے بعد جب خود ان کے ایامِ صدارت میں داد رسی نہ ہوئی اور ساری محنت ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گئی تو جامعیان
کو اس سے خاصی شکایت پیدا ہو گئی لیکن ان کے خلوص نیت پر شک نہیں ہوا۔ یہ سمجھ کر صبر کر لینا پڑا،

ط رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔

سادگی کی انتہا تھی کہ جانتے بوجھتے ہوئے امرتسر اسٹیشن پر اپنے پیروں قتل گاہ کی سمت چل پڑے
خود دشمنوں سے ہاتھا پائی کی نہ گالی گلوچ۔ بقول فیضی:

جس دھج سے چلا مقتل میں کوئی وہ شان سلامت رہتی ہے ÷ یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی کوئی بات نہیں

اس مخلص دوست کا خدا بھلا کرے جس نے دوڑ دھوپ کر کے ان حضرات کو بچا کر ہم سب پر اور مملکت پر احسان کیا
پھر جب شنکر اچاریہ ذاکر صاحب کی ملاقات پر کچھ حضرات نے ناک بھوں چڑھائیں اور سراسر الزام اس دوست پر رکھا
جو پھول پھل ناریل سمیت انہیں اچاریہ کے قدموں میں لے گیا تو سب متعجب رہ گئے کہ یہ سب کیسے ہوا۔ جس شخص نے کسی شاہ
و پیرزادہ کی قدم بوسی نہ کی ہو، کبھی کسی مزار پر فاتحہ نہ پڑھا ہو، وہ ایک سادھو کے چرنوں میں بیٹھنے کیسے چلا گیا۔

لیکن ان کے پرانے مزاج شناس جانتے تھے کہ اپنی ہوشیاری و پرکاری کے باوجود کسی کی دل آزاری ان سے
دشوار تھی۔ بس لے ان کی سادگی پر سوچ کر مطمئن ہو جائے گی۔ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ذاکر صاحب کی یاد کے ساتھ رہروانِ راہ کو علم و عمل اور خدمتِ خلق کا ہر میدان دکھاتا رہا ہے جو نصف
صدی تک ہندوستان پر چھایا رہا اور اب حماقت بنتا جا رہا ہے۔

پھر بھی مجھے فخر ہے۔ میں نے انہیں دیکھا، ان کے ساتھ کام کیا۔ کچھ عرصہ کارزارِ حیات میں ایک وسیع ال
استاد سے عمل اور پر خلوص ٹریننگ حاصل کی اور اس دورِ خانہ نشینی میں صرف ہدیۂ عقیدت ہی پیش کر سکتی ہوں

—— خدا انہیں اپنی رحمت سے نوازدے۔

# مشاہیر کی محسن کتابیں

- حبیب الرحمٰن خاں شروانی
- سید سلیمان ندوی
- عبد الماجد دریا بادی
- عبید اللہ سندھی
- مناظر احسن گیلانی
- میاں بشیر احمد
- بدر الدین علوی
- سید طلحہ
- سعید احمد اکبر آبادی
- سید نواب علی
- اعزاز علی (دیوبند)
- شاہ حلیم عطا
- عبد العزیز میمن
- عبد السلام ندوی
- خواجہ غلام السیدین
- ابو الحسن علی ندوی

۴۰ سال کے قریب ہوئے ماہنامہ الندوہ (لکھنؤ) کی عہد جدید کی چند اشاعتوں میں ایک سلسلہ مضامین 'مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں' کے عنوان سے مسلسل چھپا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں محمد عمران خان ندوی نے اس پورے سلسلہ کو سید ابوالحسن ندوی صاحب کے ایک مضمون کے اضافہ کے ساتھ اس نام سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔ آئندہ صفحات میں ان سارے مضامین میں ہر مضمون نگار نے جن کتابوں کا تذکرہ کیا ہے وہ سب یکے بعد دیگرے نقل کیا جارہا ہے۔

امید ہے مشاہیر کا یہ انتخاب دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ آئندہ ممکن ہوا تو اس کا دائرہ وسیع تر کیا جاسکے گا۔

# مشاہیر کی محسن کتابیں

(۱) حبیب الرحمٰن خاں شیروانی: اُردوئے معلّٰی، عودِ ہندی (غالب) آبِ حیات، صیلۃ الکبریٰ (آزاد)، المامون، الفاروق، سیرۃ النعمان، شعر العجم (شبلی)، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (شبلی)۔

کنز العمال، مقالات الاسلامیین (اشعری)، بستان المحدثین (شاہ عبدالعزیز)، ازالۃ الخفا (شاہ ولی اللہ)، تذکرۃ الحفاظ (ذہبی)، طبقات (ابن سعد)، معارف (ابن قتیبہ)، مقدمہ شرح بخاری (ابن حجر عسقلانی) وفیات (ابن خلکان) —

حالاتِ مرزا مظہر (شاہ غلام علی)، حالات شاہ غلام علی (شاہ عبدالغنی)، فوائد الفواد (حسن دہلوی)، سلسلۃ العارفین۔

(۲) سید سلیمان ندوی: شبلی کی تصانیف، تقویت الایمان (شاہ اسمٰعیل شہید) عجالۂ نافعہ (شاہ عبدالعزیز)، بستان المحدثین (شاہ عبدالعزیز)، تذکرۃ الحفاظ (ذہبی)، مقدمہ فتح الباری (ابن حجر) وفیات (ابن خلکان)۔

الفہرست (ابن ندیم)، کشف الظنون (حاجی خلیفہ)، دلائل الاعجاز (جرجانی)، حماسہ، نقد الشعر، ملل و نحل (شہرستانی)، الملل و النحل (ابن حزم)، کشف الادلہ (ابن رشد)، حجۃ اللہ البالغہ (شاہ ولی اللہ)؛ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابیں۔

(۳) عبدالماجد دریابادی: مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں، گلستاں، بوستاں، رقعاتِ قتیل، یوسف زلیخا، کیمیائے سعادت۔

ترکِ اسلام (ثناء اللہ امرتسری)، سرمۂ چشم آریہ (مرزا غلام احمد قادیانی)، نور الدین (حکیم نور الدین)، ماہ نامہ تحفۂ محمدیہ (محمد علی مونگیری)، الاسلام و تاریخ الاسلام (احسان اللہ عباسی)، شرر و منشی سجاد حسین کی تصانیف، الکلام و مقالاتِ شبلی، رسالہ الندوہ، مسز بیسنٹ اور ڈاکٹر بھگوان داس کی کتابیں، بھاگوت گیتا کا ترجمہ، سیرۃ النبی جلد اوّل۔

اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی اور مولانا محمد علی کا خاموش اثر۔

مثنوی معنوی مع مولانا امداد اللہ مہاجر مکی کے حاشیوں کے، مولانا محمد علی لاہوری کا ترجمۂ قرآن، محمد علی کی نظمیں، اقبال کی نظمیں، مکتوبات مجددی، عطار، جامی، شیخ جیلانی، غزالی، سہروردی کی تصانیف؛ لیکن سب سے گہرا نقش مثنوی کا تھا اور مکتوبات کا۔ Islam on the Cross Roads by Md. Asad مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف، صحیح بخاری اور فتح الباری، مفردات القرآن، تاج العروس، لسان العرب۔

(۴) عبید اللہ سندھی: تحفۃ الہند (عبید اللہ)، تقویت الایمان از اسمٰعیل شہیدؒ، قبلہ نما (قاسم نانوتوی)، حجۃ اللہ البالغہ، الفوز الکبیر، فتح الرحمٰن، البدور البازغۃ (شاہ ولی اللہ)، عبقات (مولانا شہید)، تکمیل الاذہان (رفیع الدین) سطعات۔ (شاہ ولی اللہ دہلوی)

تفہیمات الٰہیہ، ازالۃ الخفا (شاہ ولی اللہ)، احکام القرآن (ابوبکر رازی)، علم الہیئت (ایاس برنی)۔

(۵) مناظر احسن گیلانی: ۔ تفسیر کبیر؛ الہلال (مولانا آزاد)، احیاء العلوم (غزالی)، تصانیف شاہ ولی اللہ، تصانیف ابن عربی، عبقات (اسمٰعیل شہید)، مکتوبات شرف الدین یحییٰ منیری، میزان الکبریٰ (وہاب شعرانی)، تذکرہ اعظم (مفتی عبد اللطیف)، اقبال کا کلام، محمد علی کا کلام، مولانا تھانوی کی تصانیف، مولانا جامی کی غزلیں، رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری)

(۶) میاں بشیر احمد: الفاروق؛ محمد (کارلائل)، دیوان حافظ، لے مزارابل Les Misérables (ہوگو) Balluana (دنیا کے بڑے مفکرین)

(۷) بدر الدین علوی: اسمٰعیل میرٹھی کی ریڈریں، شمس التواریخ چار حصے، شاہ عبد القادر کا ترجمۂ قرآن مع تفسیر ابن عباس، سفرنامہ بلاد اسلامیہ از عبد الرحمٰن امرتسری، اصول عجیبہ، رسالۃ الفرائض، لٹریری ہسٹری (نکلسن)، عربین پوئٹری (لائل)، مفضلیات: مقدمہ (لائل)، عربین پوئٹری (کلارسٹن)، عربک لٹریچر (ہوارٹ)

تفسیر خازن، حاشیہ جمل، فتح الباری، عمدۃ القاری، اللمعات، مرقات المفاتیح، تہذیب التہذیب، فتح القدیر، عینی، عنایۃ، قاموس، امالی (قالی)، الکامل، اخبار الاخیار، اصول المقصود۔

(۸) سید طٰہٰ (اورنٹیل کالج لاہور): کتاب العمدہ (ابن رشیق)، الکتاب (سیبویہ)، مقامات حریری، جاحظ، اغانی، الامامہ والسیاسہ (ابن قتیبہ)، نہج البلاغہ، حماسہ، قصائد متنبی، المظہر (سیوطی)، کامل (مبرد)، فتح الباری، موطا، بخاری، مسند ابن حنبل، زاد المعاد، الاکلیل فی استنباط التنزیل (سیوطی)، تفسیر احمدی، تفسیر ابن عربی، احکام القرآن (جصاص)، مفتاح العلوم (سکاکی)، الطراز، دلائل الاعجاز، احیاء العلوم، مثنوی روم، رسالہ قشیریہ، عوارف المعارف، فتوح الغیب، مکتوبات مجدد، تفرقہ بین الاسلام والزندقہ (غزالی) حجۃ اللہ، صدری، شرح مواقف، شمس بازغہ، تحریر ابن ہمام، توضیح وتلویح، ابن تیمیہ کی تصانیف، شفاء العلیل (ابن قیم)، ابن خلدون۔

آب حیات، گلشن بیخار، گل رعنا، مقدمہ حالی، شعر العجم

(۹) سعید احمد اکبر آبادی: کامل (مبرد)، اغانی، نہایۃ الادب، صبح الاعشیٰ، البیان التبیین (جاحظ) حماسہ، مقاصد الفلاسفہ وتہافۃ الفلاسفہ (غزالی)، ابن سینا کی اشارات (امام رازی طوسی کی شرحوں کی مدد سے)؛ سقط الزند، لزوم مالایلزم (معری)، دیوان حسان بن ثابت۔

شبلی وسید سلیمان ندوی کی تصانیف خاص کر المامون، الغزالی، الفاروق، سیرۃ النبیؐ جلد اول (شبلی)، ارض القرآن، سیرۃ عائشہؓ، امام مالک، رسالہ معارف (سید سلیمان)، رسالہ زمانہ "رسالہ جامعہ" اور رسالہ "اردو"۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابیں۔

انقلاب فرانس (برک)، مقالات میکالے، اسپرٹ آف اسلام (امیر علی) دیوان حافظ، دیوان غالب۔

(۱۰) سید نواب علی: شاہ عبدالقادر کا ترجمۂ قرآن، کیمیائے سعادت، احیاء العلوم، المنقذ من الضلال، تذکرۃ الاولیاء (عطار)، مثنوی روم، فتوح الغیب، تفسیر سرسید، خطبات احمدیہ، اسپرٹ آف اسلام (امیر علی) _______ اور

امیر علی کی History of the Saracen

اور آرنلڈ کی Preaching of Islam

امام الغزالی، رسائل شبلی، تفسیر کبیر، تفسیر خازن، ابن کثیر، بیضاوی، تفسیر ابن جریر، طبقات ابن سعد، اصابہ، میزان الاعتدال، تفسیر جامی، مجمع البیان، صحیحین، کافی۔

(۱۱) اعزاز علی دیوبند: گلستاں، سکندر نامہ، بیضاوی، نور الانوار،

مقامات حریری، مفصل (زمخشری)، اوضح المسالک، شرح الفیہ (ابن عقیل) سیبویہ، تاریخ یمینی، کلام امراء القیس، سقط الزند (معری) دلائل الاعجاز، مطول، مختار الصحاح، منتہی الادب، لسان العرب مجلہ عدلیہ، الحج الواضحہ فی البینات الراجحہ، شرح وقایہ، شرح نقایہ (ملا علی قاری) ریاض الصالحین (نودی) تصانیف غزالی۔

(۱۲) شاہ حلیم عطا صاحب : تفسیر فتح العزیز، بخاری، الدین الخالص (صدیق حسن خاں) فتح الباری، مزہر (سیوطی) فقہ اللغہ (ثعالبی)، اذکار (نودی) التبیان فی آداب حملۃ القرآن، ریاض الصالحین (نودی) تلبیس ابلیس اور صفۃ الصفوہ (ابن جوزی)، الواسطہ بین الخلق والحق (ابن تیمیہ)، زاد المعاد (ابن قیم)، الاسماء والصفات (بیہقی)، قیام اللیل (محمد بن نصر مروزی)، صحیحین، موطا، شرح مسلم (نودی)، شفاء العلیل، (ابن قیم)، الغایۃ الامانی ——— (آلوسی زاد) الملل والنحل اور ابن حزم کی دوسری تصانیف۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن رجب، ابن الہادی، ابن حجر عسقلانی، محمد ابن ابراہیم وزیر یمانی، محمد بن اسماعیل امیر یمانی، محمد بن علی شوکانی، صدیق حسن خاں کی تصانیف۔

منہاج السنہ، الجواب الصحیح عن بدل دین المسیح، ابن تیمیہ کی اہم ترین کتاب المجموعۃ الرسائل اور ابن قیم کی زاد المعاد، تفاسیر یہ ابن کثیر اور کتب تواریخ میں البدایۃ والنہایۃ۔

(۱۳) عبدالعزیز میمن (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) : مفصل، کتاب سیبویہ، معلقات، دیوان متنبی، حماسہ، جمہرۃ اشعار العرب، مفضلیات، مقامات، سقط الزند، دیوان ابوالعتاہیہ، خزانۃ الادب، حماسہ (ابوتمام) حماسہ (البحتری)، وحشیات (ابوتمام)، حماسۃ الخالدین، حماسۃ لہ حماسۃ مغربیہ۔

قراضۃ الذہب (ابن رشیق)، رسالۃ الانکار (ابن شرف)، شرح المختار من اشعار بشار العمدہ (ابن رشیق)، الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء (مرزبانی)، آمالی، کامل (مبرد) ادب الکاتب کتاب البیان والتبیین، امالی (ابوعلی القالی)

(۱۴) عبدالسلام ندوی : آمدنامہ، صفوۃ المصادر، کریما، مامقیماں، اللہ خدا بوستاں، گلستاں، اخلاق محسنی۔

شبنم شاداب، دیوان غنی، دیوان ہلالی، انوارِ سہیلی، سکندر نامہ، بہارِ دانش، مینا بازار۔
میزان، منشعب، زبدہ، پنج گنج، صرفِ میر، نحوِ میر، ہدایت النحو، قال اقول، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، شرح تہذیب، شرح مطالع، ملا جلال، حجۃ اللہ، امور عامہ، حواشی مولانا عبد الحی فرنگی محلی، کافیہ، شرح جامی، قدوری، قطبی، میر قطبی، شرح وقایہ، میبذی، نور الانوار، ہدیہ سعیدیہ، ملا حسن، میر زاہد۔
گلدستۂ پیام یار، گلدستۂ پیام عاشق، گلدستۂ دامن گلچیں۔
الفاروق (شبلی)، مقدمہ شعر و شاعری، حیات سعدی، یادگار غالب (حالی)، حکیم محمد علی کے ناول، محمد حسین آزاد کے مضامین، عبد الماجد دریا بادی کی فلسفۂ اجتماع، فلسفۂ جذبات، تاریخ اخلاق یورپ۔
تفسیر کبیر (رازی)، شرح حکمت العین، شرح حکمت الاشراق، توضیح تلویح، ہدایہ، حماسہ، سبعہ معلقہ، متنبی، نقد الشعر، دلائل الاعجاز، قاضی مبارک، صدری، صحیح بخاری۔

(۱۵) **خواجہ غلام السیدین:** ترجمان القرآن (ابو الکلام آزاد)، مواعظ حسنہ (عبد العلی حربی) اقبال کا کلام، مسدس حالی، مراثی انیس، پریم چند کے ناول اور افسانے، حالی کی حیات جاوید، سرشار کا فسانۂ آزاد، فرحت اللہ بیگ کے مضامین، ٹیگور کی بعض ادبی اور قومی تصانیف، عبد الرحمٰن بجنوری کا مقدمۂ دیوان غالب۔

مغربی مصنفوں میں ڈکنس، گوئٹے، رسل، برنارڈ شا، ایچ۔ جی۔ ویلز، اناطول فرانس، رومارولاں، اپٹن سنکلر۔

(۱۶) **ابو الحسن علی ندوی:** منظوم فتوح الشام (عبد الرزاق کلامی)، مسدس حالی، رحمۃ للعالمین (قاضی سلمان منصور پوری)، الفاروق (شبلی)، آبِ حیات (محمد حسین آزاد)، گل رعنا (عبد الحی)، نیرنگ خیال (محمد حسین آزاد)، حالی، نذیر احمد، شرر اور رتن ناتھ سرشار کی چند کتابیں، یاد ایام (عبد الحی)، معرکۂ مذہب و سائنس (ڈریپر، مترجمہ: ظفر علی خاں)۔ مولانا حبیب الرحمن، شیخ تقی الدین ہلالی المراکشی، حبیب الرحمن خاں شیروانی، ڈاکٹر حکیم سید عبد العلی، اقبال، مولانا الیاس کاندھلوی، مولانا احمد علی کی تحریریں رسالۃ القریری (ابو الحسن علی القریری)، النظرات (منفلوطی)، شرح امام نودی، ابو داؤد کی الادعیہ زمخشری کی الزہد والرقائق، غزالی کی احیاء العلوم، الامامۃ و السیاسۃ (ابن قتیبہ) کلیلہ و دمنہ، مقفع

کتاب الاغانی (ابوالفرج اصفہانی)، جاحظ کے رسائل امیر شکیب ارسلان کی تحریریں، عبدالرحمن الکواکبی کی ام القریٰ، محی الدین قصوری کا سلسلہ مضامین سید احمد شہید کے بارے میں (رسالہ "توحید" امرتسر مرتبہ مولانا داؤد غزنوی ۲۷ - ۲۹)، زاد المعاد (ابن قیم)۔

محمد بن نصر مروزی کی قیام اللیل، ابن تیمیہ کی تفسیر سورۂ نور، ابن قیم کی الجواب الکافی، صاحب ہدایہ کے ایک شاگرد کی کتاب "تعلیم المتعلم"۔ والد مرحوم کی ارمغان احباب، مولانا محمد علی مونگیری کی ارشاد رحمانی، فوائد الفواد (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء)، دار المعارف (شاہ غلام علی) تلبیس ابلیس۔

عبدالماجد دریا بادی کا "سچ"۔ ابوالاعلیٰ مودودی کا "ترجمان القرآن" "تنقیحات" اسلام ایٹ دی کراس روڈ (Islam at the Cross Roads) از محمد اسد۔

احمد امین کی فجر الاسلام جلد اوّل، ضحی الاسلام تین جلدیں، مولانا ابوالکلام کا تذکرہ، البلاغ اور ترجمان القرآن کی دوسری جلد، سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس۔ سرسید کے تہذیب الاخلاق کے فائل، حیات جاوید (حالی)، وقار حیات (اکرام اللہ خاں ندوی)، سید طفیل احمد کی حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل۔

نزہت الخواطر (عبدالحی)، اقبال کا کلام، مذہب و عقلیات (عبدالباری ندوی)، ابن تیمیہ کی سورۂ اخلاص اور کتاب النبوات کے اشارات، شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات، شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفا، حجۃ اللہ البالغہ اور الفوز الکبیر، شاہ اسمٰعیل شہید کی منصب امامت۔

سید احمد شہید کے ملفوظات کا مجموعہ، صراط المستقیم (مرتبہ شاہ اسمٰعیل شہید)

●●

محمد عمران خان
خانہ امیر گنج ٹونک

# خدا بخش لائبریری کے چند اہم اور نادر مخطوطات

(۱)

## فاکہۃ البستان:-

اس کے مصنف مولانا محمد ہاشم بن عبدالغفور التتوی ہیں جو علماء سندھ میں ٹھٹھہ کے مشہور عالم
ہیں۔ مزید تصانیف کے مالک ہیں۔ اس کتاب میں فقہ کے اہم ذخیرے کو سامنے رکھتے ہوئے جانوروں
ت و حرمت سے بحث کی گئی ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو کچھ انہیں حاصل ہو سکا ہے وہ تمام معلومات
جمع کر دی گئی ہیں۔ اس طرح کتاب کا ایک حصہ ذبح کے مسائل پر مشتمل ہے اور نہایت جامع حصہ ہے۔
ن کے سلسلے میں جہاں سے حصہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک ایک جانور کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے سیر حاصل
کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ایک نادر نسخہ ہمارے ذاتی کتب خانہ (کتب خانہ عرفانیہ ٹونک) میں بھی موجود ہے اور
چھا نسخہ ہے۔ اسے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا ارادہ بھی ہے۔ لیکن خدا بخش لائبریری کا نسخہ دیکھ کر
سرت ہوئی کہ یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا لکھا ہوا ہے اور یہاں کے اندراج کے مطابق مصنف کا خود نوشت
۱۱۲۸ھ میں اس کی تصنیف شروع ہوئی اور ۳ رجب ۱۱۳۲ھ کو اس کی تکمیل ہوئی۔ کتابت کے بعد یہ
صاحب کی ملکیت میں آ گیا جو مصنف سے تعلق میں بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ جن صاحب
ت میں پہنچا تھا، ان کی مہر ثبت تھی لیکن افسوس مہر محو کر دی گئی ہے البتہ اس پر جو نوٹ
ہے وہ صاف ہے۔ "قد تشرف بتملکہ صاحب الخاتم"
کے بعد یہ عبارت ہے:

"الجزء الاول من فاکہۃ البستان تصنیف الفاضل والمحقق العالم الفاضل
العارف الکامل المجود المتقی المحدث الفقیہ محمد الہاشم السندی البتوری"

مولدًا والتتوی مسکنا، سلمه المحیی الحی الذی لایموت ابدًا۔"

کتاب کے شروع میں تفصیلی فہرست شامل ہے۔ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے: "سبحانك لاعلم لنا الا ما علمتنا" الخ۔ پھر لکھتے ہیں:

" امابعد فیقول الافقر الراجی الی رحمة رب البلاد، قلیل البضاعة والزاد محمد الهاشم بن عبد الغفور التتوی اقامة البتور اقتی من حیث الولاد، ان هذه نبذة" الخ

اختتام جو مصنف کے ترقیمے کی حیثیت بھی رکھتا ہے، وہ اس طرح ہے:

" تمت الرسالة المسماة بفاکهة البستان بید مؤلفه الفقیر الحقیر محمد هاشم بن عبد الغفور رحمهما ربهما انه غفور شکور وغفر الله لکاتبه ولمن معه والدیهما ولجمیع المومنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات آمین یارب العالمین۔ قد تم هذه الرسالة الشریفة۔ یوم الاثنین من شهر رجب فی تاریخ ثالث منها اثنان وثلاثون ومائة والف۔"

یہ نسخہ ۲۵۷ اوراق پر مشتمل ہے۔

جانوروں اور اُن کی خصوصیات کے سلسلہ میں علامہ الدمیری کی کتاب "حیوٰۃ الحیوان" بہت مشہور ہے اور متعدد بار طبع بھی ہو چکی ہے۔ اس کتاب سے بھی فاکہۃ البستان میں بہت استفادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ ذکر غیر مفید نہیں ہوگا کہ حیوٰۃ الحیوان کا اُردو ترجمہ غالبًا اب تک نہیں ہوا ہے یا نہیں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ ہمارے نسبی جد امجد مولوی فضل الحق صاحب ٹونکی خطیب جامع مسجد متوفی ۱۳۴۴ھ نے کیا ہے، جو دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور مترجم کے قلم سے ان کا اصل مسودہ ہے۔ امتداد زمانہ کے مطابق زبان میں کافی فرق ہے لیکن اسے بآسانی جدید زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

(۲)

مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی کی ایک تصنیف "التحفة الوزیریة فی المسائل النحویة" کا نسخہ دیکھنے میں آیا۔ مولانا کی تصانیف میں شاید اس کا ذکر ہو۔ لیکن یہاں اس لائبریری میں اس کا نسخہ دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا عبد الحق صاحب خیر آبادی المتوفی ۱۳۱۶ھ خلیفہ والد بزرگوار

ولانا فضل حق صاحب خیرآبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ کی طرح ٹونک کے رئیسوں سے بھی متعلق رہے ہیں۔ بلکہ غدر کی
باہی کے بعد دو سال ان کا قیام ٹونک میں رہا ہے۔ غالباً اسی زمانۂ قیام میں آپ نے یہ کتاب تصنیف کی اور
سے نواب وزیرالدولہ جانشین نواب امیرالدولہ بہادر (۱۲۵۰ھ / ۱۸۳۴ء تا ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء) کے نام پر معنون کیا
ور اسی مناسبت سے اس کا نام "التحفۃ الوزیریہ فی المسائل النحویہ" رکھا۔ کتاب کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:

"یا مالک یوم الدین إیاک نعبد و ایاک نستعین ونصلی علی رسولک" الخ

وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وبعد فیقول العبد الفقیر الی اللہ الغنی الهادی محمد عبدالحق خیرآبادی اعاذہ اللہ عن ظلمات الجهل وهداہ الی نور العلم والفضل: انی مع قصور باعی فی البراعة وخیبة قدحی فی الصناعة وتراکم افواج الهموم علیّ، وتلاطم امواج الغموم لدیّ، حررت رسالة فی علم النحو وجعلتها تحفة للجناب المقدس المشتهر فی العرب والعجم، صاحب السیف والقلم، الواصل الی اخص معارج الشوکة والحشمة، البالغ اقصی مدارج الجلالة والعظمة، اعنی النواب وزیرالدولة امیرالملک محمد وزیرخان بهادر نصرت جنگ لا زالت اعلام علمه رافعة ورأیات دولته ناصبة، وسمیتها "بالتحفة الوزیریه فی المسائل النحویه" واللہ الموفق للصدق والصواب وبه الاعتصام فی کل باب، وها انا اشرع فی المرام لغایة الملک العلام ـ الکلمة دال علی معنی مفرد بالوضع، وینقسم" الخ

کتاب کا اختتام اس طرح ہے:

"هذا آخر بحث الحروف وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقه محمد وآله واصحابه بعد کل لمح وطرف"

ابتدائی حصہ میں اور درمیان میں متعدد حواشی بھی پائے جاتے ہیں۔ ان حواشی سے اور اصل متن
کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ اور اس کے منہیات خود مصنف کتاب کے قلم سے ہیں۔ کتاب پر گو کوئی ترقیمہ
نسخ نہیں لیکن ٹونک دارالعلوم میں مولانا کی کئی تحریرات نواب صاحب کے نام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، طرز کتابت
در خط کی ہم آہنگی بھی اس پر دلالت کرتی ہے۔ حواشی کے ساتھ "منہ عفی عنہ" کی کشش اور طرز خصوصیت سے

اس کا ثبوت ہیں۔ حافظ اعظم

## (۳)

خدا بخش لائبریری کے ذخیرہ میں ایک کتاب "تذکرہ فی سفر آگرہ" مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ کتاب بھی ٹونک سے متعلق ہے۔ نواب وزیر الدولہ کے بیٹے صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب نے ابتدائی عمر میں اسے ترتیب دیا ہے۔ جب کہ انہیں اپنے والد صاحب کے ساتھ آگرہ کا سفر کرنے کا موقع ملا۔ ۱۲۸۰ھ میں لارڈ کیننگ جب ڈھاکہ اور بنگالہ کی مہم سے واپس آ رہے تھے اُس وقت آگرہ میں رؤسا کا ایک اجلاس ہوا جس میں دوسرے رؤسا کے ساتھ نواب وزیرالدولہ والی ریاست ٹونک نے بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شرکت کی اور نواب صاحب کے فرمانے کے مطابق صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب نے یہ سفرنامہ بڑے اہتمام سے ترتیب دیا۔ زبان نہایت صاف و شستہ اور فارسی ادبیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ساتھ ساتھ اشعار اور نظموں کی چاشنی بھی ہے سفر کی روداد کے ساتھ درمیان کی منزلوں کی بھی کافی تفصیلات ہیں۔ چنانچہ بیانہ، کروائی، فتح پور سیکری اور بالآخر آگرہ کی کافی تفصیلات اس سفرنامہ میں ملتی ہیں۔ پھر جن رئیسوں نے شرکت کی اُن میں خاص خاص ریاستوں کے کچھ تاریخی حالات ہیں۔ ۱۲۸۰ھ میں اس سفرنامہ کی تکمیل ہوئی۔ آخر میں کچھ تاریخی قطعات بھی ہیں جن میں ایک قطعۂ تاریخ، مولوی الٰہی بخش صاحب نازش خیرآبادی المتوفی ۱۲۸۶ھ کا بھی ہے۔ اس نسخہ کے کاتب حافظ عزیز الرحمٰن صاحب ٹونکی ہیں جو ٹونک کے مشہور خوش نویس گذرے ہیں اور اُستاد اصغر علی آبرو کے شاگردوں میں تھے۔ کتابت کا سال بھی یہی ہے۔ یہ نسخہ ۳۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ٹونک میں بھی اس سفرنامے کے کئی نسخے تھے لیکن افسوس آہستہ آہستہ سب ضائع ہو گئے۔ صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب کے پسر نائب المریاست صاحبزادہ عبیداللہ خاں صاحب کے کتب خانہ میں بھی اس کا نسخہ تھا، معلوم نہیں وہ کیا ہوا۔ اس سفرنامہ کا ایک نسخہ مرحوم حافظ محمود خاں شیرانی کے ذخیرہ کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانہ میں داخل ہو گیا، جو وہاں محفوظ ہے اور ذخیرۂ شیرانی کے مخطوطات کی جو فہرست وہاں سے شائع ہوئی ہے اُس میں اس نسخہ کی بھی کچھ تفصیلات ہیں۔ اسی طرح اُس میں صاحبزادہ عبداللہ خاں صاحب کی ایک دوسری تصنیف کا بھی نسخہ ہے اور اُس کی کچھ تفصیلات بھی اس فہرست سے معلوم ہوتی ہیں۔

ابتدا: الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام ...... اما بعد میگوید مخفی عباد خدا عبداللہ خان غفراللہ ذنوبہ ... وتام این رسالہ "تذکرہ فی سفر آگرہ" نہادم۔ شعر

نشد مرتب این رسالہ دلپسند ٭ در ہزار و دو صد و ہفتاد و ہفت الخ

اس رسالہ کا نمبر ۲۵۱۸ ہے اور ۲۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۴)

**طبقات المفسرین :** للعلامہ شمس الدین محمد بن علی بن احمد الداؤدی المالکی تلمیذ الحافظ عبد الرحمن جلال الدین السیوطی (سلسلہ نمبر ۲۳۹۰ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری) ۱۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ حروف کی ترتیب پر مفسرین کے حالات لکھے ہیں۔ صاحب ایجاز البیان کے لئے لکھتے ہیں :

" محمود بن ابی الحسین النیشاپوری الغزنوی الملقب بیان الحق قال یاقوت کان عالماً بارعاً مفسراً لغویاً فقیہاً متقناً فصیحاً، لہ تصانیف ادعی فیہا الاعجاز، منہا خلق الانسان، جمل الغرائب فی تفسیر الحدیث، ایجاز البیان فی معنی القرآن وغیر ذلک۔ ومن شعرہ۔

فلا تحقرن خلقاً من الناس علۃ ٭ ولی الہ العالمین وما تدری
فذ والقدر عند اللہ خاف عن الوری ٭ کما خفیت من علمہم لیلۃ القدر" (ورق ۱۱۶ و ۱۱۷)

کسی صاحب نے ناقلی نمبر ڈال رکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں ۱۳۴ مفسرین کے حالات ہیں۔ شاید کسی نے ابھی یہ کام کیا ہو۔ کتاب کے آخری ورق پر یوسف بن قزغلی کے نام پر ایک حاشیہ رشاد بن عبد المطلب مصری کے قلم سے اس طرح درج ہے کہ :

" الصواب قزاؤغلی ومعناہ بالترکیۃ ابن البنت اَی السبط۔ وہٰذا معنی قولہ سبط ابن الجوزی"

رشاد بن عبد المطلب عرب لیگ کی جانب سے مصر سے ۱۹۵۲ء میں ایک وفد کی شکل میں ہندوستان آئے تھے اور اس وقت مولانا آزاد کی معرفت ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے نادر کتابوں کی فوٹو گرافیاں جن کا انتظام وہ خود کر کے آئے تھے، لی تھیں۔ ٹونک کے کتب خانہ سے بھی کافی کتابیں اسی طرح حاصل کیں اور کئی روز ٹونک میں قیام رہا۔ اس زمانہ میں مولانا رشاد جب یہاں آئے ہوں گے اس وقت اس پر یہ نوٹ دیا ہوگا۔ اس نسخہ کے کاتب قاسم علی حیدرآبادی ہیں اور ۲۹ شعبان ۱۲۹۲ھ اس کی تاریخ کتابت ہے۔ غالباً کسی نادر نسخہ سے نقل کر لیا ہوا نسخہ ہے جو جدول شنجرفی، لوح کتاب قدرے طلائی و مینا کار ہے۔

(۵)

یہاں ایک تاریخ ہجرت پور فارسی کا نسخہ بھی دیکھنے میں آیا۔ یہ مختصر تاریخ ہے۔ اس میں راجہ درجن سال ملک ہجرت پور اور انگریزوں کے درمیان جو نزاع ہوا ہے اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کے مرتب انند لال سے

کا مستوفی ہیں جو ۱۲۴۰ھ میں بھرت پور سے متعلق تھے۔ ادیب آدمی معلوم ہوتا ہے، فارسی بہت اچھی اور ادیبانہ ہے۔ ۴۴ اوراق پر مشتمل ہے۔ پیش نظر نسخہ کے کاتب کوئی قادر بخش ہیں اور ۱۲۴۷ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔ مکمل نسخہ ہے۔

ابتدا: "حمد بے حد قدیم و صادق است مستدیم کہ حکومت بالغہ قادر کارساز تعالی الخ

پھر لکھتے ہیں: "بندۂ خاکسار، ذرۂ بیمقدار اننداری مدت سنہ یکہزار دو صد چہل بیاوری بخت بیدار، سعادت" الخ

اختتام: "والحمد للہ والمنۃ کہ این تازہ حکایت بعین عنایت آن سرو گلستان امارت بہ ضبط کتابت در آمد و در عرصہ یک ہفتہ باتمام رسید۔ بیت:

از بزرگان دعا طمع دارم ٭ زانکہ من بندۂ گنہگارم"

بھرت پور کی تاریخیں عام طور پر ملتی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے نسخہ نادر اور اچھا ہے۔

(۶)

یہاں "آئین نامہ" مرتبہ منشی لبا دن لال شاداں کا قلمی نسخہ بھی دیکھنے میں آیا۔ ۱۲۵۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اسی سال نواب میر خان صاحب والی ٹونک کا انتقال ہوا ہے اور انہی کے حالات میں یہ کتاب ترتیب دی گئی تھی۔ ان کا طریقہ تھا کہ اپنی زندگی میں اس کے متعدد نسخے تیار کراتے رہتے اور مختلف متعلق حضرات اور رؤسا کو بھیجتے رہتے تھے۔ یہ نسخہ بھی اسی طرح کا تیار شدہ معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے مصور بھی کرانا چاہا ہے۔ جگہ جگہ مصوری کے لئے جگہ چھوڑی ہوئی ہے اور حاشیہ پر نوٹ ہے کہ یہاں کس کی تصویر بنائی جائے گی۔ یہ نسخہ ۱۴۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ عطاء اللہ نومسلم ساکن دہلی اس کے کاتب ہیں۔

(۷)

تفسیر واحدی کے بھی یہاں کئی نسخے دیکھنے میں آئے۔ علامہ واحدی پانچویں صدی کے مفسر ہیں انہوں نے تین تفسیریں لکھی ہیں۔ ایک نہایت طویل ہے۔ اس کا نسخہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ دوسری تفسیر بسیط ہے۔ اس کے نسخے ٹونک اور رامپور وغیرہ میں محفوظ ہیں۔ تیسری تفسیر، تفسیر وجیز ہے (یہ شاید کبھی طبع بھی ہوئی ہے)۔ اس کے دو نسخے اس لائبریری میں ہیں۔ ٹونک اور رام پور کے کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے محفوظ ہیں۔ تفسیر وسیط بھی ہے۔ یہاں اور ٹونک کا نسخہ قدرے محشی بھی ہے۔ یہاں ایک نسخہ تفسیر واحدی کے نام سے ہے اور ایک جلد ہے۔ شاید یہ تفسیر وسیط واحدی کی ہو۔

# غالب، یاس یگانہ اور حسرت عظیم آبادی

[ غلام رسول حسرت عظیم آبادی (ب ۱۲۴۳ھ) شاد عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۳۵۴ھ (۱۹۳۶ء) میں دیوان مرتب ہوا۔ اسی دیوان سے یہ دلچسپ ورق نقل کیا جا رہا ہے ]

غالب: شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا — اس تکلف سے کہ گویا بتکدہ کا در کھلا

یاس: واں نقاب اٹھی کہ صبحِ حشر کا منظر کھلا — یا کسی کے حسنِ عالمتاب کا دفتر کھلا

حسرت: چاک پھر سینہ کیا داغوں کا پھر منظر کھلا — درد پھر دل میں ہوا اور زخم کا پھر نشتر کھلا

غالب: منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

یاس: اشکِ خوں سے زرد چہرے پر ہے اک طرفہ بہار — دیکھیے رنگِ جنوں کیا میرے منہ پر کھلا

حسرت: اور رنگِ حسن دونا ہو گیا وقتِ عتاب — یہ نقابِ سرخ کتنا آپ کے منہ پر کھلا

غالب: گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب — آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

حسرت: قتلِ عاشق اس قدر منظور ہے اس شوخ کو — تیغ رکھتا ہے کمر میں، ہاتھ میں نشتر کھلا

یاس: بند آنکھیں ہو گئیں بیتاب ہو ہو کر گرے — سامنے پیاسوں کے کس نے رکھ دیا ساغر کھلا

حسرت: چشمِ میگوں دیکھ کر ساقی کی دل بیخود ہوا — میں نے یہ سمجھا کہ ہے رکھا ہوا ساغر کھلا

غالب: گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید — پر یہ کیا ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

حسرت: راز کی باتیں کہیں کب لاکھ گو پوچھا کیے — نامہ بر ہرگز نہیں تیرا پری پیکر کھلا

یاس: چپ لگی مجھ کو گناہِ عشق ثابت ہو گیا — رنگ چہرے کا اڑا، رازِ دلِ مضطر کھلا

حسرت: دکھ سہا گو لاکھ لیکن رنگِ رخ بدلا نہیں — مرتے مرتے بھی نہیں رازِ دلِ مضطر کھلا

غالب: بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا — رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

حسرت: پھر امنڈ آئی ہماری چشمِ تر یادش بخیر — آج پھر یا رب درِ گنجینۂ گوہر کھلا

غالب: کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول — آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

حسرت : کٹ گیا دن ہجر کا خوشیاں مناؤ مژدہ دو
شب ہوئی وہ چاند نکلا دیدۂ اختر کھلا

یاس : خنجر قاتل سے جنت کی ہوا آنے لگی
اور بہار زخم سے فردوس کا منظر کھلا

حسرت : فصل گل آئی ادھر، صحن چمن رنگیں ہوا
داغ دل سے اس طرف فردوس کا منظر کھلا

غالب : در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

حسرت : ضعف ہو تیرا برا، اس در پہ میں جانے کو تھا
وائے ناکامی مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

یاس : نیم جاں چھوڑا تری تلوار نے اچھا کیا
ایڑیاں بسمل نے رگڑ دیں صبر کا جوہر کھلا

حسرت : اس حسیں کو یاد آتی ہیں وفائیں اب مری
خاک ہو جانے پہ میرے صبر کا جوہر کھلا

یاس : صحبت واعظ میں بھی انگڑائیاں آنے لگیں
راز اپنی میکشی کا کیا کہیں کیونکر کھلا

حسرت : داغ ہائے دل کو رکھا سات پردوں میں نہاں
راز الفت کا تمہاری غیر پہ کیونکر کھلا

غالب : اسکی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

یاس : ہاتھ الجھا اب گریباں میں تو گھبراؤ نہ یاس
بیڑیاں کیونکر کٹیں زنداں کا در کیونکر کھلا

حسرت : قدسیوں میں ہوگا پھر کیونکر نہیں اس کا شمار
جس پہ اے حسرت کرامات ساقی کوثر کھلا

(فسانۂ محبت معروف بہ دیوان حسرت
صفحہ ۳۸۳ - ۸۴

وسیم احمد اعظمی
ریسرچ یونیٹ (یونانی)
(سی سی آر یو ایم)
خدا بخش لائبریری پٹنہ

# تصحیح و اضافہ

## (۱)

# زبدۃ الطب

مفتاح الکنوز، جلد ۳، نمبر ۳۲۸، پروگریس نمبر ۳۵۶

اصل کتاب کے آغاز سے قبل تین اضافی تحریریں ملتی ہیں۔ اول الذکر دونوں تحریریں زبدۃ الطب کے بارے میں مصنف، سن تالیف، و سن کتابت سے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں۔ آخرالذکر تحریر کتاب کی شیرازہ بندی سے متعلق ہے۔ اضافی تحریر ۱ کے راقم ابوالقاسم ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"این کتاب 'زبدۃ الطب' از ابتدا تا شروع کتاب معالجات جزویہ، تصنیف سید اسمٰعیل جرجانی است کہ برای سلطان علاء الدین تکش خوارزم شاہ تصنیف نمودہ۔ و معالجات جزویہ تصنیف ابوالحسن مختار بن حسن مشہور بہ ابن بطلان است، نامش 'تقویم الصحۃ' است کہ سید مذکور با کتاب خود تضمین ساختہ۔ تصنیف 'تقویم الصحۃ' در سن ۴۴۰ چہارصد و چہل ہجری و تصنیف سید بالا، در سن ۵۰۹ پانصد و نو ہجری است"

اضافی تحریر ۲، اضافی تحریر ۱ کے بعد کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ راقم الحروف کا نام مذکور نہیں ہے۔ اس کی عبارت اس طرح ہے:

"این کتاب ہفتاد سال بعد تقریباً بعد از تصنیف نوشتہ شدہ، مصنفش تا آخر معالجات کلیہ سید اسمٰعیل جرجانی مصنف کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی است۔ و مصنف معالجات جزویہ است ابن بطلان نصرانی صاحب کتاب تقویم الابدان"

فہرست ساز خدا بخش لائبریری نے عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز، جلد سوم صفحہ الف میں، اس جلد میں شامل نوادر کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے اس نسخہ کے بارے میں لکھا ہے:

"زبدۃ الطب در فن طب است، مؤلفہ سید اسمٰعیل الجرجانی این کتاب برای سلطان خوارزم در سال ۵۰۰ھ یعنی چہل سال بعد وفات مؤلف نقل شدہ بود"

اضافی تحریر ۱ کے مطابق 'زبدۃ الطب' کی تصنیف ۵۰۹ھ میں ہوئی اور یہ درست نہیں ہے کیونکہ جرجانی کا انتقال ۵۳۱ھ میں ہوگیا تھا۔ اسی طرح اضافی تحریر ۲ کے مطابق یہ نسخہ جرجانی کے

کے انتقال کے ۷۰ سال بعد نقل کیا گیا حالانکہ اسکی کتابت محمود السمنانی کے ہاتھوں ۶۷۰ھ میں ہوئی مزید اضافی تحریر ۲ سے پتہ چلتا ہے کہ معالجات جزویہ ابن بطلان کی تالیف ہے جو "تقویم الابدان" کا بھی مصنف ہے۔ حالانکہ "تقویم الابدان فی تدبیر الانسان" کا مؤلف ابن جزلہ ہے۔

فہرست ساز کے خیال میں یہ نسخہ ۶۷۰ھ میں مؤلف کے انتقال کے ۴۰ سال بعد سلطان خوارزم شاہ کے لئے نقل کیا گیا۔ جرجانی کے سن وفات ۵۳۱ھ کے حساب سے گویا یہ نسخہ انتقال کے تقریباً ایک سو انتالیس سال بعد لکھا گیا ــــــ ہمیں نفس مخطوطہ میں کہیں بھی اس طرح کے اشارات نہیں ملتے جو اضافی تحریر ۱ و ۲ نیز فہرست ساز کی تحقیق کی تصدیق کر سکیں ــــــ مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۳ جلد سوم میں ابن بطلان کو "بالسین" لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے مزید معالجات جزویہ کو اس سے منسوب کر دیا گیا ہے جب کہ مخطوطہ کے ابواب کی تقسیم اور اس کی عبارت کے مطابق یہ بھی جرجانی ہی کی تالیف ہے۔

اضافی تحریر ۱ معالجات جزویہ کو ابن بطلان کی تالیف تقویم الصحۃ قرار دیتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تقویم الصحۃ ابن بطلان کی تالیف ہے۔ سید اسمٰعیل جرجانی نے تقویم الصحۃ کو ذخیرۃ الطب میں شامل کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن اس نسخہ میں تقویم الصحۃ کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ "تقویم الصحۃ" کا ایک قلمی نسخہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے، جو بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں ادویہ کے مزاج اور افعال و خواص کا ذکر ہے اور یہاں کے نسخہ میں ادویہ سے متعلق مباحث شامل نہیں ہیں!!

●●

عابد رضا بیدار

(۲)

# ایک مخطوطہ، دو اندراج

۶۲۱۷-۱۸-۱۹ نمبر کی کتابیں گیا کے خلفر نواب صاحب کے تحفہ کے طور پر لائبریری کو ایک ساتھ ملیں۔ فی الحال بحث ۱۷، اور ۱۹ کے بارے میں ہے۔ قاسم صاحب ۱۹۶۳ء تک دونوں کرم زدہ اور بودہ حال میں پہنچی تھیں۔ پہلی ۶۲۱۷ کے بارے میں مزید یہ بھی بیان ہے کہ ناقابلِ مرمت ہے۔ ۶۲۱۷ پر جس کتاب 'حکایات الصالحین' کا اندراج تھا، وہ کسی مرحلے پر خارج کر دی گئی یا خود خارج ہو گئی اور اگلا اندراج کرنے والے نے اُسے physically دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس اگلے اندراج میں جو ۱۹۵۵ء میں ہوا! اوراق کی تعداد کا اندراج نہ پایا جانا اس خیال کی توثیق کرتا ہے۔

۶۲۱۹ مخطوطہ میں دو کتابیں شامل تھیں سکندر نامہ اور تحفۃ العراقین؛ مل کر ۱۰۸ ورق کا اندراج تھا۔ یعنی احمد صاحب کے مرتبہ رجسٹر کا معاملہ ہے۔ قاسم صاحب کے رجسٹر میں بھی یہ دونوں کتابیں درج ہیں۔ انہوں نے اتنا مزید کیا ہے کہ سکندر نامہ کے ۲۶ ورق اور تحفۃ العراقین کے ۸۲ ورق الگ الگ لکھ دیئے ہیں جو دونوں مل کر ۱۰۸ ہی ہو جاتے ہیں۔

وہ اوراق جنہیں ۶۲۱۷ نمبری اندراج میں 'ناقابلِ مرمت ٹھہرایا گیا تھا' اتنا کہ اس کے اوراق کی تعداد کے اندراج کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا ——— نہ اندراج اوّل کے موقع پر، نہ اندراج دوم پر، وہ کسی مرحلہ پر خارج ہو جانے کے باوجود عملی اخراج ریکارڈ پر نہ لائے جانے کے سبب جب تیسرے ہاتھ پر پہنچیں، تو اس پورے عمل کو نظر میں رکھ کے نتیجہ مرتب کرنے کے بجائے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ ایک چھلانگ کے بعد کے نمبر ۶۲۱۹ میں شامل ایک کتاب کو اس خارج شدہ نمبر پر لے آئیں۔ چنانچہ ۶۲۱۷ نمبر ڈال کر اسے کتاب نمبر ۶۲۴۳ ٹھہرا کے اصل اندراج 'حکایات الصالحین' کی جگہ 'قران السعدین' کر دیا گیا۔ سہولت پسندی کے تحت ۶۲۱۹ ایک نمبر سمجھ میں آیا۔ اس لئے ایک نمبر پر ایک کتاب کے اصول کے تحت بظاہر مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ مزید اطلاع سامنے تھی کہ ۶۲۱۹ پر تو دو آئٹم پہلے سے درج ہیں 'سکندر نامہ' اور 'قران السعدین' ——— تو دوسرے کا کیا ہوگا۔ فوراً ہی حل نکالا گیا کہ یہاں بھی درج ہے 'خود' وہاں بھی۔ پرانے زمانے میں اقطاب و ابدال کے بارے میں سنا جاتا تھا کہ وہ بیک وقت دو جگہوں

پر موجود پائے جا سکتے تھے، لیکن ایک کتاب کے بارے میں کوئی کیسے مان لیتا کہ یہ دونوں جگہ بیک وقت موجود ہو سکتی ہے۔
اس اعتراض سے بچنے کے لیے ایک صورت نکال لی گئی۔ پہلے اندراج ملاحظہ ہوں:

| قدیم پروگریس نمبر | قدیم کتاب نمبر | سید اطہر شیر کا مرسل نمبر | نام کتاب | مصنف | اوراق | سطور | خط |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۶۲۱۷/ | ۲۹۴۳ | ۲۵۲۹ | تحفۃ العراقین | خاقانی شیروانی | ۸۲ | ۱۵ | نستعلیق |
| (۲) ۶۲۱۹/ | ۲۹۴۶ | ۲۹۳۰ | " | " | " | " | " |

ــــ دو نمبروں پر ایک ہی کتاب کی الجھن رفع کرنے کے لیے کچھ فرق کرنا ضروری تھا۔ نام میں فرق نہیں ہو سکتا تھا، مصنف میں، نہ سطروں میں، نہ خط میں۔ لیکن اندراج کے تین خانے اور باقی تھے: ایک سنہ کتابت جس میں (تاریخ کتابت چونکہ مخطوط میں درج نہیں تھی اس لیے سب کچھ مرتب کی صوابدید اور تخمین پر مبنی تھا) ایک جگہ تخمینی صدی ۱۳ لکھ دی اور فرق کرنے کے لیے دوسری جگہ ۱۱۔ کیفیت کے خانے میں بھی آزادی تھی، ملتے جلتے دو تین لفظ موجود تھے ایک اندراج کے تحت 'کرم خوردہ' لکھ دیا، دوسرے کے تحت 'بوسیدہ'۔ ان دونوں خانوں کے لیے تو جتنا [illegible] ہو جا سکتا تھا، اس سے کام لیا گیا لیکن پھر بھی کسی کو شبہ ہو سکتا تھا کہ ۱۳ اور ۱۱ کی تخمین اور بوسیدہ اور کرم خوردہ کا بیان لازماً امتیاز پیدا نہیں کرتا خصوصاً جب خط اور اوراق کیا سطور کی تعداد بھی ایک سی ٹھہر چکی ہو۔ اس لیے اس کے بعد جو آخری خانہ 'امید بچا تھا اس میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ تین تین چار چار سنٹی میٹر کا فرق لے آیا گیا۔ ایک کا ناپ ۲۴ × ۱۵ / ۱۸½ × ۹ لکھ دیا گیا دوسرے کا ۲۱ × ۱۲ / ۱۳ × ۶½ اور اب فہرست نگار صاحب مطمئن ہو گئے کہ فریب مکمل ہو گیا۔

واقعۃً 'حکایات الصالحین' کے اگر کچھ بوسیدہ اوراق قاسم صاحب کو ملے بھی تھے تو وہ ضائع ہو گئے، صرف اندراج یادگار رہ گیا۔ اس طرح ۲۹۴۳ نمبر Redundant ہو گیا (جس پر فہرست ساز نے ۲۹۴۶ کو منتقل کرنے کی ناکام کوشش کی ہے)۔ جہاں تک 'قران السعدین' کا سوال ہے یہ ایک ہی نسخہ ہے، دو نہیں (جو اصلاً ۲۹۴۶ پر ہی تھا اور اب فہرست ساز کی کرشمہ سازی سے بیک وقت ۲۹۴۶ نمبر پر بھی ہے اور ۲۹۴۳ پر بھی)۔

●●

محبوب حسین - خدابخش لائبریری پٹنہ

(۳)

# فوائد ضیائیہ

پُرانے فہرست نگار نے اس مخطوطہ نمبر ۸۱۷۸، پروگریس نمبر ۳۴۶۶۶ کو 'بلاغ المبین' درج کیا ہے۔ مختلف مقامات سے مخطوطہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ "فوائد ضیائیہ" ہے المعروف بہ شرح جامی، نہ کہ "بلاغ المبین"۔ چونکہ بلاغ المبین کا ٹائٹل مخطوطہ پر لگا ہوا تھا، یہی اندراج کر دیا گیا۔ مخطوطہ کی عبارت دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی گئی۔ اگر اصل ٹائٹل پیج کو پلٹ کر حمد و نعت پر ہی نظر ڈال لی جاتی تو مضمون سامنے آجاتا جس سے اندازہ ہو جاتا کہ 'بلاغ المبین' اس کتاب کا ٹائٹل ہرگز نہیں ہے۔ 'بلاغ المبین' فارسی زبان کی کتاب ہے اور 'فوائد ضیائیہ' عربی کی۔ مخطوطہ کا اصل ٹائٹل آخر میں موجود ہے۔

واضح ہو کہ یہ مخطوطہ دسنہ لائبریری سے آیا ہے۔ دسنہ کے رجسٹر پر دیکھا تو وہاں بھی اس مخطوطہ کا نام 'بلاغ المبین' ہی پایا۔ 'این خانہ ہمہ آفتاب است'

●●

**پس نوشت :-** اُوپر کی عبارت میں نے ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء کے ایک اندراج سے نقل کی تھی۔ لیکن کچھ الجھاو ابھی باقی تھا۔ میں نے اپنی جستجو جاری رکھی یہاں تک کہ آج (۲ مئی ۱۹۸۲ء کو) خان صاحب کی روح سے رجوع کئے بغیر ہی بحمداللہ یہ مسئلہ پوری طرح حل ہو گیا اور تازہ ترین تحقیقات کی روشنی میں دونوں کتابوں 'بلاغ المبین' اور 'فوائد ضیائیہ' کا سراغ مل گیا۔

بات یوں ہوئی کہ دسنہ سے کتابیں لانے کے لئے جن افسران کو بھیجا گیا وہ عربی، فارسی اور اُردو کے لوگ نہ تھے، بنابریں وہاں سے اس لائبریری میں جو کتابیں ٹرک پر آئیں ان کی پیکنگ بہت عجلت میں کی گئی ہوگی جس سے غیر مجلد کتابوں کے اوراق آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔

واقعتہً دسنہ سے دو کتابیں آئیں، ایک فوائد ضیائیہ تھی اور دوسری 'بلاغ المبین'۔ بلاغ المبین فارسی کی کتاب ہے۔ شاہ رفیع الدین کی تصنیف۔ خدابخش لائبریری میں ان دونوں مخطوطات کی آمد کے بعد پروگریس رجسٹر لکھنے والے صاحب اور ان کے بعد ہینڈ لسٹ بنانے والے صاحب دونوں نے فوائد ضیائیہ کو اُلٹ پلٹ کر نہیں دیکھا، اس کے اوپر بے شک بلاغ المبین کا پہلا ورق غلطی سے لگا ہوا تھا۔ لیکن دوسرے ورق کو باضابطہ فوائد ضیائیہ شروع ہوتی ہے اور تا اختتام موجود ہے۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ بلاغ المبین (پہلا ورق) فارسی میں ہے، جبکہ فوائد ضیائیہ تمام و کمال عربی میں ہے۔

اصل بلاغ المبین بھی —— یعنی پہلے ورق فوائد ضیائیہ کو بخش کے، دوسرے ورق سے —— لائبریری میں موجود تھی لیکن غلطی سے اس کا اندراج بھی مندرجہ بالا فہرست سازوں نے عربی میں کر دیا تھا جبکہ جیسا کہ فارسی مخطوطہ ہے۔ اس بلاغ المبین کا سر بے تن تھا میں نے اس کا تن بے سر تلاش کر لیا ہے۔ اب یہ دونوں مخطوطے میرے ٹیبل پر خوشی میں باہم بغلگیر ہو رہے ہیں اور زبان حال سے مجھے دعائیں دے رہے ہیں۔ آپ سے امید ہے کہ ان کی مسرت میں شریک ہوں گے اور ان بے زبانوں کی دعا پر آمین کہیں گے۔

●●

(۴)

محبوب حسین، خدا بخش لائبریری، پٹنہ

# کتاب الوصلة الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب

(کیٹلاگ نمبر ۹۶ - ایچ ایل نمبر ۲۱۹۳ - اوراق = ۱۸۲ - س ۹)

اس مخطوط کا موضوع ہے: "الأغذیة والأشربه وما یتعلق بها"

لائق وفائق کیٹلاگر (ڈاکٹر عظیم الدین احمد) نے اس مخطوط کو Dictionaries of medicine کے تحت رکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ موصوف نے اس مجبوری سے اس کو عنوان مذکورہ میں داخل کر دیا کہ اس موضوع پر صرف یہی ایک کتاب اُن کو ملی اور ایک کتاب کے لئے لائق کیٹلاگر نے کوئی علیحدہ عنوان قائم کرنا مناسب نہ خیال کیا۔ مخطوط میں درج ذیل عنوانات سے بحث ہے:

(۱) پانی کو خوشبو کرنے کا طریقہ اور جو ادویات اس میں مستعمل ہوں گی۔ (۲) پینے کی چیزوں کا بیان (۳) حلوہ کی قسمیں، اجزاء اور تیار کرنے کا طریقہ (۴) روٹی، سکھ، نان ختائی وغیرہ کے اقسام، ان کے اجزاء ترکیبی اور تیاری کا نسخہ (۵) غسل کا پانی، صابون و شیمپو وغیرہ (۶) دہان کا ذائقہ درست کرنے کے لئے عرقیات اور دوسری چیزیں۔

کیٹلاگر صاحب نے سن کتابت کا اندازہ ۱۶ ویں صدی لگایا ہے۔ میرا اندازہ بھی یہی ہے

مصنف:۔ کمال الدین ابو القاسم عمر ابن احمد العقیلی الحلبی ۵۸۸ھ (۱۱۹۳ء) میں بمقام حلب پیدا ہوا۔ حدیث، فقہ، معانی و بلاغت اور تاریخ میں کافی شہرت کا مالک ہوا۔ تاتاریوں کے مظالم سے مجبور ہو کر مصر کی طرف رحلت کر گیا۔

تعلیم:۔ دمشق، بغداد اور فلسطین میں تعلیم حاصل کی۔ حلب میں اس کے علم و فضل کی شہرت اس درجہ بڑھی کہ یہ "ذی الاصحاب الامام العالم" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ۶۶۰ھ ۱۲۶۲ء میں بمقام مصر وفات پائی۔ حلب کی ایک ضخیم تاریخ لکھنا شروع کی تھی؛ ملا علی قاری طبقات حنفیہ میں لکھتے ہیں کہ وہ تاریخ مکمل ہو کر ۴۰ جلدوں میں ختم ہوئی۔ لیکن ذہبی نے اس کا خلاصہ زبدۃ الحلب کے نام سے تالیف کیا۔

مخطوط کے آخر میں ایک مہر پائی جاتی ہے: "الفقیر محمد بن شیخ محمود الواثق بالملک المعبود"

اس کے بعد ۶ ذی علم اصحاب کی تحریریں ہیں، جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ ●●

وسیم احمد اعظمی
(ریسرچ اسسٹنٹ یونانی)
(سی۔سی۔آر۔یو۔ایم)
خدابخش لائبریری پٹنہ

(۵)

# اٹھارہ رسائل کی جگہ بارہ

عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۶، ج ۲ میں ہینڈلسٹ ر ۲۶۳۱ کے تحت ایک مجموعہ کا اندراج ہے جو ایک سو سولہ اوراق پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ فہرست مجمل کے مطابق اس میں بارہ رسائل شامل ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

ہینڈلسٹ ر ۲۶۳۱/۱ التعلیقات

ر ۲۶۳۱/۲ مقالـة ـ الشیخ منصور محمد بن محمد طرخون الفارابی

ر ۲۶۳۱/۳ رسـالـة ـ

ر ۲۶۳۱/۴ التلویحات ـ شہاب الدین یحیٰی بن حبش السہروردی

ر ۲۶۳۱/۵ رسالة فی الحروف ـ الشیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا

ر ۲۶۳۱/۶ رسالة فی تحقیق الزاویه ـ 〃 〃

ر ۲۶۳۱/۷ رسالة فی بیان معنی الفلسفه ـ

ر ۲۶۳۱/۸ الرسالة النیروزیه ـ الشیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا

ر ۲۶۳۱/۹ اجوبة المسائل العشرة ـ 〃 〃 〃

ر ۲۶۳۱/۱۰ رسالة فی النفس 〃 〃 〃

ر ۲۶۳۱/۱۱ رسالة فی الکلیات ـ قطب الدین محمد بن محمد الرازی

ر ۲۶۳۱/۱۲ رسالة فی العقائد ـ جلال الدین محمد اسعد الصدیقی الدوانی

لیکن اس مجموعہ میں ۱۲ کی بجائے ۱۸ رسائل ہیں۔ مطبوعہ فہرست مجمل میں جن رسائل کا اندراج نہیں ہو ا ہے وہ رسائل جن کا اندراج ہے، لیکن اطلاعات نامکمل ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطبوعہ فہرست مجمل میں ۲۶۳۱/۱ کے تحت "التعلیقات" کے مصنف کا نام درج نہیں ہے حالانکہ مخطوطہ پر مصنف کی حیثیت الشیخ الرئیس ابوعلی الحسین بن عبداللہ بن سینا کا نام درج ہے۔ ۲۶۳۱/۲ کے تحت

مخطوطہ کا نام "مقالۃ" تحریر ہے، جو ایک مجمل اطلاع دیتا ہے۔ حالانکہ مخطوطہ میں "مقالۃ الشیخ ابی نصر الفارابی رحمہ تعالیٰ فی الجمع بین رای افلاطن وارسطاطالیس" تحریر ہے۔ اس سے مقالہ کی نوعیت واضح ہوجاتی ہے۔ ب ۲۶۳۱/۳ کے تحت مخطوطہ کا نام "رسالۃ" درج ہے۔ حالانکہ مکمل نام "رسالۃ فی المبادی التی بہا قوام الاجسام والاعراض التی بہا ستہ اصناف" ہے۔ ب ۲۶۳۱/۸ کے تحت "الرسالۃ الفیروزیہ" تین اوراق پر مشتمل بتایا گیا ہے۔ جب کہ یہ صرف ایک ورق پر مشتمل ہے۔

مندرجہ ذیل وہ رسائل ہیں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں لیکن فہرست نگار نے انہیں نہ گنتی میں لیا نہ اندراج میں:

| ہینڈلسٹ | رسالہ | مصنف | ورق |
|---|---|---|---|
| ب ۲۶۳۱/۳ | رسالۃ لامعلوم الاسم | الفارابی | ورق ۴۷ ب تا ۴۸ الف |
| ب ۲۶۳۱/۴ | " " | " " | ورق ۴۸ الف تا ۵۰ الف |
| ب ۲۶۳۱/۷ | " " | محمد بن محمد بن الحسن الطوسی | ورق ۶۹ الف تا |
| ب ۲۶۳۱/۸ | رسالۃ فی علم الواجب | محمد بن محمد | ورق ۹۷ الف |
| ب ۲۶۳۱/۹ | اربعۃ وعشرون مسائل | نصیر الدین الطوسی | ورق ۹۸ الف تا ۱۰۱ الف |
| ب ۲۶۳۱/۱۲ | رسالۃ لامعلوم الاسم | | ورق ۱۰۶ الف تا ۱۰۸ ب |

رشید حسن خاں
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

# "تدوینِ متن کے مسائل" کے بارے میں

## (۱)

جرنل کا شمارہ ۱۲-۱۶ ملا۔ شکر گزار ہوں۔ بلا تکلف کہتا ہوں کہ یہ کارآمد نمبر ہے، خاص کر ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے لیے۔ جو کمی تھی وہ آپ کے مفصّل تبصروں نے پوری کر دی۔ اس طرح اصولی بحثیں بھی آگئیں اور عملی مشقیں بھی فراہم ہو گئیں۔ البتہ ایک بات یہ ضرور ہے کہ دیوانِ راغب والا تبصرہ ۳۰۳ کی رائفل سے چڑیا کے شکار والی بات ہو گئی۔ جو لوگ غیر مکلّف ہیں، وہ نہ آپ کے مخاطب ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں نہ ہمارے۔ دوسرا تبصرہ بالکل درست اور برحق!

البتہ املا کا مسئلہ آپکی توجہ کا اب تک طلبگار ہے۔ کاتب صاحب نے اصل کی پابندی نہیں کی اور مصحح نے بھی بے پروائی کی۔ مثلاً آپ میرا ہی مضمون لیجیے: ص ۳۴ "اسی لیے" "کام کرنے والے کے لیے" (ایضاً) "اس وقت انہی" (ایضاً)

ص ۳۶، س ۷: "انہوں" ص ۳۹، س ۸: "بجائے" س ۹: "انہی"۔ س ۱۲: "گنجائش"۔

ایک جگہ کتابت یا یادداشت کی ایک غلطی نے میرا مفہوم ہی بدل دیا۔ میں نے کہا تھا کہ ۲۸۰ لفظوں میں سے تین لفظ ایسے تھے جن کی تصحیح کما حقہٗ نہیں ہو سکی۔ لیکن یہ جملہ جس طرح معرضِ تحریر میں آیا ہے، اس سے بات بدل گئی (ص ۱۳۳ س ۵)

ص ۳۹، س ۲۲: "آج شناسا نہیں" غالباً "ہم" چھوٹ گیا ہے۔ البتہ اسی صفحہ پر ایک غلطی ایسی ہے جس کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ س ۵ پر "پانچ نسخے ایسے ضرور موجود ہیں" میں "پانچ" کی جگہ مجھے "چار" لکھنا چاہیے تھا۔

میرا خیال یہ ہے کہ اس خاص نمبر کو آپ (اپنے معمول کے مطابق) کتابی صورت میں بھی چھاپ دیجیے۔ یہ نصابی ضرورتوں کے کام آئے گا۔ اس کی بڑی ضرورت ہے۔ غلط نامہ ضرور آخر میں شامل کر دیجیے گا۔

اس تدوین نمبر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ آپ اسی انداز کا اور اسی پیمانے پر ایک تحقیق نمبر بھی مرتب کر دیں۔ یعنی پہلے ایک مذاکرہ ہو اور پھر اسی کے مقالات اور مباحث کو اسی طرح ایک خاص نمبر میں مرتب کر دیا جائے، اس طرح تکمیل ہو جائے گی۔ لیکن ان مباحث موضوعات کا تعین کر دیا جائے، تاکہ تکرار نہ ہو مفاہیم کی، (جو اس نمبر میں ہوئی ہے) مثلاً اس طرح: (۱) تحقیق، تنقید اور تدوین کی تعریف (۲) روایت اور شہادت کا فرق اور ان کے احکام (۳) تحقیق کی زبان (۴) کیا تحقیق مثبت اور منفی ہوتی ہے (جیسا کہ بعض نابالغ لکھتے ہیں) (۵) تحقیق اور اخذِ نتائج اور اس کے حدود۔ وغیرہ۔

رئیس نعمانی
پرشین اکیڈمی، لکھنو

۲

**تدوین اور طبع موزوں:** سرسری نظر میں آپکا مقالہ پسند آیا شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ بہت دنوں سے یہ موضوع خود میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا جس پر آپنے قلم اٹھایا اور سلیقے سے مضمون لکھا۔ یہ علمی و ادبی تاریخ کے ناخوشگوار ترین واقعات میں سے ہے کہ اکثر نااہلوں کو مواقع اور وسائل مہیا ہو جاتے ہیں (مثال کے طور پر آپکے "سیمنار" میں بعض ایسے لوگ بھی شریک کئے گئے جو کسی طرح ڈگری اور لکچررشپ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جانے کے باوجود نہ فکری نثر لکھ سکتے ہیں اور نہ شعر کو موزوں پڑھ سکتے ہیں)

جرنل ۱۶، ص ۱۲۱ پر " فی القیمۃ سعیھم مشکور باد" میں قیم قیمت کی جمع نہیں ہے بلکہ " قیامت " کے املا کی ایک شکل ہے جس میں " ی " پر اشباعی زبر ہوتا ہے یہ " فی " ۔ " اللقی " اور ضمیر " ہ " سے مرکب نہیں ہو سکتا ________ ۔ اس لیے کہ اس صورت میں لقی پر " ال " کا استعمال عربی قواعد کی رو سے درست نہیں ہوگا ۔ دوسری بات یہ ہے کہ " سعیھم مشکور " قرآن کی ایک آیت سے ماخوذ ہے ۔ اور وہ آیت قرآن میں جس جگہ آئی ہے، وہاں کئی آیات سے " قیامت " ہی کا ذکر چل رہا ہے اور سعیھم مشکور بھی اسی ذیل میں وارد ہوا ہے ۔ اور اسی لیے شاعر نے " فی القیمہ " کہا ہے جو اس وقت کے رائج املا کے مطابق " فی القیمہ " لکھا ہے ۔ اور قرآنی رسم الخط میں آج بھی اس کا املا یہی ہے ۔

ڈاکٹر کلیم سہسرامی
سابق صدر شعبہ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

# قمر گیاوی وغیرہ کے بارے میں

①

آپ کے 'جرنل' کے (۱۰-۱۱) شمارے میں قمر گیاوی پر آپ کا مختصر نوٹ نظر سے گزرا، مجھے تعجب ہے کہ آپ کو یہ التباس[1] کس طرح ہوا کہ قمر صاحب مولانا محمد مسلی مرحوم سے انتقال (۱۹۳۱ء) تک زندہ تھے۔ موصوف آخری عمر میں نیا مکان بنا کر سہسرام ہی میں مستقل سکونت پذیر ہو گئے تھے اور میرے پڑوس کے محلے میں تھے۔ ۱۹۶۰ء تک میں اُن سے ملتا رہا ہوں۔ زبان و بیان اور فن شعر کے بہت سے نکات بھی ان سے سیکھنے کا مجھے فخر حاصل ہے۔ 'فرہنگ آصفیہ' کے غالباً پہلے ایڈیشن پر ان کی تقریظ پڑھنے کے لائق ہے اور اسی نسخے میں سید احمد دہلوی کی تحریر قمر صاحب سے متعلق موجود ہے، جس سے زبان و بیان اور لغت نویسی کے فن پر موصوف کی قدرت و صلاحیت کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قمر صاحب کی شخصیت اور اہلیت پر ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ اُن کا نادر کتابخانہ اب بھی محفوظ ہے کہ جس میں قلمی اور مطلّا و مذہب نسخے بھی تھے۔ آپ دلچسپی لیں تو سہسرام کے کسی سرکاری افسر کے ذریعہ اُن کا کتابخانہ آپ کے یہاں منتقل ہو سکتا ہے۔

②

"آپ کے جرنل کا دسواں شمارہ بعد مطالعہ کے بعد لطف آگیا، جن لوگوں کو قاضی صاحب نے بخش دیا تھا، ان کی طمانیت آپ نے بخشی۔ ان حضرات کے مضامین میں نظر بالکل نہیں ہیں، آپ کا مقالہ "تدوین و طبع موزوں" عملی تحقیق کی اچھی مثال ہے۔ اسی قسم کا ایک مضمون حضرت قمر گیاوی کا لکھا ہوا میرے پاس اب تک محفوظ ہے، اس میں بہار کے اکثر اساتذہ اور شعرا کے کلام کی تنقید پیش ہے۔ اور ایک علاحدہ مستقل مضمون بھی نظر سے ہے۔

چند جگہ مجھے آپ سے جزوی اختلاف ہے، مثلاً انگریزی الفاظ کا استعمال "کنفیوژن" (ص۸۳) "چیک کی جا سکتی ہیں" (ص۸۶)، میرے خیال میں یہ مفہوم ادا کرنے کی اردو میں صلاحیت ہے۔ اگر یہ کام آپ انجام نہ دیں گے، تو دوسروں سے کیا توقع کی جائے (ص۹۶)، ذکر بعضی اشخاص میکدہ پارسی ... ۶۰۔ ایرانی اس طرح لکھتا ہے "ذکر بعضی (از) اشخاص میکدہ پارسی۔"

---

[1] التباس نہیں، صحیح تاریخ کا علم نہ ہونے کے سبب یہ تعین کی ایک کوشش تھی کہ کم سے کم اس وقت تک قمر ضرور زندہ تھے (ادارہ)

مسترت حسین آزاد (رامپور)

# رسالہ "ادیب" الٰہ آباد کے بارے میں

خدا بخش لائبریری جرنل تقریباً دیکھ لیا۔ آپ نے بہت اچھا اور کام آنے والا مواد جمع کر دیا ہے۔ لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ نے لکھا ہے کہ "ادیب" جنوری ۱۹۱۰ء سے جولائی ۱۹۱۳ء تک کا انتخاب ہے حالانکہ انتخاب میں شماروں کی جو تفصیل دی گئی ہے اس میں جولائی ۱۹۱۳ء کا کوئی شمارہ نظر نہیں آتا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ جولائی ۱۹۱۳ء کے شمارہ کا کوئی مضمون آپ نے انتخاب کے لائق نہ سمجھا ہو اس لیے فہرست میں بھی ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ڈاکٹر رینڈر پرشاد سکسینہ بدایونی نے بھی رسالہ "ادیب" پر ایک تعارفی مضمون لکھا ہے، جو "قومی زبان" اپریل ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ادیب کا آخری پرچہ جون ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ غالباً سکسینہ صاحب سہواً ایسا لکھ گئے ہیں، کیونکہ آپ کے لکھنے کے مطابق آخری شمارہ جولائی ۱۹۱۳ء کا ہوا۔ لیکن فہرست میں اس ماہ کے شمارہ کا کوئی ذکر نہ ہونے کی وجہ سے سکسینہ صاحب کے مضمون کی طرف پھر خیال جا رہا ہے۔ آپ اصل وجہ سے مطلع فرمائیں۔ ممکن ہے سمجھنے میں مجھ ہی سے کہیں غلطی ہو رہی ہو۔

●●

○

**ادارہ:-** سکسینہ صاحب کا خیال اور آپ کا شبہ صحیح ہے جولائی غلطی سے لکھا گیا۔ اسے جون ۱۹۱۳ء پڑھا جائے۔

محمد عمر سیفی
امیر گنج، ٹونک

# غزلیات سلمان ساوجی - استدراک
## کے بارے میں

جرنل ۱۶ میں پروفیسر ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کے مضمون غزلیات سلمان ساوجی، پر آپ کا نوٹ بعنوان "استدراک" نہایت مناسب رہا۔ کوئی کوئی شعر حاشیہ نمبر پا جانے کے باوجود رہ گیا۔ مثلاً ص ۶، ص ۲۸، ص ۴۷، ص ۶۸، ص ۸۸، ص ۱۰۸، ص ۱۲۹ پر نمبر غلط لگ گیا، جبکہ ۱۴۰ پر لگا تھا۔ ص ۱۳۲ رہ گیا۔ شعر ص ۱۳۶ پر نمبر رہ گیا۔ ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۴۸ استدراک میں چھوٹ گئے۔ ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۸ اور ۱۶۹ پر نمبر تو پڑ گئے مگر تشریح و استدراک میں نہ آسکے۔ علیٰ ہذا، آگے کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ غالباً غیر ضروری سا تھا اس لئے عمداً چھوڑ دیا گیا۔

---

ادارہ: اشعار پر نمبر صرف سہولت اور اشارے کے لیے ڈالے گئے تھے تاکہ ہر صفحے پر کسی بھی شعر کی تلاش میں آسانی ہو، یہ نمبر لازماً اس امر کا اظہار نہیں کرتے کہ اس پر کوئی نوٹ بھی دیا جا رہا ہے۔ البتہ متعلقہ شعر اس ربط سے فوراً تلاش ہو سکتا ہے۔

ئی کتابیں

## علم کا مقام اور اہل علم کی ذمہ داریاں - از سید ابوالحسن علی ندوی

یہ وہ خطبہ ہے جو کشمیر یونیورسٹی کے ساتویں کانوکیشن منعقدہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری پیش کئے جانے کے موقع پر پڑھا گیا۔

---

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہماری جامعات نے جو قدیم کے مقابلہ میں جدید علم کا سرچشمہ خیال کی جاتی ہیں مدرسوں سے وابستہ علماء کی قیمت بھی پہچاننی شروع کردی ہے۔ اگرچہ یہ اس وقت ہوا جب مدرسوں سے وابستہ ایک ہندوستانی عالم دین کی ممالک میں بڑے پیمانے پر پذیرائی شروع ہوئی ——— اس مختصر خطبہ سے جو کل ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے ایک طویل اہم اقتباس "جرنل" کے صفحات میں محفوظ کردینا مناسب ہوگا، جو درج ذیل ہے:

"جامعات کا پہلا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیریکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کف جَو کے عوض بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے کوئی بت ہے نہیں خریدا جاسکتا، تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا! ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کرے، وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کرسکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تحریک، کوئی غلط دعوت و تحریک کسی دام خرید نہ سکے، جو اقبال کے الفاظ میں پورے اعتماد و افتخار کے ساتھ کہہ سکیں:

کلاہ تیرا کہ ہے جوہر نہیں میں | غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن | کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

غرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں حق و صداقت اور علم و ہدایت کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہوں، جن کو کسی کے لیے بھوکا رہنے میں وہ لذت آئے جو کسی کو پیٹ بھر کر کھانے اور "خورد و نوش" میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ مسرت حاصل ہو جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں ہوتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں، ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے خالق کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لیے صرف کریں۔ دانش گاہوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کررہی ہیں؟ میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی تعریف نہیں کہ وہاں بڑی تعداد میں یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہوگئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شوق میں جستجو کی راہیں علم و اخلاق کے پھیلانے اور برائیوں، بداخلاقیوں، سفاکی و درندگی، دولت

قوت کی پرستش کو رد کرنے کے لیے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں؟ اپنی قوم کو صاحب شعور، جذبہ اور باضمیر قوم بنانے کے لیے کتنی تعداد میں نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کرکے اس مقصد کے لیے اپنے کو وقف کرتے ہیں۔ اصل معیار یہ ہے کہ کتنے نوجوان ایسے ہیں جو دنیا کی تمام آرام اور ترقیوں سے آنکھیں بند کرکے کسی گوشے میں ٹھوس علمی و تعمیری کام کر رہے ہیں!!

شریفانہ انسانی زندگی گزارنے کا بنیادی فن، خدا ترسی، انسان دوستی، ضبط نفس کی صلاحیت، ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دینا، کرامتِ انسانیت کا احترام، انسانی جان و مال، عزت و آبرو تحفظ کا جذبہ، حقوق کے مطالبہ پر ادائے فرض کو ترجیح، مظلوموں اور کمزوروں کی حمایت و حفاظت اور ظالم و طاقتوروں سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ، ان انسانوں سے جو دولت و جاہت کے سوا کوئی جوہر نہیں رکھتے، عدم وابستگی، ہر موقع پر اور خود اپنی قوم اپنی جماعت کے مقابلے میں کلمۂ حق کہنے کی جرأت، اپنے اور پرائے معاملہ میں انصاف اور ترازو کی تول، کسی دانا و بینا طاقت کی نگرانی کا یقین اور اس کے سامنے جواب اور حساب کا کھٹکا، یہی صحیح خوشگوار و بے خطر اور کامیاب زندگی گزارنے کی بنیادی شرطیں اور ایک اعلیٰ و خوش اسلوب معاشرہ، اور ایک طاقتور محفوظ و باعزت ملک کی حقیقی ضرورتیں اور اس کے تحفظ کی ضمانتیں ہیں۔ اس کی تعلیم اور اس کے لیے مناسب ماحول مہیا کرنا دانش گاہوں کا اوّلین فرض اور اعلیٰ حصول تعلیم یافتہ نسل اور ملک کے دانشوروں کی پہلی ذمہ داری ہے اور ہم کو ان جیسے تمام مواقع پر دیکھنا چاہیے کہ اس کام کی تکمیل میں ہماری دانش گاہیں کتنی کامیاب اور ان کے سند یافتہ افراد و فضلا کتنے مبارکباد ہیں؟ اور آئندہ ان مقاصد کے حصول اور تکمیل کے لیے ہم کیا عزائم رکھتے ہیں؟ اور ہم نے اس سلسلے میں کیا منصوبے سوچے ہیں؟

قاضی عبد الودود (بار۔ ایٹ۔ لا)
پٹنہ

# تبصرہ

## فرہنگ آصفیہ (۵)

[ اگر صفحہ کے شمار کے بعد کوئی نشان اختصاری نہ ہو، تو لغت آصفیہ میں بطور لغت شامل نہیں۔ شمار کے بعد "بس" ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ لغت بغیر سند ہے اور "س" ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سند ہے، مگر ناکافی۔ ق = قافیہ]

### (۶۲) دیوان ناجی، مرتبہ ڈاکٹر فضل الحق ۱ تا ۱۳۶

۱ بہبہا "عباس لے کے مشک چلا ہے فرات پر" ص۲۱۲ "کیا ڈر ہے موت سیں (سیتی چاہیے، ورنہ مصرع ناموزوں) اُسے بہبہا (کذا) ہے یہ" ۲ اتفاقاً قافیۂ ناقا وغیرہ۔ "تعبیر میں سختیوں کے آگو یہ اتفاقاً" ص۲۱۴، تنوین کے ساتھ قافیۂ ناقا (ناقہ) نہیں ہو سکتا۔ اتفاقا مثلِ املا ہے۔ ۳ نستارنا (ماضی دیوان میں) "ای عزیزاں دکھا کے چہرہ و رخ" ص۹ "آہ مہرو نے مجھ کو نستارا" ۴ پھاٹنا = پھٹنا "رشک سیں دل کلی کا جاوے پھاٹ" ص۷ ۵ پشیمانی کھینچنا "کھینچتا ہے دل پشیمانی ہنوز" ص۱۰۵ ۶ آشیانی = آشیانہ والا "دام میں بوالہوس کے آیا نہیں" ص۲۴۲ "کیونکہ یہ باز آشیانی ہے" ۷ ہات = ہاتھ (بطور قافیہ) "موت ناجی کی پیارے اب تمہارے ہات ہے" ص۲۵۸ ۸ رشوت خور "جب سے حبشی ہوا ہے رشوت خور" ص۲۳۴ "بس" "سب نے ٹھہرادیا ہے کالا چور" ۹ تلاوا "کم ڈوبتا ہے لشکر جب گرد ہو تلاوا" ص۷ "بس" ۱۰ صاحب (بکسرۂ با) قران "سکّے ہے مہر خاں میں اس صاحب قراں کا" ص۶ "بس" نستاما = چمکارا (آصفیہ) باپ دعوا یا نستارا" ص۷ "بس" ۱۲ وہ بالفتح = گو بالضم "میں دیا پھولوں کا دوناں یا کو مُرجھ گیا" ص۱۲ اگھیرا "ہر اک مہرو سما جاتا ہو میرے دل کی وسعت میں" ص۱۹ "بس" "الٰہی روز محشر تلک ہو آباد یہ گھیرا" ۱۳ معترض ہوا "کوئی بوسہ نہ تھا اس لب کا معترض تھا وہ جلوا" ص۲۱ "س" ۱۵ ماسا (حاشیہ میں آسا) = عصا "بھولا قیام نماز سجود میں توڑ ماسا" ص۲۳، ۱۶ شیوہ لینا کسی امر کا "شیوہ لیا ہے تم نے زکات فری کا" ص۲۴ ۱۷ دبکانا "حبش ناجی کا دل غیرت سیں انگا ما سا دبکایا" ص۲۵

۵۲ شکیل 'خوشنما ہو شکل میں دیکھا نہیں ایسا شکیل' ص۱۳۷ 'س، ۵۳ دودھیل 'لات
مٹھو ملی کی گھائی جو پالے دودھیل' ص۱۳۹ 'س، ۵۴ لئیل 'اور بہتا ہمنہارا دن کا جا اہوتی ہو لئیل' ص۱۳۹ ۵۶
ارذل 'لگن کا داغ کھا کر پوی کی خود مر گیا ارذل' ص۱۴۱ ۵۷ وقر 'مسکین یتیم سوں کا اس میں وقر نہیں' ص۱۴۸
'بس، ۵۸ انبیاؤں (جمع الجمع بسیاق اردو) 'سرتاج انبیاؤں کا ختم رسل کتیں' ص۱۵۲ (رسل جمع)
۵۹ جواہر بکسرہا (اصل میں بفتحہا) 'کہ جا بجا ابر و دیکھو سیں گر بکھری جواہر (ق) ہوں' ص۱۶۰، ۶۰
ببری (مطبوعہ میں بیری) 'مجھ کوں دیکھو ہو شیر کی نظروں' ص۱۶۱ 'بس' جب ستی ببریاں
دکھائی ہیں' ۶۱ چوائی (مطبوعہ میں جوائی) 'شوخ چنچل بڑی چوائی ہیں' ص۱۷۱ ۶۲ اسلوب 'جو دل کو کھینچ بکر
کا اسلوب جاتی ہیں' ص۱۶۶ ۶۳ اعمالوں (جمع الجمع) 'چھوٹیں گر حشر کر دن اپنے ہی اعمالوں سیں' ص۱۶۹ ۶۴ امولا
'بہامت دیکھ یو جا یہ سب موتی امولے ہیں' ص۱۷۳، ۶۵ بتیاں (جمع) 'تو برگ نرگس اوپر بجا ہے لکھوں
جو اپنے سجن کوں بتیاں' ص۱۷۵ ۶۶ رتیاں (جمع) لگے ہو کانٹا نظر میں سونا کٹیں گی کیسو یہ کالی
رتیاں' ص۱۷۷ 'بس' ۶۷ پھتیاں (جمع) 'بنا و بنتا نہیں ہے ناتی جو اس سجن کوں لگاؤ پھتیاں' ص۱۷۷
۶۸ پہلوان بہ ہائے متحرک و لام ساکن) 'یہ سند ہاتھ لگی مجھ کوں پہلوانوں سیں' ص۱۷۹ 'س'
۶۹ ڈنڈ بیل 'کہ جاتی ہو وہیں پکڑ اک ڈنڈ بیل کے تئیں' ص۱۸۳ 'بس' ۷۰ جزدان 'آج لڑکا
بول گو مکتب میں کل جزدان کو' ص۱۸۹ 'بس' ۷۱ مزاحم 'کب خط مزاحم ہو کلاہ بشری کو' ص۱۹۱
'س' ۷۲ واشگاف 'ہم سیں دو حرف واشگاف کرو' ص۱۹۲ ۷۳ رکت (خون) 'یہ پیک نئیں کسو کا
گویا رکت ہو یارو' ص۲۰۲ 'بس' ۷۴ وہ بالفتح = وہ بالضم 'انصاف سیں بعید ہے یا رب نہ یہ نہ وہ
(قافیہ رہ) ص۲۰۴ ۷۵ فردی 'مول بڑھتی جس قدر گوہر کا ہو فردی سیں ہے' ص۲۱۶ ۷۶ جان کندنی
'مہ مہری وو کوہکن سیتی جان کندنی کو' ص۲۱۸ 'بس' ۷۷ سرس 'سوز سیں ایک پانی مٹھا ترا
سرس ہے' ص۲۲۰ ۷۸ کماہی 'دل میں میرے تڑپ کماہی ہے' ص۲۲۳ ۷۹ ایاغی 'مئے وحدت کا وہ ایاغی ہے' ص۲۲۴
۸۰ ناخواندی (مونث) 'جو لڑکا ماہ پیکر نکتہ فہم اور خوش طبیعت ہو۔ 'بجلی ہے اس سے جو میری مجلس میں
ہو نا خواندی' ص۲۲۵، ۸۱ ماندی (مؤنث) 'کہ ہو دھتی ہو اوس کی طبع سوں کیں درد میں
ماندی' ص۲۳۵ 'س، ۸۲ گھاٹنا = گھٹنا 'کہ پہنچا مصر کو تئیں کارواں بحق رہی گھاٹنے' ص۲۳۸، ۸۳
بھونرالی جامن 'کنول کھل جائے گا جو دیکھ لو جامن ہے بھونرالی' ص۲۲۹، ۸۴ ہچی (قافیہ سچی) 'کہ مجھ اپنے
لب سیں دی ہچی' ص۲۵۰، ۸۵ چپل (مطبوعہ چپل) ۸۶ چھندی 'ہے کٹیلا چپل بڑا چھندی'

فرش کوچکتر بود موافق نشستن کہ آنرا گسترا بندہ ، عابدانِ ہنود پرستش سازند ۴ آٹھو ر
۵ آٹھر = جای ماندن بہایم ۶ آٹھواں = روز ہشتم بعد چولی کہ مردمان آن روز بجای معیّن
شوند۔ آصفہ میں آٹھواں کا میلا ، دریای لطافت میں آٹھوں پہر ۷ اٹھوانس = ہشت پہلو ۸ ا
بالف مقصورہ آصفہ میں بالف ممدودہ ۹ آٹھلاپن = شوخی وشرارت اسپ .. کہ سوار او
آن سبب از پشت خود بیندازد۔ (مصرع "آٹھلاپن ہے سمند ناز کا") اپوک (چوک سے) ۱۱ ا
رنگ کبوتر ۱۲ ادنگھائی = انگھائی ' ادنگھ سے ۱۳ ایڑ بھیڑ = خریدن وفروختن اجناس
واسباب .. وکنایہ از تباہی وسرگشتگی ۱۴ اچھوتا پنڈا ۱۵ آکھلی = گو دِ نشیب راہ ،
کہ پیل ازان صدمہ خورد ۱۶ آگ پر لکڑی سیدھی کرنا ۱۷ آگ دبانا ۱۸ آگ کا درخت
مدار کا درخت ۱۹ آگا تاگا = محاورۂ زنان ۲۰ آگے چھوڑ پیچھے دوڑ ' آصفہ 'بس'۔
۲۱ آلھا ۲۲ آنکھ مچولا ۲۳ ابری تفتا = رنگی باشد از کبوترانِ سبزہ ۲۴ اپنایت ' آصفہ میں
اپنائیت ۲۵ اجود = دوا .. ۲۶ ادرسا = قماش .. ۲۷ ادلا = گوشت ساقِ حیوا
باشد کہ آن ریشہ ندارد ۲۸ ادھ پئی ۲۹ ادھیا = نصف ماہانہ بود کہ بشرط نوکری بکسی داد
کنند۔ ۳۰ اڈّیان = درپاپوشہای ٹاٹبانی کہ پارچہ ہای بانات بجای پاشنہ دوزند۔
۳۱ ادھیلی ۳۲ اِرّا = قسم زبون ترلیٰ ؛ ۳۳ اڑّابہ = اسبابِ خیمہ وتوپ و مانند آن ؛
آن بار کردہ دہند و زگاوان کشیدہ برند ۳۴ اراک = درخت .. ۳۵ اردلی اتزنا
گاییدن چند کس باشد یک زن را در یک جلسہ ۳۶ اردلی بازار = بازاریست ندلکھ
واصل این لغت آنست کہ ہرگاہ پادشاہان ہند سفر میکردند ، در ہر مقام بازاری برای خرید اجناس
واسباب ضروری برای مردمان سواری مقرر میشد ۳۷ اڑا گوڑی = ضد وشرارت ۳۸ اڑبڑ
ناہمواری ونشیب وفرازِ راہ ۳۹ اڑ = خللِ معدہ .. ۴۰ اڑم = انبار ہر جنس ۴۱ اسکا
انگریزی لفظ .. ۴۲ اسگند = بیخیست اندک تلخ ، وبہترین آن ناگوری است ۴۳ اکپولہ
۴۴ اکرنگ = یکرنگ ۴۵ اکلیل الملک = گیاہ قیصر ۴۶ اک منزلا ۴۷ اکھنڈ = اسپ
کہ دندانِ شیر شکستہ باشد ۴۸ باجن = ساز نواختن ۴۹ باران کوٹ ۵۰ بارگیر = کسی
براسپ خود نوکر کناند ۵۱ باڑھیا (باڑھ سے) ۵۲ بازی ہرنا ۵۳ بازی ہروانا۔

۵۴ بالاکپی = ایک آلہ .. ۵۵ بالوکی دوات ۵۶ بانخ آصفہ میں بانجھ ۵۷ بالی بھولی
۵۸ بانا = چیزی از رشتہ بافند، و در پای کبوتران گردان دارند .. ۵۹ باندا = مرض درخت
.. ۶۰ باندغلام ۶۱ باندھنوں، آصفہ میں باندھنو ۶۲ باہرا = دسنی درچوب بازی ۶۳ بائی =
بازی .. ۶۴ بتبر = برندۂ موی پا ہای اسپ وشتر ۶۵ تباس پھپتی ۶۶ تبام، آصفہ
یں بوتام ۶۷ بتر بازی ۶۸ بٹ ٹرائی = امتحان سنگ ترازو ٹرائی انگریزی لفظ معلوم
ہوتا ہی ۶۹ بٹوائی ۷۰ بٹے بازی (زبانوں پراسی طرح)، آصفہ میں ٹبابازی ۷۱ بجھاوٹ =
تیزکردن کارد وشمشیر ۷۲ بجھایا پانی ۷۳ بجھرا = ظرف .. ۷۴ بجونگرا ۷۵ بنجی = بوریکوچک
۷۶ بدبومرد ۷۷ بدبورنڈی ۷۸ بدھاہوا = مسرور ۷۹ بڈہرا بڈہری = گیاہ ۸۰ براچینتا
۸۱ براد = بیزاری ۸۲ بہرانا = پاشیدن ۸۳ برنا ۸۴ برفیا = برف فروش ۸۵ برک،
انگریزی لفظ = کسی کہ قابل کار کردن نباشد ۸۶ برکہ، عربی = حوض ۸۷ برگد کی ڈاڑھی
۸۸ برنگا = تختہای کوچک .. ۸۹ بروٹ = مرض .. ۹۰ برہا = جای کہ درآن آب از
چاہ وتالاب آمدہ وروان شدہ درکشت وزراعت رسد۔ بکسر یا بزبان قصیہ سرا ییدن الفاظ
فزان ۹۱ بریتا = رسن گندہ .. ۹۲ بڑدنکھا = نیشکر .. ۹۳ بڑباگڑ = شیرہ .. ۹۴
بڑبڑیڑی (کذا) = بزرگان اموات ،، کہ فاتحہ آنہا در ہر تقریب شادی التزام زنانست ۹۵
بڑہنیا = کبوتر .. ۹۶ بڑچچی ۹۷ بڑسول = قرص سفید کہ از شکر سازند ۹۸ بڑکا ۹۹
بڑکتا ننا بڑیل ، آنچہ برای پختہ کردن سقف وبام اندازند از ریزہ ہای خشت وسفال -

●●

particulars given in the three inscriptions" and ignoring the usual hyperboles, one can say that the warrior saint's name was Ibrahim, the son of Abu Bakr; that he was a Syed, popularly called Ibrahim Bayyu; that he was entitled Saif-ud-Daulat; and that he was the Maqta of Bihar. See also Dr. Ahmad's fn. No. 3 on p. 38 of the above book about the Mahoris.

9. See also a note of Dr. Z. A. Desai in Epigraphica Indica, (Arabic and Persian) in 1955-56 and also the Urdu book already referred to regarding the word Bayyu.
10. Sirat-i-Firozshahi, translated and edited by the present writer.
11. Chandayan, edited by Dr. Parmeshwarilal Gupta.
12. Journal of Bihar and Orissa Research Society, 1919 p.p. 31-43

—:o o:—

an one account for the date, 1415=1355, of Sanskrit inscrption, wo years after the clearly stated date of his death, Sunday 13th ilhijja, 753 (20th January, 1353) ?

Was not Malik Mubarak. the warrior Chief and the Lord of Jalmau (U.P.), quite different from the husband of Ruqayya and aid to be the nephew of Malik Bayyu ? (e) The Urdu book gives he translation of a Farman granted by emperor Muhammad Shah n the 6th year and renewed in the 13th year of his accession in 143 A.H. The grantee, Badrus Salam; is said to have been a lirect descendant, on the daughter's side, of Malik Ibrahim Bayyu, nd the word Saiyed occurs in it. A son of Badrus Salam, named Darvesh Ali was given the offices of 'Qaza' (Judiciary), Ihtesab censorship of morals), and Khitabat (sermonisation). Keeping n view the great distance of time between the 14th and 18th enturies, and the transformation that takes place of facts and events at the hands of those who have a tendency for magnification and laudation of their ancestory, one may be pardoned for not taking such thingverys seriously.

---

**leferences—**


1. Peer-Pahari is named after Syed Ahmed called Peer-Pahar. See Blochmann's note JASB 1873.
2. Buchanan's an account of the District of Patna in Bihar 1811-12.
3. Vide Quraishi's Ancient Manuments in the Province of Bihar and Orissa : also A.S. of Indian Seres 1931.
4. Ravenshaw's article in JASB VIIIth, 1839.
5. Epigraphica Indica (1892) gives the text of one inscription.
6. Dalton ET : Ethnology of Bengal. It records a current tradition, which is exactly similiar to that found in the case of other saintly personages. e. g. see the writer's paper in Bengal, past and present, Calcutta, on the mausoleum of **Mamu-Bhanja** at Jaruha, Hajipur.
7. Martin's Eastern India 1838.
8. Dr. Q. Ahmad writes in his valuble book, Corpus of Arabic and Persian Inscriptions of Bihar "piecing together the

Malik Mubarak (d) About the campaigns, the first was led by Malik Bayyu in 749 under the directions of emperor Muhammad Tughlaq against some Hindu refractory chieftains of Chai champa in Hazaribagh region. The second compaign was led against Bithal who is said to have been a petty ruler of Bihar who had oppressed and fleeced the Mahuri Merchant of Mathura who subsequently settled down in Bihar and still commemorate the relief offered to their ancestors. The third and the most important compaign was led against Hans Kumar, who was probably a Cheru Chief with his strong hold in Rohtas. On the occasion of a visit to Nalanda Bargaun the Hindu Chief had killed the son of a muslim lady on whose complaint Malik Ibrahim was sent to Bihar to Chastise the Rajah. After repeated and bitter struggles the Rajah was killed; but his people who had dispersed, took the Malik unawares from behind and killed him, suddenly coming out from their ambush. The corpse of the warrior saint was brought and burried on the hill top of Biharsharif. There is a bare reference to the successful raids against the Chakwar pirates on the Begusari side of the Ganges But the family records of the Chakwar bear witness to the struggle.

Both the authors have drawn upon the observations of Hazrat Arshad of Jaunpur in his late 17th century book, Ganj-i-Arshadi, which we have already considered. There are several questions well worth consideration, why is there a complete absence of all references in contemporaneous Sufic Literature to Malik Bayyu ? Why are the verses on the mausoleum completely devoid of any reference to his descent from the Prophet of Islam, or his death as a *shaheed* or martyr ? The verses are only partially helpful, viz, the Maqta of Bihar, Malik Saif Daulat (the sword of the state), Safdar Saf Shikan (the breaker and the arranger of ranks). Madar-i-Mulk Ibrahim Bubkr (Malik Ibrahim son of Abu Bakr and the pivot of the realm). The day and date given in it is 13th Dhul Hijja 153 A.H. Dr. Qeyamuddin rightly observes that there are good reasons to believe that Ibrahim Bayyu served under Muhammad Tughlaq, but he died in the time of his successor Firoze Shah Tughlaq. Dr. Ahmad has described Malik Ibrahim as the governor in Magadh on behalf of FirozeTughlaq. Can the Maqta of the Persian and Mandaleshwar of the Sanskrit inscription be taken as analogoues ? How

Safar, has a reference under the date 1st Jamadi I 782 A.H. It tells us that "Salah Mukhlis, Naib-i-Ghaib-i-Daud Khan" came to offer his congratulations to Makhdum Sharafuddin on the occasion of the first (Ghurra) of the month. He had brought some sweet smelling flowers in a towel (Rupak) for the saint; but the latter issued his 'Farman' that it should be distributed among those who were present in this assembly. The word 'Ghaib' or 'Ghaibat' requires further thought. Did it mean that Salahuddin (son of Mukhlis) deputised for Daud in the latter's absence, was the compiler of Munis-ul-Muridin and the same engineer who built the fort for Firoze Shah in the Saran district ? Much depends upon the establishment of the identity of Asadul Haq-wa-d-din Daud Khan referred to in these inscriptions. Was he the eldest son of Malik Ibrahim Bayyu ?

The two books; Riyadh-un-Naim by one who claimed direct descent, in the twentieth generation, from Malik Bayyu, and the larger work, Tarikh-i-Malik, represent attempts in modern periods to furnish a biographical sketch of the life and activities of their alleged ancestor who lies buried on the hill in Bihar. Besides the three inscription of the mausoleum, with six and twelve verses on slabs fixed on the eastern and southern entrance, and twelve more on a slab which was removed to Calcutta museum, the writers of these books in Urdu have banked upon two genealogical tables or Shajara they found in the Zafarabad and Islampur Khanqahs. The present writer had seen the Islampur Shajara which did not appear to be very old. The light shed on the warrior saint in these two books come to the following points (a) Malik Bayyu was directly descended, in seventh generation, from Ghaus-i-Pak, Abdul Qadir Jilani, who was a Hasani Husaini Saiyed, and the founder of the Qadri Order of Sufis. (b) Malik Bayyu came from But Nagar in the vicinity of Ghazni whence came also Bibi Ruqayya, said to have been the grand daughter of Jaliluddin, one of the four brothers of the celebrated Makhdum Sharafuddin Maneri (c) Besides seven sons, Malik Bayyu had left two daughters, one of them, Bibi Mahinyan, was married to Zafarabadi Saint, Sadruddin Chiragh-i-Hind, not a Saiyed like Saaduddin Aftab-i-Hind, who was connected by marriage with the ruling chief of the Saiyed dynasty of Bengal; and the other was the wife of his brother's son, named

scattered, scarce inscriptional stone slabs, the most important and complete is that which belongs to a mosque, dated 765 or 13 by, and is now attached to the chiraghdan of a tomb in Ambair Dargah. It says that the sacred structure had been raised during the "Ayalat" (Governorship) of Asadul Haque wa-d-Din Ulugh-i-Azam Daud Khan". Was this Daud, the eldest of the seven sons referred to in Ganj-i-Arshadi; and should he be taken as the successor of Malik Bayyu ? What about the Chaghtai title given to him ? Was it due to the dignified position he occupied ? An earlier in-scribed stone slab, transferred from Bihar to Calcutta museum, refers to the time (Waqt) of Khanzada Sulaiman (bin) "Ulugh Daud Khan"; Another fragmentary stone which Dr. Qeyamuddin brought out from the debris piled up in the Dargah of Shah Qumais, Bihar, giving, like the others, the name of the reigning Sultan Firoze Shah Tughlaq, tells us about the identity and connection of these personages with Malik Bayyu. Can it be taken as a fact, as has been done by some scholars, that Daud was the son and successor of Malik Ibrahim Bayyu and ruled from 753 to 765 as Governor of Bihar, and he was succeeded by his son, Malik Sulaiman, and the latter had a son, Malik Sirajuddin mentioned in an undated inscription in the Dargah of Shah Qumais. We can concede that the juxtaposition of name is indicative of *ibniat or kunia* (that is patronym taken from father). But we need stronger and more certain evidences to fortify the facts of the alleged cnnections between them and the main subject of this paper.

Reference has been made above to the inscriptional stone attached to the gate of a Dargah in village Tajpur Basahi in the old Saran district. This partially mutilated black basalt stone was originally attached to a strong Fort (Hisn-i-hasin) built by Sultan Firoze Tughlaq in 774 in old Saran. It is worth-while to mention here that the builder or engineer who built this Fort, names himself as Salah Mukhlis Daud Khani, and it was the same person who compiled an important Malfuz of Makhdum Sharafuddin Maneri, named Munis-ul-Muridin, and it contains the same date 775. His honoured spiritual guide was so pleased that he took off from his head his own turban and put it on his head. Salah Mukhlis was really Salahuddin son of Mukhlis Khan who described himself as Daud Khani. Another Malfuz, called Malfuz-us-

said to have been a high class noble. Neville, the compiler of the old Jounpur Gazetteer refers to a rare work, Manaqib-i-Darweshia, only a few pages whereof were fortunately shown to the present writer by a representative of the family. It appears that there was 'Musaharat' (Marriage relationship) between the family of Malik Ibrahim Bayyu and the well known contemporary saint, Sadruddin 'Chiragh-i-Hind Zafarabadi (Jaunpur). This lends some support to the claim of honoured ancestry put forward by Malik community for the warrior saint of Bihar.

Buchanon, the English traveller, in his report of 1811-12, tells us that he visited the mausoleum on the Bihar hillock which he described as a structnre of rather crude construction. a quadrangular with sloping walls and a clumsy dome. Surprisingly enough, Buchanon, has made no mention of the Persian Inscriptions on the mausoleum and on the sides. He refers to twenty five houses of people claiming intimate connection with, and attached to, the tomb. They described themselves as the hereditory 'Mujavirs' or 'Khuddams' (Custodians, Keepers, Servants), devotedly employed for lighting and cleaning the mausolsum and the surrounding area which was studded with pucca tombs.

The writer feels indebted to his ex-pupil and friend, Dr. Ved Prakash of Guru Gobind Singh Collego for supplying the copies of certain archival documents in the Patna Secretariat Library, consisting of 'Rubakars' or court proceedings, and also of a 'Mahzarnama' or petition with attested signatures of all those who were present on the occasion. The documents bore the dates, 1847-48. The petitioner, Panah Ali and some others, claimed to have enjoyed the 'Muhtarifa', that is duties levied on certain trades and occupations on yearly or monthly basis, for services rendered in connection with the Mazar of Syed Ibrahim alias Malik Bayyu, built 51o years back. The difference of a decade and a half must be taken as an approximate estimate. Some may take the use of the word Syed here as conjecfural rather than real; but the persistence of the traditions, still cnrrent, cannot be ignored.

We may now turn to the evidences furnished by epigraphic sources, and also certain allusions in Sufic literature which may be clothed by some with a sense of actuality. Of the scanty, stray

went together for we have at least some rare cases in the history of Khaljis of Delhi; one is that of Syed Wahiduddin, and another is that of Qutbuddin Quraishi, and both were called Malik. The difficulty in settling the question of lineage and position arises when we are confronted with the question of the immediate successor of the warrior saint, who had the epithet of Ulugh-i-Azam added to his name. Will not one be justified in presuming that he was one of the best representatives of the central Asian adventurers who came sometime during the reign of Md. Ibn Tughlaq; that the Sultan deputed him to protect the weak and the distressed against the strong and the refractory chiefs, oppressors, pirates and plunderers, and by sheer force of his right arms he swept over the whole of Bihar, north and south, chastising and vanquishing a Chero chief of Rohtas, the Chakwar pirates of Samoh in Begusarai region, and some tribal chiefs in Chhotanagpur area ? It is the long continued and persistent local traditions which may lead one to such suppositions or presumptions. But presumptions cannot be treated as actuality. Why is it that nowhere in any of the epigraphs, there is not the slightest indication of his career and achievements, the manner his death as also of his Arab origin and antecedents ?

There is very little beyond the names of Malik Bayyu and some others in the Jain temple Sanskrit inscription of Rajgir, and in the Awadhi poem, Chandayan of Mulla Daud. The former, noticed by P. C. Nahar, in J.B.O.R.S., Patna, in 1919, is dated 6th day of Asarh, 1412 V.S., corresponding to 1355, that is two years later than the date of the inscriptions of the Bihar mausoleum. It first eulogises the reigning sovereign, "Sultan Phiroj Saha of Dilli, the ruler of the world, and the protector of the good, with his lotus feet and the shoots of rays emanating from jewels of his turban. The 2nd and 3rd names which occur in the inscription are those of the "Mandaleshwar (Governor) Malika Bayyu", and of his "Sewaka" (Assistant), a new name, Masarat-ud-Dina (Nusrat-uddin) who probably deputised for him in Rajgir. As for Chandayan which is a story of Lorik and Chanda, composed by Maulana Daud (Daud Kab Jo Chanda Gayee) in 781 (Baras Sat Sai Ho Ekasi), under the auspices of Khan-i-Jahan Jouna Sah, the Prime Minister, (Jauna Sah Ojir Bakhana) of "Sah Phiroz Dilli Surtana." It mentions Malik Baya along with his son Malik Mubarak, who i

not Daud but Malik Mubarak who has been mentioned as the eat noble and son of Malik Baya "Malik Baya Put Udharan hiru; Malik Mubarak tahan Ke Meeru". He is 'randhir in yudh' (war), a Sringar (adornment) of the royal army, and, he is superb th in war and liberality.

Despite all these facts and allusions, we have still much out Malik Baya or Bayyu that is hazi, mazi and bewildering. ere is a good deal of confusion about his origin and antecents, earlier habitation, racial extraction, motives, purposes and casions of his advent in India, the great deeds that he rformed, and the circumstances that led to his death. The epiaphical or inscriptional evidences tell us of something as to who was, what was he like, his virtues and his fight for his faith; t not as to when and whence he came and why ? We are not a position, on the basis of all that we have, to say, what his cient lineage and honoured ancestory was which the local tradins, still current among those who claim direct descent from n, ascribe to him.

Let us try to see what the inscriptions say. The text with the ranslation have been published, but we may consider here only hose words and expressions, which are suggestive of certain ssential features, and flash new light. Some of these are as llows : Madar-i-Mulk (the pivot or the centre of the realm); lalik Saifi-i-Daulat, (the Lord of the sword and the state); Safdar afshikan (keeper and breaker of ranks); Brahim bu Bakr (Ibrahim he son of Abu Bakr); Maqta-i-Bihar (the feudal Lord or the lilitary Governor of Bihar). The lofty and high sounding epiets and appellations and the expression "Hami-i-Deen" (defener of the faith) "Kuni Diwar-i-Khakash ra Muattar" ( make the thes of its wall fragrant ) have their own meaning and value. here is, however, not the slightest indication, in any of the line, hether he was a Syed or a Tatar Turk with the appellation of lugh-i-Azam, and as to how he fought for his religion and where.

Significantly enough, there is no such thing as Ulugh or n, a Chaghtai or Turkish title, nor Mir or Syed which are well wn Arabic words. One cannot say that Mir and Malik never

the undertaking by lifting up some bricks for the building. Surmises drawn from juxtaposition of things found scattered side by side, or the local traditions, uncritically taken for granted, by a pious but credulous writer cannot be a safe and helpful guide in establishing the identity of the venerable figure lying within the mausoleum in Kaghazi Mahalla. All that can be said is that he must have been a highly respected personage, once a cynosure of people, a centre and object of homage, attention, allegiance and reverence so as to attract somebody, possessed of power and means, and capable of raising a splendid spacious mausoleum of such a size and so solid as to defy the wear and tear of times after a lapse of more than six centuries.

As regards, the warrior-saint, Malik Ibrahim Bayyu, lying buried on the Bihar hillock, the subject of this paper, there is no such historic uncertainty as to require a mere conjectural reconstruction and any elaborate process of re-instatement and re-establishment of his personality. Apart from the three versified Persian inscriptions on his mausoleum, we get a rare Sanskrit inscription on a stone tablet which once adorned the top of a Jain temple on the Rajgir Hill. All these furnish us with direct evidence about our hero and his individuality. Though, there is a total lack of contemporaneous historical writings, throwing any light on the subject, and the fairly copious Sufic literature produced in Bihar in the 14th and 15th century is also completely devoid of all mention or references about him and his performances, there is a very important reference in a unique contemporary manuscript, Sirat-i-Firoze Shahi, available in Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna. Among other nobles, mention has been made of Daud (bin Malik) Bayyu. The doubling of the word 'Daud', ( Da'ud Ibn Da'ud ) a name of considerable importance, was probably a mistaken insertion by the scribe. There is another documentary or literary, and a-near-cotemporary, evidence, in the Hindi poem, named Chandayan, composed in 781 by Mulla Daud of Dalmau, in Rai Breily District (U.P.). The name of a Daud and possibly his successors occur in some of rare scattered inscribed stone slabs. One is found on a Chiraghdan of a tomb in the Amber Dargah, Bihar-sharif, and another is on the gate of a Dargah in Tajpur Basahi in Saran District, lel belonging to the time of Firoze Shah Tughlaq. In Chandaya nit

laid in eternal sleep in their burial vaults in Bihar town, one on a hillock called Peer Pahari, and another in Kaghazi Mahalla. Something definite and certain, but not much, can be said about the former, but there is little or nothing except a single, solitary, lean and later evidence to bank upon about the latter. Both belonged to the 14th century and died one after the other. The essential features of the Tughlaq style of architecture, the sloping wall, is possessed by both the structures. While the larger or more spacious and imposing mausoleum in Kaghazi Mahalla is completely bereft of all internal evidence, inscriptional or otherwise, about the respected personage lying in eternal rest in it; and it is devoid even of a socket or hollow which could have been indicative of an inscribed slab, the case is different about the smaller domed mausoleum on the hill for it was provided with as many as three inscribed slabs on the entrance wall and on the sides. The magnificient mausoleum is ascribed by a well-known Sufi saint of Jaunpur, the author of Ganj-i-Arshadi, a late 17th century work, to a pious and scholarly personage named Shah Muhammed Badh Seistani. Round about the mausoleum ascibed to him, there appears to have been once a cluster of buildings which in course of time toppled down. Some inscriptions of the Sultanate and the Mughal times are still found on the wall of a Qanati or roofless mosque. Of these one is that of Sultan Ibrahim, the Sharqi King of Jaunpur, and it is dated 807. Lying here and there, within the demolished walls and enclosure, in the proximity of the mausoleum, one can still find many painted and polished marble slabs of Persian pattern, and on the way of the mausoleum, one can see the broken pieces of a black basalt stone pillar of ancient times. The Sufi saint of Jaunpur must have blindly accepted the local traditions which were still current in his time about the venerable Seistani scholar who, according to the same writer, was an elder contemporary of Makhdum Sharafuddin Ahmad Maneri, and also probably his teacher. We are told that the Makhdum occasionally came to the place to offer his Fatiha to the departed soul. There is a self conflicting statement made by the author of Ganj-i-Arshadi that when Malik Ibrahim Bayyu died, and Daud, the eldest of his seven sons, began to build his mausoleum, Makhdum Sharafuddin, Shah Muhammed Badh Seistani and Ahmad Ghirmposh came to bless

man of high distinction, bearing lofty appellation such as "Khan-i-Kabir, Tahamtan-i-be-nazeer" ( the great Lord and the peerless warrior), "Ulugh Taghi Khan bin Boghra Khan". Is there anythin anywhere to enable us to establish his identity and flesh, clothe an animate the grey powdered stuff of his decayed bones ? A broke stone slab, found lying in the gate of a house in Bihar town mentions the reigning King, Firoze Shah Tughlaq, and conatins a expression which is as much attractive as it is inexplicable. Thi is the "Hajib-i-Hinduana-i-Mamalik". Does it mean, the chamber-lain in charge of the Hindus of the realm ? Have we heard of an such official functionary ?

The elements for the composition of historical works or bio-graphical accounts are generally sought in writings coming dow from contemporary chronicles of events, and stress is laid on bot contemporaneity and credibility. There are many pitfalls such a bias, prejudices, predilections and sentiment of conceit, and c magnifying the lineage and ancestry of somebody. There is also lack of facts and sense of continuity and chronology. But a stude of history doing something in the sphere of research would n feel deterred either by the paucity of materials or other defects an difficulties. He knows that facts and circumstances are rooted i the soil of records, which may be documentary, epigraphical c archaeological. It is not an easy task to reach an absolute tru regarding something that had happened in the distant past. But h would not give up his pursuits and would like to grapple with th problems facing him. Even the meagre and later evidences hav some value, and the flashes which have circumstantial and inferen-cial implication cannot be totally ignored. One would welcom whatever looks like a new and un-expected light and has som bearing on the aspects of his subject of enquiry. In the absen of solid facts he would try to draw certain inferences helpful for th knowledge of the facts, knowing full well, however, that even aft being carefully weighed and examined his surmises may turn o to be groundless testimony, and nothing better than mere sugges-tions or suppositions.

With a view to find out the truth let us try to grope in th light and darkness, in remote past, regarding two venerable figure

illustrated by copiously quoted verses and apt stories and anecdotes. Devoted followers and disciples like Zain Badr Arabi, Ashraf Rukn Balkhi, Salah Mukhlis Daudkhani, and others who were present in the Majlis or the Assembly, compiled the collections of the sayings or the discourses of the master and also of the letters written by his own hand by the Shaikh and addressed to distantly placed disciplies.

Although, we are fortunate to have somewhat copious contemporary supply of evidences high-lighting the activities and influences of the Sufi mystics and Shaikhs, principally of the Firdausi and the Shuttari orders, and occasionally flashing certain ideas on something of socio-religious and cultural interests, but these are largely views and thoughts rather than what could be enshrined in history as systematic records and continuous narrative. Besides that, have we got all that emanated from the pen and lips of the spiritual leader ? For example, there is nowhere any trace now of the correspondence of Makhdum Sharafuddin and Sultan Sikander Shah of Bengal, which has been referred to in his Maktubat by Maulana Muzaffar Balkhi. Do we know all that was worth knowing, reliable, and certain about the life and times of the venerable spiritual leader and his devoted disciples and companions, worthy characters — socially, intellectually and culturally — and of hallowed associations ? Many men of rank and position with their own individuality of character and conduct, piety and virtue, valour and fortitude, position and rank, and of distinction, who shone at their best in their respective spheres, vanished in obscurity. Ungrateful posterity allowed legends, idle gossips, guesses and conjectural references to give colour and fullness to many characters, facts and events which had become historic uncertainties, and were shrouded in mists and mazes of antiquity and obscurity. Can we say how many people became non-entities, being disregarded and forgotten by the people of the time and of the future ? One can recall here the poetic line in English, "Many a gem of purest ray serene — The vast unfathomed ocean bears" A case in point is furnished by a broken basalt inscribed stone slab, discovered by chance, somewhere in Bhagalpur town. It takes us back to the time of Sultan Firoze Tughlaq and tells us of a

could not be taken as identical with, the material universe or th
human soul. They held that the whole atmosphere around an
everything in the universe was a manifestation and a reflex of th
Divine, for we can have no reflexion of light without light.

How good and glorious was the time in Bihar when man
like-minded seekers of God were engaged in the religious an
moral pursuits, and being inspired by the discourses delivered b
a great Shaikh and a learned Sufi of towering personality, the
made history. Bihar at that time was directly under the Tughlaq
and, was a part of their vast Empire. They had an organised Gover
nment run by the formation of an efficient official class, workin
in the interest of peace and tranquillity and for the welfare o
the people, under the orders of the crown. This was the period o
great Sufic Institutional establishments, Khanqah's and Jama'at
khanas, serving not only as the hospices and resting places fo
travellers and way-farers but as homes for the weak, sick and th
destitute. These establishments resounded with the lessons, deli
vered on theology, mysticism, scholastic philosophy, exegesi
law, ethics and morality. The Sufi Shaikhs expounded the ou
come of their experimental knowledge, intuition or insight. The
were discussions and dialogues on tenets of the faith, the way o
the Sufis, and the spirit and meaning of the texts of the scriptur
and the traditions or the sayings of the Prophet. The religiou
devoted ones practised severe religious exercises, withdrawi
themselves into seclusion, while others held Sama' or auditio
indulging in ecstatic songs which were deemed a means of attai
ing communion with the Lord. The spiritual leaders made ferve
exhortations to their fellow-men to pursue the path of truth a
morality so as to lead honest and pure moral lives.

It was at this time that the pioneer of the Firdausi order
Muslim mysticism in India, Makhdum Sharafuddin Ahmad Man
had been persuaded to return from his wanderings on hills and ju
gles, and settle down in Bihar-town where he expounded his te
chings, setting forth explanations and interpretations of the scri
tural texts and of recorded reliable traditions. Not only princip
of law and jurisprudence, philosophic subtleties of scholastici
but also dogmas and doctrines were brought home to the audien

The 14th century is an important period in religious history, here was an effulgence of mystical activities and considerable eriments of various forms of spirituality of great influence, both e East and the West, Asia and Europe. Dame St. Juliana of wich, the anonymous author of the great classical and mysl writing, "The Clouds of the Unknown" which laid down that love the Absolute may be gotten and holden, but by thoughts understanding never", and the great Flemish mystic, Jan Ruybroeck, described by Evelyn Underhill, in the edition of work (1293-1381), as "one of the very greatest in the world". their counter-parts in Sufi savants and learned mystic Shaikhs ver northern India from Sindh, Multan and Delhi to Bihar and gal. It was an age of religious activities and mystic quest for one, unknown, unknowable, and it was a time of great devenent of the mystic way of life, and a craving of human spirit nite with, and get abiding rest in, the unseen Divine Reality mystic sought knowledge of God through love and the lium of personal experience rather than of the reason. The 14th tury was also a hey-day of many-sided activities and a period loom of religious and material prosperity. Sufism or Islamic sticism was the prevailing form of religion of the Muslims. e, in the area of the world we live in, Bihar, the mystical sys- while emphasising the need of seeking direct communion of soul with, and absorption into, the Infinite, the Eternal, evinstrong transcendental perception of Islam; they brought myism in close relation with theology and morality. They the creator through the creation, and they believed that the nite, absolute and incomprehensible was the author of, and

*The legendry ancestor of the Maliks of Bihar, Malik Ibrahim, or Malik Bayyu as he is popularly known, was the Governor of Bihar during the reign of Muhammad and Firoze Tughlaqs. Died in 753 A.H. ( 13th Zul Hijja ), his mausoleum on Pir Pahari, the highest peak in Bihar Sharif, still dominates the surroundings.*

*Prof. S. H. Askari has tried to determine the historical position of the great Malik and his times on the basis of epigraphical sources, the available historical material and family traditions.*

# Historical Fragments Relating to Malik Bayyu & His Times

By
Prof. S. H. ASKARI

**Our Contributors :**

- Dr. Mas'ud Husain (Aligarh), Nephew of Dr. Zakir Husain, D. Litt. from Paris, formerly Vice-Chancellor, Jamia Millia, Delhi and Professor of Linguistics, Usmania and Aligarh Universities. For details *see* p. 4 of this Journal.
- Mr. Khurshid Alam Khan (Delhi), Son-in-Law of Dr. Zakir Husain, Minister of State for Tourism & Civil Aviation, Govt. of India, For details *see* p. 26 of this Journal.
- Mrs. Saliha Abid Husain (Delhi), a co-worker of Dr. Zakir Husain, during Jamia Days, daughter of Khwaja Ghulam us-Saqalain and wife of Dr. S. Abid Husain; an eminent novelist & short story writer. For details *see* p. 36 of the Journal.
- Mr. Abdul Latif Azmi (Delhi), a student & co-worker of Dr. Zakir Husain during Jamia Days. Formerly editor of monthly 'Subh'; editor ( and then Sub-editor ) of monthly 'Jamia'. For details *see* p. 48 of this Journal.
- Mrs. Anis Kidwai (d. 1982), an eminent Writer of Urdu daughter of Wilayat Ali Bambuq, who was a co-worker of Maulana Mohammad Ali and died in his early age; sister-in-Law of Rafi Ahmad Kidwai. Formerly member of Rajya Sabha. For details *see* p. 66 of this Journal.
- Hm. Mohammad Imran Khan, Fellow, Arabic & Persian Research Institute, Tonk, Rajasthan.
- Hm. Wasim Ahmad Azmi, BUMS (Lucknow), Research Assistant Literary Research Unit ( Unani Medicine ), Khuda Bakhsh Library, Patna.
- Mr. Ahmad Yusuf (Patna), Urdu critic and short story writer.
- Mr. Rais Nomani, founder of Persian Academy, Lucknow; editor of Persian periodical 'Ibarat'.
- Dr. Kalim Sahsarami, D. Litt., Professor of Linguistics, Rajshahi University, Bangla Desh.
- Mr. Masarrat Husain Azad, Secretary Saulat Public Library, Rampur (U.P.), formerly editor, 'Al-Faruq' and 'Jauhar'.
- Mr. Mohammad Umar Saifi (Tonk), a devotee of Urdu Literature, possessing a remarkable collection of periodicals & letters of Urdu Poets and eminent Scholars.
- For others,

  *See* Journal Nos. 1, 12 & 16.

## CONTENTS

The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the aterial preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or haveing any concern with it.

Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

Notes and addenda, by way of corrections and additions to any information published in this Journal or in any publication of the Library e. g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

**Rs. 15-00 per copy**

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S.A. & Other Countries : 24.00 Dollars

*Printers :* Hindustan Printing Works, Rampur, U.P. &
Patna Litho Press, Patna-4
*Publisher :* Mahboob Husain, for Khuda Bakhsh O.P. Library, Patna

# KHUDA BAKHSH LIBRARY

# JOURNAL

# 19

1981

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

خدا بخش لائبریری

۲۰

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۲۳۲۴/۷۷



بیسواں شمارہ : ۱۹۸۲ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : پندرہ رُپے

| | | | |
|---|---|---|---|
| سالانہ خریداری | اندرون ملک | : | ۶۰ رُپے |
| | پاکستان | : | ۱۲ ڈالر |
| | یوروپ | : | ۸ پونڈ |
| | امریکا اور دیگر ممالک | : | ۲۴ ڈالر |

محبوب حسین نے اُردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس، رمنہ لین پٹنہ ۴ میں اور انگریزی حصہ ہندستان پرنٹنگ ورکس کملا سیور دہلی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری سے شائع کیا

# فہرست

# اس شمارے کے لکھنے والے

● پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی: (پ ۱۹۰۷ء)، سابق صدر شعبۂ فارسی پٹنہ یو
سابق ڈائرکٹر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ، سابق آنریری سکریٹری خدا بخش اورنٹل پبلک لا
۔آپ کی تصانیف میں مطالعۂ حسرت، مطالعۂ شاد، تنقیدی مطالعے، تحقیقی مطالعے اور قابل
قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے متعدد کتابیں ایڈیٹ کی ہیں، جن میں سفینۂ خوشگو سہ
دیوان امین عظیم آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ "سفینہ" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ زیر ادا
ہے۔ فی الحال خدا بخش لائبریری کے فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست کے نگراں ہیں۔

● جناب بدرالدین طیب جی (پ ۱۹۰۷ء)، آکسفورڈ کے گریجویٹ۔ آئی، سی، ایس۔ آز
کے بعد بلجیم اور دولت مشترکہ میں ہندوستان کے پہلے نمائندے ہوئے۔ پھر انڈونیشیا، ایران،
جرمنی اور جاپان میں سفیر ہوئے۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر
آپ کی تصانیف میں 'چیف اینڈ گرین' اور 'سیلف ان سیکولرزم' قابل ذکر ہیں۔

بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱، ۱۲ اور ۱۹

# کنز تواریخ

تیرھویں صدی ہجری کی تاریخیں

۱۲۰۳ھ - ۱۲۹۹ھ

(قطعاتِ تاریخی سے ماخوذ)

شاہ غلام یحیٰ عظیم آبادی

(م ۱۳۰۲ھ)

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

۱۹۸۳ء

# پیشگفتار

شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی کے قلم سے یہ ۱۲۰۳ھ سے ۱۲۹۹ھ تک کی تاریخیں ہیں۔ اہم اشخاص کی پیدائش (=پ) وفات (=م) شادی کی تاریخوں اور بعض مساجد کی بنا وغیرہ کے سلسلے میں یہ مواد ان کے مجموعۂ قطعات تاریخی موسوم بہ کنز تواریخ سے ماخوذ ہے۔ یہ مخطوطہ خدا بخش میں محفوظ ہے۔

لائبریری کی طرف سے اس سے قبل محمد سعید حسرت عظیم آبادی کے اسی قسم کے قطعات تاریخی سے متعلق مواد تاریخہای پیدائش و وفات معاصران کے نام سے پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی شمار کی جائے۔

"سید شاہ محمد یحییٰ نام، یحییٰ تخلص اور ابو محمد کنیت ہے۔ والد کا نام سید شاہ وجہ اللہ فرحت تخلص اور دادا کا نام سید شاہ احمد اللہ ہے۔ شاہ کی اصلی شہر پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۰۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ سید شاہ سلیمان پھلواروی حاذق نے تاریخ وفات لکھی جس کا ایک شعر یہ ہے:

سال تاریخ نوشتم حاذق ❊ شاہ یحییٰ بجنان رحلت کرد

حضرت یحییٰ کا قلمی دیوان بلکہ اسے کلیات کہا جا سکتا ہے اب تک محفوظ ہے اور راقم کے پیش نظر رہ چکا ہے۔ سید شریف الدین احمد عرف بچو صاحب عظیم آبادی جو جناب سید شاہ محمد یحییٰ کے نبیرہ ہیں، اس کلیات کو بطور خاندانی تبرک کے سینے سے لگائے ہوئے کراچی لے آئے ہیں۔۔ جناب سید شاہ محمد یحییٰ کے فرزند شاہ مہدی کی شادی خواجہ سید فخر الدین سخن دہلوی ثم آروی صدر اعلیٰ کی پہلی بیوی کی دختر سے ہوئی تھی۔ آپ نے عربی و فارسی علوم متداولہ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی سے حاصل کی۔ مولانا محمد سعید حسرت سے شعر گوئی میں بھی اصلاح لیتے تھے[1]"

کنز تواریخ کا قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ فارسی اور کہیں کہیں اردو قطعاتِ تاریخی پر مشتمل ضخیم نسخہ ہے جو بڑے سائز کے ۵۴۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

---

۱۔ مسلم شعرای بہار جلد پنجم از حکیم سید احمد اللہ ندوی، صفحہ ۱۳۶

مؤلف نے جو دیباچہ لکھا ہے اس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے :

"بعد حمد و نعت میگوید خاکسار دل برکندہ از دین و دنیا محمد یحییٰ ابوالعلائی ولد صوری و معنوی حضرت شاہ وجہ اللہ ابوالعلائی قدس اللہ سرہٗ کہ ہمچوان از سن صبا شوق فن تاریخ در سر داشت و این گرامی صفت را بترغیب و تشویق جناب عم مرحوم شاہ لطف اللہ ذوق اذاقہ اللہ نعم الجنان کہ مارا در آغوش ناز پرورش میکردند، از والد بزرگوار خودم می آموختم۔ پدرم تاریخہا از من میگویانیدند و برای اصلاح در حضور خال مولانا السید بشارت علی خفا تخلص الحقہ اللہ بآبائہ الطاہرین کہ بدار السلطنت لکھنؤ در سرکار شاہ اودھ بر پایگاہ جلیل سربلند بودند و در اصناف علوم و فنون دستمایۂ بزرگ داشتند، کما یظہر من تصنیفاتہٖ میفرستادند۔ حضرت خال صحیح مارا تعلیم میکردند و از اکثر قواعد تحریراً مطلع می نمودند۔ و از حضیض نقصان باوج کمال میرسانیدند۔ تا اینکہ زمانہ نرد دغا باخت، والد و خال و عم من رحمۃ اللہ علیہم شہر خموشاں توطن گزیدہ، لبم را بشور و فغان آشنا ساختند۔ آخرکار در حلقۂ درس حضرت مولانا و استاذنا مولوی محمد سعید عظیم آبادی حسرت تخلص انار اللہ برہانہٗ زانوی ادب تہ کردم و در چند سال مختصرات صرف و نحو خواندہ از اقتباس انوار صحبت کثیر المنفعت مولانا بتاریخگوئی مناسبت صحیح پیدا نمودم، و اکثر و بیشتر مورد تحسین جناب استاد مرشدم۔ چند مرتبہ تاریخہارا جمع کردم لیکن گزند عین الکمال باو رسید، از بیشتر تلف شد و محنت برباد رفت۔ الحال کہ سنہ یکہزار و دو صد و ہشتاد و ہشت ہجری است، و فرزندم محمد مہدی طال عمرہٗ کہ عنقریب بمکتب نشستہ۔ انشاء اللہ تعالیٰ درین فن بر جد و پدر سبقت میکند، بخیال آمد کہ گفتہای خودم را کہ چون اوراق خزان دیدہ منتشر و پراگندہ است مرتب و مجموع سازم، یزدان را شکر کہ بمحنت یکماہ امروز کہ چہاردہم ماہ صفر روز جمعہ است از تعب سواد برداشتن نجات یافتم۔ کما قلت

قطعہ اولیٰ : شد مرتب بمحنت بسیار + فکر یحییٰ مجلد تاریخ

برجواد مؤرخین انصاف پسند آنست کہ اگر بمعائنۂ این تواریخ محظوظ سازند من بیدستگاہ را بدعا یاد و شاد فرمایند و بر خطاہائم مونگیرند :

شاعر نیم و شعر ندانم کہ چہ باشد

من مرثیہ خوان دلِ دیوانۂ خویشم"

کنز تواریخ جس کا ایک اور تاریخی نام "مجلد تواریخ" ہے اس میں اولین تاریخ قطعہ رسول اکرمؐ کی تاریخ پیدائش پر ہے، پھر وفات نبویؐ پر، پھر تاریخ بتاریخ پہلی، دوسری اور تیسری

صدی کے دو دو چار چار اہم سنین کی تاریخیں ہیں۔ پھر گیارھویں اور بارھویں صدی کی چند تاریخیں ہیں۔ تیرھویں صدی ۱۲۰۳ھ سے شروع ہوتی ہے اور اگرچہ معاصرت کے لحاظ سے ہمیں ۱۲۵۴ھ کے آس پاس سے شروع کرنا تھا لیکن اس خیال سے کہ تیرھویں صدی ہجری مکمل کر لی جائے اس انتخاب کو ۱۲۰۳ھ سے ہی شروع کیا گیا ہے۔ انتخاب میں (سوائے غالب اور دو ایک اسی قسم کے اہم اشخاص کے) قطعہ کا صرف وہ متعلقہ مصرع یا مصرع کا ٹکڑا لیا گیا ہے جس سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

کنز تواریخ محمد سعید حسرت کے تاریخی قطعات کے مجموعے سے زیادہ ضخیم ہے اور اس لئے زیادہ اشخاص پر حاوی ہے۔ اپنے اس قسم کے انتخابات میں ہم صرف معاصر حصہ لیتے ہیں جس پر پورا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ یہی نکتہ اس انتخاب میں بھی پیش نظر رہا ہے۔ تاہم تھوڑی چھوٹ دے کر پچاس سال اُدھر کی تاریخوں کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے۔

عابد رضا بیدار

●●

---

مخففات : م = وفات کے لیے
پ = پیدائش کے لیے

---

# کنز تواریخ

○

هم :- حضرت شاہ رکن الدین عشق قدس سرہٗ - واقعہ ہشتم جمادی الاوّل ۱۲۰۳ھ

آفتابِ طریقت = ۱۲۰۳ھ - نقشبند کارگاہِ محبت = ۱۲۰۳ھ

هم :- حضرت مولانا شاہ غلام یحییٰ چشتی عظیم آبادی - واقعہ ہفتم جمادی الآخر ۱۲۰۶ھ

شیخ نامدار = ۱۲۰۶ھ - آفتاب دین امام شرع آہ = ۱۲۰۶ھ

هم :- حضرت سیّد شاہ شمس الضحیٰ قادری حسنی الحسینی - واقعہ غرہ شعبان ۱۲۱۵ھ

گلِ باغ محی جیلانی = ۱۲۱۵ھ

هم :- حضرت مولانا سیّد شاہ حسن رضا - واقعہ دوازدہم محرم ۱۲۱۶ھ

شہ افضل = ۱۲۱۶ھ

هم :- حضرت ابوالمجد خواجہ شاہ عبدالصمد قدس سرہٗ - واقعہ بست ودوم رمضان ۲۳

حلّ بعد النقل فی دار السّلام = ۱۲۲۳ھ - جاش بادا در بہشت = ۱۲۲۳ھ

هم :- حضرت مخدومی شاہ حسن علی قدس سرہٗ - واقعہ بست ونہم ربیع الاوّل ۲۴

فرید الدہر مخدوم = ۱۲۲۴ھ - وَبَشِّرِ المومنین بان لہم من اللہ اجرا = ۱۲۲۴

هم :- جدّہ مرحومہ واقعہ چہاردہم رجب ۱۲۲۴ھ وقیل ۱۲۲۵ھ

بادخت بی جدّمن بادالہٰی = ۱۲۲۴ھ

هم :- حضرت شاہ احمد حسین عرف چھوٹے خلف اصغر حضرت شاہ رکن الدین عشق - و

بست ونہم جمادی الآخر ۱۲۳۷ھ توفی مخدومنا = ۱۲۳۷ھ

هم :- حضرت شاہ احمد اللہ قادری - واقعہ دوازدہم ربیع الاوّل ۱۲۳۸ھ

فاز رضوان النبی = ۱۲۳۸ھ - جامع شرع وطریق مصطفیٰ = ۱۲۳۸ھ

:- حضرت شاہ قدرت اللہ قدس سرہٗ - ۲۴ ربیع الاول -

نوّر اللہ مضجعہ = ۱۲۴۰ھ

:- حضرت خواجہ عبد اللہ علیہ الرحمہ - ۲ ذی الحجہ -

من نہ تنہا خواستم تاریخ فوت ✻ بہر سالش شش جہت افسوس گفت = ۱۲۴۲ھ

:- برادرم خواجہ ابراھیم علی خاں، عرف علی مرزا -

شمس الضحیٰ = ۱۲۴۹ھ — غلام حسنین = ۱۲۴۹ھ

:- محمد یحییٰ ابو العلائی - ۱۴ رجب

ظہیر الحق = مظاہر = ۱۲۵۴ھ

:- خواجہ میر مرزا مرحوم -

رضوان اللہ علیہ ابداً ابداً = ۱۲۵۴ھ

بنای تعمیر مسجد، فرمودہ منشی سید امیر علی، واقع مقام کٹرہ

کعبہ عرش منزل است = ۱۲۵۵ھ

:- سید شاہ قمر الدین حسین - ۲۰ شعبان

ہای رحلت قطب دوراں کردہ = ۱۲۵۵ھ — سید قمر ملت و دین افسوس = ۱۲۵۵ھ

: حضرت خواجہ سید شاہ ابو البرکات باقی - ۸ رمضان

ہای مرشد و مخدوم = ۱۲۵۶ھ - الموت جسر یوصل العبد الی الرّب = ۱۲۵۶ھ

:- اُم الام — ۱۳ رمضان - بادحشرش باتبول = ۱۲۵۶ھ

:- حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم - متوطن شہر گھاٹی ۲۹ ذی قعدہ

حق بین خدا دوست بود = ۱۲۵۷ھ

:- عمۂ مرحومۂ کوچکم - ۱۳ شوال - اُو یافتہ جا قریب بتول = ۱۲۵۷ھ

:- خواجہ شاہ ہدایت اللہ - ۹ صفر

رفتہ جنت جدم از دنیا = ۱۲۵۸ھ

م :- سیّد شاہ غلام حسن، حسن تخلص۔ ساکن موضع بیتھو۔

رقم کرد سیّد غلام حسن ۱۲۶۳ گذشت از سرِ ہستیٔ بے ثبات = ۱۲۵۸ھ

پ :- پسر برادرم خواجہ آغا جان منعم بخش عرف سلطان جان

ظہور الدین احمد = ۱۲۵۹ھ

پ :- ہمشیرہ زادہ ام سیّد وارث حسین خلف الصدق برادرم میر فدا حسین۔

شمس طلعت ماہوش = ۱۲۶۱ھ — باعثِ فرحت = ۱۲۶۱ھ

م :- محمد یوسف میر، مرید حضرت والد ماجدم شاہ وجہ اللہ۔

حشر او با پیر او یارب شواد = ۱۲۶۱ھ

پ :- صاحبزادۂ مولانا و مرشدنا حضرت سیّد شاہ مبارک حسین۔

ضمیر الدین حسن = ۱۲۶۳ھ

پ :- برادرم سیّد حسن مظہر عرف محمد، خلف سیّد بشارت علی۔

حسن مظہر = ۱۲۶۳ھ — میر محمد ذاکر = ۱۲۶۳ھ

م :- جناب خواجہ حسن علی خان احراری برکاتی۔ ۱۳ جمادی الاوّل۔

وی بد خواجہ با برکات = ۱۲۶۳ھ

م :- حضرت خواجہ شاہ ابوالحسن ابوالعلائی برکاتی۔ ۲۸ جمادی الاولیٰ۔

نوّر تربتہٗ = ۱۲۶۳ھ

م :- میر اصغر علی۔ غمِ اکبر = ۱۲۶۳ھ۔

پ :- دخترِ خواہرم۔ بنت خواہر = ۱۲۶۴ھ

م :- حضرت شاہ یحییٰ علی۔ ۱۰ ذی قعدہ۔ داغ یحییٰ علی عالی = ۴

پ :- پسر برادرم شیخ جمال علی، غلام حیدر نام۔

فرح بخش دل ما = ۱۲۶۵ھ

م :- حضرت مولوی شاہ ابوالحسن پھلواروی فرؔد تخلص۔ ۲۴ محرم

اختر دین = ۱۲۶۵ھ — بمرد آہ شیخ زمانہ = ۱۲۶۵ھ

پ :- صاحبزادۂ مبارک حسین۔
رشکِ شمس و قمر = ۱۲۶۶ھ — نکو منظر = ۱۲۶۶

پ :- پسر برادرم شاہ لطیف علی، عرف خواجہ میاں جان نقشبندی ابوالعلائی
برخوردار احمد = ۱۲۶۶ھ - المال والبنون زینۃ الحیوۃ الدنیا = ۱۲۶۶ھ

م :- مولوی حکیم فیاض علی۔
حیف از رحلتِ جناب استاد = ۱۲۶۶ھ

م :- حضرت سیّد شاہ غلام حسن منعمی، ۲۴ ماہ محرم۔
گشتہ او محو تجلای الٰہ = ۱۲۶۶ھ

م :- جناب عم مرحوم خواجہ اشرف علی، ۲ جمادی الآخر۔
عم مرحوم کرد رحلت = ۱۲۶۶ھ — بجنّت یافتہ دیدار وجہ اللہ دی = ۱۲۶۶ھ

م :- حضرت والد ماجدم شاہ وجہ اللہ۔ ۱۳ جمادی الآخر
رفتی با لود و دریا = ۱۲۶۶ھ — رنج شیخ زمانہ = ۱۲۶۶ھ — آمد حضور رب = ۱۲۶۶ھ

م :- جناب خال مولانا السید بدر الدجیٰ، المعروف بسید بشارت علی الحسنی الحسینی المتخلص بخفا، ۲ رمضان
رنج بشارت علی = ۱۲۶۶ھ — میر بشارت علی = ۱۲۶۶ھ

م :- جناب عم مرحوم، خواجہ اشرف علی۔ ۲ جمادی الآخر
لا نظیر لھم = ۱۲۶۶ھ — والد و خال و عمنا ہیہات = ۱۲۶۶ھ

تاریخ خرقہ پوشی و خلافت و جانشینی این ناکارہ بعد وفات حضرت والد ماجد۔
بزرگاں نہادند تاج پدر = ۱۲۶۶ھ — خرقہ پوشیدم = ۱۲۶۶ھ

پ :- پسر برادرم نواب لطف علی خاں۔ ظہور یوسف = ۱۲۶۷ھ

م :- پسر برادرم " " " ۔ داغ پسر = ۱۲۶۷ھ

م :- جناب جدی مولوی افضل علی۔ ۱۹ رجب۔ ماہ رجب یوم الخمیس افسوس بود = ۱۲۶۷ھ

م :- خواجہ بدر الدین خاں عرف آغا مرزا مرحوم، پسر بزرگ خواجہ میر مرزا مرحوم۔
وای آغا مرزا = ۱۲۶۷ھ

م :۔ شاہ محمد واحد خلف بزرگ شاہ محمد حسین رئیس محی الدین نگر۔
سخت افسوس = ۱۲۶۷ھ

تاریخ امام باڑہ۔ روضۂ انور = ۱۲۶۸ھ
" دروازۂ امام باڑہ۔ باب خانہ حامی محشر = ۱۲۶۸ھ
" مسجد بنا کردۂ برادرم خواجہ لطیف علی، عرف شاہ میاں جان
ہم رتبۂ عرش الٰہی = ۱۲۶۸ھ
" حفر چاہ مولوی فضل حق، بمقام مظفرپور ضلع ترہت۔
از و میر سید فیض ہم = ۱۲۶۸ھ

پ :۔ جناب سید شاہ علی حسین، دانا پور، مشتمل بر تہنیت صاحبزادہ۔
شکر صد شکر از عطای الہ = ۱۲۶۸ھ — آمدہ فیض حق بلند اقبال = ۱۲۶۸ھ
بحفظہ و بکرمہ = ۱۲۶۸ھ — جناب والاجاہ سید علی حسین صاحب دام کرامانہم = ۶۸
م :۔ حاجی میر بخشی، رئیس عظیم آباد، محلہ حاجی گنج۔ ای وای جناب میر بخشی حاجی = ۱۸
م :۔ مسماۃ فضہ، دختر کرنیل کلب علی خاں، ۲ رجب۔ فضہ صالحہ مردہ = ۱۲۶۸
تاریخ بنای مسجد شیخ امداد علی رئیس عظیم آباد۔ ساخت عالی کعبۂ = ۱۲۶۹
" منشی علی عظیم، منصف، بمقام ہلسہ۔ معبد بیت الحرام است = ۲۶۹
پ :۔ پسر برادرم شیخ جمال علی، مسمی بغلام محمد۔ محمد سخاوت علی = ۲۶۹
پ :۔ صاحبزادہ مولانا مرشدنا میر مبارک حسین۔ سید سخاوت حسین = ۶۹
م :۔ جناب استاذی مولوی محمدی۔ وای استاذ من = ۶۹
م :۔ میر محمد اسحاق خاں، پسر دختر کرنیل کلب علی خاں مرحوم۔ داخل خلد = ۶۹
م :۔ لالہ مکھن لال، ریاضی داں گھڑی ساز۔

ولے مکھن لال رحلت کرد زین دنیا سبک ؛ واقف از علم ریاضی آنکہ عالی قدر بد
۱۸۵۳ع ۱۲۶۹ھ
سال فوتش راند از ملہم عالی پسند = ۱۲۶۰ فصلی — داخل بیکنٹھ مکھن لال نیکوکار شد = ۱۹۰۹ سمبت

م :- عمۂ بزرگ ۱۱ شعبان۔

تہ خاک گردیدہ = ۱۲۶۹ھ — بحضور جناب فاطمہ ہیں = ۱۲۶۹ھ

پ :- پسر میر احمد حسین، خلف کوچک میر اسماعیل علی۔

ظہور الحسین = ۱۲۷۰ھ — نیک منظر = ۱۲۷۰ھ

م :- حضرت استاذنا شاہ لطف اللہ ذوق

کرد رحلت عم من افسوس = ۱۲۷۰ھ — آخر ماہ رجب بود افسوس = ۱۲۷۰ھ

م :- شاہ عبدالرحمٰن عرف مستان شاہ، خلیفہ صوفی شاہ دلاور علی۔

وای مستان مست رب = ۱۲۷۰ھ

م :- مولوی محمد کامل بنگالی، تلمیذ استاذنا حضرت مولوی محمد سعید

پیوستہ برحمت الٰہی کامل = ۱۲۷۰ھ

م :- مولوی عیسٰی پھلواروی۔

رفت عیسٰی بر آسمان بلند = ۱۲۷۰ھ

م :- خواجہ علیم اللہ، رئیس ڈھاکہ۔

ہای از خواجہ علیم اللہ عالی قدر = ۱۲۷۰ھ — شد بسوی جنت الفردوس واویلا = ۱۲۷۰ھ

م :- مسماۃ فاطمہ دختر علی احمد خاں۔ فاطمہ رفت بجنت = ۱۲۷۰ھ

تاریخ نظم مثنوی سر السر شرح بیت مشہور مثنوی مولانا جلال الدین رومی

فرح بخشای اہل دل = ۱۲۷۱ھ — فرح بخش طبع = ۱۲۷۱ھ

" بنای مسجد شاہ محمد حسین، واقع مقام محی الدین نگر۔

معلی کعبہ شد تعمیر = ۱۲۷۱ھ

" " " امام باندی وعیدان، واقع محلہ گرہٹہ

ہم رتبہ بکعبہ شد بنا مسجد نو = ۱۲۷۱ھ

" تزویج فقیر دیوانۂ ابوالعلا محمد یحیٰی ابوالعلائی، با دختر دوم جناب خواجہ اشرف علی ۶ جمادی الآخر

ساختم عقد = ۱۲۷۱ھ + بحکم کبریا شد خانہ آباد = ۱۲۷۱ھ

تاریخ تزویج میر ارشاد حسین، خلف میر امداد حسین۔
شد قران نیک ماہ و آفتاب = ۱۲۷۱ھ

" کدخدائی میر واجد حسین، ابن الاخت میر فضیلت حسین۔
اقتران کوکبین ارفعین = ۱۲۷۱ھ

" کدخدائی شیخ یوسف حسین عرف پیارے پسر شیخ بشارت حسین۔
گشتہ قران اسعدین = ۱۲۷۱ھ

" کدخدائی خواجہ شمس الدین خان عرف محمد نواب، با دختر خواجہ محمد رحیم خان۔
گشتہ پیوند مہر و زہرہ بجا = ۱۲۷۱ھ

پ :۔ فرزند ارجمند مولانا و مرشدنا حضرت سیّد شاہ مبارک حسین۔
نمونۂ خورشید = ۱۲۷۱ھ — نورِ شمس و قمر دگر آمد = ۱۲۷۱ھ

پ :۔ پسر محبوب شبیر مسمیٰ بعلی شبیر۔ نورِ بخش دیدۂ من = ۱۲۷۱ھ

پ :۔ خلف برادرم خواجہ لطیف علی عرف شاہ میاں جان۔ غلام منعم = ۱۲۷۱

م :۔ حضرت شاہ مظہر حسین منعمی ابوالعلائی ۱۳ ربیع الآخر۔
بلغ العلیٰ بکمالہ = ۱۲۷۱ھ — آہ شیخ کامل و ہادی راہ ایزدی = ۷۱

م :۔ حضرت مخدوم حکیم شاہ مظہر حسین و شاہ وحید الدین احمد داناپوری۔
آہ رفتند بسوی جنت = ۱۲۷۱ھ

م :۔ صوفی دلاور علی شاہ، ۴ جمادی الآخر۔
زندہ دل شیخ کامل حق بین = ۱۲۷۱ھ

م :۔ برادرم مولوی سید حمید الدین احمد، عرف مولوی منگن تخلص اوج۔
طوطی شکر شکن فارس آہ = ۱۲۷۱ھ

م :۔ حکیم ابوالحسن طبیب مشہور عظیم آباد۔ ماہ جمادی الآخر۔
ہیہات مسیح وقت وعیسیٰ احکام = ۱۲۷۱ — شد او بہشتی لاریب = ۷۱

م :۔ امام الدین خدمتگار۔ آہ خدمتگار = ۱۲۷۱ھ

م :- زوجہ رحیم بخش - زہر خوردہ مرد = ۱۲۷۱ھ

تاریخ شہادت مولوی امیر علی شہید با جماعت مسلمانان -

فازوا بالفوز العظیم = ۱۲۷۲ھ

م :- مولوی حافظ شاہ عبد الغنی منعمی پھلواروی، ۱۴ر شعبان -

وای قطب وقت شبیر زماں صاحب کمال = ۱۲۷۲ھ - بے آب باغ پھلواری = ۱۲۷۲ھ

م :- جناب خواجہ سلطان جان - ۱۲ر ربیع الاوّل

خواجہ سلطان جان بمرد افسوس = ۱۲۷۲

م :- منشی سیّد فضل احمد، الہ آبادی - یافت سیّد بہشت = ۱۲۷۲ھ

م :- سید محمد علی - جمادی الاخیرہ دوشنبہ = ۱۲۷۲ھ

م :- مولوی عبد الکریم، تلمیذ رشید حضرت مولانا محمد سعید -

ختمہ اللہ بالحسنیٰ = ۱۲۷۲ - الٰہی ابر رحمت سایبان مدفن او کن ۱۲۷۲ھ

تاریخ تسلط نصاریٰ متسلط بلکھنؤ گشتند - چون نصاریٰ زخبث باطنہا

گفت تاریخ این خرابیٔ دل - لکھنؤ شد خراب وا ویلا ۱۲۷۲ھ

تاریخ کدخدائی سید حامد حسین عرف میرن جان، تخلّص نکہت -

انشاء اللہ المستعان المعین = ۱۲۷۲ھ - بجناب مجتبیٰ سید حامد حسین تقا زاد شوکتکم = ۱۲۷۲ھ

پ :- پسر مولوی سیّد شبیر علی - ای خداداد ادمدامش زندہ = ۱۲۷۲ھ

پ :- پسر مولوی سیّد امجد علی -

سیّد محمد اطہر = ۱۲۷۲ھ - سیّد مظہر احمد = ۱۲۷۲ھ

م :- میر یوسف علی - بمہر جہاں رفت یوسف = ۱۲۷۲ھ

م :- جناب ملکھو - زین جہاں آہ بجنّت رفتہ = ۱۲۷۲ھ

م :- بخشی، مؤذن مسجد محلہ بندہ ۲۰ر رجب - ملال ودریغ بخشی = ۱۲۷۲ھ

م :- امیر النّسا بیگم، والدہ برادرم نواب لطف علی خاں -

بجنّت امیر النّسا شد مکین = ۱۲۷۲ھ

تاریخ زواج خواجہ الطاف علی عرف علی مرزا، برادر کوچک خواجہ لطیف علی عرف شاہ میاں جان۔

خدایا کن مبارک شادی او = ۱۲۷۳ھ

" ازدواج نواب محمد علی خاں، خلف رشید ذوابہ سید محمد تقی خاں، رئیس منلفرپور۔

پیوند مہر و مشتری = ۱۲۷۳ھ

م :۔ سید شاہ تجمل حسین منعمی، ۲۵ جمادی الآخر۔

شد بجنت تجمل ما = ۱۲۷۳ھ — رفتہ از بزم ما تجمل زود = ۱۲۷۳ھ

م :۔ مولانا سید شاہ فخر الدین حسین، عرف مبارک حسین تخلص خواہش۔ ۱۳ ذی الحجہ

شاہ ما کردہ بجنت آرام = ۱۲۷۳ھ — خورشید کمال باطن = ۱۲۷۳ھ

م :۔ حبیب اللہ خاں۔ بود ماہ رمضان و جمعہ = ۱۲۷۳ھ

م :۔ مولوی سید حسین عرف میرن، برادر کوچک جناب مولوی سید محمد لکھنوی مجتہد

شد بجنت جناب مجتہد آہ = ۱۲۷۳ھ

تاریخ بنا کردن مسجد میر فرحت علی واقع کوچۂ صدر۔ کعبۂ عرش رتبہ = ۱۲۷۴ھ

" کدخدائی برادرم خواجہ ابراھیم علی عرف علی مرزا، با دختر خواجہ محمد ذاکر۔

شدہ آباد خانۂ اُنس = ۱۲۷۴ھ

پ :۔ دختر ہمشیرہ زاد راقم صبیہ رضیہ، جناب مولوی فدا حسین۔ نوید دختر = ۱۲۷۴ھ

پ :۔ دختر راقم محمد یحیٰ ابو العلائی ۲۵ جمادی الاولیٰ۔

داد ایزد دخترم = ۱۲۷۴ھ — قمر طلعت پری چہرہ = ۱۲۷۴ھ

م :۔ برادرم خواجہ آغا جان، ۲۷ ربیع الاوّل — باد در روز قیامت یار رسول = ۱۲۷۴

در انجشید لطف ایزدی = ۱۲۷۴ھ

م :۔ شیخ ولی احمد آروی۔ بجنت ولی احمدم رفت = ۱۲۷۴ھ

م :۔ جناب حاجی منشی واعظ علی، ۱۲ رمضان۔

بای رحلت کردہ در ماہِ صیام = ۱۲۷۴ھ — واصل ذات الہیٰ = ۱۲۷۴ھ

م :۔ دختر فقیر راقم محمد یحیٰ، ۱۹ شعبان دریغ و واویلا = ۱۲۷۴ھ

م :- بنت ہمشیرہ زاد راقم دختر جناب مولوی فدا حسین، ماہ شوال۔

بنت ہمشیرہ زاد مرد آہ ۱۲۷۴ھ

کدخدائی مولوی علی اکرم، آروی۔ شر شادی کدخدائی او = ۱۲۷۵ھ

" شاہ محمد واجد، صاجزادہ شاہ محمد حسین محی الدین نگر۔

از ماہ صیام بست و شش بود = ۱۲۷۵ھ

پ :- خلف سید صفدر حسین عرف میر مرزا، ۲۹ر شوال۔

حق تعالیٰ پسر نیک عطا کردہ = ۱۲۷۵ھ — خوبرو، مہر لقا، پاک نژاد = ۱۲۷۵ھ

پ :- نام تاریخی خلف قاضی محمد اسماعیل : غلام صدیق = ۱۲۷۵ھ

پ :- دختر برادرم خواجہ ابراہیم علی، عرف علی مرزا۔

بوجود آمدہ دختر = ۱۲۷۵ھ — داد ایزد دختر زیبا باد = ۱۲۷۵ھ

تزویج پسر زادہ مولوی محمد احسن۔ تزویج پسر زادہ مبارک باشد = ۱۲۷۵

م :- میر فرحت علی مردہ در شہر محرم ای وای = ۱۲۷۵ھ —

پنجشنبہ دوم از شہر محرم بر آہ = ۱۲۷۵ھ

م :- مرزا حسین بخش داناپور۔ اول شہر صفر شنبہ آہ = ۱۲۷۵ھ

م :- جناب خواجہ علی رضا۔ امیر ذی وقار آہ = ۱۲۷۵ھ

م :- مولوی سید خیرات علی خاں۔ بجنت شد حیف زین دار فانی = ۱۲۷۵ھ

م :- جناب مولوی جلال الدین حسین۔ ۱۷ر ربیع الاول۔ بجنت رفتہ صاحب دل = ۱۲۷۵ھ

م :- شیخ امداد علی۔ لیل سادس از مہ ذی القعدہ دیوم الاحد = ۱۲۷۵ھ

م :- برادرم جناب خواجہ احمد حسین، ۱۵ر رجب

آہ بے نظیر زمن = ۱۲۷۵ھ — آہ وادیلا دریغا = ۱۲۷۵ھ

م :- اہلیہ آغا محمد حسین۔ شوہر دوستی باتول = ۱۲۷۵ھ

م :- سراج النسا بیگم، والدہ میر عنایت حسین، ۲۷ر ذی الحجہ

از جہاں رفت بجنت بیگم = ۱۲۷۵ھ — مکاں سراج النسا شد بجنت = ۱۲۷۵ھ

م :- اہلیہ مولوی محمد امین عرف عبدالغفور - بابید ترابہ نخ و بلا مبرا بے جان = ۱۲۷۵ھ

تاریخ کدخدائی برادرم نواب لطف علی خاں - نزدیک بمہر گشت زہرہ = ۱۲۷۶ھ

〃 سید کاظم حسین، برادر کوچک قاضی رضا حسین، بادختر منشی امیر علی -

گردیده یکجا بامشتری ماہ = ۱۲۷۶ھ — شد کدخدا عزیز دلم صاحب جمال = ۱۲۷۶ھ

پ :- خلف شیخ عبدالکریم، ساکن منیر - اختر جبینی = ۱۲۷۶ھ

م :- جناب مولوی واجد علی بنارسی -

گشت تاریخ آہ آہ نہاں = گنج علم وادب بخاک شدہ = ۱۲۷۶ھ

م :- شاہ محمد حسین، ۹ رجب - بہ پنجشنبہ نہم شہر رجب وا ویلاہ = ۱۲۷۶ھ

م :- مولوی محامد حسین، برادر کوچک مولوی حافظ امیر الحسن -

یافت در زمرۂ اصحاب نبی جای قیام = ۱۲۷۶ھ

م :- حسینی - حسینی رفتہ جنت = ۱۲۷۶ھ

م :- میر نادر علی - جمادی الاخیرہ شب پانزدہ = ۱۲۷۶

م :- امیر النساء بیگم، والدہ سید لطف علی خاں، ۱۳ رمضان -

بادختر نبی باد = ۱۲۷۶ھ — قل هنا روح وریحان وجنات کریم = ۱۲۷۶ھ

م :- زوجۂ ثانیہ مولوی سید محمد وحید الدین بہادر -

ہوشربا حادثہ گردید آہ = ۱۲۷۶ھ

تاریخ قدوم شاہ محمد مہدی مسعود، از کریم چک بہ عظیم آباد -

مقدم شیخ اکمل کامل = ۱۲۷۷ھ — شیخ کامل مہدی دین حق آمد = ۱۲۷۷ھ

پ :- دختر حافظ احمد رضا - پری چہرہ زہرہ شمایل = ۱۲۷۷ھ

م :- جناب شاہ احمد سعید دہلوی ثم المدنی مجددی، ۳ ربیع الاول

حاصلش اتصال ایزد شد = ۱۲۷۷ھ — واصل جنت معلی شد = ۱۲۷۷ھ

م :- حسین علی شاہ، کہ در مجلس عرس حضرت رسالت صلعم، بحالت وجد و سماع بمقام پھلواری جان دادند

۱۲ ربیع الاول - پریدہ طائر روحش بعین وجد و سماع = ۱۲۷۷ھ

م :- جناب سید علی احمد - یکم ز شہر صفر بود و روز آدینہ = ۱۲۷۷ھ

م :- جناب سید شاہ امجد حسن بلخی فردوسی، ۲۱ جمادی الاولیٰ -

قبلۂ پاک دلان رفت بفردوس = ۱۲۷۷ - ولی قضا فزود = ۱۲۷۷ھ

م :- شاہ امجد حسن و میر احمد حسین و مولوی نیاز علی -

اقامت گہ شان بفردوس باد = ۱۲۷۷ھ

م :- منشی اسماعیل اکبرآبادی، منشی دفتر لفٹنٹ گورنر - رفت پیش خلیل اسمٰعیل = ۱۲۷۷ھ

م :- خواجہ وزیرالدین - مرد خواجہ وزیرالدین صد آہ = ۱۲۷۷ھ

م :- شیخ الفو، مرید حضرت والد ماجد شاہ وجہ اللہ - آہ شیخ الفو مرد = ۱۲۷۷ھ

م :- میر احمد حسین - لقای خدا یافتم = ۱۲۷۷ھ

م :- اہلیہ جناب مولوی انور علی یاس، خوشدامن مولوی محمد سعید -

باد بفردوس برین خانہ = ۱۲۷۷ھ

م :- گھسیٹی، دایۂ حقیر ماہ جمادی الاولی - گھسیٹی شدہ جنتی = ۱۲۷۷ھ

قطعۂ تاریخ منازعت اہل سنت و جماعت با شیعان و غلبۂ اہل انصاف برارباب خلاف -

| | |
|---|---|
| بماہ محرم ذلیل و حقیر | چو گشتند اعدای دین متین |
| مظفر شدند اہل انصاف وحق | بجاہ جناب رسول امین |
| کہ در مجلس تعزیت شیعیان | نمودند سب صحابہ ز کین |
| شنیدند چون سنیان این سخن | شدند از حمیت بسر خشمگین |
| زد و ضرب کردند از دست و پا | بر آن قوم دور از طریق یقین |
| پشیمان شد از گفتۂ خویشتن | ہم آن قایل مبتدع ہم مکین |
| رقم ساختم سال این ماجرا | بگشتند مقہور اعدای دین = ۱۲۷۷ھ |

م :- سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی ظفر تخلص[1] -

| | |
|---|---|
| شاہ درویش خو بہادر شاہ | زین سپنج سرا نمود سفر |
| در غزل چون ظفر تخلص داشت | گشت سال وفات حیف ظفر = ۱۲۷۸ھ |

---

[1] - تجو تذکرہ ۱۲۷۹ھ آ گے صفو ۱۴۲ پر آ رہے ہیں۔

تاریخ آغاز بنای تکیہ حضرت شاہ رکن الدین عشق - بنیادِ خیرات = ۱۲۷۸ھ
" کدخدائی جناب خواجہ علی حسن، با دختر بزرگ جناب خواجہ سلطان جان -
گفت ہاتف سال عقد از دواج = ۱۲۷۸ھ
" کدخدائی جناب حکیم شاہ فرحت حسن، حفید حضرت حکیم شاہ مظہر حسین -
شد از دواجش بوقت سعید = ۱۲۷۸ھ
" کدخدائی خواجہ باقر علی، خلف خواجہ عبدالحسین، با خواہر میر حامد حسین -
زواجش شدہ بوقت سعید = ۱۲۷۸ھ
" کدخدائی خواجہ علی نقی، عرف علی نواب پسر بزرگ خواجہ محمد کاظم، شفا تخلص، با دختر خواجہ محمد اسمٰعیل
کدخدا مہ لقا علی نواب = ۱۲۷۸ھ

پ :- پسر میر امیر جان - نظیر حسن = ۱۲۷۸ھ

پ :- دختر برادرم سیّد صفدر حسین، عرف میر میرزا -
داد باو دختر زیبا اللہ = ۱۲۷۸ھ — پاک و پاکیزہ دختر = ۱۲۷۸ھ

پ :- دختر سیّد محمد اجمل -
دختر اجمل = ۱۲۷۸ھ — دختر سیّد = ۱۲۷۸ھ

م :- جناب سید شاہ جمال علی فردوسی، سجادہ نشین حضرت مخدوم شاہ شعیب -
جاودانی بہشت یافتہ = ۱۲۷۸ھ

م :- جناب مولوی شاہ محمد حسین پھلواروی بمکہ مشرفہ، ۱۲ شعبان -
تا قیامت ماندوی درج = ۱۲۷۸ھ — شد ز جہان وارث علم نبی = ۱۲۷۸ھ

م :- جناب شاہ غلام اعظم موری الہ آبادی، افضل تخلص، ابن الابن شاہ محمد اجمل -
نماندہ افضل اجمل بعالم = ۱۲۷۸ھ

م :- مولوی فضل حق خیرآبادی، ۱۲ صفر -
بادشاہ فضلا و اولیاء = ۱۲۷۸ھ — آہ افضل عصر = ۱۲۷۸ھ

م :- مولوی گوہر علی - وفات گوہر دریای جود شد ایوا = ۱۲۷۸ھ

م :- خواجہ فیض اللہ، فرحت تخلص۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ۔
حیف فرحت از دل عالم شدہ = ۱۲۷۸ھ

م :- مولوی محمد امین عرف عبدالغفور، ۲۵ صفر۔
دوشنبہ بیست و پنج از صفر = ۱۲۷۸ھ ــ شد این حادثۂ جانفرسا = ۱۲۷۸ھ

م :- برادرم میر فدا حسین، ۹ رجب روز آدینہ۔
صدمۂ او کمر من بشکست = ۱۲۷۸ھ ــ رفت از عالم برادر ما = ۱۲۷۸ھ

م :- میر منظہر ــ الم منظہر نبی = ۱۲۷۸ھ

م :- دختر حضرت سید شاہ علیم الدین بلخی فردوسی، ۲۶ رجب۔
روح راحت دیدہ از الم تاریخ + رجب و بست و ششم کم فرمود = ۱۲۷۸ھ

م :- شاہ غلام شرف و اہلیہ قاضی محمد اسمٰعیل و خلف شاہ تجمل حسین۔

داغ بسیار = ۱۲۷۸ھ

م :- مادر برادرم سید حسن منظہر عرف محمد۔ زوجۂ خالم فوت نمود = ۱۲۷۸ھ

م :- القو، مطربۂ مشہورہ عظیم آباد۔
القو بہشت حور گردید = ۱۲۷۸ھ ــ گشتہ با طائفۂ حور نوازان القو = ۱۲۷۸ھ

تاریخ مسجد بنا کردہ میر اکرام علی، مقام کرجا۔ کعبہ ساخت و بہند بنا = ۱۲۷۹ھ

" خانقاہ حضرت شاہ رکن الدین عشق، از سر نو بنا کردہ۔
شد بنا خانقاہ اقدس = ۱۲۷۹ھ ــ شد بنا بارگاہ اکبر عشق = ۱۲۷۹ھ

" عمارت بارہ دری بنا کردہ شیخ مہدی علی۔ مضبوط بارہ دری = ۱۲۷۹ھ

" سنگ ریزی از آسمان، ۲۵ شوال۔
طرفہ ماجرای گشت = ۱۲۷۹ھ ــ از فلک افتاد بر روی زمین سنگ = ۱۲۷۹ھ

" کدخدائی سید شاہ غلام شرف برادر کوچک حضرت سید شاہ علیم الدین۔
شاد شدم از شادی شاہ = ۱۲۷۹ھ

" کدخدائی سید شاہ غلام منظفر، خلف الصدق حضرت سید شاہ علیم الدین۔

گردید کدخدا برادر = ۱۲۷۹ھ — مبارک بشہ شاہ نوشاہ ما = ۱۲۷۹ھ

تاریخ کدخدائی سراج الدین حسین پسر ناظر محمد حسین با بنت الاخت سید علی اشرف -

بزہرہ اقتران مہ مبارک = ۱۲۷۹ھ

" کدخدائی سید امیر حسن، خلف کوچک جناب مولوی سید شاہ امداد علی خاں بہادر -

شدہ کدخدا امیر حسن = ۱۲۷۹ھ — ز امداد آل علی گشت نوشہ = ۱۲۷۹ھ

" زواج سید حسن منظہر عرف محمدؐ با دختر خواجہ اسد علی، ۲۶ ذی الحجہ -

زوج حسن منظہر = ۱۲۷۹ھ — باد فرخندہ بوی شادی = ۱۲۷۹ھ

" کدخدائی برادر زادہ خواجہ منعم بخش، عرف سلطان جان پسر آخر خواجہ آغا جان -

شدہ نور چشم دو نوشہ = ۱۲۷۹ھ — گردید وی کتخدا = ۱۲۷۹ھ

تاریخ کدخدائی غلام حیدر و غلام محمد پسران برادرم شیخ جمال علی -

گردید اقتران دو ماہ و دو زہرہ = ۱۲۷۹ھ

پ :- پسر راقم الحروف محمد یحییٰ ابو العلائی -

ناظر حسین = ۱۲۷۹ھ - نظیر احسن = ۱۲۷۹ھ - بخشید ایزد فرزند = ۱۲۷۹ھ

پ :- پسر برادرم خواجہ لطیف علی، عرف شاہ میاں جان -

بلند بخت بدیع الجمال = ۱۲۷۹ھ — نونہال باغ اقبال = ۱۲۷۹ھ

پ :- پسر خواجہ محمد اصغر، داماد خواجہ عبد الغنی، رئیس ڈھاکہ -

زینت رہ اختر = ۱۲۷۹ھ — الہٰی بخت او بیدار باد = ۱۲۷۹ھ

پ :- خلف میر تجمل حسین، مسمیٰ بنذر الرحمٰن -

روشنی نقطۂ چشم پدر = ۱۲۷۹ھ — ماہ اوج بختیاری = ۱۲۷۹ھ

پ :- پسر میر کاظم علی - پور کاظم علی = ۱۲۷۹ھ

م :- حضرت ابو الفیاض سید شاہ غلام حسین قمری ۲۲ محرم -

بست و دو از شہر محرم = ۱۲۷۹ھ — فائز برضوان حق باد او = ۱۲۷۹ھ

م :- شاہ محمد یار، ۲ محرم بجنت شد محمد یار از دہر = ۱۲۷۹ھ

م :۔ حاجی سید شاہ امام علی بمکۂ معظمہ۔ سیدز مکہ جنت رفت = ۱۲۷۹ھ

م :۔ حاجی شاہ ظہور الحق، ا رجمادی الآخر۔ کرد رحلت شاہ عالی = ۱۲۷۹ھ

م :۔ جناب شاہ مظہر الحق، ۵ رجب۔ یافت در فردوس وصل حق = ۱۲۷۹ھ

م :۔ جناب شاہ عبد الوالی لکھنوی، خلیفہ مولانا انوار لکھنوی۔

درویش باخدا نماند آہ = ۱۲۷۹ھ — پوشیدہ بانوار تجلی والی = ۱۲۷۹ھ

م :۔ حافظ شاہ سعد الدین حفید رشید حافظ نور اللہ خوشنویس لکھنوی۔

لہ روح و ریحان فی الخلد = ۱۲۷۹ھ — بی شبہ واصل حق گشت = ۱۲۷۹ھ

م :۔ لالہ مُرلی دھر کہ ببرکت امیر ابو العلا مشرف باسلام شد۔

داخل بارگہ سید والا شد = ۱۲۷۹ھ — فوت مُرلی دھر شد = ۱۲۷۹ھ

م :۔ سراج الدین بہادر شاہ ابو ظفر، خاتم سلاطین تیموریہ تخت نشین دہلی

صد آہ خورشید ہند = ۱۲۷۹ھ، فرمودہ شاہ رحلت = ۱۲۷۹ھ

م :۔ امیر دوست محمد خاں، والیٔ کابل۔ وای امیر اعظم = ۱۲۷۹ھ

م :۔ امیر افضل علی، ۱۷ جمادی الاولیٰ۔ بنمود جا در بہشت بریں = ۱۲۷۹ھ

م :۔ قاضی محمد شریف آروی۔ ۱۲ ذی الحجہ۔ صد آہ از مرگ قاضی = ۱۲۷۹ھ

م :۔ مرزا امان علی ذبیح تخلص۔ ۱۱ ذی قعدہ، روز جمعہ۔

ذی القعدہ و روز جمعہ بُد ہای = ۱۲۷۹ — او عندلیب باغ جناں = ۱۲۷۹ھ

م :۔ ناظر محمد حسین۔ ۶ شوال روز جمعہ۔ رد خراشیدہ از الم گفتم
ششِ شوال روز جمعہ بود = ۱۲۷۹ھ

م :۔ مرزا شیخ اسماعیل، پسر مولوی تیغ علی۔

با ذبیح اللہ او پیوستہ = ۱۲۷۹ھ — کے وائے غم اسماعیل = ۱۲۷۹ھ

م :۔ شیخ یار محمد۔ غم وصال شہ عزیز = ۱۲۷۹ھ

م :۔ شیخ ذو الفقار علی۔ کرد ترک حیات وی = ۱۲۷۹ھ

م :۔ چند عزیزاں۔ غم عزیزان عزیز = ۱۲۷۹ھ

م :۔ میر غلام علی۔ حیف غلام علی = ۱۲۷۹ھ

م :- سید قاسم علی خاں خلف میر عبداللہ رئیس عظیم آباد۔

بود امیر ذی وقر = ۱۲۷۹ھ — بود سر خیل امیران جہاں آہ = ۱۲۷۹ھ

م :- آغا ابوالحسن، ۲۲ جمادی الاولیٰ، روز یکشنبہ۔

شہر جمادی الاولین بیست و دوم یوم الاحد = ۱۲۷۹ھ

م :- اہلیہ نواب یوسف علی خاں۔

دی پیش جناب زہرا رفت = ۱۲۷۹ھ — بشد از دہر زلیخای زماں = ۹

م :- گوہر مطہرۂ عظیم آباد۔

شد آہ لولی چالاک زیر خاک = ۱۲۷۹ھ — گوہر آلودہ شد بخاک سیہ = ۹

تاریخ زواج حضرت شاہ منعم حسن، خلف اصغر حضرت مخدوم حکیم شاہ محمد مہدی مسعو

کدخدا شد شاہ ما = ۱۲۸۰ھ — باشمس شدہ قران زہرہ = ۸۰

〃 زواج شاہ غلام عباس، فرزند مولانا حکیم شاہ محمد ہادی۔

نوشہ از مہر رسول اللہ = ۱۲۸۰ھ

〃 ازدواج خواجہ امان اللہ، پسر اوسط خواجہ ولی اللہ، با بنت نظیر علی خاں

نوشہ گشت امان اللہ ما = ۱۲۸۰ھ — گشت تزویج عزیزم =

〃 زواج مظہر حسن پسر شیخ امین الدین، خواہر زادۂ حاجی عبدالحی، با دختر ا

زواج مظہر حسین = ۱۲۸۰ھ

پ :- خلف شاہ امجد حسین، سجادہ نشین حضرت مخدوم یحییٰ منیری۔

خورشید طالع ولید = ۱۲۸۰ھ — اختر جاہ و جلال = ۲۸۰

پ :- خلف اقبال علی خاں، ۷ جمادی الآخر، روز جمعہ

یوم جمعہ سابع از ماہ جمادی آخرین = ۱۲۸۰ھ — فرزند قمر طلعت من =

پ :- پسر خواجہ منعم بخش، عرف سلطان جان خلف برادرم آغا جان۔

عمرش بود کردگارا درازہ = ۱۲۸۰ھ

پ :- دختر برادرم خواجہ ابراہیم علی عرف خواجہ علی مرزا - ماہ محرم
نکو دختر = ۱۲۸۰ھ — خدیجۃ الکبریٰ = ۱۲۸۰ھ

م :- مولوی حافظ محمد عبداللہ کانپوری -
فاضل بے بدل وحامل مصحف بود آہ = ۱۲۸۰ھ

م :- شاہ غلام رسول، کانپوری مجددی -
در فقر وفنا معروف بود آن زندہ دل = ۱۲۸۰ھ

م :- حضرت شاہ کبیر الدین احمد سہسرامی - فمنہم من قضیٰ نحبہ = ۱۲۸۰

م :- جناب منشی سید امداد علی خاں -
باد از امداد علی اندر قیامت یا رسول = ۱۲۸۰ھ

م :- حاجی برکت اللہ - بہشت برین جائش باد = ۱۲۸۰ھ

م :- جناب حاجی مولوی فرید پھلواروی کہ بمدینہ طیبہ انتقال فرمودند و بجنت البقیع آسودند -
آن جنت از جوار نبی یافتہ = ۱۲۸۰ھ بجنت از مدینہ پاک رفتہ

م :- شاہ میاں جان خلیفہ حضرت شاہ غلام حسین ابوالفیاض قمر
زاہل ذوق وشوق او بود = ۱۲۸۰ھ

م :- سید عبدالکریم، برادر کوچک منشی سید فرزند علی - رحلت عبدالکریم ما کرد = ۱۲۸۰ھ

م :- چودھری موسیٰ رضا آروی - مغفور = ۱۲۸۰ھ

م :- پسر حکیم امیر حسن - ساکن خواجہ شکار پور -
دور از دیار ویار بعہد شباب مرد = ۱۲۸۰ھ

م :- برادرم نواب لطف علی خاں، ۱۴ جمادی الآخر -
قم لطف علی با آداب = ۱۲۸۰ھ — حق جل وعلا راضی از و باد = ۱۲۸۰ھ

م :- خواجہ محمد کاظم، متخلص بیشفا، و ربیع الاول، روز سہ شنبہ
سہ شنبہ تاسع از اول ربیع = ۱۲۸۰ھ — لالہ آسا ماند داغ دی بدل = ۱۲۸۰ھ

م :- خواجہ عنایت علی ، ۲۹ جمادی الاولیٰ۔

ہای از خواجہ عنایت علی = ۱۲۸۰ھ — شد روانہ بہشت = ۱۲۸۰

م :- والدہ جناب شاہ فدا حسین داناپوری، ماہ شوال۔

حشرش با بتول پاک بادا = ۱۲۸۰ھ

م :- اہلیہ حضرت سید شاہ علیم الدین قبلہ کہ بمدینہ منورہ رحلت نمودند و بجنت البقیع آسودند

اللہ اکبر یافت او قرب جناب فاطمہ = ۱۲۸۰ھ — او در بہشت جا و دل یافت = ۰

م :- مسماۃ مریم، والدۂ مولوی عبد الحکیم — مریم جوار مریم یافت = ۱۲۸۰

م :- ” امام باندی، زوجہ میر وارث علی، خواہر میر حسین علی الہ آبادی -

با بتول طیبہ اندر قیامت باد = ۱۲۸۰ھ — بود او بحشر با بنت رسول = ۱۲۸۰ھ

م :- چنیا کنیزک دہ سالہ۔ ای وای غم کنیزک دہ سالہ = ۱۲۸۰ھ

تاریخ بنای مسجد، واقع مقام نیورہ بحسن انتظام سید محمد نجم الدین - مسجد دلپسند شد تعمیر = ۱۲۸۱

” حبس دوام مولوی احمد اللہ — نجات ابد یافت در حبس دایم = ۱۲۸۱

” ازدواج سید شاہ منیر الدین حسین، فرزند نخستین شاہ مبارک حسین با دختر شاہ عطا حسین

مبارک باد نوشہ شد رسما = ۱۲۸۱ھ — یکجا شد آفتاب و مہتاب = ۱۲۸۱

” ازدواج سید محمد اکبر، خلف شاہ محمد سجاد، ابوالعلائی -

شد از مہر رسول اللہ نوشاہ = ۱۲۸۱ھ

” تزویج سید محمد یحییٰ، برادر کوچک حافظ سید احمد رضا۔

خدایا مبارک کنی شادی او = ۱۲۸۱ھ

” تزویج دختر برادرم شیخ جمال علی بشیخ حسین بخش منسوب شد۔

مبارک ام و اب را شادی بنت = ۱۲۸۱ھ — گردیدہ کار خیر او = ۱۲۸۱

” فراغ برادر ممدوح از شادی و کدخدائی جمیع اولاد خود۔ فالغ = ۱۲۸۱

پ :- پسر سید شاہ غلام اشرف، برادر کوچک حضرت شاہ علیم الدین -

بندۂ مظفر = ۱۲۸۱ھ — ببرج شرف آفتابی = ۱۲۸۱ھ

پ :- فرزند شاہ ابوالحسن محمد علی حبیب، متخلص بنصر، سجادہ نشین پھلواری۔

وارث نعمات اجداد = ۱۲۸۱ھ — گشت محبوب حبیب ما تولد = ۱۲۸۱ھ

پ :- ابن البنت مولوی علی اعظم — داد ایزد بعلی اعظم ما سبطی = ۱۲۸۱ھ

م :- فرزندم نور العلا — وای ای لخت جگر = ۱۲۸۱ھ — نور از عین پدر رفت = ۱۲۸۱ھ

م :- جناب سید شاہ محمد حسن بلخی فردوسی — بجنت شد آہ شاہ محمد حسن = ۱۲۸۱ھ

م :- مولوی ابوالبرکات رکن الدین محمد تراب علی۔

ہیہات کہ افتادہ ز پا رکن دین = ۱۲۸۱ھ — بود بی نظیر زمن = ۱۲۸۱ھ

م :- مولوی ہادی علی لکھنوی — جنتی شد مولوی ہادی عالی مقام = ۱۲۸۱ھ

م :- شاہ محمد سلامت اللہ بدایونی کانپوری المتخلص بکشفی۔

ای ہای شد بزیر زمین آفتاب علم = ۱۲۸۱ھ — ہای استاذ زمانہ = ۱۲۸۱ھ

کشفی علامہ کجا رفتہ ہای = ۱۲۸۱ھ

م :- پھول شاہ :- بدون بوی گل ز جہان جہان رفتہ پھول شاہ = ۱۲۸۱ھ

م :- حکیم امام الدین خاں کہ از حضور شاہ دہلی ارسطو الملک خطاب داشتند۔

ارسطوی زمانہ رفتہ افسوس = ۱۲۸۱ھ

م :- شاہ قطب الدین المخاطب محمد سجادہ نشین منیر شریف — رفت قطب منیر از آفاق = ۱۲۸۱ھ

م :- سید شاہ محمد قاسم ابوالعلائی برکاتی۔ ۱۷ شوال

آہ عین عشق بود آن عاشق ابوالعلا = ۱۲۸۱ھ — در جمال بوالعلا وی دیدہ دید خدا = ۱۲۸۱ھ

م :- خواجہ حسن خاں احراری۔

جنت ماوا مسکنش شد = ۱۲۸۱ھ — نماندہ حاتم دوراں = ۱۲۸۱ھ

تاریخ قدوم شاہ ولی اللہ از اکبر آباد۔

از پیش محبوب خدا آمد حبیب فی ربیا = ۱۲۸۲ھ — راحت جان من آمد مقدمش = ۱۲۸۲ھ

" مدرسہ بنا کردہ منشی امیر علی خاں واقع مقام باڑہ — تعالی اللہ بنای عالیت این = ۱۲۸۲ھ

تاریخ مسجد بناکردہ منشی محمد امیر، رشتہ دار عدالت دیوانی بمقام صاحب گنج۔

بنا ساختہ مسجد نو = ۱۲۸۲ھ — ہم مرتبہ عرش ودود = ۱۲۸۲ھ

" زواج حاجی شاہ عبدالحی قتبانیہ۔ عبدالحی دگر شد کدخدا = ۱۲۸۲ھ

" کدخدائی خواجہ محمد خلیل، خلف خواجہ امیرالدین۔

بکن شادی وی مبارک خدایا = ۱۲۸۲ھ

" کدخدائی خواجہ احسن اللہ، خلف خواجہ عبدالعزیز، رئیس ڈھاکہ۔

گشتہ نوشاہ احسن اللہ = ۱۲۸۲ھ — گردید ہم بمشتری مہ = ۱۲۸۲ھ

" کدخدائی امداد امام، پسر سید محمد وحیدالدین خان بہادر، با دختر منشی فرزند علی۔

جمع زہرہ بمشتری = ۱۲۸۲ھ

" کدخدائی فخرالدین، پسر فرزند علی، با دختر میر ولایت حسین۔

بمہر اقتران مہ گردید = ۱۲۸۲ھ

" کدخدائی حافظ عبدالغفور۔

از دواج او ز فضل ایزدی شد = ۱۲۸۲ھ

تاریخ کدخدائی محمد حنیف، پسر مولوی احمد کبیر پھلواری، حیرت تخلص۔

زہرہ با مشتری ہمایون = ۱۲۸۲ھ — خورشید جمع با ماہ = ۱۲۸۲ھ

پ :- پسر خواجہ منعم بخش، عرف سلطان جان خاصہ برادرم خواجہ آغا جان۔

محمد منظر = ۱۲۸۲ھ

پ :- پسر برادرم سید صفدر حسین، میر میرزا۔ بفضل شاہ انبیا = ۱۲۸۲ھ

پ :- دختر میر احمد حسین، فرزند کوچک میر اسمٰعیل علی۔ دختر جلیلہ = ۱۲۸۲ھ

پ :- " خواجہ علی حسن، خلف اصغر خواجہ محمد ذاکر۔ دختری دادہ باد ایزد پاک = ۱۲۸۲

پ :- " " باقر علی، خلف الرشید خواجہ عبدالحسین خاں۔ بہ ولد داد دختر ایزد = ۱۲۸۲

م :- میر الٰہی بخش۔ جناب میر الٰہی بخش ایوای = ۱۲۸۲ھ

م :- میرزا [illegible]۔ [illegible] کرم حق = ۱۲۸۲ھ

م :- جناب میر عبدالحسین شیر پوری والد میر عنایت حسین وکیل ۔ آہ رحلت بسید مرحوم ما کردہ = ۱۲۸۲ھ

م :- میر کمال علی ۔ یکشنبہ و ذی قعدہ = ۱۲۸۲ھ

م :- خواجہ عبدالنبی، ساکن لاسہ از مریدان شاہ وجہ اللہ ۔

عبدالنبی بقرب نبی الاالہ رفت = ۱۲۸۲ھ

م :- مولوی ابراہیم،

لیل نہم از رمضان بود آہ = ۱۲۸۲ھ — حیف اہل برکات و حسنات = ۱۲۸۲ھ

م :- سید ابوالحسن عرف نواب جان ۔ لاریب فیہ جنت یافت = ۱۲۸۲ھ

م :- میر امیر حسن پسر دختر میر سخاوت حسین ۔ وی شدہ مایل بگلگشت جناں = ۱۲۸۲ھ

م :- مولوی رضوان علی، مرید جناب امداد علی خاں بہادر رضوی ۔

فایز اُو باد ا برضوان علی = ۱۲۸۲ھ

م :- اہلیہ جناب منشی محمد امیر علی خاں ۔

جنت خلد مقام اُو باد = ۱۲۸۲ھ — کہ حشرش با بتول طیبہ باد = ۱۲۸۲ھ

تاریخ زواج سید ظفر امام، فرزند ہمشیرہ زاد مولوی محمد سعید بمقام کاکو با دختر شاہ محمد مبین ۔

گشت ازدواج در شوال = ۱۲۸۳ھ — با مشتری زہرہ جمع = ۱۲۸۳ھ

" کدخدائی سید محمد میر پسر میر منگی جان، با دختر خواجہ جیون ۔

بماہ اجماع خورشید = ۱۲۸۳ھ — ببیں خورشید و مہ باہم = ۱۲۸۳ھ

پ :- پسر خواجہ ابراہیم علی، عرف علی مرزا ۔ محمد مناظر = ۱۲۸۳ھ

پ :- پسر مولوی برکت علی ۔ غلام اسمٰعیل = ۱۲۸۳ھ

پ :- پسر عبدالحق، خویش قاضی فرخ حسین ۔

مظہر حسینی = ۱۲۸۳ — غلام پیر = ۱۲۸۳ھ

م :- شیخ حفیظ اللہ، ڈاکٹر ۔ افسوس وآہ حفیظ اللہ = ۱۲۸۳ھ

م :- پسر مبارک حسین ، دختر زادہ میر واجد علی وکیل ۔

یکشنبہ از شہر محرم خمسہ = ۱۲۸۳ھ

م :- حافظ فتح الدین، پنجابی — حافظ مرحوم = ۱۲۸۳ھ

م :- سید علی منظہر، عرف میرن جان — ای وای علی منظہر = ۱۲۸۳ھ

م :- داروغہ سید مبارک علی منعمی ابوالعلائی، طالب تخلص۔

رفت جنت طالب حق = ۱۲۸۳ھ — بود ظریف طبع = ۱۲۸۳ھ

م :- مولوی تبارک علی — بود بباغ ارم جای دی = ۱۲۸۳ھ

م :- خواجہ ولی اللہ —

عاشر شوال شنبہ بود آہ = ۱۲۸۳ھ — کرد خواجہ رحلت آہ = ۱۲۸۳ھ

م :- پسر ابوالبرکات، داناپوری — ہای داغ پسر = ۱۲۸۳ھ

م :- منشی اکبر علی سندیلی کہ بمکّہ معظّمہ رحلت کردند۔

دادہ آن مرد خدا جان بر حق = ۱۲۸۳ھ — با تشنگان کربلا باد مقام وی = ۱۲۸۳ھ

م : دختر خواجہ محمد اسمٰعیل — قیامتی شدہ بہر پدر = ۱۲۸۳ھ

م :- اہلیہ قاضی فرخ حسین مہدی ساکن مہدانواں — حشرش با بتول طیبہ باد = ۱۲۸۳ھ

م :- اہلیہ شیخ حسین علی مسترشد قاضی فرخ حسین۔ گشتہ قربان آسم آل عبا = ۱۲۸۳ھ

تاریخ بنای مسجد تعمیر کردہ محمد غازی، ساکن ڈھاکہ۔

خانۂ پاک خدا = ۱۲۸۴ھ — ہم مرتبۂ عرش ایزد = ۱۲۸۴ھ

" تزویج الفت حسین، پسر کوچک برادرم شیخ ہمت علی۔

یارب در زن و شو باد الفت = ۱۲۸۴ھ

" کدخدائی شاہ واجد حسین، فرزند شاہ محمد حسن ابن حکیم شاہ محمد مہدی

مبارک اقتران زہرہ و ماہ = ۱۲۸۴ھ

" تزویج مولوی شاہ محمد رشید الحق، خلف شاہ علی امیر الحق، با دختر میر صفدر علی۔

گردید اقتران مہر و ماہ = ۱۲۸۴ھ

" تزویج مولوی مرتضیٰ حسن، برادر کوچک میر شریف حسین، پھلواروی۔

گردیدہ وی کتخدا = ۱۲۸۴ھ

تاریخ کتخدائی سید علی شبیر پسر میر محبوب - با ماہ اجماع خورشید = ۱۲۸۴ھ
" " پسران حکیم سید محمد امیر - مبارک اقتران زہرہ و ماہ = ۱۲۸۴ھ
" زواج سید مہدی نواب با دختر سید لطف علی خاں -

مہ با مشتری گردید باہم = ۱۲۸۴ھ — زلف عروس و دست نوشہ = ۱۲۸۴ھ

پ :- فرزند محمد یحیٰ ابو العلائی مولود ششم -

ولید روز سہ شنبہ و سادس ماہ شعبان = ۱۲۸۴ھ — راحت روح است = ۱۲۸۴ھ

پ :- صاحبزادۂ حکیم سید محمد مہدی بلخی

مظفر دیں = ۱۲۸۴ھ — مظہر الحق = ۱۲۸۴ھ

پ :- پسر شیخ محمد یعقوب، ساکن مہدانواں - یوسف مصر پور یعقوب است = ۱۲۸۴ھ

م :- مفتی مولانا محمد صدر الدین خاں دہلوی -

گفتم تاریخ بادل زار ÷ صدر العلما وفات فرمود = ۱۲۸۴ھ — افسوس افضل علمای بلاد ہند = ۱۲۸۴ھ

ابوا فاضل علامۂ دہر = ۱۲۸۴ھ — صدر گردید او باہل بہشت = ۱۲۸۴ھ

م :- ملّا محمد غوث مجددی، خلیفہ شاہ احمد سعید -

فاضل پارسا و کامل بود = ۱۲۸۴ھ شیخ کامل و لی بحق واصل = ۱۲۸۴ھ

م :- مولوی حاجی شاہ حسین علی فتحپوری، خلیفہ شاہ سلیمان -

فخر ہند و اعز دوراں = ۱۲۸۴ھ - منتخب عالماں = ۱۲۸۴ھ

م :- مولوی سیّد محمد لکھنوی، مجتہد الشیعہ -

بود آہا عالم ذی اجتہاد = ۱۲۸۴ھ — آہ اعلم اثنا عشریہ = ۱۲۸۴ھ

م :- سیّد شاہ محمد واحد داناپوری -

بزرگ خدا آشنا حیف = ۱۲۸۴ھ — فائز رضوان الحق = ۱۲۸۴ھ

م :- شیخ الٰہی بخش، مرید حضرت منیر الدین حسین -

سہ شنبہ ز شہر محرم دوم بود = ۱۲۸۴ھ

م :- برادر عزیزم سید حسن منظہر عرف محمد -

کرد سفر ازیں جہاں در سفر آہ آہ او = ۱۲۸۴ھ — کمر مارا شکست = ۱۲۸۴ھ

م :- میر علی محمد - غم جوان عزیز من = ۱۲۸۴ھ

م :- میر محمد علی قدیر استاد میر حامد حسین نکہت -

ایوای قدیر خوشگوی = ۱۲۸۴ھ آہ والا طبع شاعر نکتہ سنج = ۱۲۸۴

پ :- پسر مولا بخش خان محی الدین نگری -

اظہار حسنین = ۱۲۸۵ھ

تاریخ حجرہ در جنب مسجد حضرت شاہ علیم الدین بلخی تعمیر فرمودند -

آسماں در سجدہ پیش این فتد = ۱۲۸۵ھ — پیش این حجرہ کند سجدہ مہر روز فلک = ۵

" بنای روضہ عالیہ حضرت شیخ شاہ محمد منعم حضرت شاہ علیم الدین بتعمیرش سعادت ابدی ذخیرہ ف

روضہ منعم کا بنا = ۱۲۸۵ھ

" ازدواج حکیم محمد حاجی، با دختر شاہ محمد نصیر - باشر اجماع زہرہ = ۱۲۸۵

" کدخدائی سید قطب الدین پسر منشی سید محمد نجم الدین - وی گشت نوشہ زلطف بنی = ۵

" ازدواج وزیر علی، پسر منشی امیر علی ساکن محلہ اسحق با دختر محمد منعم

نوشاہ بشد وزیر من ابن امیر = ۱۲۸۵ھ

پ :- ابن الابن مولوی واعظ حسین - دہد عمر و اقبال وی را خدا = ۱۱۸۵ھ

پ :- پسر میر خادم حسین، داماد ہمشیرہ زادم -

یاد را و بخت بود یا الہ = ۱۲۸۵ھ — وراثت حسنین = ۱۲۸۵ھ

پ :- پسر سید محمد میر خلف میر نگی جان - لعل دخشاں = ۱۲۸۵ھ

پ :- پسر ظہور الحق، خلف کلاں شیخ ہمت علی -

جلوۂ حسن ظہور بود = ۱۲۸۵ھ — دہد عمر و اقبال وی را خدا = ۱۲۸۵ھ

پ :- فضل امام فرزند مولوی سید ظفر امام -

خدا عمر مولود سازد دراز = ۱۲۸۵ھ — نور دیدہ جد و اب فضل امام = ۱۲۸۵

:- دختر حافظ عبد الغفور۔ دادہ باد دختر بازیب الہ = ۱۲۸۵ھ

:- مولوی شاہ علی کبیرؒ عرف شاہ محمد میرن جان افضلی محمدیؒ۔ ابن البنت شاہ محمد اجمل

حیف روز ششم ماہ محرم = ۱۲۸۵ھ - آہ از افضل عصر = ۱۲۸۵ھ

:- ملّا عبد الصمد کابلی۔ ملا عبد الصمد رحلت فرمودہ = ۱۲۸۵ھ

:- مولوی محمد فصیح غازی پوری۔ داغ محمد فصیح = ۱۲۸۵ - داحفظ نام آوری = ۱۲۸۵ھ

:- شاہ وزیر اللہ - بپیش شاہ نجف شد وزیر = ۱۲۸۵ھ

:- سیّد شاہ فدا حسین داناپوری۔

بسالِ وفاتش نوشتیم کو + فدا گشت بر اسم پاک حسین = ۱۲۸۵ھ - سہ شنبہ چہاردہ شہر صیام = ۱۲۸۵ھ

:- حضرت سیّد علی بن یوسف۔

دلیل خیرات = ۱۲۸۵ھ - درقیامت باعلی باشد علی = ۱۲۸۵ھ

:- خواجہ احمد خاں - رئیس این علاکرد رحلت = ۱۲۸۵ھ

:- شیخ غلام میر، عرف شیخ بکاؤ۔ صد آہ شیخ بکاؤ بمرد = ۱۲۸۵ھ

:- برادرم شیخ جمال علی، مرید حضرت شاہ وجہ اللہ - کجا آہ آں شیخ مرحوم = ۱۲۸۵ھ

:- میر علی محمد مرحوم - غم آں جواں عزیزم = ۱۲۸۵ھ

:- نواب غلام عباس، عرف نواب دولہ، مقیم مظفر پور۔

دریغ وآہ نواب = ۱۲۸۵ھ - غم نواب دولہ صاحب ودل = ۱۲۸۵ھ

:- مولوی سیّد اعظم الدین حسن خاں۔

شدہ انجام کار او ہمہ خوب = ۱۲۸۵ھ - بودہ امیر ذی وقار = ۱۲۸۵ھ

:- مولوی فرید الدین خاں مرحوم، صدر امین آرہ ضلع شاہ آباد۔

فرید دین بجنت شد از الہ آباد = ۱۲۸۵ھ - انتقال فرید عادل شد = ۱۲۸۵ھ

:- نواب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب معروف مرزا نوشہ ۲ ذی قعدہ روز شنبہ۔

مرزا نوشہ جناب غالب | در فن سخنوری یگانہ
از اہل سخن ربود دلہا | در شعر بطرز جادوانہ

کیفیتِ نثر اُو چہ گویم دارد انداز دلبرانہ
باشد بکلام او عجب لطف معشوقانہ و عاشقانہ
از کشورِ ہند تا بفارس زد کوس کمال خسروانہ
در وجد آرد قلوب پاکاں قولش در قالب ترانہ
مستانہ کلام او بخشد کیف و سکرمی شبانہ
این اشعارم بمدحت او بنود گفتار شاعرانہ
ہر آنچہ کہ گفتہ ایم یاراں باشد قول محققانہ
بگذاشتہ خاک پاک دہلی در شوق بہشت جاودانہ
سال آن بنظیر یحیٰی گو بود نظیری زمانہ = ۱۲۸۵ھ

دیگر:- غالب نام آور کہ گرفتی از قلم خود کار سیف
رحلت کرد و سالش گفتم حیف جناب غالب حیف = ۱۲۸۵ھ

م:- مرزا رجب علی بیگ، سرور تخلص -
بردہ سرور ازدل وجانم سرور = ۱۲۸۵ھ

م:- نُورخاں، خویش محمد بخش خاں محی الدین نگری -
وای صد افسوس جواں نورخاں = ۱۲۸۵ھ

م:- تنّی مطرب مشہور پٹنہ - تن تنّی الحال گردید بجان = ۱۲۸۵ھ

م:- مادر حافظ احمد شاہ، اہلیہ میر عبدالسبحان -
باد اوی بحشر با بنت رسول = ۱۲۸۵ھ

م:- اہل خانہ مولوی سید ابوالحسن، پسر بزرگ سید امداد علی خاں بہادر
بود بست و پنجم شہر رجب = ۱۲۸۵ھ - وی گشت باریاب بجرای سیدہ = ۱۲۸۵ھ

م:- دل جان لولی، مشہورۂ اٹاوہ -
پری رخسار بود = ۱۲۸۵ھ - حیف مُرد شد زیر خاک = ۱۲۸۵

تاریخ چاہ بنا کردہ شاہ آل احمد، واقع مولا نگر۔ ہست از چشمۂ آب حیات = ۱۲۸۶ھ

〃 〃 وزیر السلطان منشی محمد امیر علیخاں بہادر واقع مقام باڑہ

این چاہ فیض آمدہ چوں بحر = ۱۲۸۶ھ

تاریخ بنای مسجد ملکہ و خانم جان واقع شہر عظیم آباد۔

نگر در ہند این بیت الحرام = ۱۲۸۶ھ — کردند بنا ے قبلہ خاص و عام = ۱۲۸۶ھ

〃 کدخدائی خواجہ سلطان جان۔ بسم اللہ الالہ العظیم = ۱۲۸۶ھ

〃 زواج خواجہ فتح محمد خاں عرف سلطان جان خلف خواجہ محمد رحیم خاں۔

عزیز ماہ چہرہ کدخدا شد = ۱۲۸۶ھ — زہرہ و مشتری جمع = ۱۲۸۶ھ

〃 زواج مولوی سیّد شاہ ابو الحسن خلف بزرگ جناب شاہ امداد علیخان با دختر شاہ لطافت حسین۔

شاہ شد نوشاہ شدہ = ۱۲۸۶ھ — اجماع خورشید و مہ = ۱۲۸۶ھ

〃 تزویج مولوی سیّد شاہ ابو الحسن خاں۔

بو الحسن سید بشد ذی الجاہ = ۱۲۸۶ھ — گشت نوشہ عزیز اعلیٰ جاہ = ۱۲۸۶ھ

〃 تزویج شیخ فتح محمد کہ در پیری بار دیگر با زن جوان نکاح کردند۔

نوجوان دولتی بہ پیری یافت = ۱۲۸۶ھ — از سر جہد طبع تاریخش + گفت فتح در مرام شود = ۱۲۸۶ھ

〃 کدخدائی خواہر ثالث خواجہ علی مرزا، با مرزا رحمت اللہ بیگ بنارسی۔

شد سبکدوش ازیں بار گراں حالا او = ۱۲۸۶ھ

پ:۔ فرزند نرینہ بخانہ شیخ امیر علی۔ دہد عمر و اقبال اورا خدای = ۱۲۸۶ھ

پ:۔ پسر حکیم ارشاد علی۔ الخلف الرشید = ۱۲۸۶ھ

فرزند رشید حق عطا کردہ بہ او = ۱۲۸۶ھ

پ:۔ بنت الابن الغنی دختر شیخ نجم الدین عرف نواب صاحب

واعظ الدین حاجی صاحب کمال = ۱۲۸۶ھ — بنت ابنش را جہاں آرای داد = ۱۲۸۶ھ

پ:۔ پسر دختر سید سمیع خلف سید محمد اشرف مرحوم۔

نادرہ گوہر طالع شدہ زیبا مہر = ۱۲۸۶ھ — خاندان اشرف = ۱۲۸۶ھ

پ :۔ دختر ثانیہ بخانۂ عبدالقادر خاں۔ داد ایزد بابلِ اُو دختر = ۱۲۸۶ھ

م :۔ شاہ محمد محمود، خلف شاہ محمد باقر، ساکن نوآبادہ۔ غم محمود کسینۂ احباب = ۱۲۸۶ھ

م :۔ کبیر الدین ۱۱ ربیع الاول۔ آہ از غم کبیر = ۱۲۸۶ھ

م :۔ قاضی احمد بخش، دولت پوری۔ جواں لائق و شائستہ مرد واویلاہ = ۱۲۸۶ھ

م :۔ میر کاظم حسین، قادری منعمی ساکن درگاہ۔ خلف میر صفدر علی۔

ایوا دادجاں کاظم حسین نوجوان = ۱۲۸۶ھ — مردہ جوان کاظم ہای = ۱۲۸۶ھ

م :۔ عالم شاہ ـــــ ز عالم آہ رفتہ شاہ عالم = ۱۲۸۶ھ

م :۔ شاہ امام الدین، والد مولوی عبدالحکیم۔

امام دیں بجنت رفتہ = ۱۲۸۶ھ ـــ یافت با خداوند وصال = ۱۲۸۶ھ

م :۔ مولوی حافظ ظہیر الحق ـــ بودہ انتخاب دہر آہ = ۱۲۸۶ھ

م :۔ میر کفایت علی ـــ از شہر بج بودہ ہشتم = ۱۲۸۶ھ

مقاش بجنت فردوس = ۱۲۸۶ھ

م :۔ نواب سید الطاف حسین خاں، رئیس عظیم آباد۔ ۱۳ ذی الحج، چہار شنبہ

جنت الماوی از الطاف حسین او یافت = ۱۲۸۶ھ

م :۔ زوجۂ ثانیہ سید علی مظہر، عرف میرن جان۔ ہفتم شہر محرم روز جمعہ بود ہای = ۱۲۸۶ھ

م :۔ اہلیہ مولوی شاہ رشید الحق۔ وای واویلا دریغا = ۱۲۸۶ھ

اہل رشید الحق ذیجاہ = ۱۲۸۶ھ

م :۔ والدہ مولانا محمد سعید حسرت۔ باامہات مومنان باد او بخلد = ۱۲۸۶ھ

م :۔ اہلیہ افضل علی خاں۔ اُو در قیامت باد با بنت نبی = ۱۲۸۶ھ

طفیل سیدہ جایش شدہ بجنت = ۱۲۸۶ھ

م :۔ والدہ منشی محمد امیر۔ ۱۸ رمضان، چہار شنبہ۔ جایش بدہد خدا بفردوس = ۱۲۸۶ھ

م :۔ مسماۃ شرف النسا بیگم، اہلیہ خواجہ احمد خاں۔

حقا بجناں یافت شرف = ۱۲۸۶ھ

پ :- پسر سیّد شاہ غلام مظفر

علیم الدین بلخی شاہ جانم — حفیدش حق تعالیٰ داد انور

بخواں سال تولد ای یگانہ — پسر یوسف شرف اللہ اکبر ۱۲۸۷ھ

پ :- ابن الابن حضرت سید شاہ علیم الدین بلخی (یعنی پسر شاہ غلام مظفر) ۳ صفر، چہار شنبہ

چہار شنبہ بیست و سہ ماہ دوم یوم ولود = ۱۲۸۷ھ

پ :- پسر غلام حیدر — بلند اختر = ۱۲۸۷ھ

پ :- پسر مولوی سید وارث علی — زاد فرزند سعادت مند بارودی نکوی = ۱۲۸۷ھ

بادل شاد نوشتیم سنین میلاد + متولد پسر صاحب اقبال شدہ = ۱۲۸۷ھ

پ :- دختر نیک اختر سیّد خادم حسین — بداد یزداں دختر = ۱۲۸۷ھ

پ :- دختر مرزا رحمت اللہ بیگ بنارسی —

بنت رحمت اللہ ہمایوں جاہ = ۱۲۸۷ھ — دختر جمیل = ۱۲۸۷ھ

پ :- دختر مولوی ابراہیم، خلف شیخ محمد یوسف — دخت وجیہ ابراہیم = ۱۲۸۷ھ

م :- حضرت شاہ علیم الدین بلخی فردوسی - شب ۱۶ ربیع الآخر، شنبہ

آہ مخدوم علیم الدین شاہ = ۱۲۸۷ھ — قطب زمن ولیِ خدا صاحب الرسول = ۱۲۸۷ھ

م :- مخدوم شاہ امیر الدین بہاری فردوسی متخلص بہ وحید سجادہ آرای شاہ شرف الدین بہاری -

قبلۂ آفاق مخدوم جہاں قطب زماں = ۱۲۸۷ھ — شاہ فردوس بفردوس رسیدہ = ۱۲۸۷ھ

م :- سید شاہ علیم الدین بلخی فردوسی و حضرت شاہ امیر الدین بہاری -

اقامت گاہ ایشاں باد فردوس = ۱۲۸۷ھ

م :- حکیم شاہ محمد مہدی مسعود باب اللہ - شب جمعہ ۴ جمادی الاول

عاشق توحید شیدای نبی = ۱۲۸۷ھ — شد نثار جلوۂ مولا علی = ۱۲۸۷ھ

م :- مشترکہ تاریخ وصال شاہ علیم الدین بلخی و حضرت شاہ محمد مہدی مسعود باب اللہ

عاشق و معشوق میں اس درجہ دیکھا اتصال — درمیاں میں رہنا دا و ماطوٰ کا ہے محال

میں نے یوں تاریخ لکھی ہے کمالِ نو یہ ہے — عاشق و معشوق دونوں کا وصالِ نو یہ ہے = ۱۲۸۷ھ

م :- جناب شاہ مسافر ساکن چشتی پور - مسافر بود ازیں عالم مسافر شد = ۱۲۸۷ھ

م :- شاہ محمد اسمٰعیل کاظمی - ای شہر کاظمی = ۱۲۸۷ — ولی باکمال و باخدا درویش = ۱۲۸۷ھ

م :- میر خادم حسین - الآن شدہ محسوب بہ خدام حسین = ۱۲۸۷ھ

م :- خواجہ الطاف علی عرف علی مرزا فقیر تخلص —

صد مہ وی کمر من بشکست = ۱۲۸۷ھ — باد با حق مسکنش جنت ز الطاف علی = ۱۲۸۷ھ

م :- صاحبزادہ حضرت شاہ منیر الدین حسین - (ابن شاہ مبارک حسین) ۱۸ ذی الحجہ، جمعہ

شد ماہ منیر من نہاں از چشم من = ۱۲۸۷ھ — وی گل سیر ندیدم کہ بہار من شد = ۱۲۸۷ھ

م :- شیخ نثار حسین ۲۹ ذی الحجہ جمعہ - از دل و جاں بشد نثار حسین = ۱۲۸۷ھ

م :- خواجہ عبدالرحیم، صبا تخلص رئیس ڈھاکہ - وہ از یں گلزار ہمچوں بوی گل رفتہ صبا = ۱۲۸۷ھ

م :- لاڈلے، پسر خواجہ ابوالحسن - وی ز زہر خوردہ مرد = ۱۲۸۷ھ

م :- حاجی جعفر علی جرّاح - بست و دو شہر محرم ہای = ۱۲۸۷ھ — بر پدموت رنگ جان نشان = ۱۲۸۷ھ

م :- آغا حیدر علی - سلخ ذی الحجہ چہار شنبہ - شد روز وداع سال از دہر وداعش = ۱۲۸۷ھ

م :- اہلیہ میر لطف اللہ — باتول طیبہ حشرش بود = ۱۲۸۷ھ

م :- دختر حافظ عالم علی — از بہر پدر قیامتی شد = ۱۲۸۷ھ

تاریخ تعمیر کربلا شریف، واقع مقام صاحب گنج باہتمام آل حسن - ای جای قبلہ ہست بہ عاشق حسین = ۱۲۸۸ھ

" تعمیر مسجد بنا کردہ میر صفدر حسین واقع محلہ لودی کٹرہ شہر عظیم آباد —

ہم رتبہ عرش اللہ = ۱۲۸۸ھ — نظیر الکعبہ = ۱۲۸۸ھ

" تیاری ناچ گھر، چودھری ظہور الحق اسلام پوری کہ بتقریب ختنہ محمد واعظ الدین پسر خود ساختہ

طرب گہ و خانہ رقص = ۱۲۸۸ھ — دلکشا و خوب ہے یہ ناچ گھر = ۱۲۸۸ھ

" طبع کلیات جناب مولوی انور علی یاس آروی -

منطبع شد کلیات یاس باطرز حمید = ۱۲۸۸ھ - دیوان یاس گشت بمطبوع طرز طبع = ۱۲۸۸ھ

" صحت پرنس آف ویلز - جانی اعتدال از صحتش یافت = ۱۸۷۲ء

" ازدواج حضرت شاہ امین احمد فردوسی با دختر خواجہ لطیف علی -

امین باشرف گردیدہ نوشہ = ۱۲۸۸ھ

تاریخ ازدواج دختر میر امیر جان۔ شدہ انجام باخوبی مبارک = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ خلف ثانی شاہ غلام شرف بلخی ۔ نیظر حسین = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ " " غلام منظفر ۔ خدااش صاحب اقبال و باجلال کناد = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر مولوی منظور احمد ۔ ولد منظور احمد = ۱۲۸۸ھ ۔ محمد منظور = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر خواجہ حسین جان ۔ سید نظیر جان = ۱۲۸۸ھ ۔ ہست راحت روح = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر میر نجف علی ۔ جواں نصیب جواں بخت باد او = ۱۲۸۸ھ ۔ بیدار بخت او دایم باد = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر مرزا رحمت اللہ نیازی ۔ داد ایزد باو پور خوش اقبال = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر باقر علی خاں، عرف بنی جان ۔ فرماید دراز ایزد حیاتش = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر ظہور الحق، خلف شیخ ہمت علی ۔ الہی یاور روی بخت باد = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر الفت حسین، خلف ہمت علی ۔ نور چشم نور چشم من = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر حافظ عبد الغفور ۔ خواجہ محمد اشرف = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ پسر شیخ راحت علی، قاضی پوری ۔ نور الرضا = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ دختر سید صفدر حسین عرف میر میرزا ۔ اللہ باو دختر داد = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ دختر فقیر محمد یحیٰ ۔ دختر کی داد ایزد پاک = ۱۲۸۸ھ

ب :۔ دختر سید شاہد حسین پسر شاہ لطافت حسین ۔ شمع خاندان جد اقدس = ۱۲۸۸ھ

:۔ میر محبوب شبیر متوکل تخلص، ہا مغرب پنجشنبہ ۔ محبوب شبیر مر بسیر جناں شد = ۱۲۸۸ھ ۔ شوکت ثانی = ۱۲۸۸ھ

:۔ حکیم سید میکائیل مجذوب ۔ گفتم سال وفاتش یافت + روزی جنت میکائیل = ۱۲۸۸ھ

:۔ میر وزیر علی عبرتی ۔ شنبہ ۱۹ ربیع الآخر ۔ ز مرگ وزیر علی عبرتی آہ = ۱۲۸۸ھ ۔ عندلیب خوشنوای ملک تہند = ۱۲۸۸ھ

:۔ ملک دعاء اللہ ۔ قبول دعوت حق کرد از سر جان وی = ۱۲۸۸ھ

:۔ خواجہ امداد علی ۔ بجنت آمدہ خواجہ زامداد علی = ۱۲۸۸ھ

:۔ شاہ منظہر علی ۔ شاہ صاحب مذاق بود ایوای = ۱۲۸۸ھ

:۔ شاہ نصیر بلخی ۔ سرور زندگیم آہ رفتہ = ۱۲۸۸ھ ۔ بفردوس معلی شد نصیر ما = ۱۲۸۸ھ

:۔ شاہ امیر الحسن ۔ جامع ظاہر و باطن = ۱۲۸۸ھ ۔ رفت پیش رسول = ۱۲۸۸ھ

م :- سید شاہ امام علی بھاگل پوری پھلواروی ۲۰ رمضان دوشنبہ - شد آہ آفتاب دین نہاں زیر زمیں = ۸۸

م :- الحاج حکیم شاہ محمد ہادی حسن خلف شاہ محمد مہدی باب اللہ و شاہ امام علی - رضی اللہ عنہم = ۱۲۸۸ھ

م :- مولوی امیر حسن - الوا زمانہ خالی گردید از بزرگاں = ۱۲۸۸ھ

م :- علی محمد واعظ لکھنوی - عمدہ واعظان لکھنؤ ہی نہ ہی = ۱۲۸۸ھ

م :- مولوی سید اظہر علی - تاریخ او برآید لفظ نما ندای دل + گر نامور رئیس این شہر سال افزون = ۱۲۸۸

م :- حاجی شیخ احمد اللہ - آمد از پئے گلگشت جنت = ۱۲۸۸ھ

م :- منشی سید امیر علی، رئیس کڑا - باد حشرش با امیر المومنین = ۱۲۸۸ھ

م :- قتل نواب و وائسرائے نائب السلطنت لارڈ میو گورنر جنرل -

بے نشانِ خرابی ہند = ۱۲۸۸ھ - نواب گورنر کا کیا قتل ہوا ناحق = ۱۲۸۸ھ

م :- اسلام مرید شاہ واعظ علی - کردہ رحلت ز جہات = ۱۲۸۸ھ

م :- بنیادی خیاط - بر قدش جامہ کفن شد قطع = ۱۲۸۸ھ - پیش ادریس رفتہ دی = ۸۸

م :- رسول بخش داناپوری، نان پز - در خمیر او نکوئی بود از یوم ازل = ۱۲۸۸ھ

م :- جدہ منشی ممتاز الحق رئیس مونگیر - وی با امہات المسلمین محشور باد = ۱۲۸۸ھ

م :- اہلیہ سید لطف علی خاں رئیس عظیم آباد - بادیا رب بر سر وی سایۂ بنت نبی = ۱۲۸۸

م :- اہلیہ ثانیہ منشی سید محمد نجم الدین صاحب - یا الٰہ او با بنات المصطفیٰ باد الحشر = ۱۲۸۸

م :- گانگو مرحومہ دایہ ام - خدا جنت دہد وی را = ۱۲۸۸ھ

تاریخ کدخدائی خواجہ امجد حسین - بشر امجد حسین مہ لقا نوشہ مبارکباد = ۱۲۸۹ھ

تاریخ انطباع دیوان محبوب شیر صولت تلمیذ محمد احسن - بستہ دیوان صولت طبع با طرز نکوی = ۸۹

" کدخدائی شاہ مبارک حسین، پسر شاہ تبارک حسین، با دختر مولوی محمد احسن -

بنا میزد مبارک کدخدائی مبارک = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر مولوی محمد ابراہیم - خدا سازدش صاحب اقبال و مال = ۱۲۸۹ - نظر

پ :- پسر سید قطب الدین - شود دیدہ بودش مبارک = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر مولوی عبد الحمید - خدا مولود فرماید مبارک = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر مولوی سید احمد حسین ــ الٰہی بخت وی بیدار بادا = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر میر ابو محمد ــ ز برج شرف بر آمده مہر = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر منشی محمد امیر ــ لعل رخشنده = ۱۲۸۹ھ

پ :- پسر حیات بخش ــ ظہور حسنین = ۱۲۸۹ھ ــ باد عمرش درازند رحیم = ۱۲۸۹ھ

م :- خواجہ میرن جان ــ سال ہزار و دو صد و ہشتاد و نہ حیف = ۱۲۸۹ھ

از رحلت خواجہ ایوای = ۱۲۸۹ھ

م :- شاہ محمد اسحاق عرف شاہ دمڑی بہار ۱۲ ربیع الاوّل ــ باجناب اہل بیت مصطفی محشور = ۱۲۸۹ھ

م :- سید شاہ حسین علی، سجادہ نشین مقام نوآبادہ ــ ۱۵ ربیع الآخر شنبہ ــ

یافت دیدار حق بجنت وی = ۱۲۸۹ھ ــ حیف آفتاب بہشت = ۱۲۸۹ھ

م :- نجیب خاں ــ یافت آن مخلد مکاں = ۱۲۸۹ھ

شد او پیش خدا با وجد و حال = ۱۲۸۹ھ

م :- مولوی شرف الدین پھلواروی ــ شرفہا از لقای احمدی یافت = ۱۲۸۹ھ

م :- مولوی شاہ عبد الرشید ــ آن صوفی سعید العاقبت شد = ۱۲۸۹ھ

م :- مولوی حافظ ابو البرکات، بمدینہ طیبہ ــ یافتہ جا بعدن ابو البرکات = ۱۲۸۹ھ

م :- قاضی سید یوسف علی بھاگلپوری ــ داغ یوسف علی ای وا = ۱۲۸۹ھ

م :- سید امجد علی ــ ہفتم شہر رجب واویلا = ۱۲۸۹ھ

م :- عبد العزیز پسر تبارک علی ــ عم عبد العزیز والاجاہ = ۱۲۸۹ھ

م :- حافظ شیخ واعظ الدین حسین ــ در جنت للعلی جایش نما الٰہی = ۱۲۸۹ھ ــ صد آہ بجنت رفتند = ۱۲۸۹ھ

م :- شیخ نبی بخش ــ بشعبان کرد ارتحال = ۱۲۸۹ھ

م :- خادم حسین خان ــ غلام و بندۂ آل محمد = ۱۲۸۹ھ

م :- میر احمد علی، عطر فروش ــ بوی خوش دہد از قبر او = ۱۲۸۹ھ

م :- حکیم امیر حسن ــ قضای وی رسیدہ آہ ناگاہ = ۱۲۸۹ھ

م :- شیخ عبد الحمید کتاب فروش ــ کتاب عمر وی شد پارہ ای وای = ۱۲۸۹ھ

مم :- میر کاظم حسین، برادر مفتی سید رضا حسین۔
صد آہ صد آہ کاظم حسین = ۱۲۸۹ھ

مم :- شیخ یوسف حسین عرف پیارے۔ داغ یوسف حسین = ۱۲۸۹ھ

مم :- شیخ راحت علی قاضی پوری۔ راحت رفت = ۱۲۸۹ھ

مم :- مولوی منّا۔ داغ مولوی منّا صاحب = ۱۲۸۹ھ

مم :- خواجہ علی نواب ۱۲ شوال۔ صد ہای خواجہ علی نواب صاحب مرحوم = ۱۲۸۹ھ

مم :- عابد علی خاں۔ وا ویلا، زغم عابد علی = ۱۲۸۹ھ

مم :- میر محمد محسن، رئیس حاجی گنج۔ غم محمد محسن = ۱۲۸۹ھ

مم :- میر ذوالفقار علی، عرف چھوٹے میرن۔ از کوچ ذوالفقار علی آہ و آہ آہ = ۱۲۸۹

مم :- ڈپٹی وارث علی خاں۔ جناب ڈپٹی وارث علی = ۱۲۸۹ھ

مم :- خواجہ جیون۔ شنبہ پنجم ذی الحجہ ماہ = ۱۲۸۹ھ

مم :- میرزا ناصر علی خاں، عرف مرزا امیر خاں۔
غم مرزا = ۱۲۸۹ھ — شد تودیع او روز وداع سال حیف = ۱۲۸۹

مم :- چاندنی بیگم صاحبہ۔ آج آہا غروب چاند ہوا = ۱۲۸۹ھ

مم :- والدہ خواجہ احمد حسین۔ داخل فردوس شد = ۱۲۸۹ھ — شب بست ہفتم = ۱۲۸۹

قطعہ تاریخ غلبۂ اہلسنت والجماعت بر شیعان بحسن تقریر در مناظرہ مولوی محمد عظیم با مولوی ہادی لکھنوی۔
"حق غالب و باطل بلا انجام" = ۱۲۹۰ھ

تاریخ تزویج مولوی علیم الدین حسین، با دختر منشی عبد العلی —
شد نوشہ علیم الدین حسین عالم و نقاد = ۱۲۹۰ھ — شدہ بطور پسندیدہ کدخدا = ۰
" تزویج محمد کبیر پسر محمد وزیر دانا پوری۔ زہی نوشہ کبیر ابن وزیر من شدہ = ۰
" کدخدائی سید خورشید نواب ابن البنت سید ولایت علی خاں رئیس اعظم عظیم آباد۔
باشتری ماہ گردیدہ باہم = ۱۲۹۰ھ

تاریخ تزویج مولوی جنت حسین ـ گردیدہ تزویج جنت حسینم = ۱۲۹۰ھ
" تزویج بنت الاخت فقیر خواہر نورچشم سید وارث حسین ـ
نحمد اللہ سبکدوش گشتی = ۱۲۹۰ھ
پ :- ابن الابن سیّد شاہ علی حسین ـ شمع خاندان عز وکمال = ۱۲۹۰ھ
گل باغ علی حسین = ۱۲۹۰ھ
پ :- پسر منشی الطاف حسین، ساکن مہدانواں ـ گشت از الطاف حسین آں پسر = ۱۲۹۰ھ
پ :- پسر سید صفدر حسین، عرف میر مرزا ـ سرور خاطر احباب = ۱۲۹۰ھ
پ :- پسر وزیر جان ـ سیّد اظہر علی = ۱۲۹۰ھ
پ :- پسر خواجہ منعم بخش، عرف سلطان جان ـ
نورچشمان نورچشم ما = ۱۲۹۰ھ ـ ناظر الحق = ۱۲۹۰ھ
پ :- دختر خواجہ حسین جان ـ دادہ یزداں دختر = ۱۲۹۰ھ
پ :- دختر سیّد محمد اکبر، خلف شاہ محمد سجّاد داناپوری ـ
بادل شاد قلم تاریخش + دختر پاک نژاد املا کرد = ۱۲۹۰ھ
م :- حضرت شاہ منعم حسن، فرزند اصغر شاہ محمد مہدی مسعود باب اللہ ۱۲ ربیع الآخر شب پنجشنبہ
در حسن اہلبیت پاک نبی فنا شد = ۱۲۹۰ھ ـ این واقعہ ہست شیخ فرسا جانکاہ = ۱۲۹۰ھ
م :- شاہ محمد حسن، فرزند اوسط حکیم شاہ محمد مہدی مسعود باب اللہ
پیش شہ شہیداں شد = ۱۲۹۰ھ
م :- منشی فرزند علی ـ فرزند علی شد پیش حیدر = ۱۲۹۰ھ
م :- مولوی نعمت اللہ لکھنوی، ۳ محرم، شنبہ = رفتہ بجنت معلی = ۱۲۹۰ھ
م :- مولوی محمد حسن ـ ۱۴ محرم، جمعہ ـ بجنت مکیں گشت = ۱۲۹۰ھ
م :- چودھری واحد علی ـ شد بجنت چودھری واحد علی باصفا = ۱۲۹۰ھ
م :- حاجی میر بہادر علی ـ غم میر = ۱۲۹۰ھ
م :- سیّد عباس، رئیس حاجی گنج ـ بادحشرش بعلم دار حسین = ۱۲۹۰ھ

م :- خویش و اہلیہ میر عنایت حسین وکیل شیرپوری (کہ در یک ہفتہ این ہر دو حادثہ واقع شد)
پے در پے ہوا دو غم = ۱۲۹۰ھ

م :- اہلیہ مولوی سید شاہ امداد علی خاں بہادر۔ ربیع الاول، جمعہ
بانبت رسول این طاہرہ معصومہ باد = ۱۲۹۰ھ - آفتاب برج عصمت = ۱۲۹۰ھ

تاریخ صحت چھوٹن مطربہ مشہورۂ پٹنہ - مبارک ہووے بی چھوٹن کو صحت = ۱۲۹۱ھ

تاریخ تزویج ثانی جناب سید امداد علی خاں —
صاحب آسایش و آرام مبارک باشد = ۱۲۹۱ھ

پ :- پسر دختر میر امیر جان — طلوع گشتہ از اوج امیر کوکب اقبال = ۱۲۹۱ھ
بباغ اقبال نونہالی = ۱۲۹۱ھ

پ :- پسر الف خاں — خورشیدم از حمل آمد = ۱۲۹۱ھ
عنایت علی خاں = ۱۲۹۱ھ — مہ تاباں الف خاں یہ ہے = ۱۲۹۱ھ

پ :- پسر حافظ عبد الغفور — غلام محمد حسین = ۱۲۹۱ھ

م :- گلاب بہادر شاہ عرف سدا سہاگ، ماہ جمادی الاخری -
خزاں ربودہ بہار گلاب از چمن جاں = ۱۲۹۱ھ

م :- قاضی محمد اسمٰعیل بششم ماہ رجب - ~~نوبہاشتی رجب~~ = ۱۲۹۱ھ
وی انتخاب دہر بود = ۱۲۹۱ھ

م :- اہلیہ حضرت شاہ احمد حسین فرزند شاہ رکن الدین عشق۔ بانجاب زینب کلثوم الحاضر باد ۱۲۹۱ھ
در جوار سیدہ آرامگاہ او شود = ۱۲۹۱ھ

م :- اہلیہ شاہ محمد سعید — محشور یارب یاد بابنت نبی = ۱۲۹۱ھ
باالٰہی حامی او باد خاتون جناں = ۱۲۹۱ھ

م :- اہلیہ جناب شاہ علی حسن — الٰہی در جوار بنت احمد باد جایش = ۱۲۹۱ھ

تاریخ بزم مشاعرہ کہ در خانۂ باغ خواجہ حسن نو ابیت طرح آن شدہ۔ تاریخ شد از شمار احد
این انجمن مشاعرہ است
۱۲۹۲ھ = ۱۲۸۲ + ۱۰

تاریخ زواج صاحبزادگان سید عزیز الدین حسین و سید اشرف الدین حسین و سید رضی الدین حسین فرزندان حضرت سید مبارک حسین۔ نوشاہ ہر سہ شاہ شدند = ۱۲۹۲ھ

م :۔ حکیم محمد وصی پھلواروی ۔ بانی یادمی شود حشرش = ۱۲۹۲ھ

م :۔ شیخ خادم علی، نہم ماہ ربیع الآخر۔ خوابگاہش باد فردوس = ۱۲۹۲ھ

م :۔ میر سخاوت حسین ۔ حیف سخاوت حسین = ۱۲۹۲ھ

م :۔ محمد رحیم خاں، ماہ ربیع الاوّل ۔ خان عالیشان نماند ای وای آہ = ۱۲۹۲ھ

محمد رحیم خاں مرحوم = ۱۲۹۲ھ

م :۔ سید محمد اشرف ۔ داد نہ جایگاہش در اشرف جناں = ۱۲۹۲ھ

م :۔ منشی خورشید حسین، رئیس امیر گنج، ۴ شعبان۔ حیف آفتاب فلک دولت و اقبال = ۱۲۹۲ھ

تاریخ تشریف آوری عظیم آباد پرنس آف ویلز بہادر ولیعہد و نختیں پور ملکہ معظمہ تاجدار ہند و انگلینڈ جنوری ۱۸۷۶ء

توبھی کہہ تاریخ ای تجّیؔ عروج + ہوگیا شہر عظیم آباد کا = ۱۸۷۶ء

م :۔ خواجہ محمود جان، خلف خواجہ علی رضا۔

غم محمود جان صد آہ = ۱۲۹۲ھ ۔ خواجہ محمود جان زدہر شدہ = ۱۲۹۲ھ

م :۔ احمد حلوہ فروش، ۲۱ رمضان ۔ صد حیف = ۱۲۹۲ھ

م :۔ حافظ سید عنایت شاہ، ۱۵ رمضان

بستۂ عشق و آزاد زہر قید = ۱۲۹۲ھ ۔ بیدل دعاشق حق آناد دش = ۱۲۹۲ھ

م :۔ مولوی حافظ شاہ عبد الغنی محدث مجددی بمدینہ منورہ ۔ فاضل اورع باکمال = ۱۲۹۲ھ

م :۔ حاجی عبد القادر، ۱۹ شوال ۔ مجموعہ فضائل افسوس = ۱۲۹۲ھ

بودہ ز آیات الٰہی جل شانہ آیتی = ۱۲۹۲ھ

م :۔ صاحبزادہ مولوی شاہ غلام عباس ۔ ۵ شعبان

باد در ظل پاک حسین = ۱۲۹۲ھ ۔ محشور با جناب علم دار پاک شد = ۱۲۹۲ھ

م :۔ فرزند نرینہ ام کلثوم (علامت ووفات) در شد۔ بود یکدم حیات و مماتش = ۱۲۹۲ھ

م :۔ والدہ ام، ۲۰ شوال روز شنبہ ۔ باد ختر نبی وی یاد = ۱۲۹۲ھ

او روز محشر باد با بنت نبی = ۱۲۹۲ھ ۔ باشد مماتش از حب زہرا = ۱۲۹۲ھ

م :- مسماۃ زینت منکوحہ میر نجف علی ـ غسیم زینت = ۱۲۹۲ھ

تاریخ شکر عطیہ سید فرزند احمد صفیؔ

رقم کردم جزا باید ز مولا ÷ عطا فی شاعر کالبدر زاہر = ۱۲۹۳ھ

شکر کرم صفیر از جان کنی = ۱۲۹۳ھ

〃 قدوم مولوی غلام امام، متخلص بشہید در عظیم آباد۔

آمد بشہر مسکن مالوف من شہید = ۱۲۹۳ھ ـ قلبہا شد از لقای تو منور = ۱۲۹۳ھ

〃 فتح میر محمد ابو صالح ـ فتح دلخواہ میمون بواد = ۱۲۹۳ھ

〃 شدت وبای ہیضہ وطلب دفع این بلا از حضرت کبریا ـ یا ربنا الحفیظ = ۱۲۹۳ھ

〃 خلاص منشی ظہیر الدین وسید امام الدین و سید حبیب الرحمن ؒ

رسید بود بلا یا و لے بخیر انجام = ۱۲۹۳ھ ـ بے جرم چھٹے بلا سے تینوں = ۱۲۹۳ھ

〃 تزویج شاہ محمد ابو القاسم خلف شاہ عبد الحق کان پوری۔

بآئین ہمایوں کہ خدا گردید ابو القاسم = ۱۲۹۳ھ ـ شدہ نوشاہ ابو القاسم محمد بارک اللہ = ۹۳

〃 زواج شاہ محمد رشید الحق ـ خدای پاکش دہاد فرزند = ۱۲۹۳ھ

رشید حق شدہ نوشاہ = ۱۲۹۳ھ

〃 تزویج سید عبد الحسین ـ پسر قاضی سید حمید الدین حسین ـ

از الطاف باب اللہ نوشہ گشتہ او = ۱۲۹۳ھ

〃 تزویج ثانی مولوی محمد وحید، ابن خلف مولوی حسن عسکری، پھلواروی۔

تزویج ثانی وحیدم گردید = ۱۲۹۳ھ

〃 زواج مولوی ظہیر الدین، خلف جلال الدین، وکیل۔

ماہ و مشتری گردید باہم = ۱۲۹۳ھ

〃 تزویج سید احسان احمد، خلف شاہ محمد نصیر ـ شکر احسان خدای پاک بر = ۲۹۳

پ :- صاحبزادہ حضرت سید شاہ عزیز الدین حسین ـ

بفرزند مبارک این پسر عزیز مبارک باد = ۱۲۹۳ھ

پ :۔ ابن البنت خواجہ شاہ لطیف علی، عرف میاں جان ۔

میرے خواجہ کو مبارک ہو نواسا = ۱۲۹۳ھ

پ :۔ فرزند کنور سکھراج بہادر رحمتی ۔ کنور سکھراج امیر و احیب التوقیر صاحب عقل = ۱۸۷۶ء

مبارک باد فرزند سلیم النفس پیدا شد = ۱۲۹۳ھ

پ :۔ پسر عابد علی خاں ۔ بود نیک اختر = ۱۲۹۳ھ ۔ باد ابیدار بخت = ۱۲۹۳ھ

پ :۔ دختر سید شاہ شرف الدین حسین ۔ زخاندان شرف = ۱۲۹۳ھ

بنت پاک شرف الدین ہے حسین = ۱۲۹۳ھ

م :۔ شاہ وصی احمد پھلواروی، ۲ ربیع الاول ۔ روز پنجشنبہ ۔

پنجشنبہ ثانی اوّل ربیع = ۱۲۹۳ھ

م :۔ ابو الحسن منطقی ۔ فاضل منطقی نماند ای وای = ۱۲۹۳ھ

م :۔ حافظ رحمت اللہ الہ آبادی، ماہ صیام ۔ بروحش رحمت اللہ دایما باد = ۱۲۹۳ھ

م :۔ خواجہ امیر الدین ۔ در بہشت بریں مکیں = ۱۲۹۳ھ

م :۔ میر عبد السبحان - ۲۸ ماہ رمضان روز سہ شنبہ ۔ سہ شہر چہارم روز سہ شنبہ بود = ۱۲۹۳ھ

م :۔ مولوی محمد بخش خاں وکیل، ۳ جمادی الآخر، دوشنبہ ۔ زفوت نادرۂ روزگار آہ صد آہ = ۱۲۹۳ھ

م :۔ حاجی خواجہ عبد الحسین خاں، ۱۱ ماہ ربیع الآخر، روز شنبہ ۔

برسر لوح دہر دبیر فلک بلاغت سلک یکی + شد ز جہاں دتیرہ جہاں گردید رقم زسال وفات = ۱۲۹۳ھ

م :۔ سید شاہد حسین، ۴ ذی قعدہ روز سہ شنبہ ۔

صد حیف وای از رحلت شاہد حسین = ۱۲۹۳ھ

م :۔ نواب علی نواز، ۲ جمادی الاولیٰ، روز جمعہ ۔

جمعہ دوم بود جمادی الاولیٰ = باالف و دو صد و نود از ہجرت = ۱۲۹۳ھ

م :۔ پیارے صاحب، رئیس حاجی گنج ۔ غم پیارے ہی ہی = ۱۲۹۳ھ

م :۔ حسین خاں لکھنوی ۔ باجل نرد باخت = ۱۲۹۳ھ

م :۔ والدۂ میر علی محمد، شاد تخلص، اہلیہ سید عباس ۔ عقل تاریخ دعائی گفت باد زوجۂ عباس باخت حسین = ۱۲۹۳ھ

تاریخ عزل سلطان عبدالعزیز خاں و تخت نشینی سلطان مراد آفندی ابن سلطان عبدالمجید خاں۔

ینزع الملک ممن یشاء و یعطی المجید من یشاء = ۱۲۹۳ھ

م :- سلطان عبدالعزیز خاں سلطان روم - سریر آرای فردوس پاک گردید = ۱۲۹۳ھ

تاریخ مجلس مشاعرہ کہ سید مہدی حسین خاں عرف ممتاز نواب فرزند سید محمد نواب در باغ واقع محلہ قاضی پورہ قائم کردند۔ مجلس عرض کمال = ۱۲۹۴ھ

" تخت نشینی سلطان عبدالحمید خاں ۔ خلد اللہ سلطنتہم = ۱۲۹۴ھ

" دعای غلبۂ روم بر روس ۔ ہو غلبۂ روم = ۱۲۹۴ھ

" شکست روسی ۔ شکست روسی گردید = ۱۲۹۴ھ

" بنای بزم مشاعرہ کہ میر فرزند احمد صفیر برای مرزا ماہر در باغ خواجہ حسن نواب قائم کردند۔
صفیر این پاک مجمع بہر ماہر کرد = ۱۲۹۴ھ

" بزم مشاعرہ کہ نوروز علیخاں شیدا لکھنوی و محمد اکبر خاں جری در محلہ لودیکٹرہ قائم کردند۔
مجمع خوب بہت ولبس = ۱۲۹۴ھ

" رہائی امیر خاں رئیس عالم گنج از حبس دوام ۔ نگردید ضائع دعایم = ۱۲۹۴ھ

" مخاطب شدن نواب سید ولایت علیخاں صاحب بخطاب مشیر سلطنت ہند در دربار یکم جنوری ۷۸
مشیر سلطنت ہند گشت = ۱۸۷۸ء

" مجموعہ کہ دران ذکر شاگردان میر فرزند احمد صفیر بلگرامی است ۔
فیض بحید صفیر = ۱۲۹۴ھ

" زواج ثانی مولوی نذیر الحق پھلواروی ۔
بوی تعلق تانہ مبارک = ۱۲۹۴ھ — بطرز خوب مبارک جناب ما انہم = ۱۲۹۴

" ازدواج دختر سید میر میرزا، با میر واحد علی ۔
بوجہ نیک بنمود ادا فرض = ۱۲۹۴ھ — کردہ دوش تر اسیکہ بزدال = ۱۲۹۴

" ازدواج سید میر حسن، خلف سید صفدر حسین عرف میر میرزا ۔
کدخدائی امیر حسن شد = ۱۲۹۴ھ — چہ ناو مبارک شادی فرزندم گردد = ۱۲۹۴

تاریخ مشترکہ شادی پسر و دختر برادر سید صفدر حسین

ازدواج پسر و دخت = ۱۲۹۴ھ — شد با خوبی بسیار انجام = ۱۲۹۴ھ

" شادی سید نور الہدیٰ پسر میر شمس الہدیٰ۔

مکرر بتاریخ این مصرعست + مبارک باد شادی این باد = ۱۲۹۴ھ

" مشترکہ شادی پسر و دختر۔ لفظ ہو دے کیجے محسوب اس تاریخ میں + آپکو صاحب مبارک بیٹا بیٹی کا بیاہ = ۱۲۹۴ھ

پ :- فرزند رابع شاہ غلام مظفر بلخی — لخت جگر ما = ۱۲۹۴ھ

پ :- پسر دختر خواجہ محمد حسن عرف پیارے صاحب۔ مظہر الحسن = ۱۲۹۴ھ

پ :- ابن الابن خواجہ لطیف علی عرف شاہ میاں جان۔ بباغ لطیف علی گل = ۱۲۹۴ھ

پ :- پسر نواب محمد علی خاں۔ مہری برآمد ز برج شرف = ۱۲۹۴ھ —

پ :- فرزند میرا بو صالح — گل نو بباغ ابو صالح آمد = ۱۲۹۴ھ — باد اخرم و سرسبز این گل = ۱۲۹۴ھ

پ :- دختر شاہ رضی الدین حسین — زہی دختر پاک پاکیزہ = ۱۲۹۴ھ

از مژدہ تولدش شاد طبع و جانم = ۱۲۹۴ھ

پ :- دختر شاہ عزیز الدین حسین — بنت فرزند مبارک گردید = ۱۲۹۴ھ

پ :- دختر شاہ رشید الحق — مبارک شود این بنت پور = ۱۲۹۴ھ

این عطیہ بماہ رمضان = ۱۲۹۴ھ

پ :- دختر، دختر نواب یوسف علی خاں —

مبارک بہ نواب این بنت بنت = ۱۲۹۴ھ

پ :- بنت میر صفدر حسین، عرف میر میرزا۔

بنت میر صفدر حسین من = ۱۲۹۴ھ — دختر من = ۱۲۹۴ھ

م :- جنگ بہادر وزیر نیپال — وزیر نامی نیپال ہای رحلت کرد = ۱۲۹۴ھ

تاریخ خواگر بسمت + بگذاشت مال و دولت = ۱۹۱۲سمت

م :- خواجہ حسین خاں — سوم شہر جمادی اولیں و پنجشنبہ بود = ۱۲۹۴ھ

آثار نجات ادعیاں = ۱۲۹۴ھ

م :- پسر حکیم ارشد علی — از مرض او بود چاره = ۱۲۹۴ھ
م :- پسر میاں ظہور الحق — صبر کن صبر کہ نعم البدل از حق برسد = ۱۲۹۴ھ
م :- ڈاکٹر حبیب اللہ۔ ۳ جمادی الآخر، روز جمعہ۔ بود آخر کار مرگ = ۹۴
م :- عبد اللہ، شریف مکّہ معظمہ — از تحمل شریف مکّہ = ۱۲۹۴ھ
م :- حکیم ارادت حسین بمکہ معظمہ، ۴ جمادی الاخری
طبیب مہاجر قضا نمودہ ہای = ۱۲۹۴ھ — طبیب سنت بُود عاجز ز مرگ ؟
م :- شیخ فتح محمد، ۵ رجب روز شنبہ۔ سہ شنبہ ز شہر رجب پنجمین = ۱۲۹۴
آمرزد گناہانش خدای = ۱۲۹۴ھ
م :- شاہ نور احمد پھلواروی۔ ۹ رجب —
بجنت یافتہ دیدار حق وی = ۱۲۹۴ھ — رجوع نور احمد شد بسوی نور احد باز = ۹۴
م :- مولوی امیر الدین، ۱۳ رجب، روز دوشنبہ۔ آہ صد آہ فاضل اورع = ۱۲۹۴ھ
غم امیر رقم کرد بادل رنجور = ۱۲۹۴ھ — حاجی زاہد عالم متشرع بدحیف = ۱۲۹۴
م :- سیّد شاہ امیر الدین حسین، رئیس نوآبادہ۔ ۲۳ رجب، یوم شنبہ —
لقای کبریا باد الجنت = ۱۲۹۴ھ — ز ارتحال فقیر امیر آہ = ۱۲۹۴
م :- حکیم علی حسین خاں، ۲۷ رجب بمکہ معظمہ۔
مردہ بمکہ فخر اطبای ہند ہای = ۱۲۹۴ھ — آہ افسوس حکیم حاجی مولوی علی حسین خاں = ۹۴
م :- ڈپٹی قاضی محمد اظہار الدین خاں — محمد اظہار الدین = ۱۲۹۴ھ
م :- مولوی جمیل احمد بلگرامی، برادر زادہ مولوی اوحد الدین بلگرامی، صاحب نفائس اللغا
بشد فاضل با ادب از جہان = ۱۲۹۴ھ
م :- شیخ احمد حسین — صد آہ از داغ احمد حسین = ۱۲۹۴ھ
م :- سعید الزماں، خلف مولوی مسیح الزماں۔ بہشتی سعید الزماں شد = ۱۴
م :- حاجی میر یوسف علی داناپوری ۸ شعبان۔ زہی بمصر جناں رفت یوسف = ۴
م :- منشی سیّد یحییٰ علی خلف سیّد عبد العلی، ۲۲ شعبان روز شنبہ۔
رفت — یحییٰ علی بجنت آہ = ۱۲۹۴ھ

م :- منشی قمرالدین رئیس بارو۔ شد بجنت قمرالدین صد آہ = ۱۲۹۴ھ
م :- حکیم مولوی شاہ آل حسن، سلخ شعبان روز یکشنبہ۔
زغم آل حسن حیف = ۱۲۹۴ھ — آہ ازین واقعہ دلم شدہ خوں = ۱۲۹۴ھ
م :- مفتی محمد سعد اللہ، ۱۴ ماہ رمضان۔ روز یکشنبہ۔
گنجینۂ علم و فضل صد آہ = ۱۲۹۴ھ — نماند آفتاب آسمان علم و دانش آہ = ۱۲۹۴ھ
م :- میر امداد علی۔ بود صد حیف ہشتم از شوال = ۱۲۹۴ھ
م :- حاجی عبدالرحیم، مقیم بریلی ۲۹ شوال۔ گفت یحیٰ سال فوتش ہای مرد + حاجی ہما مذاق اہل دل = ۱۲۹۴ھ
م :- شاہ ولی اللہ، شب دوازدہم ذی قعدہ، دوشنبہ۔
عاشق پیر خرد = ۱۲۹۴ھ — در عشق حق تعالیٰ = ۱۲۹۴ھ
م :- خواجہ محمد حسن، ۲ ذی الحجہ روز چہارشنبہ۔ سال رحیل است کہ ہیہات آہ + از اجل خواجہ محمد حسن = ۱۲۹۴ھ
م :- شاہ نہال حسن، ۹ ذی الحجہ روز شنبہ۔ از دست اجل حیف نہال حسن افتاد = ۱۲۹۴ھ
م :- خواجہ محبوب جان۔ دل غمدیدہ من سال فوتش از سراندوہ + جوان محبوب جاں کرد از جہاں حیف صد رحلت گفت = ۱۲۹۴ھ
م :- میر جوہر علی — ازین دار جوہر علی رفت وای = ۱۲۹۴ھ
م :- اہلیہ ثانیہ سید محمد حسین عرف محمدو، رئیس حاجی گنج۔
ہمنشینم ہمنشین حور عین = ۱۲۹۴ھ — بار غم اہلیہ = ۱۲۹۴ھ
م :- دختر کوچک مرزا رحمت اللہ۔ جعلہا الالہ للوالدین شافعۃ ومشفعۃ = ۱۲۹۴ھ
م :- والدۂ شاہ میاں جان، ۲۸ شوال روز دوشنبہ۔
حیف بود آخر ماہ شوال = ۱۲۹۴ھ — در قبر یافتند آرام = ۱۲۹۴ھ
پ :- پسر حیدر شاہ، اختر شاہ نام۔
بادا بلند اختر = ۱۲۹۵ھ — زیبا گل باغ حیدر = ۱۲۹۵ھ

نام تاریخی گلدستۂ مشاعرہ کنور سکھراج بہادر رحمتی تخلص۔
تحفۂ انجمن رحمتی = ۱۲۹۵ھ

تاریخ تزویج عبدالخالق، پسر اشرف حسین پھلواروی۔

بازیب کدخدا شد این نور دیدہ = ۱۲۹۵ھ — با مشتری جمع زہرہ بود = ۱۲۹۵ھ

" " ثانی نجم الدین حسین ئیس بریل بود زہرہ جمع بامشتری = ۱۲۹۵ھ

زافضال حسین ابن علی اولاد وی بزید = ۱۲۹۵ھ

" " فرزند سید مہدی حسین خان عرف ممتاز نواب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ونصلی علی نبیہ العلیم = ۱۲۹۵ھ

پ :۔ پسر مولوی شاہ محمد رشید الحق۔ آدینہ نسبت کشتم بود = ۱۲۹۵ھ

خلف الرشیدم = ۱۲۹۵ھ

پ :۔ پسر سید واجد حسین، خلف بزرگ سید اسماعیل علی، رئیس عظیم آباد۔

دہد ربت کریمش عمر واقبال جواں = ۱۲۹۵ — یاالٰہی بخت بیدار او بود = ۱۲۹۵ھ

تاریخ قطعہ سید علی صاحب شاد کہ در حال پٹنہ انشا فرمودہ اند۔

| | |
|---|---|
| شاد فخر شعرا جامع علم وتحقیق | آنکہ بر فضل وکمالش بنود جای سخن |
| قطعہ ساختہ انشاد بحال پٹنہ | کرد العزۃ للہ ادا حق وطن |
| شعر ہاش آمدہ بردانش او برہانی | ناطقہ در صفت خوبیش آمد الکن |
| ہمہ اشعار گہر بار بنظم وترتیب | آمدہ ہمچو عقیق یمن و در عدن |
| سال این قطعہ قم خامہ او ساخت زہی | قطعۂ جنت فردوس بود قطعۂ من = ۱۲۹۵ھ |

پ :۔ پسر عمر خاں صاحب، عرف ننھے — عمر طویل ایزد بخشد = ۱۲۹۵ھ

نام تاریخی حسین علی خاں، رئیس محلہ سنگی مسجد۔ مظاہر الحسن = ۱۲۹۵ھ

پ :۔ پسر شمس الضحیٰ، بدر الدجیٰ نام خلف حافظ نصیر الحق۔ ماہ شمس الضحیٰ = ۱۲۹۵ھ

پ :۔ بنت البنت میر صفدر حسین عرف میر میرزا، دختر میر واجد علی۔

مبارک حسین بنت بنت = ۱۲۹۵ھ — مبارکباد بنت البنت من = ۱۲۹۵ھ

م :۔ اخوند عبدالغفور، ساکن سوات۔ ۷ محرم روز شنبہ۔

داعی خلق بحق شد زجہاں = ۱۲۹۵ھ — ہفتم ماہ محرم یوم شنبہ بودہ آہ = ۱۲۹۵

م :- سیّد الطاف حسین احمد، خلف سید افضل حسین احمد، ۲۳ محرم روز دوشنبہ۔
در جنت الماوی شد الطاف حسین آہ = ۱۲۹۵ھ

م :- حاجی میر محبوب بخش، ۲۶ محرم ۔ در محرم شدہ وفات اُو = ۱۲۹۵ھ

م :- سیّد علی رضا - ۲۹ ماہ صفر روز دوشنبہ۔ حیف صد حیف جوانی بصفر کرد سفر = ۱۲۹۵ھ

م :- میاں سعید، شہر صفر۔ عم سعید صد وای = ۱۲۹۵ھ

م :- بخشی دلّال بمکہ معظمہ ۔ بخشی ای وا بمکہ مرد بنا = ۱۲۹۵ھ
بخشید ایزد زمین حرم = ۱۲۹۵ھ

م :- حافظ محمد یوسف، خواہر زادہ مرزا رحمت اللہ بنارسی۔
ایوا داغ یوسف نوجواں = ۱۲۹۵ھ

م :- بہاری پسر ڈپٹی مولوی سید امیر حسن خاں۔ ایوای داغ پسر = ۱۲۹۵ھ

م :- نواب سید محمد باقر خاں عرف نواب مرزا ۔ ۱۰ ربیع الاوّل روز جمعہ۔
چوں بوی گل بجنت ای وای رفتہ = ۱۲۹۵ھ

م :- خواجہ علی حسین، ابن الابن حضرت شاہ ابوالبرکات ماہ ربیع الاوّل۔
عقل تاریخش از سرابہام + مات خواجہ علی حسین نوشت = ۱۲۹۵ھ

م :- مولوی شاہ محمد علی حبیب قادری تخلص بہ نصر، سجادہ نشیں پھلواروی۔ ۲۷ ربیع الاول روز دوشنبہ۔
آہ پنہاں آفتاب دیں شدہ زیر زمیں = ۱۲۹۵ھ ۔ وارث علم رسول آہا نماند = ۱۲۹۵ھ

م :- شاہ آل احمد پھلواروی، ۱۷ شعبان ۔
شاہ زدہ شہر شعبان = ۱۲۹۵ھ ۔ وصال حبیب خدا یافتیم = ۱۲۹۵ھ

م :- منشی نور الحسن، رئیس ملاٹھی ۔ بے نور شدہ زمانہ تیرہ = ۱۲۹۵ھ

م :- میر کمال الدین حسین ، ساکن محلہ مہندرو، ربیع الآخر۔ ہر کمالی را زوالی ہست دنیا بالیقین ۱۲۹۵ھ

م :- شاہ برکت اللہ۔ خلف و سجادہ نشین مولانا شاہ عماد الدین حسین حسنی منعمی۔
تیم سلسلہ منعمیہ رفتہ جواں = ۱۲۹۵ھ

م :- سیّد عبدالودود بخارانی - ۲۲ رمضان -
یکتای دہر و نادرۂ عصر بود آہ = ۱۲۹۵ھ

م :- مولوی سید محمد واجد - شہر رمضان -
رفت بفردوس برین = ۱۲۹۵ھ — جنتی گشت محمد واجد = ۱۲۹۵ھ

م :- عنایت خاں کہ در دریا غرق شدند - ۲۷ شب ماہ رمضان -
آہ عنایت خاں صاحب آہ = ۱۲۹۵ھ — یافت وجہ اللہ را در قرری = ۱۲۹۵ھ

م :- اہلیہ حاجی مولوی سیّد احمد حسین، ۲۱ ذی قعدہ روز یکشنبہ -
داخل بخلد وی بادا = ۱۲۹۵ھ — یکشنبہ و ذی قعدہ بود = ۱۲۹۵ھ

تاریخ مجمعی کہ برای تحقیق اقوال سیّد احمد خاں بہادر سی - ایس - آئی - مندرجہ تہذیب الاخلاق بہر ہفتہ در کاشانۂ قاضی سیّد رضا حسین صاحب مقرر می شود -

زہی این مجمع تقوی مزاجان — خوشا تحقیق ارباب فضایل
شود رفع از وجود پاک ایشان — بلای گر شود از چرخ نازل
بحال این جماعت ہست لاریب — عنایات خدای پاک شامل
شود از اتفاق اہل تحقیق — عوام النّاس را تحقیق حاصل
در اقوال جناب سیّد احمد — کہ در طرز خود آمد فرد کامل
تامل ساز و مگذر از سر حق — بامعان نظر کن غور رای دل
کہ احقاق حق اینجا ہست منظور — کنند ارباب علم ابطال باطل
شود ز آیینہ دلہای ما مان — کنون زنگار زیغ و ریب زایل
بخوان تاریخ این بزم مبارک — بہ اینجا ہست تحقیق مسایل = ۱۲۹۶ھ

تاریخ تزویج سیّد بدر الحسن خلف میر ظہور الحسن -
دلم سال تزویج باجان شاد + بود زہرہ در خانۂ بدر گفت = ۱۲۹۶ھ

م :- میر نثار حسین والد میر حامد حسین نکہت -
نوشتم سال فوتش بادل زار + سہ شنبہ سہ و دہ شہر محرم = ۱۲۹۶ھ

تاریخ صحت میر علی محمد شاد۔

جناب شاد فخر شاعران صاحب تحقیق — کہ دارد در دل خود حب آل سید لولاک
خدایش داد صحت در حروف معجم تاریخ — رقم زد خامۂ یکی شفا بخشید رب پاک
۱۲ ۹۶ھ

دیگر: شاد عالی رتبہ را لاقدر را — صحت دارم چون اللہ داد
عقل از تعداد ابجد گفت سال — از شفای شاد دلی گردیدہ شاد = ۱۲۹۶ھ

تاریخ زواج سید محب حسن، پسر میر ذیشان حسین ۔ زواج پور ذیشانی = ۱۲۹۶ھ
" " چودھری واعظ الدین خلف چودھری ظہور الحق ۔ شاکر حق بشد نوشاہ = ۱۲۹۶ھ
" " نظیر حسن عرف دھڑمی میاں ابن الاخت حاجی سید محمد سجاد ۔ زواج نظیر حسن = ۱۲۹۶ھ
" " الیاس حسن متخلص بہ طاہر، پسر مرزا ماہر لکھنوی خواہر زادہ اہلیہ خواجہ محمد اسمٰعیل خاں ۔
با زہرہ وصل مشتری = ۱۲۹۶ھ ۔
" زواج خواجہ سید حسن، پسر خواجہ محمد حسن ۔ نہال بر و مند خواجہ سید حسن حسنا = ۱۲۹۶ھ
" " سید محمد مہدی حسن خاں عرف بادشاہ نواب نخستین پور سید لطف علی خاں ۔
منزل خورشید با ماہ = ۱۲۹۶ھ ۔ وصال ماہ با خورشید = ۱۲۹۶ھ
" کدخدائی نواب سید الطاف حسین خاں خلف نواب محمد باقر خاں عرف نواب مرزا
با الطاف محمد گشت نوشہ = ۱۲۹۶ھ ۔ شد قران زہرہ و مہ بہ زمیں = ۱۲۹۶ھ
" " شیخ فضل الرحمٰن، پسر شیخ نثار حسین ۔
ایں جشن شادی شد مبارک = ۱۲۹۶ھ
" کار خیر دختران سید محمد ابو سعید خاں ۔
دو کار خیر با سامان نمود = ۱۲۹۶ھ

پ :- فرزند نرینہ بخانہ خواجہ فتح محمد خاں، عرف سلطان ۔
بس بخت او بیدار بادا = ۱۲۹۶ھ

پ :- پسر حاجی سید واجد حسین ۔ قادر قیوم دہد عمر درازش = ۱۲۹۶ھ
پ :- پسر، پسر شیخ نعمان خان شیشہ گر ۔ محمد نظام الدین حسن = ۱۲۹۶ھ

پ :- دختر میر واجد علی بنت البنت میر صفدر حسین عرف میر مرزا- یگانہ دادہ خداوند گوہرش- ۱۲۹۶ھ
پ :- دختر بخانۂ مولوی علیم الدین حسین دختر مولوی = ۱۲۹۶ھ
پ :- " بخانۂ نواب نجم الدین حسین
فضل امام شد = ۱۲۹۶ھ — دختر نواب پاکباز = ۱۲۹۶ھ
م :- شاہ فضل اللہ پھلواروی محرم- آہا شاہ فضل اللہ آہا = ۱۲۹۶ھ
م :- شاہ عبدالغنی مجددی محدث، ۶ محرم روز شنبہ-
خادم شرع احمدی بود آہ = ۱۲۹۶ھ — آیت کامل ز آیات رسول اللہ بود = ۱۲۹۶
م :- اصم ابکم، محمد علی، ماہ صفر روز شنبہ-
گفت پیر اصم و اضعف ہای = ۱۲۹۶ھ — شد بجاتش بسوال و بجواب بحیا = ۱۲۹۶
پ :- پسر ظہور الحق، مرید شاہ میاں جان- ماہ ظہور الحق = ۱۲۹۶ھ
م :- شاہ تبارک حسین - خدای تبارک دہد پاک جا = ۱۲۹۶ھ
م :- سید شاہ فخرالدین کشمیری- ۶ ربیع الاول روز جمعہ = ہای شہ فخرالدین = ۱۲۹۶
م :- شیخ مودن تاجر - ایوا از مرگ شیخ مودن = ۱۲۹۶ھ
م :- شیخ فخرالدین حسین پسر غلام پیر- افسوس نداد مرگ فرصت = ۱۲۹۶ھ
م :- سید علی رضا پھلوری، ۱۱ ربیع الآخر، روز جمعہ-
آمدہ اجل غریب = ۱۲۹۶ھ — سید شدہ آہ بادل پر حسرت = ۱۲۹۶
م :- میر فدا حسین، خواہر زادہ مولوی سید اصغر حسین-
داخل زمرۂ باایمان شد = ۱۲۹۶ھ — سید ابوالبسفر رحلت کرد = ۱۲۹۶
م :- مرزا نادر بیگ- ۱۸ ربیع الآخر روز جمعہ-
غم نادر = ۱۲۹۶ھ
م :- سید محمد ابوسعید خاں، ۲۰ ربیع الآخر-
بود یوم الاحد ماہ ربیع الآخر = ۱۲۹۶ھ — سعید من سعید العاقبت شد = ۱۲۹۶
م :- مولوی تراب علی، ۲۵ ربیع الآخر روز جمعہ- جمعہ و ماہ ربیع الآخر = ۱۲۹۶

م :۔ سیّد شاہ محمد ہارون، مرید و خلیفہ شاہ علیم الدین۔ ۲۴ ربیع الآخر۔ روز پنجشنبہ۔

قلم سال تاریخ کن باخدا + رقم زد بفردوس ہارون برفت = ۱۲۹۶ھ

م :۔ مولوی ہدایت اللہ۔ ۱۴ جمادی الاولیٰ، روز چہارشنبہ۔

ہدایت اللہ ما جنتی شد = ۱۲۹۶ھ

م :۔ سیّد امام الدین۔ ۱۷ جمادی الاولیٰ روز شنبہ۔

صد آہ غم عزیز از جاں = ۱۲۹۶ھ — غم جوان عزیز من آہ آہ = ۱۲۹۶ھ

م :۔ مولوی ولایت حسین۔ ہیہات مرگ ولایت حسینم = ۱۲۹۶ھ

م :۔ امداد حسین، نوجوان پسر محمد بخش خاں محی الدین نگری ۔ غم امداد نوجوان من = ۱۲۹۶ھ

م :۔ امیر علی شاہ، ۱۷ رجب روز شنبہ ۔ ہفدہم شہر رجب بود شنبہ ایوا = ۱۲۹۶ھ

م :۔ سید شاہ ہدایت حسین، رئیس دربھنگہ۔ بود ز اہل خیر و ہدایت = ۱۲۹۶ھ

م :۔ مولوی وارث علی سیفی کان پوری۔ ۱۶ رجب روز دوشنبہ۔

نماند آن سیفی جوہر شناس صاحب جوہر = ۱۲۹۶ھ ۔

م :۔ دو پسر و یک دختر خواجہ امان اللہ۔ ہر سہ حادثہ بعرصۂ دو ماہ واقع شد۔

سہ غم یک جان من وای = ۱۲۹۶ھ

م :۔ خواجہ جلال الدین، ساکن نیپال مرید حضرت والد قدس سرہ۔ ۳ رجب

شد آرام گہ وی بہشت = ۱۲۹۶ھ ۔ برادرم بطریقت جلال دین بخاست = ۱۲۹۶ھ

م :۔ صدیق احمد، عیسیٰ پوری۔ ماہ رجب ۔ شد محشور با صدیق اکبر = ۱۲۹۶ھ

م :۔ راجہ ہیبت سنگھ، خلف راجہ مجوب سنگھ ۔ غم مہاراج آہ = ۱۲۹۶ھ

م :۔ سید لطف الرحمٰن، خلف مولوی سید فرید الدین ۔ لطف الرحمٰن نمود رحلت صد ہای = ۱۲۹۶ھ

م :۔ خواجہ مقبول علی ۱۵ رمضان روز چہارشنبہ ۔

چہارشنبہ پانزدہ بد آہ از شہر صیام = ۱۲۹۶ھ ۔ برخیز یا رسول مقبول = ۱۲۹۶ھ

م :۔ منشی امین الدین حسین۔ ۲۹ رمضان ۔ روز چہارشنبہ ۔

رفت پیش مصطفیٰ اللہ جو = ۱۲۹۶ھ — چہارشنبہ بست ونہ بود۔ آہ از ماہ صیام = ۱۲۹۶ھ

م :- شاہ نظام الدین حفید مولانا فخرالدین دہلوی۔ ماہ شوال۔

شمع فخر آہ = ۱۲۹۶ھ — حیف ایوا یادگار فخر دین = ۱۲۹۶ھ

م :- شاہ غلام اشرف۔ غرۂ شوال روز جمعہ۔ عیدم شدہ عشرۂ محرم = ۱۲۹۶ھ

پ :- پسر الفت حسین خلف شیخ ہمت علی۔ محمد چراغ = ۱۲۹۶ھ

م :- نصیر الدین محمد، برادر بزرگ وزیر السلطان نواب محمد امیر علی خاں بہادر۔

محمد نصیر شما باد در قبر = ۱۲۹۶ھ — نصیر الدین محمد شد بجنت = ۱۲۹۶ھ

م :- غلام امام شہید۔ ۸ شوال روز پنجشنبہ۔

ثنا خوان حبیب اللہ = ۱۲۹۶ھ — شد بقرب رسول زندہ شہید = ۱۲۹۶ھ

م :- شاہ شرف الدین حسین مہدوی متخلص بخود شناس۔

ایوا خود شناس مہدوی = ۱۲۹۶ھ

م :- وزیر السلطان نواب محمد امیر علی خاں بہادر۔

باد حشرش با امیر المومنین = ۱۲۹۶ھ — وای پنہاں آفتاب ہند شد زیر زمیں = ۱۲۹۶ھ

م :- اہلیہ شاہ مبارک حسین — ویرانی خانہ مبارک صد آہ = ۱۲۹۶ھ

م :- " میر احمد حسین، رئیس حاجی گنج۔

یافت جنت زوجۂ والا نسب احمد حسین = ۱۲۹۶ھ — بس مایۂ آرام او برباد گشت = ۱۲۹۶ھ

م :- دختر سید حبیب الرحمن۔ عقل سال وفات گفت آہا + از پی مادر و پدر شد عشر = ۱۲۹۶ھ

م :- اہلیہ سید شاہ لطافت حسین رئیس نو آبادہ ۱۷ شوال یکشنبہ۔

باد با بنت رسول پاک حشر او = ۱۲۹۶ھ

م :- وارث النسا بیگم۔ بنت سید لطف علی خاں۔ اہلیہ سید ممتاز نواب۔

آہ پنہاں شد عروس از دیدۂ شوہر = ۱۲۹۶ھ — صد آہ محرم شدہ از بہرش عید = ۱۲۹۶ھ

تاریخ افتتاح مدرسہ شاہ محمد سعید حسرت — کشاد استاد باب علم و دانش = ۱۲۹۷

" مشاعرہ بباغ سید محمد نواب — مجمع شاعران است این = ۱۲۹۷ھ

زواج سید نہال اشرف، فرزند سید علی اشرف پیاری
زود این نہال تازہ بار آور شود = ۱۲۹۷ھ
از دواج سید علی رشید، خلف سید محمد نجم الدین، با دختر قاضی ظہور عالم آروی
کر زواج رشید ما گشتہ = ۱۲۹۷ھ
زواج نواب سرفراز حسین خاں عرف بنے نواب خلف نواب لطف علی خاں، با دختر خواجہ علی مرزا۔
او بہ تزویج سرفراز شدہ = ۱۲۹۷ھ
تزویج ثانی نواب سید محمد حسین خاں، عرف چھوٹے صاحب ہجرتی تخلص با دختر شاہ ثالث
مبارک ثانیاً تزویج الٰہی = ۱۲۹۷ھ

ب :۔ دختر امیر حسن، فرزند میر میرزا۔ دختر ابنم = ۱۲۹۷ھ
م :۔ حاجی سید اسمٰعیل علی، ۱۰ ربیع الاوّل، روز یکشنبہ۔
آہ رئیس اعظم = ۱۲۹۷ھ
م :۔ شیخ ریاض الدین حسین، ۲۸ ربیع الاوّل۔
آمد بہ ریاض ارم = ۱۲۹۷ھ
م :۔ حسین شریف مکہ معظمہ۔ شریف مکہ بجدہ شدہ شہید = ۱۲۹۷ھ
م :۔ شاہ محمد حسین محی الدین نگری۔ ۲۱ ربیع الآخر، روز جمعہ۔
در ذکر حق جاں بداد = ۱۲۹۷ھ
م :۔ سید امیر علی شاہ اکبر آبادی۔ بود وارث جنّات عدن = ۱۲۹۷ھ
م :۔ سید فخر الدین ساکن نیورہ۔ ایوا مرد فخر الدین جواں = ۱۲۹۷ھ
م :۔ خواجہ محمد اسمٰعیل خاں۔ ۱۱ ماہ ذی الحجہ۔
یازدہ از شہر ذی الحجہ = ۱۲۹۷ھ
م :۔ واعظ الحق ـــ یافتہ جنت زمرگ مکہ وی = ۱۲۹۷ھ
م :۔ خانصاحب مولوی محمد اسمٰعیل خلف الصدق ۱۷ جمادی الآخر، روز پنجشنبہ۔
غنودہ بیوم اجل = ۱۲۹۷ھ

م :۔ شیخ ناظم علی بھاگل پوری ۔ حیف ناظم علی حیف = ۱۲۹۷ھ
م :۔ حسنیٰ دختر باندی مظفرپوری ۔ خود بہشتی گردید حسنیٰ = ۱۲۹۷ھ

تاریخ زواج حافظ سید نذرالرحمٰن، نواسہ مولانا محمد سعید حسرت

زواج حافظ عالی مقام = ۱۲۹۸ھ ۔ نوشاہی او باد مبارک = ۱۲۹۸ھ

تاریخ تزویج مولوی سلیمان، با دختر کوچک شاہ علی حبیب نصر۔

گشتہ عقد بلقیس و سلیمان = ۱۲۹۸ھ

〃 زواج نواب محمد حسن خاں، خلف نواب یوسف علی خاں۔

محمد حسن گشتہ نوشاہ = ۱۲۹۸ھ ۔ بلقیس در قصر سلیمان آمدہ جلوہ طراز = ۱۲۹۸ھ

〃 زواج احسن جان سہسرامی ۔ نوشہ گشتہ حسن جانم = ۱۲۹۸ھ

پ :۔ ابن الابن شیخ میاں جان شیشہ گر۔ خورشید حسنین = ۱۲۹۸ھ
پ :۔ فرزند بخانہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی ۔ گل بازیب باغ اکبر = ۱۲۹۸ھ
پ :۔ دختر نواب سرفراز حسین ۔ دختر پاک آمدہ بوجود = ۱۲۹۸ھ
م :۔ شاہ محمد عمر مجددی ۔ ۲ محرم روز یکشنبہ بمقام رامپور ۔ جای او در زمرۂ خاصان یزداں باد = ۱۲۹۸ھ
م :۔ داروغہ امام خاں، مرید حضرت شاہ نذر محمد، ۳ محرم روز دوشنبہ، بمقام داناپور۔

در جنت قدس مسکنش باد = ۱۲۹۸ھ ۔ جان عزیز نذر محمد نمود آہ = ۱۲۹۸ھ

م :۔ میر الطاف علی، ۱۰ محرم روز دوشنبہ ۔ شد فائز خلد بریں = ۱۲۹۸ھ
م :۔ شاہ نوازش رسول سجادہ نشیں پتھو۔

چون نوازش رسول رحلت کرد ۔ شد بفردوس طیب و طاہر

لفظ رحلت بنام او کن ضم ۔ تا شود سال فوت او ظاہر

م :۔ عبدالعزیز، پسر بزرگ مولوی محمد واجد ۔ داغ مولوی عبدالعزیز = ۱۲۹۸ھ
م :۔ شیخ محمد صالح، ۱۷ ربیع الآخر ۔ زیر ظل پاک حسین = ۱۲۹۸ھ
م :۔ مولوی سید علی اعظم پھلواروی ۔ وصال فاضل پھلواروی = ۱۲۹۸ھ
م :۔ مولوی عبدالرشید کشمیری الاصل ۔ وفات عبدالرشید حیف = ۱۲۹۸ھ

م :- رمضان علی خاں قاری وحدیث خواں — قاری و ذاکر آہ واویلا = ۱۲۹۸ھ

م :- داروغہ سیّد فدا حسین — داغ سید فدا حسین آہ = ۱۲۹۸ھ

م :- شاہ الفت حسین فریاد — چون بخیر ز دردم نالہ و فریاد صد آہ = ۱۲۹۸ھ

م :- شاہ سیف الحق ماہ شوال — مقامش بود سدرۃ المنتہیٰ = ۱۲۹۸ھ

م :- حکیم سید احمد حسین خاں، ۱۳ ذی قعدہ، روز یکشنبہ —

آنکہ میکرد مردہ را زندہ + بسر او چگونہ آمد اجل = ۱۲۹۸ھ

م :- شاہ محمد سجاد ابوالعلائی داناپوری - ۴ ذی قعدہ، روز یکشنبہ -

۴ ذی القعدہ و یوم احد و چاردہم = ۱۲۹۸ھ — رونق افزای جنت الماوا = ۱۲۹۸ھ

م :- شاہ فدا حسین کریم چکی —

بنام حسین گشت واللہ فدا = ۱۲۹۸ھ

م :- سیّد محمد تبارک حسین ولد قاضی محمد نور الحسن، ۲۷ ذی الحجہ، در راہ مدینہ منورہ -

رحیل بست و ہفتم ماہ حج = ۱۲۹۸ھ

م :- مولوی احمد اللہ بجزیرۂ انڈمن، ۲۷ ذی الحجہ —

ماہ حج بود بیست و ہشتم = ۱۲۹۸ھ

م :- واقعۂ قتل کمن خاں رئیس غازی پور — بیدردی نمودند اہل زنار شہید = ۱۲۹۸ھ

م :- وفات میر عوض علی خوشنویس رامپوری -

چون قلم شد چاک دل از صدمۂ مرگش = ۱۲۹۸ھ

تلمیح: قدوم نواب مرزا خاں صاحب داغ از رامپور بعظیم آباد -

قدوم داغ حق گوی = ۱۲۹۹ھ

" تزویج عبد العزیز خاں عرف ننی نواب پسر عبد الرحمٰن خاں با دختر حافظ احمد اللہ صاحب

کہ مہ با مشتری گردیدہ باہم = ۱۲۹۹ھ

" تزویج سید خلیل الرحمٰن، فرزند مولوی سید فضل الرحمٰن -

کہ زیبندہ بیک برج آفتاب و ماہتاب آمد = ۱۲۹۹ھ

تاریخ زواج مولوی شاہ علی ابدال، فرزند اوسط جناب شاہ مخدوم حسن۔

کہ تزویج علی ابدال گشتہ = ۱۲۹۹ھ

" زواج ثالث شاہ نصیر الحق ـ ثالثاً کردہ وی ازدواج = ۱۲۹۹ھ

" کدخدائی شاہ محمد باسط نخستین پسر شاہ محمد واجد، با دختر شاہ امین احمد۔

کردہ تاج نوشہی وی زیب سر = ۱۲۹۹ھ ـ نوشاہی باسط عزیز ما گشت = ۱۲۹۹ھ

" قدوم مولوی عبد الحی از لکھنؤ بعظیم آباد۔ قدومش نزول رحمتِ حق = ۱۲۹۹ھ

○

تاریخ آرایش تھانہ خواجہ کلاں گھاٹ کہ سب انسپکٹر لالہ ڈیگن لال صاحب، بعہد حکومت خود آراستند۔

| | |
|---|---|
| سب انسپکٹر معلی جاہ ڈیگن لال را | دادہ است ایزد تعالیٰ اقتدار و احتشام |
| جمع در وی آمدہ عدل و رعیت پروری | ہست ممدوح و مکرم بر زبان خاص و عام |
| مند نا آن موضع دلکش ز اطرافِ مونگیر | ہست آباد از مقام و مسکن آن نیکنام |
| تھانۂ خواجہ کلاں را رونق بسیار داد | با کمال اہتمام و با نہایت انتظام |
| این چنین آرایش تھانہ بدورِ کس نبود | آفرین بر عقل ڈیگن لال صاحب احترام |
| عیسوی تاریخ این زیبایش از یحیٰ شنو | تھانہ باشد رونق بسیار زان والا مقام = ۱۸۸۲ء |

تاریخ اجرائے اخبار "بہار پنچ" کہ محمد اکبر خاں جاری کردند:

بود مشہور در آفاق این اخبار دلجوی = ۱۸۸۷ء

مصرع تاریخ برائے لوح اخبار ـ آزادہ و ظریف مرصع بہار پنچ = ۱۸۸۷

قاضی عبدالودود (بار ایٹ لا)

# کچھ دساتیر کے بارے میں

دساتیر طبع اوّل کے مرتّب و ناشر ملّا فیروز لکھتے ہیں:

کتاب مستطاب دساتیر[1] یعنی کلام ربّانی . . . کہ درینولا اقل واجہل عباد فیروز بن مرحوم ملّا کاؤس بمعاونت . . صاحب عالی شان . . مستر ولیم[2] ارسکین صاحب جلیل المناقب بزبان انگریزی ترجمہ ودر طبع خانۂ[3] بندر معمورۂ ممبئی[4] معروف بہ کوریر[5] مطبوع ومنتشر میگرداند . . . زبان اصل صحایف منزل اصلاً وقطعاً مناسبت بزبان زند[6] وپہلوی ودری بلکہ بجمیع السنۂ مشہورۂ . . . این زمان ندارد۔ ودر عصر خسرو پرویز حضرت ساسان پنجم این صحف را بزبان فرس درغایت سلاست وفصاحت و بلاغت . . ترجمہ نمودہ وہرچہ از آیات بیّنات کہ محتاج بزیادت شرح وبسط ست بعد ترجمۂ الفاظ آیات شرحی واضح مرقوم تا طالبان را دریافت بسہولت میسّر گردد . . این صحیفۂ مقدّسہ تا عہد شاہ جہان . . کالشمس فی الضحیٰ ظاہر . . ہویدا وبعد ازان . . مخفی ونا پیدا بود تا آنکہ قبل ازین پنجاہ وچہار سال دراوقاتی کہ والد ماجد . . سفر ایران اختیار[7] واقل نیز ہمراہ بودہ در اصفہان این نعمت عظمیٰ . . نصیب والد ماجد گردید[8] و مصنّف کتاب شارستان چہار چمن فرزانہ بہرام بن فرہاد کہ در فرقۂ زرتشتیہ از اعاظم حکما در عہد اکبر وجہانگیر بودہ غایت عقیدت ونہایت رسوخیت باین صحف مقدمہ داشتہ وحکیم[9] برہان تبریزی جامع . . برہان قاطع کہ فی الواقع اشمل واکمل سائر فرہنگہای دیگر مفقود الذکر است آوردہ۔ ومؤلّف . . دبستان المذاہب[10]

---

۱۔ ملّا نے انگریزی میں اسے DEBATIR لکھا ہے۔ ۲۔ یعنی ولیم ۳۔ طبع خانہ = مطبع ۴۔ ممبی بالیم، بمبئی ۵۔ COURIER ۶۔ زند یعنی اوستائی زبان، مگر اوستا کو زند کہنا نہیں چاہیے۔ ۷۔ یہاں پر فعل حذف۔ یہ درست نہیں، مگر ملّا سے یہ غلطی کئی جگہ سرزد ہوئی ہے۔ ۸۔ انگریزی دیباچے میں ہے کہ آغا محمد طاہر کتاب فروش سے دساتیر ملی تھی اور اس پر "کتاب گبری" مرقوم تھا۔ ۹۔ نہ جانے حکمت کا کیا تصوّر ذہن میں تھا کہ برہان کو حکیم لکھا۔ وہ اپنی کتاب سے حکیم درکنار فہمیدہ شخص بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ۱۰۔ کوئی اس طرح اور کوئی دبستانِ مذاہب لکھتا ہے۔

کہ بنظر غالب این حقیر میر ذو الفقار علی نام دارد .. از دساتیر کیشہای[۱] جداگانہ اہالی ایران .. و با اکثر اصحاب آن ملل نیز ملاقات در مرقوم فرموده - وسر ولیم جونس .. اگرچہ دساتیر .. با و نرسیده . اما در یکی از تالیف معتبرۂ خود انہ .. دبستان .. ذکری چند منتخب مرقوم فرمود .. و چون آن کتاب بفرد واحد منحصر و ثانی آن مفقود الاثر، این اقل را اکثر اوقات با اصحاب علم و ارباب عمل فرقۂ انگریزیہ بیست و مکالمت میسر و فطرت .. این گروه تحقیق .. تجسس ... مجهول .. بعد اطلاع بر وجود این صحیفہ عجیب و تحریص بر ترجمۂ آن در زبان انگریزی می نمودند تا آنکہ نواب مغفرت مآب امین الملک گورنر ڈنکن فرمانفرمای بندر بمبئی با ستبداد تمام بترجمہ مشغول و بذل جهد را تمام و انتشار آن مبذول میداشت - اماں از اجل اماں نیافت ... بعد ازان ...... جنرل سر جان مالکم بہادر از انگلستان مینوشتان ... تاکید اختتام ترجمہ .. و خود نیز در کتابی کہ مشتمل بر احوال ایران بزبان انگریزی تالیف فرموده شمۂ از اوصاف این صحیفہ .. مندرج ساختہ .. این حقیر نیز مدتی صرف اوقات در دریافت زبان اصل کتاب و مضامین آن بالغات فارسیہ غیر مستعملہ زمانہ ما بذا معروف و .. تصحیح سہو و تصحیف لغات و تحریف عبارات کہ از کاتب در صحیفہ واقع شده بود پرداختہ و .. فرهنگی علیحده مساوی لغات متداولہ و غیر متداولۂ این صحیفہ مرقوم ... مگر سہ چہار لفظ کہ معنی آن در حجاب اختفا محجوب در ذیل آن الفاظ مکتوب کہ معنی معلوم نگردیده ... اصل این صحیفہ .. در یک جلد علیحده و ترجمۂ آن در زبان انگریزی و فرهنگ بخط فارسی در جلد دیگر مطبوع و بنام نامی .. جنرل صاحب مشہور و مشتہر گردانید و قیمت این ہر دو جلد سی و پنج روپیہ مقرر است۔"

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے : دساتیر کی زبان عہد حاضر کی کسی مشہور زبان سے یا ادنیٰ دپہلوی و دری سے کچھ "مناسبت" نہیں رکھتی۔ عہد خسرو پرویز میں ساسان پنجم نے اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ عہد شاہ جہاں میں یہ کتاب سورج کی طرح ظاہر تھی۔ لیکن اس کے بعد مخفی ہوگئی۔ اس کا ایک نسخہ ملا کاؤس کو اصفہان میں ملا۔ انگریزوں کو جب اس کے وجود کی اطلاع ہوئی تو وہ اس کے ترجمۂ انگریزی پر مصر ہوئے۔ یہ کام گورنر بمبئی نے شروع کیا۔ لیکن قبل اتمام راہی عدم ہوئے۔ اس کے بعد جنرل سر جان مالکم نے خود ملا فیروز سے ترجمہ کی تحریک کی اور ملا نے یہ کام مسٹر ارسکن کی اعانت سے انجام دیا۔ ہر دو جلد کی قیمت ۳۵ روپے تھی۔

---

۱ - کذا

فہرست مندرجات جلد ۱ : نامۂ شت[1] مہ آباد ص۱ ۔ نامۂ جی افرام ص۵۱ ، نامۂ شای کلیو ص۷۴ ، نامۂ یاسان ص۹۰ ، نامۂ گلشاہ[2] ص۱۰۶ ، نامۂ سیامک ص۱۱۵ ، نامۂ ہوشنگ ص۱۲۳ ، نامۂ تہمورس ص۱۲۹ ، نامۂ جمشید ص۱۳۸ ، نامۂ فریدوں ص۱۵۶ ، نامۂ منوچہر ص۱۶۴ ، نامۂ کیخسرو ص۱۶۹ ، نامۂ زرتشت ص۱۷۶ ، پیغامِ سکندر ص۲۲۳ ، نامۂ ساسان نخست ص۲۲۶ ، نامۂ ساسان پنجم ص۲۹۸ ، اصل کتاب ص۳۰۵ سطر ۲ میں ختم ہوتی ہے ۔ اس کے بعد ص۳۰۵ تا ص۳۱۶ ملاّ فیروز کی عبارات ہیں جن کے اقتباسات اوپر درج ہو چکے ہیں ۔ آخر میں ۴ صفحوں کا غلط نامہ ہے ۔

جلد ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی تھی ۔ ملاّ نے سب سے پہلے سر جان مالکم سے خطاب کیا ہے جن کے نام یہ کتاب معنون ہے ۔ دیباچہ (ص۱ تا ص۱۱) میں سر ولیم جونس نے دساتیر کی نسبت دبستان کے حوالے سے جو کچھ لکھا تھا وہ اور مارکوئس ہیسٹنگس نے ترجمۂ ملاّ کے متعلق وابستگان فورٹ ولیم کالج سے ۱۸۱۷ء میں جو کچھ کہا تھا نقل ہوا ہے ۔ ترجمۂ ڈنکن کے بارے میں دیباچے سے یہ اطلاعات ملتی ہیں : ڈنکن تقریباً ۵ سال ملاّ کی مدد سے ترجمہ کرتے رہے ۔ لیکن نامکمل تھا کہ صحت خراب ہوگئی اور وہ ملاّ کو ساتھ لے کر ISLE OF FRANCE جانے اور بعد تکمیل ترجمہ کو ملکہ وکٹوریہ کی نذر کرنا چاہتے تھے لیکن قضا نے مہلت نہ دی اور وہ بمبئی ہی میں فوت ہو گئے ۔ ان کا ترجمہ ان کی دوسری چیزوں کی طرح انگلستان بھیج دیا گیا ۔ ملاّ نے یہ بھی لکھا ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کے موضوع پر ان کا رزم نامہ منظوم موسوم بہ جارج نامہ قریب الاختتام ہے ۔ انگریزی ترجمہ ۲۰۳ صفحوں میں آیا ہے اور فرہنگ دساتیر نے ۱۸ صفحے لئے ہیں ۔ جلد ۲ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کم ۴۰۰ نسخوں کے خریدار اشاعت سے قبل ہی پیدا ہو گئے تھے ۔ ۱۰۰ نسخوں کی خریداری حکومت بمبئی نے کی تھی اور ۵۰ باشندگان انگلستان نے جن کے نام درج نہیں ۔ وہ خریدار جن کے نام کتاب میں ہیں ان میں سے ۱۹ اپنے ناموں سے زرتشتی معلوم ہوتے ہیں ۔ ۲ مسلمان اور باقی عیسائی جن میں سے بعض کے سوا ظاہراً سب یورپی ہیں ۔ خریداران ذیل علی الخصوص قابل ذکر ہیں ۔ ہز رویل ہائی نس پرنس ریجنٹ (۲ نسخے) ، مارکوئس ہیسٹنگس گورنر جنرل (۶) لورڈ بشپ کلکتہ مسٹر ارسکن (۳) ٹرنر میکن[3] ۔

---

۱ ۔ شت تعظیمی لفظ ، دساتیری فہرست میں آباد کی طرح ہر پیمبر کے نام سے قبل ۔ ۲ ۔ یعنی کیومرث

۳ ۔ ناشر شاہنامہ فردوسی ۔

(۱) فیروز ۱۱۲۷ یزدگردی میں بروچ میں پیدا ہوئے۔ ۸ سال کے تھے کہ ان کے والد ملا کاؤس اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کر کے سورت آ گئے اور ۲ سالہ فیروز کو ساتھ لے کر ایران گئے۔ فیروز نے وہاں علوم مذہبی کی تحصیل کی اور "زند و پہلوی و اوستا و فارسی" سیکھی اور "مراتب موبدی" کو اتمام پر پہنچایا۔ ملا نے اس کے بعد "نجوم، منطق، فلسفہ، حکمت، الٰہیات و صرف و نحو" کی طرف بھی توجہ کی اور آخر میں بغداد وغیرہ میں ۱ سالہ اقامت کے بعد ۱۱۴۹ یزدگردی میں سورت واپس آئے۔ مگر تھوڑے ہی زمانے کے بعد بمبئی میں توطن گزین ہو گئے۔ "حکومت انگلستان" نے چار سو روپے ماہانہ ان کی مدتِ عمر کے لئے ان کے واسطے مقرر کر دیئے تھے۔ ملا کی وفات بتاریخ ۸ اکتوبر ۱۸۳۰ء واقع ہوئی۔ یہ حالات آقای رشید شہمردان[1] کی کتاب فرزانگان زرتشتی سے ماخوذ ہیں۔

(۲) آذر کیوان کا نسب نامہ دبستان مذاہب میں یوں درج ہے: "آذر کیوان ابن آذر گشسپ ابن آذر زردشت، ابن آذر برزین، ابن آذر خورین، ابن آذر ابین، ابن آذر بہرام ابن آذر نوش، ابن آذر مہتر ابن کہتر آذر ساسان کہ او را پنجم ساسان گویند، ابن مہتر آذر ساسان کہ چہارم ساسانش میخوانند ابن کہین آذر ساسان کہ مشہور بسوم آذر ساسان است۔ ابن .. دوم آذر ساسان ... ابن ... آذر ساسان نخست ابن خرد داراب ابن بزرگ داراب ابن بہمن ابن اسفندیار .. "

ڈاکٹر محمد معین ص۳۲ نے "آذر کیوان و پیروان او" (مجلۂ دانشکدۂ ادبیات شمارہ ۳ سال ۴) میں آذر مہتر کی تصحیح "آذر مہر" سے کی ہے اور لکھا ہے "نام پدران آذر کیوان تا آذر مہر ہمہ نامہای آتشکدہاست کہ در فرہنگ ہای پارسی بعنوان 'ہفت آتشکدہ' یاد شدہ اند و این ہفت آتشکدہ بصورتی کہ نقل کردہ اند وجود خارجی نداشتہ" ص۳۲۔

واضح رہے کہ اس نسب نامے میں مسلسل ۵ ساسان آئے ہیں۔ آقای محمد معین اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "مؤلف دساتیر پنج ساسان را از خود ساختہ است و این امر سوابقی دارد، از جملہ در فارسنامہ ابن البلخی میخوانیم:

"... اردشیر بن بابک[2] بن ساسان بن بابک، بن ساسان ابن بابک بن ساسان بن بہمن بن

۱- میرے کرمفرما ہیں اور باوجود زرتشتی ہونے کے نقشبندی سلسلے میں مرید ہیں۔ ۲- فارسنامہ اور مجمل التواریخ و القصص کا بیان ایک نہیں۔

ندیار" مؤلف مجمل التواریخ والقصص گوید" بہمن را پسری بود نام وی ساسان چون بہمن پادشاہی
ز راداو، ننگ آمدش ازین کار و بدو رجائی رفت ... و از وی پسری ماند ہم ساسان نام بود تا پنجمین
رہمان ساسان نام ہمی نہادند" یہ صحیح ہے کہ ۵ ساسان پہلے سے کتابوں میں چلے آتے تھے۔
ان کا تعلق تاریخ سے نہیں، اساطیر سے ہے۔ مزید یہ کہ ان کا مفروضہ زمانہ عہد خسرو پرویز کے
ے پہلے ختم ہوگیا تھا۔ اس عہد میں کوئی گمنام شخص ساسان نام کا ہو تو ہو، لیکن کوئی ایسا شخص جس کا
زمانے کی کتابوں میں ذکر آیا ہو اور اس عہد کے اہم معاملات سے اس کا سروکار رہا ہو، نہ تھا۔
محمد معین کا قول ہے کہ "ناگفتہ خود پیداست کہ این شجرۃ النسب مجعولست، وشاید نام پدر
صحیح نقل کردہ باشند" ساسانوں سے قطع نظر یہ کب ممکن ہے کہ آذر کیوان اور ساسان پنجم کے
یان آٹھ ہی پشتیں ہوں۔ دبستان میں جو نسب نامہ ہے، وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، باحتمال قوی خود
ر کیوان اس کا ذمہ دار ہے۔

دبستان میں آذر کیوان کے متعلق مرقوم ہے : ۵ سال کی عمر سے کم خواری اور شب بیداری شروع
در یافت کے وقت اس کی غذا کا وزن ایک درم رہ گیا تھا۔ ۲۸ برس خم نشین رہا اور اواخر
یا ایران سے ہند آیا اور کچھ دن پٹنہ میں مقیم رہ کر ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوا۔ ۸۵ سال کی عمر ہوئی۔
راہ سلوک میں حکمائے ہند و ایران و یونان نے خواب میں "اقسام حکمت" اس کے سپرد کئے۔ ایکدن
ے گیا جو کچھ پوچھا گیا اس نے اس کا جواب دیا۔ لوگ "ذو العلوم" کہنے لگے۔ ہیبر صاحب نے ایک سید صوفی
روایت کی کہ آذر کیوان کو برا نہ کہو، وہ ایک خدا رسیدہ شخص ہے۔ اس کا مرید یہ سنکر کہ ہیبر صاحب
ر کیوان کے مداح ہیں اس سے ملنے گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ حال ہی میں اصطخر سے آیا ہے۔
ر کیوان کو یہ سب معاملہ پہلے ہی معلوم تھا۔ وہ گوشت کھانے اور جاندار کو مارنے اور آزار دینے سے
ع تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی روح اس کے جسم سے جب چاہتی ہے باہر نکل آتی ہے۔ اس نے اپنے
ن مشاہدات کو منظوم کیا ہے :

بجو زابد اہسا[1] برگزشتم روان      رسیدم سوی پاک فرخ روان الخ

---

۱۔ دبستان (نول کشور ۱۸۸۸ء) میں ابدا ہیا (متن)
ن در اصل ابدا ہیا سیم ہے اور آذر کیوان کی نظم میں اسی طرح ہے۔ اس نظم میں مشاہدات کا ذکر ہے۔

اکبر کے زمانے میں آذر کیوان ہندوستان طلب کیا گیا۔ لیکن اس نے عذر کیا اور اپنی کتاب بھیج دی، "در ستایش واجب الوجود و عقول و نفوس و سماوات و کواکب و عناصر و در نصائح بادشاہ مشتمل بر چہاردہ جزو۔ ہر اوّل سطر آن پارسی بحت دری بود و تصحیف آن عربی میشد، چون قلب میکردند ترکی بود، چون تصحیف آن میخواندند ہندی میگشت"۔ ابوالفضل کو اعتقاد تمام آذر کیوان سے تھا۔ اس کے دوسرے مسلمان معتقد بھی تھے، از انجملہ ابوالقاسم فندرسکی۔

آذر کیوان کا حال دبستان کے علاوہ چہار چمن[1] میں تھا، لیکن اس کتاب کا چوتھا چمن جس میں یہ تھا، غائب ہے۔ اس بات کا کوئی قابلِ قبول ثبوت نہیں کہ عہدِ اکبری میں اس سے ہندوستان آنے کی استدعا کی گئی تھی، یا فندرسکی اس کے معتقد تھے۔ صاحبِ دبستان یا دوسرے دساتیریوں کی شہادت کا عدم و وجود برابر ہے۔ ۱۴ جزو کی ایسی کتاب کہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی سب میں پڑھی جا سکے، نہ کبھی لکھی گئی، نہ لکھی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد معین کا قول ہے کہ آذر کیوان اواخر قرن دہم ہجری میں اپنے مریدوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہند گیا اور پٹنہ میں مقیم ہوا۔ پٹنہ جانا مسلّم، لیکن اس کا ثبوت موجود نہیں کہ وہ اواخر قرن مذکور میں ہند آیا تھا۔ آذر کیوان نے بہت سی کتابیں لکھی ہوں گی، لیکن اس نظم کے سوا جس کا ذکر آ چکا ہے کوئی چیز جو خود اس کے نام سے ہو، موجود نہیں۔

اس کا قطعی طور پر ثابت کرنا ممکن نہیں۔ لیکن قرائن قوی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خود آذر کیوان دساتیر کا مصنف ہے۔ نامۂ ساسان پنجم میں یہ عبارت ملتی ہے:

"در تخمۂ تو پیغمبری ہمیشہ ماند" دساتیر ص۳۰۴

آذر کیوان کے معتقدین نہ صرف اسے بلکہ اس کے بیٹے کو بھی نبی لکھتے ہیں۔ یہ پیشینگوئی کہ ساسان پنجم کی نسل سے نبی آئندہ بھی ہوتے رہیں گے اس غرض سے تھی کہ دعوے کا موقع مل سکے۔

(۳) فرزانہ بہرام آذر کیوان کے قیام پٹنہ کے زمانہ میں شیراز سے آیا اور ریاضت میں مشغول ہوا۔ پارسی و پہلوی و عربی سے جیسا چاہیے واقف تھا اور منطق و طبیعات و ریاضیات و الٰہیات سے بخوبی آگاہ۔ چہار چمن میں وہ کہتا ہے "بیاوری حضرت کیوان بملک ملکوت و جبروت و لاہوت[2] رسیدم و تجلّیات آثاری و افعالی و صفاتی و ذاتی وصول یافتم"۔ فرزانہ بہرام تاجر پیشہ تھے۔ لوگوں کا

---

۱۔ چہار چمن طبع ہو چکی ہے۔ لیکن اس میں چوتھا چمن الحاقی ہے، اصل غائب ہے۔ میں نے بمبئی اور پونا میں بہتوں سے اس کے متعلق دریافت کیا، کسی کے پاس موجود نہیں پایا گیا۔ ۲۔ ان بزرگوں میں انکساری کی کمی نہیں

رہے کہ کیمیاگر تھے۔ تجارت لئے چھپانے کی غرض سے تھی۔ بمقام لاہور ۱۰۴۳ میں وفات پائی (دبستان ملاکا)

(۴) دبستانِ مذاہب کے مصنف نے اپنے حالات تو دیئے ہیں لیکن کسی جگہ اپنا نام نہیں لکھا۔ مُلّا
نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میر ذوالفقار علی اس کے مصنف ہیں۔ مآثر الامرا نے ذوالفقار اردستانی
کو اس کا مصنف لکھا ہے۔ یہ قول بھی ہے کہ کیخسرو پسر آذر کیوان اس کا مصنف ہے۔ میں اس سے متفق
۔ یہ بخوبی ممکن ہے کہ اس نے کبھی اپنے کو میر ذوالفقار علی اور کبھی صرف ذوالفقار کہا ہو ۔۔ موبد تخلص
ک شاعر کا دیوان فارسی کتابخانۂ خدا بخش میں موجود ہے اور اس کتاب خانے کی طرف سے شائع
یرے نزدیک اس میں شبہے کی بہت کم گنجائش ہے کہ یہ موبد ہی دبستانِ مذاہب کا مصنف ہے خواہ وہ آذر کیوان کا بیٹا ہو نہ ہو۔

(۵) برہان قاطع پہلی فرہنگ ہے جس میں خاص دساتیری الفاظ ملتے ہیں۔ لیکن دساتیر کا
ایک آدھ جگہ ہو تو ہو۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ بیشتر دساتیری الفاظ اس میں موجود ہیں۔ اس فرہنگ میں
فات کے شمول کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بعد کی فرہنگوں میں بھی داخل ہوئے اور انکی خاصی تعداد نظم و نثر
ں میں ایران و ہند دونوں ممالک میں مستعمل ہونے لگی۔ علی اکبر دہخدا کے لغت نامہ تک میں دساتیری
ظ مثل آرش و آرشی بغیر حوالۂ دساتیر آگئے ہیں۔ ایرانی شعرا مثل فرصت و ہدایت وغیرہ کے یہاں
دساتیری الفاظ ملتے ہیں اور غالب کی دستنبو تو ان سے مملو ہے۔

(۶) یہ بات کہ عہد شاہجہاں تک دساتیر ایک بہت مشہور کتاب تھی غلط محض ہے۔ دساتیر کی
کتابیں قرن یازدہم میں لکھی ہیں ان سے اور برہان قاطع سے قطع نظر دساتیر کا نام تک کہیں نہ آیا اور
ں کے خاص الفاظ و مطالب کہیں ملتے ہیں۔ اس کی اشاعت کے بعد ہی مستشرقین مغرب نے اس کی مجہولیت
اتفاق اعلان کیا۔ نہ کشتی البتہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ اس کی اصلیت کا قائل
ور دوسرا اسے جعلی قرار دیتا تھا۔ بالآخر اورنٹیل کانگریس کے اجلاس جینوا میں شہریار جی دادا بھائی بروچا
مقالہ اس کے خلاف پڑھا اور اس کے بعد سے شاید ہی کوئی زردشتی ہو جو اس کی اصلیت کا قائل
ان کے مقالے کا ایک اقتباس آقای شہمردان کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"پس از مطالعات دقیق دساتیر باین نتیجہ میرسم کہ این کتاب ہیچ وجہ نمیتوان جزو کتاب مذہبی مزدیسنا
آورد، زیرا مندرجاتش نہ با مندرجات اوستا برابر است و نہ با مندرجات کتب پہلوی دورۂ
سانیان و یقیناً محصول دورۂ اخیر می باشد ۔ ہر چند تعلیمات این کتاب باقتالیم ۔۔ زردشت نیز

مشابہت ندارد، بلکہ تعلیمات ہنود، بودا و مذہب افلاطونی متمایل است۔ چنانچہ خوردن گوشت حرام
و ریاضت و زہد و فاقہ کشی و تجرد و ترک دنیا ما موعظ مینماید۔ دساتیر از نقطۂ نظر تقویم و اساطیر و
تاریخ و کتب مذہبی مزدیسنا مغائرت تامی دارد و دبان آسمانی آن تحریفی است از السنۂ پہلوی پارسی و ہندی۔

(۷) زردشتیوں کے کتب مقدس میں زردشت سے قبل کے پیمبروں کی طرف اشارہ ہو، لیکن کسی کو بطور پیمبر نہیں
بتایا اور نہ یہ زردشتی عقیدہ ہے کہ زردشت کے بعد کوئی نبی آئیگا۔ زردشتی مذہب میں زردشت کو مرکزی حیثیت حاصل
ہے اور دساتیری پیمبروں میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ زردشتی و دساتیری عقاید بھی مختلف ہیں۔ پھر
اس کی کیا وجہ ہے کہ زردشتیوں کے ایک گروہ نے اسے اپنی کتاب مقدس تسلیم کیا؟ اس کا راز اسکی فرضی قدامت میں
مخفی ہے جس پر سر ولیم جونس نے بہت زور دیا تھا۔

دساتیر کے مطابق آبادیوں کی حکومت (اسکے بعد جی افرامی وغیرہ آئے) "سوزاد" سال رہی اور سوزاد
سال ۳۰ ہزار مہاسنگ برس ہوتا ہے (دساتیر ص۵۶) یہ کس طرح ممکن تھا کہ ملا فیروز وغیرہ دنیا کی قدیم ترین کتاب کے
مصنف ہونے کے فخر سے زردشتیوں کو محروم کر دیتے۔ رہے دساتیری اور زردشتی عقائد کے احکام کے اختلافات تو
صاحب دبستان نے اس کے باوجود دساتیر کو قبول کرنے کے لیے زمین ہموار کردی تھی۔ دساتیری فن تاویل میں بڑی
مہارت رکھتے تھے۔ لفظوں کے الٹ پھیر سے وہ کوئی دعوٰی ایسا نہیں جسے ثابت نہ کر سکتے ہوں جو دبستان میں ہے۔
آبادی کہتے ہیں کہ زردشت کا مدار رمز و اشارات پر ہے۔ حقیقت کو صرف خواص سمجھ سکتے ہیں۔ عوام سے
ایسی باتیں کہنی چاہئیں جو ان کے فہم کے ماوراء نہ ہوں۔ بعض آبادیوں کا قول ہے کہ زند دو قسم کی تھی۔ ایک صحیح اور
بے رمز جسے مہ زند کہتے تھے اور دوسری مرموز جسے صرف زند کہتے ہیں۔ پہلی نامۂ آباد کے مطابق تھی۔ لیکن یہ
تسلط بیگانگاں مثل ترکان و رومیان کے بعد غائب ہوگئی اور زند کا بھی ایک بڑا حصہ ضائع ہوگیا۔ عہد اشکانیاں
میں زند پر عمل تھا، لیکن اردشیر ساسان دوم کا مطیع تھا اور مہ زند پر عامل۔ نوشیرواں کے عہد میں بھی اسی پر عمل تھا۔
آبادیوں کا عقیدہ ہے کہ "اگرچہ دین زردشت از گشتاسپ تا یزدگرد رواج تمام داشت، اما بادشاہان تاویل
کردہ آن را با شریعت آذر ہوشنگ یعنی مہ آباد مطابق می ساختند"

(۸) آجکل زردشتیوں کے دو گروہ ہیں۔ ایک دساتیر کو عہد اکبری سے قبل کی کتاب نہیں مانتا۔ دوسرا ایسے جعلی
کر جعلی ہونے کے باوجود یہ اس قدر جدید نہیں اور واقعی خسرو پرویز کے عہد یا اس کے کچھ بعد کی ہے۔ اس گروہ کے دلائل بہت کمزور ہیں۔



(بشکریہ نقوش اپریل — جون ۱۹۶۶ء)

پروفیسر سید امیر حسن عابدی
دہلی یونیورسٹی

# سلمان ساوجی کی کچھ اور غیر مطبوعہ غزلیں

نسخۂ خدا بخش سے جرنل نمبر ۲۱ میں سلمان ساوجی کا غیر مطبوعہ کلام پیش کیا گیا۔

دیوان سلمان ساوجی کا ایک بہت عمدہ اور قدیم قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے جس کی کتابت ناصر بن بندہ چہر نے محرم ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں قاہرہ میں تمام کی تھی۔ غالباً یہ سلمان کے کلام کا سب سے قدیم نسخہ ہے جو ان کی وفات کے تقریباً چودہ سال بعد لکھا گیا۔ اس نسخہ میں قصیدے، غزلیں، قطعے اور رباعیاں دی ہوئی ہیں جبکہ خدا بخش والے نسخہ میں صرف غزلیں ہیں۔ اس نسخہ میں چھبیس غزلیں ایسی ہیں جو اب تک دیوان کے مطبوعہ نسخوں میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔ ان میں سے صرف یہ دو غزلیں خدا بخش کے نسخہ میں موجود ہیں: "آنجا کہ عشق آمد کجا نیز خرد را جا بود" اور "خواہیم چون زلیخا یوسف دگر خریدن"۔ البتہ خدا بخش والے نسخہ میں دوسری غزل کا مقطع نہیں ہے۔ جبکہ سالار جنگ میوزیم کے نسخہ میں یہ مقطع بھی موجود ہے:

سلمان بنام و نالہ کشش قلم کر خواہد — این ناچار ستردن و این نالہ ہا دریدن

لیکن حسب ذیل غزلیں ایسی ہیں جو نہ خدا بخش کے نسخہ میں موجود ہیں اور نہ مطبوعہ نسخوں میں:

۱

بی گل رویت ندارد رونق بستان ما
بی حضورت هیچ نوری نیست در ایوان ما

گر بسامان سر کویش رسی ای باد صبح
عرضه داری شرح حال بی سر و سامان ما

در دل ما پاس غم بشکست غم در دل بماند
چیست یاران چاره غمهای بی پایان ما

در فراقت چیست گویی زندگانی را سبب
سخت رویی فلک یا سستی پیمان ما

دوستان گویند دل را صبر فرما پید صبر
چون کنم ای دوستان دل نیست در فرمان ما

در فراق دوست دل خون گشت خواهد شد بباد
دوستان بهر خدا جان شما و جان ما

در فراقش چند چندین شب شبی خوابم ربود
می شنیدم در شکر خواب از لب جانان ما

بار هجر ما که کوه از بر ندارد طاقت او جوست
چون تحمل میکند کو هی دل سلمان ما

۲

من کجا دریابم آن کس را که عقلش درنیافت — جز دل مسکین وصالش را کسی دیگر نیافت

بی غلط گفتم که بود آنکس که در عشقش گرفت — بار دل را بر خود و از باغ وصلش بر نیافت

چون برم من جان ز دست آنکه هر کس کو نهاد — در رهش پا زیر پای خود بغیر سر نیافت

مرغ جانم را که دل بال و توان تن پر است — می فرستادم برش بیچاره بال و پر نیافت

منت هر دریای هستی کو بها دان چیست عشق — هر که شد غواص آن دریا بجز این گوهر نیافت

کعبهٔ وصل ترا می جست راهی در درون — سالها گردید گردش عقل و آخر در نیافت

چشم سلمان است در خود ماه رخسارت چو نور — هیچ چشمی در جهان نوری چنین درخور نیافت

۳

ای جهان را چو مه عید مبارک رویت — عید صاحب نظران طاق خم ابرویت

گیسوی تو شب قدرست و در او منزل الروح — خود که داند بجهان قدر شب گیسویت

گوشهٔ ماه ز برقع بنما تا چو هلال — شود انگشت نمای همه عالم رویت

۴

جان من می رقصد از شادی مگر یار آمدست — می جهد چشمم همانا وقت دیدار آمدست

جان بیارم باستقبال آمد تا به لب — قوتی از تو مگر در جان بیمار آمدست

می رود اشکم که بوسد خاک راهش را بچشم — بر لبم جان نیز پنداری بدین کار آمدست

زان دهان می خواهد از بهر امان انگشترت — جان زار من که زیر لب بزنهار آمدست

تا ندیدم روی خوبت را ندیدم روز نیک — از فراقت روز بر من چون شب تار آمدست

در فراق رویت ای نور دو چشم من ببین — تا بروی من چها زین چشم خونبار آمدست

بی تو گر می خورده ام در سینه ام خون بسته است — بی تو گر گل دیده ام در دیده ام خار آمدست

گر نسیمی زان خط عنبر بمن گذاری کرده است — همچو چنگ از هر رگم صد نالهٔ زار آمدست

روز بر چشمم سیه گردیده است از غم چو شب — در خیالم زان زمان کان زلف و رخسار آمدست

گر بلا بسیار شد سلمان چه شد مردانه باش — بر سر مردان بلای عشق بسیار آمدست

۵

ما را بجز از عشق تو در خانه کسی نیست — بنمای رخ از پرده که بیگانه کسی نیست

بردار ز هم سلسله تا خلق بدانند — کز سلسله داران تو دیوانه کسی نیست

فرزانه تر از دوم اگر زاهد و صوفی ست
ای دوست بدوران تو فرزانه کسی نیست

در خلوت دل ساختمت منزل و آنکس
کز دل نکند منزل جانانه کسی نیست

خمار بده باده باغیار که خامست
مطرب مزنش ره که در آن خانه کسی نیست

سرگشته بسی اند ولی آنک چو پرکار
دارد قدمی ثابت و مردانه کسی نیست

دل گرمی پروانه ده ای شمع که در عشق
امروز بجانبازی پروانه کسی نیست

سلمان مطلب یار که بسیار بجستند
زین جنس درین منزل ویرانه کسی نیست

یاری که بکامت برساند زلب خود
در دور تو جز ساغر و پیمانه کسی نیست

۶

سرو خواند با تو خود را راست لعلها راست نیست
سرورا این حسن و رعنایی که قد رسواست نیست

راستی را سرو بس رعناست اما اینک باد
در سر افکندست یعنی با تو هم بالاست نیست

قصد جانم میکنی من خود فدایت کرده‌ام
گر تو پنداری که تقصیری که هست از ماست نیست

۷

چشم مخمور تو تا در خواب مستی خفته است
از خمار چشم مستت عالمی آشفته است

سنبلت را بس پریشان حال می‌بینم مگر
باد صبح از حال من با وی حدیثی گفته است

چشم بد دور از گل رویت که در گلزار حسن
هرگز از روی تو نازکتر گلی نشگفته است

دیده باریک بینم در شب تاریک هجر
بس که بر یاد دلت در های غلطان سفته است

دل چو در محراب ابروی چشم مستت دید گفت
کافر سرمست در محراب بین چون خفته است

خاک راهت خواستم رفتن بمژگان عقل گفت
نیست حاجت کش صبا عمدا بگیسو رفته است

عاقبت هم سر بجایی میزند این خون دل
کز غم عشق تو سلمان در درون بنهفته است

۸

دولت وصل آن صنم روی بما نمی‌کند
سرو روان او مرا کام روا نمی‌کند

عمری و گفته‌ای اگر صبر کنی وفا کنم
عمر عزیز چون کنم عمر وفا نمی‌کند

گفته بدم رها کنم شیوه عشق و عاشقی
عشق بکار خود مرا باز رها نمی‌کند

۹

نه تنها بسر کوی تو ما را بار می افتد
که هر روزی صد آن منزل ازین صد بار می افتد

بوایت بازشبگیری چنان مست است در بستان
که چون زلفت ز مستی بر گل و گلزار می افتد

بلطف مردم چشم شماتت کم کن ای دشمن
چه شاید کرد مردم را ازین بسیار می افتد

۱۰

دلی کہ شیفتۂ زلف دلربا باشد ... ہمیشہ زار و پریشان و مبتلا باشد

بلی عجب نبود گر بود پریشان حال ... گدا کہ در طلب وصل بادشا باشد

بہانۂ تو رقیب است و نیست این مسموع ... رقیب را چہ محل گر ترا رضا باشد

جفای دشمن و جور رقیب و طعنۂ خلق ... خوش است بر دل اگر دوست را وفا باشد

اگر ترا گذری بر من ضعیف افتد ... و یا ترا نظری بر من گدا باشد

از آن طرف نپذیرد کمال تو نقصان ... وزین طرف شرف روزما... باشد

نگار گشت بخون جگر رخ سلمان ... بترس زانکہ بد و نیک را جزا باشد

۱۱

کار شد تنگ برین دل خبر یار کنید ... دوستان بہر خدا چارۂ این کار کنید

سیل عشق آمد و این بخت گران خواب مرا ... گر خبر نیست ازین واقعہ بیدار کنید

اثری کرد ہوا در من و بیمار شدم ... بدو چشمش کہ علاج من بیمار کنید

شیخنا زان طرف صومعہ کاری نگشود ... بعد ازین روی بہ خمخانۂ خمار کنید

در رخش ہر چہ من ای مدعیان می بینم ... گر ببینید شما ہمچو من اقرار کنید

در جمال رخ او ای مہ و مہر ار نگرید ... ہر دو چون سایہ بجودش پس دیوار کنید

من بچشم خوشش آوردہ ام اقرار مباد ... کہ بسلمان نظر از دیدۂ انکار کنید

۱۲

در خرابات مرا دوش بدوش آوردند ... بی خودم بردہ آن یار فروش آوردند

شہسواری کہ نیامد بہمہ کون فرو ... بدر خانۂ خمار فروش آوردند

دوش بر دوش فلک میزدم امروز کہ دوش ... مستم از کوی خرابات بدوش آوردند

مطربان دیر لب از پردۂ اسرار بتی ... تا چہ گفتند کہ نی را بخروش آوردند

در نی خشک دمیدند ہی از آتش تو ... خون خام خم خمار بجوش آوردند

ساقیان داروی بیہوشی می دردادند ... دل بیہوش مرا باز بہوش آوردند

شاہدان اینہمہ دلہای پریشان را جمع ... بتماشای گل روی تو دوش آوردند

چشم و ابروی تو از گوشۂ خود سلمان را ... در خرابات کشان از بن گوش آوردند

۱۳

آن دم کہ باد صبح بزلف گذر کند ... مشک ختن بخون جگر چہرہ تر کند

اگر نہ زانکہ سنبل زلف تو مشک را ... ہر دم زروی رشک چو خون در جگر کند

ہر دم کہ از صفای جمال تو دم زنم ... صبحم سر از دریچۂ انفاس بر کند

هر گه که مهر روی تو در خاطر آورم          خورشید سر ز روزن اندیشه در کند
دارم شکسته بسته چو زلف تو می که او          هر دم هوای صحبت روی چو خور کند
کار من از تو راست بزر میشود چو زر          آری چو زر بود همه کاری چو زر کند
مویت نهاد سر به کمرگاه تو مگر          آمد مگر که دست هوس در کمر کند
سرگشته بند و لیست چه سوداست در سرش          آن به که این خیال کژ از سر بدر کند
دل خواست تا حکایت زلف تو سر بسر          معلوم رای آصف جمشید فر کند
لیکن چنین حدیث پراگنده چون کسی          در بندگی خواجهٔ نیکو سیر کند
خورشید آسمان وزارت که آسمان          خاک درش بمرتبه کحل بصر کند
اعظم غیاث دولت و دین آنکه روزگار          نامش وزیر مملکت بحر و بر کند
تا رایت مظفر سلطان خاوری          هر شام عزم مملکت باختر کند
بادا ز قدر رایت چنانک او          هر روز فتح عرصهٔ ملک دگر کند

## ۱۴

میکشم خود را و بازم دل بسویش میکشد          مو کشان زلفش مرا در خاک کویش میکشد
می برد حسنش بروی دلستان هر جا دلیست          ور نمی آید دل مسکین بمویش میکشد
ما چو بید از بادی لرزیم از آن غیرت که باد          می جهد در روی او برقع ز رویش میکشد
گل چو می داند که بلبل را فغان از عشق اوست          هر چه دل گوید صداع گفت و گویش میکشد
می کشیدم کوزهٔ دردی ندست ساقی          کین زمان هر صوفی صافی سبویش میکشد
شمهٔ از حال من شاید که این گل بشنود          این تن مسکین نه بیماری بویش میکشد
نوی او هست از دهانش تنگ تر وین ناتوان          باد بر دل تنگ تنگ از دست خویشش میکشد
از دوی نیست سلمان را بغیر از روی دوست          چون کند چون دوست خط بر آرزویش میکشد

## ۱۵

آن پری کیست که از عالم جان روی نمود          وین چه حوریست که بر ما در فردوس گشود
دل پروانهٔ غم شمع من از من بستد          می پیمانهٔ جان لعل تو بر من بنمود
گرچه آواز رباب است مخالف با شرع          راستی آمده تحقیق بعشاق نمود
در دل تیرهٔ ما گشت نهان خورشیدی          روی خورشید بگل چون نتوانیم اندود
ما چو هودیم بر آتش بکش از ما دامن          گر ز ما دود بر آید چه زیانت ز آن دود
عمر ما گم شد و عشقت فزون پنداری          کانچه کم گشت ز عمرم همه در عشق فزود

آنچنان نازکی ای گل که اگر با تو نسیم      دم زند روی تو چون لاله شود خون آلود
دیدهٔ ما بخیال لب عنابی تو      بسکه انجام زجاجی صفی می پالود
مدعی چند کنی عیب که مستست فلان      این چنین ست و چنین بود و چنین خواهد بود
بنشستیم زپس پردهٔ تقوی عمری      ناگهان باد هوا آمد و پرده بر بود
سود سلمان همه اینست که سر بر در تو      سود سرمایهٔ خود را چو زیان کرد چه سود

۱۶

دل پیش زخم تیغ تو جان را سپر کند      از زخم تیغ دوست کسی چون حذر کند
آن را در آید از در دل آن جهان جان      کز دل مراد جان و جهان را بدر کند
ما راست همچو دیده عزیزی که نیست کسم      آن نور دیده را که بهر دم نظر کند
سرمست چشم دوست بود سر گران هنوز      چون نرگس آن زمان که سر از خاک بر کند
زان جورها که میکند آن خوشتر آیدم      چندانکه گویمش که مکن بیشتر کند
سلمان تواند از سر هر دو جهان گذشت      آسان و مشکل از سر کویت گذر کند

۱۷

نسیم برو و بوی جان و دلستان بمن آور      سلام من برسان و جواب آن بمن آور
نوای بلبل معنی مصورتی که توانی      بگلستان برو برگی ز گلستان بمن آور
صباش می برد از آستین عبیر بدامن      تو هردمی کن و گردیش ز آستان بمن آور
دواش اگر بفرستد به طالبان دواده      ز درد دش آنچه بیابی همان چنان بمن آور
بدیده گرد سر کویش از برای دل من      تلطفی کن و برچین یگان یگان بمن آور
ترا در آن دهن تنگ یار هست مجالی      حکایتی بنهانی از آن دهن بمن آور
نصیب من همه بیمست اگر غمیم فرستد      مبر زمان متعلل همان زمان بمن آور
دل شکستهٔ سلمان که نیست نام و نشانش      بجوی در سر زلفش از و نشان بمن آور

۱۸

ما دهان لعل لبش می میدهد هشیار باش      چشم مستش رهزن خوابست هان بیدار باش
گر بدین عشق او اقرار داری عشق او      منکر عقل ست و دین از عقل و دین بیزار باش

عیسی نفس دوای بخشد و جان میدهد　　گر تو داری این هوس گه مرده گه هشیار باش

۱۹

بدست خود دل خود در کمند زلفت افکندم　　بصد بند دگر خود را و دل را بر تو می بندم

ز دست دوست می گریم ولیکن رغم دشمن را　　چو ابر نوبهاری در میان گریه می خندم

تو دل در بند آن داری که جانم در کمند آری　　بحق زلف دلبندت که من دایم در آن بندم

جز از بار دلم باری مرا حاصل نشد هرگز　　ز چندین دانهٔ گوهر که در عالم پراکندم

ز کوه محنت سلمان غم فرهاد کاهی دان　　که گر او کوه کند از غم من بیچاره جان کندم

۲۰

آتش سودا اگر در دل سودای من　　شعله ازین سان زند وای دل و وای من

مایهٔ سودای ماست زلف تو لیکن چه سود　　زانکه پراکنده گشت مایهٔ سودای من

نالهٔ من هر شبی سر بفلک میکشد　　تا بچه خواهد کشید نالهٔ شبهای من

قصهٔ خوناب دل گر نکنم چون کنم　　می رسد از دل بلب جوشش دریای من

از سر رحمت مگر هم تو شوی دستگیر　　ورنه چه برخیزد از دست من و پای من

بس که رگ جان من زد غم عشقت چو چنگ　　غیر رگ و پوست نیست هیچ بر اعضای من

دل چو قبا بسته ام در قد و بالای تو　　عشق قدت جامه ایست راست ببالای من

۲۱

ای آنکه رخ و زلف تو آرایش دیده　　گردیده بسی دیده و مثل تو ندیده

از گوشه بسی گوشه نشین را که ببینی　　در میکده با چشم سیاه تو کشیده

چشمت باشارت دل من برد و فدایت　　چیزی که اشارت کنی ای دوست بدیده

زلف تو بپوشید سراپای قدت را　　آن شعر قباییست بقد تو بریده

سربسته حدیثیست سراپای تو چو مویت　　فی الجمله حدیثیست بگوش تو رسیده

هر لحظه بدل میکنی از دیده اشارت　　دل می طلبی از من دل داده بدیده

چشمم بمژه قصهٔ شوق تو نوشته　　دل خون شده وانگه ز سر خامه چکیده

نامه سخن بوالعجبم می شنواند　　سلمان همه عمر آن سخن از کس نشنیده

۴۲

داردسر سودای باز این کاسه سودائی — دل رفت دگر جای آه از دل هرجائی

گفتند بصبر از دل اندوه توان بردن — آری بتوان لیکن کو صبر و توانائی

ای صبر همی گفتی روزیت بکار آیم — چون کار برفت از دست اکنون بچه کار آئی

بردار حریف انگشت از حرف خطای من — کین حرف نمی گنجد در دفتر دانائی

در آینه گر خود را بینی بروی از خود — آن به که تو خود خود را با آینه ننمائی

چون شمع ندارد صبر از دود که بنشیند — آرام کجا گیرد پروانهٔ سودائی

در عشق تو بدنامیست اندیشه ز بدنامی — در عهد تو رسوائیست اندیشه ز رسوائی

چندین چه کنی سلمان در سینه نهان مهرش — خورشید جهان آرا تا کی بگل اندائی

۴۳

ای نسیم صبح بوی جانفزا می آوری — من نمی دانم که این بو از کجا می آوری

ای نسیم از خاک کوی یار حاصل کرده ای — تا چنین داری که از باد صبا می آوری

گلبن باد آورش ما را نمی بخشید بوی — هم تو باری کز درش بوئی بما می آوری

گلستان شوق را نشو و نمای میدهی — بلبلان بی نوا را در نوا می آوری

ناتوانی را نکه راهی بس دراز و پیچ پیچ — از سر زلف چنینم زیر پا می آوری

رفته بود از جا دل ما بازش آوردی بجا — خاک کویش بر طریق خون بها می آوری

خون ما را ریختی در انتظار اکنون بیا — راستی را شرط دلداری بجا می آوری

گر زدی لطف یکدم میکنی در کار ما — وقت ما چون صبح از آن دم باصفا می آوری

قاصد سلمان و یکدم نمیگیری قرار — روز و شب یائی بری پیغام یا می آوری

۴۴

باز بیمار خود دم ساختی و خوش کردی — خون من ریختی و جان مرا پر دردی

شرط کردی که دل سوختگان را نبرم — دل من بردی و آن قاعده یاد آوردی

خیز و چون گرد زنش دست بدامن بخشان — کاش بر تو نشاند از در بر گردی

چه صبا نیست بریدی که برد نامه بدوست — خنکا باد صبا گر نکند دم سردی

ق

مهر دیا گر صفت در عقب او سلمان — به از آن نیست که اندر عقب او گردی

زیر بحر انجش اگر عارف صاحب ذوقی — ترک درمان کن اگر صادق تنها دردی

عابد رضا بیدار

# غیر مطبوعہ سلمان ساوجی کہاں تک غیر مطبوعہ ہے

## ——— استدراک

[ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی نے نسخۂ سالار جنگ سے سلمان ساوجی کی جو ۲۴ غزلیں غیر مطبوعہ قرار دیکر جرنل میں اشاعت کے لیے بھیجیں وہ ان کے بیان پر اعتماد کر کے چھاپنے کے لیے دیدی گئیں۔ یہ فارم چھپ چکا (جو اس جرنل نمبر ۲ میں شاملِ اشاعت ہے) تو خیال آیا کہ احتیاطاً کلیات سلمان کا مطبوعہ نسخہ خود بھی دیکھ لیا جائے۔ دیکھنے پر پتا چلا کہ ۲۴ میں سے ۱۴ غزلیں طبع شدہ ہیں۔ ۲۴ غزلوں کا فارم چھپ چکا تھا اس لیے چیکنگ کے اس نتیجہ پر افسوس بھی ہوا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ایک تو تحقیق کا کام کرنے والوں کو اس مثال سے یہ سبق بھی حاصل ہو جائے گا کہ جلد بازی تحقیق کے منافی ہے۔ دوسرے اس طور پر طبع شدہ غزلوں کی نشاندہی کے ساتھ وہ اہم اختلافات نسخ و قرأت سامنے آجائیں گے جو آئندہ لوگوں کے لیے کام آسکیں گے ]

کلیات سلمان ساوجی' آوستا کی ترتیب و تصحیح سے انجمن ایران کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر عابدی کی دریافت کردہ ۲۴ غزلوں میں سے ۱۴' اس مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں جنکی تفصیل درج ذیل ہے :

(۱) یہ غزل مطبوعہ نسخے میں (ص ۲۵۳ پر) موجود ہے اس معمولی فرق کے ساتھ کہ مطبوعہ میں ساتویں شعر میں قافیہ 'جانان' کے بجائے 'سلطان' ہے

مطبوعہ کی مدد سے ایک غلطی کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے مقطع، مصرع ثانی اس طرح لکھا ہے ؎ چوں تحمل میکند کو ہی دلِ سلمان ما۔ یہ کوہی دراصل گوی' ہے۔ 'کوہی' یوں بھی یہاں مہمل ہے۔

(۲) دوسری غزل بھی مطبوعہ (ص ۲۸۷ پر) موجود ہے۔ دو جگہ معمولی اختلاف ملتا ہے۔ دوسرے شعر کے مصرع ثانی میں (؏ باد دل را بر نو نوا از باغ وصلش بر نیافت)۔ مطبوعہ میں بر کی جگہ آن ہے؛ چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں (؏ میغرستادم پرسش بیچارہ بال و پر نیافت)، پرسش کی پرسش' ہے لہ پانچواں شعر، پہلا مصرع' البتہ' ڈاکٹر عابدی کی قرأت میں فی الحال مہمل ہے ؎ منت در در آیی ہستی کو بدٔ زال چیست عشق) مطبوعہ متن کی روشنی میں اس کی تصحیح ہو جاتی ہے جو اس طرح ہے:

ع ہست در دریای ہستی گوہری آن چیست عشق

اس پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ : ع ہر کہ شد غواص آن دریا جز این گوہر نیافت ، مطبوعہ

' جز این ' کی جگہ ' بجز ' ہے۔ مقطع میں دونوں مصرعوں میں اختلاف ہے :

چشم سلمان است در خور راہ رخسارت چو نور — ہیچ چشمی در جہان نوری چنین در خور نیافت

مطبوعہ نسخہ میں ' است ' کے بجائے ' راست ' ہے ۔ ' رخسارت ' کی جگہ ' رخسارش ' اور چنین کی بجائے

(۳) یہ غزل مطبوعہ کلیات میں (ص ۲۸۶) موجود ہے :

تیسری غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ( ع گیسوی تو شب قدر ہست و درد و منزل )

مطبوعہ میں (ص ۲۸۶) ' درد ' سے قبل ' و ' نہیں ہے ۔

(۴) یہ غزل مطبوعہ کلیات میں (ص ۲۸۷) موجود ہے :

چوتھے شعر کا پہلا مصرع ڈاکٹر عابدی کے یہاں اس طرح ہے : ع زان دہان میخواہد از بہر آماد

مطبوعہ میں یہ مصرع اس طور سے ہے : ع زان دہان میخواہد از بہر زبان انگشتری ۔

پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں ( ع تا ندیدم روی خوبت ما ندیدم روز نیک ) ' ندیدم ' کی

مطبوعہ میں ' بدیدم ' ہے اور ' نیک ' کی جگہ ' خوب ' ،

آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں ( ع ہچو چنگ از ہر رگم صد نالۂ زار آمدست ) ' رگ '

کی جگہ مطبوعہ میں ' رگ من ' ہے ۔

نویں شعر کا دوسرا مصرع ( در خیالم زان زمان کان زلف و رخسار آمدست ) مطبوعہ میں ا

ہے : ع در خیالم کان زمان آن زلف و رخسار آمدست ۔

مطبوعہ کلیات میں اس غزل کے مقطع کے بعد وہ شعر ہے جو عابدی ورژن میں چھٹا شعر ہے ۔

خیال میں مطبوعہ کی ترتیب یہاں غلط ہے ۔

(۵) مطبوعہ کلیات میں (ص ۲۸۱) مقطع اور مقطع کے بعد کا شعر موجود نہیں ہے ۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں ( ع بردار ز رہ سلسلۂ تا خلق بدانند ) ' مہ ' کی جگہ مطبوعہ میں

تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں ( ع فرزانہ تر مردم اگر زاہد و صوفیست ) مطبوعہ میں

کی جگہ ' بر ' ہے ۔

پانچویں شعر کے پہلے مصرع (ع خمار مدہ بادہ باغیار کہ خاست) مطبوعہ صورت میں اس طرح ہے:

ع خمار باغیار مدہ بادہ کہ خاست۔

چھٹے شعر کے پہلے مصرع میں (ع گشتہ بسی رند ولی آنکہ چو بیکار) مطبوعہ میں 'اند' کی جگہ 'ماند' ہے اور 'آنکہ' کی جگہ 'آنکہ'۔

(۶) تینوں شعر مطبوعہ کلیات میں نہیں ہیں۔

(۷) مطبوعہ کلیات میں یہ غزل (ص ۲۸۳) موجود ہے۔ اختلافات درج ذیل ہیں۔

ساتویں غزل کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں (ع آز خمار چشم مستت عالمی آشفتہ است) مطبوعہ میں 'از' کی جگہ 'در' ہے۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں (ع باد صبح از حال من بادی حدیثی گفتہ است) 'دی' کی جگہ 'او' ہے۔

چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں (ع بسکہ بر یاد دلت درہای غلتاں سفتہ است) مطبوعہ میں 'در یاد لبت' ہے جو بہتر ہے۔

پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں (ع دل چو در محراب ابر چشم مستت دید گفت) 'ابر' مطبوعہ میں ابرو ہے جو یقیناً صحیح ہے۔

چھٹے شعر کے دوسرے مصرع میں (ع نیست حاجت کش صبا صد رہ بگیسو رفتہ است) 'بگیسو' کی جگہ مطبوعہ میں "بمژگان" ہے جو بہتر ہے۔

(۸) یہ تین شعر مطبوعہ کلیات میں نہیں پائے جاتے۔

(۹) ایک غزل اسی ردیف و قوافی کے ساتھ مقطع سمیت مطبوعہ کلیات میں (ص ۳۳۷) پائی جاتی ہے۔ ایک مطلع بھی ہے لیکن یہ تینوں شعر اس میں موجود نہیں۔

(۱۰) یہ غزل مطبوعہ (ص ۳۰۱) میں موجود ہے۔ پہلے شعر کے پہلے مصرع میں (ع دلی کہ شیفتۂ زلف دلربا باشد) مطبوعہ میں 'زلف' کی جگہ 'روی تو' (دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں مطبوعہ میں 'یاد شا' کی جگہ 'پادشا'؛ یہ فرق نظر انداز کیا جا سکتا ہے)

تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں (ع بہانۂ تو رقیبیست و نیست این مسموع) 'رقیبیست'

ہے اور مطبوعہ میں بھی یہی ہے۔ 'رقیبیست' پڑھنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔

چوتھے شعر کے دوسرے مصرع میں (دوست را آن وفا باشد) 'را وفا' کی جگہ مطبوعہ میں 'با وفا' ہے

چھٹے شعر کے دوسرے مصرع (ع دز نیطرت شرف روز ما... باشد) میں نصف آخر کو

کے مطابق اس طرح پڑھا جائے گا اور اس طرح وہ لفظ بھی پورا ہو جائے گا جو ڈاکٹر عابدی سے پڑھا نہ جا سکا تھا

"روزگار ما باشد"۔ مقطع میں مطبوعہ میں 'زانکہ' کی جگہ 'ازانکہ' ہے۔

(۱۱) یہ غزل مطبوعہ کلیات میں (ص ۳۰۳) موجود ہے۔ مندرجہ ذیل اختلافات کے ساتھ :

چوتھا شعر، پہلا مصرع (ع شیخنان از طرف صومعہ کاری نگشود)، لفظ شیخنان (جو ڈاکٹر

کے لیے غالباً پریشان کن تھا) مطبوعہ میں شیخان ہے۔ مزید برآں 'صومعہ' کی جگہ 'کعبہ جو' ہے۔

ایسا اختلاف ہے جو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں (ع در رخش ہر چہ من از معنیاں می بینم) مطبوعہ میں 'ہر'

کی جگہ 'آنچہ' ہے۔

چھٹا شعر (ع در جمال رخ ادای مہ و مہر از نگرید + ہر دو چون سایہ بسجود ش پس دیوار کنید

مطبوعہ میں 'جمال و رخ' ہے۔ واو کے اضافے کے ساتھ ؛ اور 'سجود' 'ش' کی کمی کے ساتھ۔

(۱۲) یہ غزل مطبوعہ (ص ۳۷۲) میں موجود ہے۔ اختلافات درج ذیل ہیں :

پہلے شعر کا پہلا مصرع (ع در خرابات مرا دوش بدوش آوردند) مطبوعہ میں 'در' کے بجائے 'ا

سے شروع ہوتا ہے۔ پورے شعر کے تناظر میں 'در' یوں بھی بے محل ٹھہرتا ہے۔ 'از' ہی ہونا چاہیے۔ لیکن

دونوں کتابت میں اکثر اس طرح لکھ دیے جاتے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا دھوکا ہو سکتا ہے۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں (ع شہسواری کہ بنیاد بہمہ کون فرد) مطبوعہ میں 'نیاد' کی

جگہ 'نیاید' ہے۔ یہ ایک فرق ہے جسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آخری لفظ مخطوطہ کی قرات میں

پڑھا گیا۔ یہ مطبوعہ میں اپنی صحیح شکل میں موجود ہے یعنی 'فرود'۔

تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں (ع دوش بر دوش فلک میزتم امروز کہ دوش) مطبوعہ میں

بجا طور پر 'فلک' کی جگہ 'ملک' ہے۔ 'دوش فلک' یہاں بے محل ہے، اسے غلط قرات کا نتیجہ قرار

دیا جا سکتا ہے۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرع (مطربان زیر لب از پردہ اسرار بتی + تا چہ گفتند کہ نی را بخروش آوردند) میں لفظ 'بتی' ، دراصل اگلے مصرع کے 'نی' ہی کی تکرار ہے۔ اور مطبوعہ میں 'بنی' ہے (= بہ + نی) 'بتی' یہاں بالکل مہمل ہو جاتا ہے۔ یہ قرارت کی غلطی ہے۔ یہ امر کہ یہ 'نی' ہی کا سلسلہ چھڑا ہوا ہے، اگلے شعر سے مزید موثق ہو جاتی ہے۔

اگلے یعنی پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں (ع در نی خشک دمیدند و می از آتش تر) مطبوعہ میں صحیح چھپا ہے۔ 'واو' دراصل 'دال' ہے اور 'از' واقعتہً 'ز' ہے۔ 'آتش تر' کی وجہ سے ڈاکٹر عابدی کو غلط فہمی ہوئی اور 'دمی' کو 'و + می' پڑھا۔ حالانکہ اس سے 'دمیدند' بغیر خبر مفعول کے رہ جاتا ہے۔

ساتویں شعر کے دوسرے مصرع میں (ع تماشای گل روی تو دوش آوردند) مطبوعہ میں 'گل' غالباً 'پوش' ہے۔

(۱۳) یہ قصیدہ یا مدحیہ قطعہ مطبوعہ کلیات میں نہیں ہے۔

(۱۴) (۱۵) (۱۶) یہ غزلیں بھی مطبوعہ میں نہیں ہیں۔

(۱۷) یہ غزل مطبوعہ (ص ۳۴۷) میں موجود ہے لیکن 'یگان' اور 'زمان' قوافی کے دو شعر مطبوعہ کلیات میں نہیں ہیں پہلا شعر مطبوعہ میں اس طرح ہے جو موزون بھی ہے اور بامعنی بھی:

نسیم صبح برو بوی دلستان بمن آور ؛ سلام من برسان و جواب آن بمن آور

ڈاکٹر عابدی کی قرارت ناموزون بھی ہے (پہلا مصرع) مہمل بھی (دوسرا مصرع) ۔ اور بے قافیہ بھی!

دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ میں 'نوانی' کی جگہ 'نودانی' ہے؛ تیسرے شعر میں مطبوعہ میں 'گردشیں' کی جگہ 'گردی' ہے؛ چوتھے شعر میں 'دواش اگر' کی جگہ مطبوعہ میں 'دوای گر' ہے؛ اور اسی شعر کے دوسرے مصرع میں 'ہمان چنان' کی جگہ 'ہم آنچنان'۔ یہ سب معمولی اختلافات ہیں۔ چھٹے شعر میں البتہ قوافی صاف اشارہ کرتے ہیں کہ قافیہ 'دہن' کی جگہ 'دہان' ہونا چاہیے۔ مطبوعہ میں بجا طور سے اسی طرح ہے۔ مقطع میں مطبوعہ میں 'اندنشان' کی جگہ 'از آن نشان' ہے۔

(۱۸) یہ تینوں شعر مطبوعہ میں نہیں ملتے۔

(۱۹) یہ غزل کلیات مطبوعہ میں (ص ۳۷۸) موجود ہے۔ لیکن خاصے ترمیم و اختلاف کے ساتھ دونوں جگہ پانچ پانچ شعر ہیں۔ لیکن: مطبوعہ کا مطلع بدلا ہوا ہے اور اس طرح ہے:

بہ زنجیر سر زلفت کہ من دایم در آن بندم ؛ کہ چون خود را بفتراک سر زلف تو در بندم

دوسرا شعر دونوں جگہ یکساں ہے۔ تیسرے شعر میں جزئی اختلاف ہے یعنی پہلے مصرع میں 'جانم' کی جگہ مطبوعہ میں 'جانہا' ہے اور مصرع ثانی میں 'بحق زلف دلبندت' کی جگہ 'بحق دوستی جانا' ہے؛ چوتھا شعر البتہ مطبوعہ میں بالکل مختلف ہے' جو اس طرح ہے:

بگویت چون صبا با آنکہ جانہا دادہ ام عمری ٭ بگردی از ندرت راضی بیوی از تو خرسندم

مقطع دونوں جگہ یکساں ہے۔

(۲۰) مطبوعہ کلیات میں (ص ۳۸۳) یہ غزل موجود ہے۔

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں (ع آتش سودا اگر در دل سودائی من) مطبوعہ میں 'سودائی' کی جگہ 'شیدائی' ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ 'دل سودا' مہمل ہے۔ دل سودائی، جس کا محل ہے وزن میں نہیں آتا مگر 'دل شیدا' وہی معنی دیتا ہے۔

پانچویں شعر میں جزئی اختلاف ہے یعنی مصرع ثانی میں 'برخیزد' کی جگہ مطبوعہ میں 'میخیزد' ہے۔

(۲۱) یہ غزل مطبوعہ (ص ۴۰۰) ہے، اختلافات بالکل معمولی ہیں:-

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں 'آنک' کی جگہ مطبوعہ میں 'آنکہ' ہے۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرع میں 'بردوفدایت' مطبوعہ میں واو کی کمی کے ساتھ 'بردفدایت' ہے۔ اور مقطع میں دوسرے مصرع میں 'آن' کی جگہ مطبوعہ میں 'این' ہے۔

(۲۲) یہ غزل مطبوعہ میں نہیں ہے۔

(۲۳) یہ غزل مطبوعہ کلیات میں (ص ۴۲۰) موجود ہے؛ اختلافات اس طرح ہیں:-

پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں مطبوعہ میں 'صبا' کی جگہ 'ہوا' ہے، جو بہتر بدل نہیں ہے؛ تیسرا شعر مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں ہے؛ پانچویں شعر کے پہلے مصرع میں مطبوعہ میں 'زانک' کی جگہ 'زانکہ' ہے اور 'دراز' اور 'پیچ پیچ' کے درمیان میں ایک واو بھی ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں مطبوعہ میں 'جبینم' کی جگہ 'جبینش' ہے؛ چھٹے شعر میں جا — اور — دل کے بیچ میں مطبوعہ میں 'واو' کا اضافہ ہے جو بے محل ہے۔

(۲۴) یہ غزل بھی غیر مطبوعہ ہے۔

نثری تمہید کے ذیل میں جو شعر (سلمان بنام الخ) غیر مطبوعہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے وہ مطبوعہ

ت میں (ص ۳۸۴) موجود ہے۔

○

لہ یہ کہ غزل نمبر ۶، ۸، ۹، ۱۸ (تین تین شعر پر مشتمل)، مدحیہ قطعہ نمبر ۱۳، غزل نمبر ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۲۲ اور ۲۴
طبوعہ رہی ہیں اور ڈاکٹر عابدی کی دریافت ہیں۔
غزل نمبر ۵ میں دو شعر نئے سامنے آئے ہیں۔ غزل نمبر ۱۷ میں بھی دو نئے اشعار کا اضافہ ہوا ہے۔
طرح غزل نمبر ۱۹ میں بھی دو شعر نئے ہیں۔ غزل نمبر ۲۳ میں ایک شعر نیا ہے۔
اس طرح سلمان ساؤجی کی ۶ مکمل غزلیں، چار (تین تین اشعار پر مشتمل) ادھوری غزلیں اور سات
ار (بقیہ غزلوں میں) نئے سامنے آئے ہیں جو امید ہے قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

اعتماد کو ٹھیس لگ ہی چکی تھی۔ نسخۂ سالار جنگ کی 'غیر مطبوعہ' یافت کی یہ کیفیت پا کر
فوراً خیال آیا کہیں نسخۂ خدا بخش کے ساتھ بھی یہی بے احتیاطی نہ برتی گئی ہو۔ مقابلہ کیا تو وہی کیفیت پائی
گئی، بلکہ اس سے دو چند۔ ڈاکٹر عابدی نے سلمان ساؤجی کے نسخۂ خدا بخش سے جرنل ۱۲ میں ایسی
غزلیں شائع کرائی تھیں جو ان کے خیال میں 'غیر مطبوعہ' تھیں۔ یہ تعداد میں ۳۰ غزلیں تھیں۔ مطبوعہ کلیات
دیکھا گیا تو ۵ کو چھوڑ کر بقیہ سب کی سب طبع شدہ نسخہ میں موجود پائی گئیں۔ عام حالات میں اس طرف کبھی
خیال بھی نہ جاتا کہ جرنل کا بیسواں شمارہ شائع ہوتے وقت بارھویں کے مشتملات کو اس نظر سے
دیکھا جائے۔ اگر ڈاکٹر عابدی نسخۂ سالار جنگ سے ماخوذ 'غیر مطبوعہ' غزلیں اشاعت کے لیے نہ بھیجتے
تو یہ چھان بین کا باب ہی نہ کھلتا اور جرنل ۱۲ کی پیشکش پر بھروسا کر کے لوگ ان غزلوں کو غیر مطبوعہ
ہی سمجھ لیتے۔ اس کے لیے ڈاکٹر عابدی کا شکریہ ادا کرنا بھی ہم پر واجب ہے کہ انھوں نے اس طور سے
اس 'یافت' کی دریافت میں مدد دی:

نسخۂ خدا بخش سے منقول 'غیر مطبوعہ' غزلوں (جرنل ۱۲) کا معاملہ اس طور پر ہے:

(۱) پیرما تدبیرما: یہ غزل مطبوعہ کلیات میں (۲۵۵) موجود ہے۔

ع رہ نخوا باشمت و درد سالخوردہ پیرما

— عابدی قرأت میں یوں ہے: "رہ نخوا باشمت، در سالِ خوردہ پیرما"

ع ما کہ از دور ازل مستیم و عاشق تاکنوں — عابدی قرات: 'تسلیم' جو غلط ہے۔

ع من غلام ہندوان سرو آزادم کہ او — عابدی قرات: 'ہندوی آن' جو صحیح ہے۔

ع ای کہ میگوئی مشو دیوانہ غافل مشو — عابدی قرات: آی کہ میگوئی مشو دیوانہ ای

(۲) گل آب ۔ گلاب (مطبوعہ ص ۲۶۰) اختلافات:

ع خاک درت شربتیست صافی و عالم شراب — عابدی قرات: مشربیست جو غلط ہے۔

(۳) شباب ۔ خراب (مطبوعہ ص ۲۶۰):

ع بشنود بوی بہار از پیش بردار نقاب — عابدی قرات: برآرد۔

ع کو چو چشمت برنمی دارد سر از مستی و خواب — عابدی قرات: 'گو' جو غلط ہے۔

ع مدعی منعم کن در عاشقی زیرا کہ ہست — عابدی " : نیست "

عقل را با پیچ و تاب زلف خوبان پیچ و تاب — عابدی 'پیچ تاب' غلط ہے۔

ع ای بہار عالم جان گل برون آمد نخواہد — عابدی : آمد

ع نسخۂ حسن رخت را عرضہ کن از جویبار — عابدی : عرض

ع سایۂ لطف الہی دیدۂ سلمان کہ ہست — عابدی : دوندی (کذا)

(۴) خوشتر ست ۔ دیگر ست ، (مطبوعہ ص ۲۷۳)

ع بادشاہ ما بنام ایزد، ہمایون اختر است — عابدی : نیامیزد

ع چون صباحش بر نفس نور و صفای دیگر ست — عابدی : چو ..... در خور ست

(۵)(۶)(۷)(۸) یہ چاروں غزلیں مطبوعہ نہیں ہیں۔

(۹) میگردد ۔ یہ غزل مطبوعہ کلیات میں موجود ہے (ص ۳۰۳)

ع روی پنہاں کن از من کہ مہرویان را } پہلے مصرع میں ۔ عابدی: پری رویان، جو مہرویان فرو

کار حسن از نظر اہل نظر میگردد } دوسرے مصرع میں ۔ کار حسن نظر از اہل نظر میگردد

تا کجا ... دریوزہ کند + ... ہمدرد میگر — عابدی : دریوزہ کند صحیح ہے۔ موزنہ قطعاً مہمل ہے۔

(۱۰) تیغ از ... جلاب و شکر میگردد — عابدی : حلاب جو غلط ہے

(۱۱) خواند ۔ داند (مطبوعہ ص ۳۳۸)

پہلے شعر میں سیاہی، تہ سپیدی میں 'ز' کی جگہ مطبوعہ میں 'و' ہے؛ تیسرے شعر میں 'آریخ' کی جگہ
'آنچہ'۔ پانچویں شعر میں 'نشناند' کی جگہ 'بنشاند' ہے۔ مقطع سے قبل شعر کے پہلے مصرع میں 'شیریں گوید' کی
جگہ 'گوید شیریں' ہے جو مناسب ہے۔ مقطع میں 'چنیں' کی جگہ 'جبیں' ہے اور 'بدین' دال سے۔

(۱۲) یہ غزل مطبوعہ نہیں ہے۔

سحرم۔ خبرم۔ یہ غزل ص۳۸۳ پر طبع شدہ موجود ہے: اس معمولی اختلاف کے ساتھ کہ پہلے
شعر میں 'کو' کی جگہ 'کر' ہے؛ اور چوتھے شعر میں 'ہوای کزدم' میں 'ہوای' کی جگہ 'نوای' ہے جو مناسب ہے۔

(۱۳) رفتم۔ یہ غزل مطبوعہ دیوان میں (ص۳۶۳) موجود ہے۔

(۱۴) دلم۔ مقابلم: یہ غزل مطبوعہ دیوان میں (ص۳۸۱) موجود ہے۔ جس سے بعض غلط قراءتوں
کی تصحیح ہو جاتی ہے۔ یعنی: تیسرے شعر میں 'بردہ' کی جگہ 'بودہ' ہے، جو بہتر ہے؛ چھٹے شعر میں
'بگسلم' کی جگہ 'نگسلم' ہے، جو ایک غلط قراءت کی تصحیح کرتا ہے؛ ساتویں شعر میں خاصا اختلاف ہے۔

(۱۵) ندہم: (مطبوعہ ص ۳۸۱) دوسرے شعر میں 'پرست' کی جگہ دونوں مصرعوں میں 'بدست'
ہے، جو مہمل کو با معنی کر دیتا ہے۔ چوتھے شعر میں 'بخدا مانده بر' کی جگہ "بخدا تا ندہد" ہے جو صحیح ہے۔
چھٹے شعر میں مار کی جگہ بار ہے (اور سمن کی جگہ سخن جو صحیح نہیں) اور 'بادگل' کی جگہ 'بارگل'۔ آخری
شعر میں کیست (عہدی) کی جگہ بست ہے۔

— دندان ندہم: یہ شعر غیر مطبوعہ ہے۔

(۱۶) ظالم: یہ غزل (ص۳۸۰) مطبوعہ ہے: اختلاف معمولی ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں: نی نیم = کی جگہ
نی تم اور آٹھویں شعر کے دوسرے مصرع میں جلالم کی جگہ = ملالم) ہے۔

(۱۷) بتستن۔ بشکستن: (مطبوعہ ص ۳۸۳) چند اختلافات: چوتھا شعر: شاہداں (= زاہداں)؛
چھٹے شعر میں 'روزی' پر ڈاکٹر عابدی کو شبہ تھا۔ مطبوعہ میں روزی ہی ہے اور ٹھیک ہی ہے۔ مقطع میں
'دالی' قطعاً غلط ہے۔ مطبوعہ میں بجا طور سے 'جدائی' ہے۔

(۱۸) نتواں: (مطبوعہ ص ۳۹۴)۔ مقطع سے قبل کے شعر میں قدرے اختلاف ہے یعنی "گر باین
حسن صفا" کی جگہ پہلے مصرع میں "گر باین حسن صفا" ہے اور مصرع ثانی میں 'چنین' کی جگہ 'چناں' ہے۔

(۱۹) گزیدن۔ کشیدن (مطبوعہ ص۳۸۳) چوتھے شعر میں 'نبرد' کی جگہ مطبوعہ میں 'نپرسد' ہے۔

(۲۰) زمود من - مقصود من : یہ غزل غیر مطبوعہ ہے۔

(۲۱) میباید شدن : یہ غزل غیر مطبوعہ ہے۔

(۲۲) جانان داشتن - زندان داشتن : یہ غزل غیر مطبوعہ ہے۔

(۲۳) آرزوی من - دست خوی من : یہ غزل غیر مطبوعہ ہے۔

(۲۴) من - ختن (مطبوعہ ص ۳۹۳)

(۲۵) بر من از غم تو - بر تن از غم تو (مطبوعہ ص ۳۹۵)

(۲۶) سوئی - روئی (مطبوعہ ص ۴۱۴) : چھٹا شعر مطبوعہ میں ناقص ہے۔ عابدی والے متن میں پورا ہے۔ آخر سے پہلے شعر میں دونوں مصرعوں میں ہر دو جگہ 'کوی' کی جگہ 'گوی' ہے۔

(۲۷) بخواری - بزاری : (مطبوعہ ص ۴۱۳) : تیسرے شعر میں 'نگویم' کی جگہ جو مہمل تھا، مطبوعہ میں 'بگویم' ہے۔ مقطع سے قبل کے شعر میں مطبوعہ میں 'نگذاری' کی جگہ 'نگذاری' ہے۔ اسی طرح مقطع میں بھی 'لب پاری' کی جگہ 'نسپاری' ہے۔ مقطع میں مصرع اولی میں 'آنرا' کی جگہ 'جانرا' ہے۔

(۲۸) بینی : (مطبوعہ ۴۱۴) : پہلے شعر میں 'قدرت' کی جگہ 'رویت' ہے۔ تیسرے شعر میں 'جانان' کی جگہ 'جانا' ہے (یہ اختلاف اور جگہوں پر بھی نظر آیا) چوتھے شعر میں 'روی ہویت' کی جگہ 'زلف ورویت' ہے۔

(۲۹) مشوی - بجوی (مطبوعہ ص ۳۹۷) یہ غزل مطبوعہ میں واو کی ردیف میں ہے۔ دوسرے شعر میں 'سرگشت' کی جگہ 'دلکشت' ہے۔ چھٹے شعر میں 'روی بگوید' مطبوعہ میں 'روشن بگوید' ہے۔

— 'شمع الخ' والا شعر غیر مطبوعہ ہے۔

(۳۰) بر میکند - دیگر میکند : (مطبوعہ ص $\frac{۲۹۷}{۲۹۸}$): مطبوعہ میں تیسرے شعر میں '[عشق می]' کی جگہ 'جان ہمی' ہے۔ مقطع سے قبل کے شعر میں 'دوبہا[ی]' کی جگہ 'درایتہا' ہے۔ مندرجہ ذیل تین شعر الحاقی ہیں۔ 'ہر زمان الخ'، 'با کمال الخ' اور 'شرح سودای الخ'۔

---

۳۰ غزلیں جو ڈاکٹر عابدی نے جرنل ۱۲ میں نسخۂ خدا بخش سے نقل کی ہیں ان میں پانچ (کردہ، آوردہ، باید بود، گرید) غیر مطبوعہ ہیں بقیہ ۲۵ غزلیں سب کی سب (سوائے اس کے کہ 'ندیم' والی غزل میں 'دندان خدم' والا شعر اور مشوی (= مشو) والی غزل میں 'شمع' سے شروع ہونے والا شعر غیر مطبوعہ ہیں) مطبوعہ ہیں۔

وسیم احمد اعظمی
ہی یونٹ، خدابخش لائبریری پٹنہ

## خدابخش لائبریری میں
# قسطا بن لوقا البعلبکی کے مخطوطات

قسطا بن لوقا البعلبکی (۸۲۰ – ۹۱۲ء)[1] کا شمار اپنے عہد کے مشہور فلسفی، طبیب اور مترجم
ا میں ہوتا ہے۔ یونانی، سریانی اور عربی لسانیات کے زبردست عالم کی حیثیت سے بھی اس کا مقام بہت بلند ہے۔
لف علوم و فنون پر اس کی تصنیفات کی تعداد باسٹھ[۶۲] تک پہنچتی ہے[2]۔ اس عظیم دانشور کے بہت سے مخطوطات
ہندستان کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ان میں خدابخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رام پور اور آصفیہ
یدرآباد شامل ہیں۔

خدابخش لائبریری میں قسطا کی تصانیف و تراجم کے چھ مخطوطات ملتے ہیں جن میں دو کا تعلق فنِ
ب سے ہے اور بقیہ چار کا علم ہیئت سے۔ رضا لائبریری رامپور میں پانچ مخطوطات کی نشاندہی کی گئی ہے،
ن میں ایک فنِ طب سے متعلق ہے اور بقیہ چار وہی ہیں جن کے دوسرے نسخے خدابخش لائبریری میں محفوظ ہیں البتہ
ں قدر فرق ضرور ہے کہ خدابخش لائبریری کی مطبوعہ فہرست مخطوطات' مفتاح الکنوز' ج ۲ میں ان کو بجا طور سے
لم ہیئت کے ضمن میں درج کیا گیا ہے (رامپور کے مطبوعہ کیٹلاگ ج ۵ میں علم ہندسہ کے ذیل میں)۔ آصفیہ حیدرآباد
یں جس ایک طبی مخطوط "کتاب فی تدبیر بدن فی سفر الحج"[3] کی نشاندہی کی گئی ہے وہی مخطوط رضا لائبریری
امپور میں بھی ہے۔ خدابخش لائبریری کے دونوں طبی مخطوطے ان سے مختلف ہیں ——— خدابخش لائبریری کے
لطوطات کا اجمالی تعارف درج ذیل ہے:

**کتاب الاکر:**۔ (ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۱۱) علم ہیئت سے متعلق یہ مخطوط ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

---

۱۔ المنجد ۲۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعۃ الجزء الاول ص ۲۴۵

۳۔ مطبوعہ فہرست آصفیہ ص ۸۲، ج ۲ میں اس کی تفصیل یوں درج ہے: "رسالہ مختصر بزبان عربی برای ابو محمد حسن بن مخلد تصنیف کردہ دران طریق حفظ صحت و علاج امراض کہ انسان را در سفر عارض شود و طبیب موجود نباشد بیان کردہ" مزید تحریر ہے: — "ابن طاؤس متوفی ۶۵۸۹ در کتاب خود کہ مسمیٰ است بہ "الاصان من اخطار الاسفار والازمان" لفظ بلفظ در باب ثالث عشر کتاب مذکور نقل نمودہ، چنانچہ در خاتمہ ہمیں رسالہ مذکور است"

اس کا اصل مصنف تھاؤ ذوسیوس الیونانی[1] ہے۔ اس کے عربی ترجمے کے فرائض دو مترجموں نے انجام دیئے ہیں۔ مخطوطہ میں ہے کہ اس کے ترجمے کی ذمہ داری ابوالعباس احمد بن المعتصم متوفی ۸۶۶ء نے قسطا بن لوقا کو سونپی تھی[2]۔ تعمیل حکم میں قسطا بن لوقا نے تیسرے مقالے کی پانچویں شکل تک کے تراجم کیے۔ اس کے بعد کا ترجمہ کسی اور نے کیا ہے (نام کی نشاندہی مخطوطہ میں نہیں کی گئی ہے) ترجمے کی اصلاح کے فرائض مشہور حرانی مترجم ثابت بن قرہ (۸۳۶ – ۹۰۱) نے انجام دیئے ہیں۔

علم ہیئت سے متعلق یہ بیش قیمت مخطوطہ تین مقالات پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے میں ۲۲، دوسرے میں ۲۳ اور تیسرے میں ۱۴ شکلیں ہیں۔ شکلیں نہایت واضح لعد صاف ہیں۔ امتداد زمانہ کا ان پر زیادہ اثر نہیں ہوا ہے۔ مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

**کتاب المساکن** :۔ (ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۱۵) علم ہیئت سے متعلق یہ مخطوطہ ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل مصنف تھاؤ ذوسیوس یونانی ہے جس کا عربی ترجمہ قسطا بن لوقا نے کیا ہے۔

مخطوطہ میں مختلف خطوں اور علاقوں میں سکونت پذیر لوگوں کے مسکن کا جائزہ لیا گیا ہے اور علم ہیئت کے مبادیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے اثرات پر گفتگو کی گئی ہے ــــ مخطوطہ کے مطابق یہ ۱۲ شکلوں پر مشتمل ہے شکلوں کی تشکیل و تفہیم کے مباحث تو ملتے ہیں لیکن ان کے بنانے کی جگہ خالی ہے۔ حواشی میں توضیحات بھی درج ہیں مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

**کتاب فی المطالع** :۔ (ہینڈ لسٹ نمبر ۳۵۱۷) علم ہیئت سے متعلق یہ مخطوطہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل مصنف البسقلاوس[3] ہے۔ جس کا عربی ترجمہ قسطا بن لوقا نے کیا ہے اور لسانی تصحیح مشہور مترجم ابو یوسف یعقوب الکندی (متوفی ۸۷۳ء) نے کی ہے۔

مخطوطہ تین مقدموں، ایک صدر اور ۱۵ شکلوں پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ کاتب کا نام

---

۱۔ مشہور مہندس اور ریاضی داں جسے اقلیدس سے زیادہ مرتبہ دیا جاتا ہے۔
۲۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز میں اس کا مترجم ابوالعباس احمد بن المعتصم کو قرار دیا گیا ہے جو غلط ہے۔
۳۔ یونانی ریاضی داں جو اقلیدس کے بعد گزرا ہے۔

[و] سنہ کتابت تحریر نہیں ہے ۔تقریباً دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے ۔

کتاب فی جرمی النیرین :۔ (ہینڈلسٹ نمبر ۲۰۲۵۳) علم ہئیت سے متعلق یہ مخطوط ۱۹
[صفح]ات پر مشتمل ہے ۔اصل مصنف ارسطرخس ہے جس کا عربی ترجمہ قسطا ابن لوقا نے کیا ہے ۔مگر مخطوط میں کہیں بھی
[ا]یسے اشارات نہیں ملتے جن سے اندازہ ہو سکے کہ اس کا مترجم قسطا ابن لوقا ہی ہے ۔ اسی مخطوط کا ایک اور نسخہ جو رضا
[لائ]بریری رامپور میں محفوظ ہے ،اس کو بھی قسطا ابن لوقا ہی سے منسوب کیا گیا ہے (ارسطرخس اسکندریہ کا مشہور ماہر فلکیات تھا)
مخطوط میں اجرام سماویہ زیر بحث ہیں ۔ تحریر ہے کہ چاند اپنی ضیا کے لئے سورج کا محتاج ہے ۔ مخطوط
کے آغاز میں ۷ شکلوں کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن اس میں صرف ۵ شکلیں ہی ملتی ہیں اور ایک کی جگہ خالی ہے ۔
مخطوط خط نستعلیق میں ہے ۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے ۔ تقریباً دسویں صدی ہجری
کا معلوم ہوتا ہے ۔

کتاب فی حفظ الصحۃ وازالۃ المرض :۔(ہینڈلسٹ نمبر ۲۱۵۲) فن طب سے متعلق یہ
[م]خطوط ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فی الحال ، فصول اور ناقص الآخر حالت میں ہے ۔اس میں فن کے مبادیات
کو مد نظر رکھتے ہوئے معالجہ سے متعلق اطبا ء کی ذمہ داری اور حاضر دماغی ، متقدمین اطبا ، جالینوس ، بقراط اور
ابن سینا کے نظریات ، نوعیت مرض اور مریض کے مزاج نیز ادویہ کے استعمال کے اوقات وغیرہ مباحث
پر پُر مغز گفتگو کی گئی ہے ۔
مخطوط مذکورہ کو قسطا بن لوقا کی تصنیف قرار دیتے ہوئے خدا بخش لائبریری کیٹلاگ[۱۸] ج ۴
میں مخطوط کی بابت مندرجہ ذیل عبارت کی نشاندہی کی گئی ہے :-

"کتاب فی حفظ الصحۃ وازالۃ المرض ، لقسطا بن لوقا"

کیٹلاگ کے مطابق اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ قسطا
[اب]ن لوقا کی ہی تصنیف ہے ، کیونکہ اس طرح کا کوئی دوسرا نسخہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے ۔
میں نے مخطوط کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ، لیکن مذکورہ بالا عبارت مجھے کہیں بھی نہیں ملی ۔ نہ ہی
یہ معلوم ہو سکا کہ کتاب کا اصل نام "کتاب فی حفظ الصحۃ وازالۃ المرض" ہے ۔ ممکن ہے کیٹلاگ
[مر]تب کی ترتیب کے وقت یہ عبارت مخطوط میں کہیں واضح رہی ہو یا کوئی اضافی ورق اس طرف نشاندہی کرتا رہا ہو ۔
لیکن فی الحال اس طرح کی کوئی عبارت یا تحریر اصل مخطوط یا کسی اضافی ورق میں نہیں ملتی ، اس لئے قسطا بن لوقا

کی طرف یقینی طور پر اس کا انتساب میرے خیال میں مبادیات تحقیق کے خلاف ہوگا۔ مزید اس کتاب کا ذکر تذکروں میں نہیں ملتا مخطوط عربی خط نسخ میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً سترہویں صدی عیسوی کا معلوم ہوتا ہے۔

**کتاب فی الوبا و اسبابہ:** ـ (ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۵۳) فن طب سے متعلق یہ مخطوط ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوط کی عبارت کے مطابق اس کو قسطا بن لوقا نے خوارزم شاہ ابو العباس مامون بن مامون کے حکم سے تصنیف کیا تھا۔ اس میں متعدی امراض، ان کے اسباب اور تحفظی تدابیر کا بیان ہے۔ بعض مباحث میں اطبائے قدیم کے اقوال و نظریات سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ مباحث کی تفصیل درج ذیل ہے:

الجملة الاولی فی حاجة الانسان الی الهوا ولزوم الهوا ابدا و مقدار تاثیرة فیه[1]

الجملة الثانیة فی اختلاف الاهویة و انواع التغایر التی تعرض له[2] و اصناف الهوا الوبی والمضر لبدن الانسان[3] و انحاء مضارة[4] و اسباب هذه الاشیاء

الجملة الثالثة فی معرفة کل واحد من هذه الانحا و تمییز بعضها من بعض و تحصیل العلامات الدالة علی واحد واحد منها۔

الجملة الرابعة فی تدبیر جمیع اصناف الوبا علی الاطلاق و کل واحد منها خصوصا و تلاحق اندازة و تدبیر الابدان الصحیحة حتی لا تقع فیه و معالجة قد وقع فیه۔

اس مخطوط کو خط نسخ میں الحسن بن علی الطبیب کے ربیع الاول ۹۴۷ھ کے کتابت کردہ ایک نسخے سے محمد محمد الشربینی المطبب نے ۱۳ شعبان ۱۰۵۳ھ میں نقل کیا ہے۔ مخطوط کے آخر میں ابن ابی اصیبعہ کے الفاظ میں قسطا بن لوقا کی نامکمل سوانح حیات تحریر ہے۔

---

۱۔ تفصیل بحث میں " لہا " تحریر ہے۔ ۲۔ تفصیل بحث میں " بالبدن الانسانی " تحریر ہے۔ کیٹلاگ میں " بالبدن الانسان " بغیر " یا " تحریر ہے۔ ۳۔ تفصیل بحث میں " مایضرہ " تحریر ہے۔ ۴۔ کیٹلاگ ج ۳ میں " یقع " " بالیا " تحریر ہے۔ حالانکہ مخطوط میں اجمالی اور تفصیلی دونوں بحثوں میں " بالنسا " تحریر ہے۔

یس نعمانی (لکھنؤ)

# محسن کتابوں وغیرہ کے بارے میں

جرنل ۱۹ پیش نظر ہے:

ص ۷۶ : شاہ رفیع الدین کی ایک کتاب کا نام "تکمیل الاذھان" چھپا ہے، عمران خان صاحب کی کتاب
ں بھی اسی طرح ہے اور غالباً یہ غلطی وہیں سے چلی ہے۔ شاہ رفیع الدین کی کتاب کا صحیح نام غالباً "تشحیذ الاذھان"
ہے۔ تکمیل الایمان شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب کا نام ہے۔ عبیداللہ سندھی صاحب نے یہ مضمون اپنے
کسی شاگرد کو املا کرایا ہوگا اور اس شاگرد کو التباس ہوا جس کو عمران خان صاحب نے مارک کئے بغیر شائع کر دیا۔
مندرجہ ذیل کتابوں کے نام محمد عمران خاں کے یہاں صحیح چھپے تھے، جرنل میں غلط چھپے ہیں :-

ص ۷۷ : سیوطی کی کتاب کا نام : المظھر کے بجائے "المزھر"؛ صدری غلط، صدرا صحیح (ص ۷۹
پر بھی اسی طرح)؛ شرح موافق غلط، شرح مواقف صحیح؛ تفسیر جامی غلط، صحیح نام تفسیر معانی ہے۔

ص ۷۸ : "الغایۃ الامانی" "المجموعۃ الرسائل" یہ دونوں پہلے 'ال' کے بغیر صحیح
ہیں یعنی "غایۃ الامانی" اور "مجموعۃ الرسائل"۔

ص ۸۰ : "دار المعارف" میں دار کو دَر پڑھا جائے؛ خطبات مدارس، میں مدارس کو مدراس؛
دمراۃ المستقیم کو صراط مستقیم۔

---

داؤدی کی "طبقات المفسرین" (جرنل ص ۸۵) کے نسخے قاہرہ وغیرہ میں بھی ہیں۔ یہ ایڈٹ ہو کے
۲ جلدوں میں طبع بھی ہو چکی ہے۔

---

محبوب حسین صاحب نے (جرنل ص ۹۳) ایک کتاب کا نام "بلاغ المبین" لکھا ہے جو غالباً رجسٹر یا کتاب کے ٹائٹل
کی نقل مطابق اصل ہے۔ اس کو بھی صحیح کرنے کے لئے یا المبین سے "ال" ہٹانا ہوگا یا بلاغ پر بھی "ال" بڑھانا
ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کو شاہ رفیع الدین کی تصنیف بتایا گیا ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اس کتاب کے
متعدد ایڈیشن مارکٹ میں آچکے ہیں اور سب پر نہیں تو اکثر پر شاہ ولی اللہ کا نام مصنف کی حیثیت سے چھپا ہے۔

دیوبند والوں نے اس کا اُردو ترجمہ بھی شاہ ولی اللہ ہی کی تصنیف سمجھ کر شائع کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب
نہ شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے نہ ان کے بیٹے شاہ رفیع الدین کی۔ بلکہ اس کا مؤلف کوئی تیسرا شخص ہے۔

ص۹۳۔ "کتاب الوصلہ الی الحبیب فی وصف الطیبات والطیب" وائلم میں آخری لفظ "الطیب" پر سوٹی سی تشدید کے بجائے 'ی' تک کھسک گئی ہے۔

---

آپ نے تعارفی صفحے پر میری تاریخ پیدائش (۱۹۵۰ء نقد) تحریر فرمائی ہے۔ عرض خدمت ہے کہ اسلامی مدارس، سرشتۂ تعلیم حکومت اتر پردیش اور لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ کے ریکارڈ کی رو سے ۱۹۵۸ء صحیح ہے

○

## بلاغ المبین کے بارے میں

محبوب حسین (پٹنہ)

بلاغ المبین کی ترکیب عربی لحاظ سے غلط ہے، "البلاغ المبین" ہونا چاہیے مگر فارسی اور اُردو میں یہ ترکیب عام طور پر مستعمل ہے۔

میں نے مطبوعہ کتاب بلاغ المبین مع ترجمہ سراج السالکین منگا کر دیکھا وہاں بھی بلا الف لام بلاغ المبین ہی پایا۔ یہ کتاب شاہ ولی اللہ دہلوی کی ہے۔ مطبوعہ جید پریس، بلیماران۔ دہلی (ہینڈ لسٹ نمبر ۵۰۲۹)

دوسری بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ اگر کوئی مؤلف اپنی کتاب کا نام ایسا رکھتا ہے جو قواعد عربی کے لحاظ سے درست نہ ہو تو مجھ کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ نام کی تصحیح کر دوں۔ اسی طرح مؤلف کے نام میں عربی قاعدہ سے کوئی غلطی ہو، اُسے بھی درست کر دینے کا حق مجھے نہ ہوگا۔

●●

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی (پٹنہ)

# تصحیح و اضافہ
# مسامحات مرآۃ العلوم (جلد سوم)

(۱) صفحہ ۳۔ کتاب نمبر ۳۲۸۹، حملۂ سکندری: سلسلہ وار نمبر ۲۳۶۲ غلط۔ ۲۳۶۶ صحیح۔

(۲) صفحہ ۲۰۔ کتاب نمبر ۳۸۱۵، سفینۂ خوشگو: خانۂ کیفیت میں یہ اطلاع صحیح نہیں ہے کہ یہ تذکرہ شعرای متاخرین ہے جو مصنف کے معاصر تھے۔ یہ تین دفتروں پر مشتمل ہے۔ نسخۂ زیر بحث دفتر دوم ہے جو شعرائے متوسطین کے احوال میں ہے۔ (صرف تیسرا دفتر شعرائے متاخرین کے احوال میں ہے جو مصنف کے معاصر تھے۔ اس جلد سوم کا کتاب نمبر ۲۲۵ ہے جو بہت کمیاب ہے۔)

(۳) صفحہ ۲۳۔ کتاب نمبر ۳۳۳۴، کلمات الشعرا: خانۂ کیفیت میں اضافہ کیا جائے کہ "برای نسخۂ دیگر کتاب نمبر ۲۲۲"

(۴) صفحہ ۲۶۔ طبقۂ اولیٰ، شعرای متاخرین: اسے متقدمین پڑھا جائے۔

(۵) صفحہ ۲۹۔ کتاب نمبر ۳۶۵۹، خمسۂ خسرو: تیسری مثنوی کا نام لیلیٰ مجنوں کے بجائے مجنوں لیلیٰ پڑھا جائے۔ پانچویں مثنوی محذوف بتائی گئی ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ پانچویں مثنوی خمسہ میں موجود ہے یعنی آئینۂ سکندری

(۶) صفحہ ۳۰۔ کتاب نمبر ۲۶۳۷، دیوان ابن یمین: فن کے خانہ میں ایضاً لکھ کر اسے مثنوی میں شمار کیا گیا ہے۔ صحیح لفظ دیوان ہونا چاہیے۔

(۷) صفحہ ۳۰۔ کتاب نمبر ۳۶۸۹، دیوان احمد چرم پوش: خانۂ کیفیت میں "برای نسخۂ دیگر، شمارہ ۳۰۶ کی

فرجوع کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یہ ہدایت صحیح نہیں ہے۔ یہ کتاب نمبر ۳۰۶ چرم پوش کے بجائے احمد جام کا دیوان ہے۔

(۸) صفحہ ۳۱ - کتاب نمبر ۲۳۵۷ : خانۂ کیفیت کی عبارت "شمارہائے ۳۱۸ تا ۳۲۴" صحیح نہیں، ۳۲۴ کے بجائے ۳۲۵ پڑھا جائے۔

(۹) صفحہ ۳۱ - کتاب نمبر ۲۴۸۹، دیوان عبدالقادر جیلانی : یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔

(۱۰) صفحہ ۳۱ - کتاب نمبر ۲۹۹۴، دیوان معین الدین چشتی اجمیری : یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے۔

(۱۱) صفحہ ۳۲ - کتاب نمبر ۲۳۶۸، فہرست نگار نے اسے دیوان حافظ قرار دیا ہے، پھر صفحہ ۶۸ پر اسی کتاب کو ۲۳۶۸ ب قرار دیا ہے، اوّل الذکر کے ۱۷۶ ورق لکھے ہیں، آخر الذکر کے ۱۶۹۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں حصے مل کے ایک کتاب ہوتی ہے۔ کتابت کی ندرت یہ ہے کہ سیدھے ہاتھ کے صفحے پر کاتب نے دیوان حافظ کی کتابت کی ہے اور اس کے مقابلے میں اُلٹے ہاتھ کے صفحے پر دیوان قاسم انوار لکھا ہے۔ اسی طور سے از اوّل تا آخر۔ اسی ترتیب کے ساتھ دونوں کتابیں دیوان حافظ اور دیوان قاسم انوار اس ایک مجلد میں موجود ہیں اس لیے نصف اوّل کو دیوان حافظ اور نصف ثانی کو دیوان قاسم انوار قرار دینا صحت سے دور ہوگا، فہرست نگار کو مغالطہ ہوا ہے۔

(۱۳) صفحہ ۳۴ - کتاب نمبر ۳۹۹۷، شرح دیوان خاقانی: خانۂ کیفیت میں اس اطلاع کا اضافہ ہونا چاہیے کہ "برائے نسخہائے دیگر کتاب نمبر ۳۳۲ و ۳۳۳" دیکھی جائیں۔

(۱۴) صفحہ ۳۴ - کتاب نمبر ۳۸۲۵، نام کتاب دیوان سنائی۔ فہرست نگار نے مصنف کا نام ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی الغزنوی بتایا ہے۔ یہ انتساب غلط ہے۔ دراصل یہ دیوان سنائی غزنوی کا نہیں بلکہ ثنائی مشہدی کا ہے جس کا نام خواجہ حسین تھا (ثنائی مشہدی کا ایک دوسرا مخطوطہ نمبر ۴۴۸ میاں موجود ہے) تعداد اوراق ۶۶، سطر ۱۶ صحیح نہیں۔ اوراق ۷۰ ہیں اور سطر ۱۷۔ کتابت سنہ ۴۹ جلوس عالمگیر قرار دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ سنہ کتابت نہیں بلکہ اس سال محمد غوث نے لالہ . . . رام کو یہ کتاب عنایت کی جو اسے فتح قلعہ . . . حیدرآباد میں حاصل ہوئی تھی "کیفیت" میں "برای نسخۂ دیگر بہ شمارہ ۳۴۰ رجوع کنید" کی جگہ یہ عبارت پڑھیے : "برای نسخۂ دیگر بہ شمارہ ۴۴۸ رجوع کنید"۔

(۱۵) صفحہ ۳۵ - کتاب نمبر ۳۹۶۰، دیوان ظہیر : سنہ کتابت ۱۲۳۲ عملی : عملی کو فصلی پڑھا جائے۔

(۱۶) صفحہ ۳۶ - کتاب نمبر ۳۹۵۹، رسالہ شمس تبریز : شمس تبریز کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں۔ مصنف اور عنوان دونوں نامعلوم ہیں۔ علاوہ ازیں اس مجلد میں سب سے پہلے تو ایک قصیدۂ رائیہ یوسف گدا کا ہے اس کے بعد ایک قصیدہ عین القضاۃ کا۔

اس مخطوطے کو رسالہ شمس تبریز سمجھنا غلط ہے۔ اس میں مختلف منظوم رسالے ہیں۔ پہلا منظوم رسالہ ایک قصیدۂ رائیہ ہے جس میں تمہید کے بعد مدح قطب عالم شیخ نصیر الحق ہے اور پھر ۴۲ ابواب پر احکام شرعیہ؛ دوسرا قصیدہ حضرت عین القضات ہمدانی ہے؛ تیسرا ایک مثنوی ہے جو ۱۰ فصلوں پر مشتمل ہے اور جن میں مسائل تصوف بیان کئے گئے ہیں۔

(۱۷) صفحہ ۳۶۔ کتاب نمبر ۲۷۸۸، سام نامہ: خانۂ کیفیت میں یہ عبارت آنی چاہیئے "برای نسخۂ دیگر کتاب نمبر ۱۸۱۲ کو دیکھا جائے"۔

(۱۸) صفحہ ۳۸۔ کتاب نمبر ۲۷۷۰ (الف) شاہنامہ: خانۂ کیفیت میں نسخۂ دیگر کا نمبر ۳۵۹ کے بجائے ۳۵۸ ہونا چاہیئے۔

(۱۹) صفحہ ۳۹۔ کتاب نمبر ۳۵۷۴: منتخب شاہنامہ: اس ایک جلد میں دو کتابیں مجلد ہیں۔ ایک منتخب شاہنامہ جو در اصل تاریخ شمشیر خانی ہے اور دوسری ہجو حضرت سلطان محمود (ق ۶، سطر ۱۵) یہ وہی ہجو ہے جو محمود شیرانی کی تحقیق سے قبل فردوسی سے منسوب کی جاتی تھی۔

(۲۰) صفحہ ۳۹۔ سلسلہ وار نمبر ۲۶۲۱۔ نام کتاب منتخب شاہنامہ۔ کتاب کا شمارہ۔ ۳۵۷۱ غلط۔ صحیح ۳۵۷۶۔ اس کا پروگریس نمبر ۲۱۸۹۲ غلط۔ ۳۱۸۹۱ صحیح۔

(۲۱) صفحہ ۴۰۔ کتاب نمبر ۳۹۵۱: منتخب شاہنامہ: خانۂ کیفیت میں ہی ایضاً لکھ کر اسے مثنوی قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ خانۂ کیفیت میں اسے صاف لکھا ہے کہ "کتاب در نثر فارسی" ہے۔ ظاہر ہے پھر مثنوی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

(۲۲) صفحہ ۴۰۔ کتاب نمبر ۲۹۳۳ الف کے بجائے غلطی سے ۱۹۳۳ درج ہو گیا ہے۔ نام بھی 'کلیات سعدی' غلط ہے صحیح نام 'دیوان طیبات' ہے۔ مصنف سعدی ہیں۔

(۲۳) صفحہ ۴۰۔ کتاب نمبر ...۴۰۔ نام کتاب خلاصۂ شاہنامہ۔ اس کتاب کا اصل نام "پرخاش نامۂ عجم" ہے۔ فہرست نگار نے مصنف کا نام نہیں بتایا۔ مصنف کا نام وزیر علی عبرتی عظیم آبادی ہے۔

(۲۴) صفحہ ۴۱۔ کتاب نمبر ۳۷۸۵: یہ مجموعۂ قصائد ہے جو ۴۶ پارہای منظوم پر مشتمل ہے۔ فہرست نگار نے جملہ قصائد کو، باستثنا ۷ (ترکیب بند) مثنوی بتایا ہے اور صرف ۱ کو قصیدہ لکھا ہے۔ مزید بر آن ۷ قصیدہ در ولایت حضرت علی کا انتساب شمس تبریز کی طرف کیا ہے۔ شمس تبریز شاعر تھے!

(۲۵) صفحہ ۴۱۔ کتاب نمبر ۴۰۷۴ (۳)، ما مقیما: صحیح نام ما مقیمان ہے۔ اسے سعدی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ یہ بھی غلط ہے۔ اس کتابخانے کی کتاب نمبر ۱۱۶۵ پر اس کا اندراج موجود ہے اور مصنف کا نام علاء الدین احمد لکھا ہے۔ انگریزی توضیحی کیٹلاگ جلد (۳) میں بھی کتاب نمبر ۱۸۶۹ کے تحت (ص ۱۳۶) اس کتاب کی

تفصیل موجود ہے اور مصنف کی بھی! موجودہ فہرست نگار نے خود بھی اسکی تعلیقہ میں ص ۴۲ پر علاء الدین سے منسوب

(۲۶) صفحہ ۴۹۔ کتاب نمبر ۲۷۸۶۔ کلیات سعدی۔ فہرست نگار نے اسے منظومات میں شامل کیا ہے حالانکہ اس میں سعدی کے مختلف نثری رسالے ہیں۔ منظومات کی فہرست سے اسے کالعدم سمجھا جائے اور اسی طرح کیفیت کا

(۲۷) صفحہ ۵۰۔ کتاب نمبر ۲۲۶۰، کتاب نمبر ۳۹۷۷ اور کتاب نمبر ۴۰۰۳ ہے۔ کتاب کا نام 'مجنوں لیلیٰ' چاہیے۔ 'لیلیٰ مجنوں' غلط ہے۔

(۲۸) صفحہ ۵۱۔ کتاب نمبر ۳۴۸۱، مثنوی ابن عماد: فہرست میں اس مثنوی کو عماد الدین فقیہ کرمانی سے منسوب کیا گیا ہے، جو غلط ہے۔ اس کا مصنف عماد خراسانی ہے، جس نے شیراز میں اپنی زندگی بسر کی۔ اس کا ایک دیوانِ غزلیات بھی ہے اور ایک دہ نامہ بھی اس نے لکھا ہے، ملاحظہ 'تذکرہ دولت شاہ' و دیگرا۔

(۲۹) صفحہ ۵۱۔ کتاب نمبر ۴۰۲۳ و کتاب نمبر ۴۰۶۳: کتاب کا نام یہاں بھی مامقیماں کے بجائے مامقیما درج ہے۔ ساتھ ہی فن میں الیفاً لکھ کر اسے مثنوی قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ یہ ترکیب بند ہے۔ مصنف حسب دستور سعدی کو قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ خود فہرست نگار نے ص ۴۷ پر علاء الدین کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۳۰) صفحہ ۵۱۔ کتاب نمبر ۲۳۲۱، آئینۂ سکندری: خانۂ کیفیت میں اضافہ کیا جائے: "برائے نسخہ دیگر کتاب نمبر ۲۹۷" دیکھیے۔

(۳۱) صفحہ ۵۱۔ کتاب نمبر ۳۷۳۵، مجموعۂ قصائد: صحیح یہ ہے کہ "یہ مجموعۂ مثنویات عطار" ہے۔

(۳۲) صفحہ ۵۵۔ کتاب نمبر ۲۷۰۲، نمبر ۲۷۲۷، نمبر ۲۸۰۱، نمبر ۲۸۰۲، نمبر ۲۸۰۳، نمبر ۲۳۶۲: یہ تمام مثنوی نہیں شرح ہیں۔

(۳۳) صفحہ ۵۶۔ کتاب نمبر ۲۹۲۹: اسے شرح مثنوی لکھنا نادرست ہے۔ یہ انتخاب مثنوی ہے۔

(۳۴) صفحہ ۵۶۔ کتاب نمبر ۳۶۷۵: یہی صورت اس کی بھی ہے کہ یہ شرح نہیں انتخاب مثنوی ہے۔

(۳۵) صفحہ ۵۶۔ کتاب نمبر ۲۳۸۲، کتاب نمبر ۳۷۶۰، کتاب نمبر ۳۷۰۳۔ یہ تینوں بھی مثنوی کی شرح نہیں، اس کا انتخاب ہے۔

(۳۶) صفحہ ۵۶۔ کتاب نمبر ۲۹۷۳، یہ بھی شرح نہیں۔ مجموعۂ اشعار ہے۔

(۲۸) صفحہ ۵۷ - کتاب نمبر ۲۹۳۳ : کتاب کا نام فہرست نگار نے 'مطلع الانوار' لکھا ہے، جو خسرو دہلوی کی تصنیف ہے - یہ اندراج غلط ہے۔ کتاب مذکور 'تحفۃ الاحرار' ہے جس کے مصنف جامی ہیں -

(۲۹) صفحہ ۵۷ - کتاب نمبر ۲۴۷۸ (۳) ' غزلیات عطار : غزلیات کو مثنوی کے تحت مندرج کرنا صحیح نہیں -

(۳۰) صفحہ ۵۷ - نمبر کتاب ۲۳۹۱ - نام کتاب: منطق الطیر سورۂ یٰسین - اس مخطوطے میں منطق الطیر کا نامکمل نسخہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں صرف سورۂ یٰسین ہی نہیں بلکہ پورا پنجسورہ نہایت خوشخط، خط نسخ میں لکھا ہوا ہے جس کو منطق الطیر کے ساتھ مجلد کر دیا گیا ہے -

(۳۰) صفحہ ۵۸ - کتاب نمبر ۲۴۷۸ ، ذیلی نمبرات ۴ تا ۱۳ : قصاید کمال ، ترجیعات رازی ، غزلیات عطار ، غزلیات سلمان ، غزلیات حافظ ، غزلیات سعدی ، غزلیات خسرو ، غزلیات کمال ، غزلیات ناصر ، اور غزلیات عراقی کا فن مثنوی قرار دینا محض غلط ہے -

(۳۱) صفحہ ۵۹ - کتاب نمبر ۲۵۰۷ - نام کتاب "ہفت بند کاشی" - کاتب کا نام فہرست نگار نے سید امیر علی بتایا ہے، حالانکہ یہ اس مخطوطے کے مالک کا نام ہے جس کی مہریں بھی ثبت ہیں - فن کے کالم میں اس کو 'مثنوی' بتایا گیا ہے - حالانکہ اس نظم کی صنف نام ہی سے ظاہر ہے -

(۳۲) صفحہ ۵۹ - کتاب نمبر ۳۴۵۸ ، نمبر ۳۴۶۰ ، نمبر ۳۴۸۶ ، نمبر ۳۵۰۱ ، نمبر ۴۰۳۴ ، اور نمبر ۴۱۰۲ - ان سب نمبروں پر ہفت بند کاشی ہے ، ہفت بند کو مثنوی شمار کرنا نادرست ہے -

(۳۳) صفحہ ۶۰ - کتاب نمبر ۴۱۰۲ - نام کتاب "ہفت بند کاشی" اس کتاب کا نام مجموعۂ مناقب جناب امیر علی ہے۔ اس میں صرف ہفت بند کاشی ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی چند ہفت بند ہیں اور دیگر شعرا کے لکھے ہوئے مناقب بھی ہیں -

(۳۴) صفحہ ۶۰ - کتاب نمبر ۴۰۳۴ - نام کتاب "ہفت بند کاشی" : کیفیت کے کالم میں یہ عبارت بڑھائیے : "دراصل یہ کتاب دیوان کلیم ہے۔ اس مخطوطے کے آخر میں 'ہفت بند کاشی' بھی مجلد ہے" دیوان کلیم کا مستقلاً اپنی مناسب جگہ پر بھی اندراج ہونا چاہیے -

(۳۵) صفحہ ۶۲ - کتاب نمبر ۲۸۶۶ (۶) ' ترجیع بند سعدی : اس ترجیع بند کو بھی غلطی سے مثنوی شمار کیا گیا ہے -

(۳۶) صفحہ ۶۲ - کتاب نمبر ۲۸۷۴ (۱) ' ترکیب بند حسن دہلوی : ترکیب بند کو مثنوی لکھنا صحیح نہیں - مزید برآں

اس نسخہ میں غزلیات قتیل و جہاندار شاہ بھی موجود ہیں جن کا مطلق تذکرہ نہیں کیا گیا۔ یہ ترکیب بر
سحرالبیان کے مصنف میر حسن کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔ فارسی فہرست میں اس کا اندراج
کس طرح سے ہوا۔

(۴۹) صفحہ ۶۲۔ کتاب نمبر ۲۵۲۶ (۱)، دیوان سنائی: دیوان کو مثنوی قرار دینا نادرست ہے۔

(۵۰) صفحہ ۶۲۔ کتاب نمبر ۲۸۷۸ (۳)، غزل شمس تبریز: اس کا مصنف شمس تبریز کو قرار دینا صحیح نہیں
جلال الدین رومی لکھنا چاہیے۔

(۵۱) ص ۶۲۔ کتاب نمبر ۲۳۲۰، قران السعید: صحیح نام قران السعدین ہے۔ علاوہ دیوان رباعی سمرقندی (م ۳۴۸ھ) بھی ہے۔
جس کا اندراج ہی نہ ہوا۔ اوراق ۲۲، سطر ۱۵۔

(۵۲) صفحہ ۶۴۔ کتاب نمبر ۳۸۴۴، خاور نامہ: پوری تفصیل یوں ہونی چاہیے "خاور نامہ، حصہ دوم"۔

(۵۳) صفحہ ۶۵۔ کتاب نمبر ۲۵۶۴، دیوان اہلی: صحیح نام کلیات اہلی چاہیے۔

(۵۴) صفحہ ۷۰۔ کتاب نمبر ۲۳۵۴، کتاب نمبر ۳۴۴۱، کتاب نمبر ۳۷۳۶ سبحۃ الابرار جامی: فن غزل
لکھا ہے، صحیح مثنوی ہے۔

(۵۵) صفحہ ۷۰۔ کتاب نمبر ۳۸۳۳، سحر حلال: کاتب کا نام نور الحسن درج کیا گیا ہے۔ فہرست نگار کو غلط
ہوئی۔ نور الحسن کاتب نہیں مالک کتاب ہے۔ کاتب کا نام کتاب میں سرے سے ہے ہی نہیں۔

(۵۶) صفحہ ۷۰۔ کتاب نمبر ۱۵۰۴، سحر حلال: یہ کتاب مخطوطہ نہیں مطبوعہ ہے جو ۱۲۶۰ھ میں طبع ہوئی۔ دلپذ
حروف طباعت کے سبب یہ اشتباہ ہوا۔ حالانکہ پہلے صفحہ پر ہی صاف درج ہے کہ یہ نسخۂ مطبوعہ اس مخطو
نسخہ پر مبنی ہے جس کی کتابت محمد حسین نے ۱۲۵۸ھ میں کی۔

(۵۷) صفحہ ۷۴۔ کتاب نمبر ۲۳۶۹، کلیاتِ اہلی: یہ اہلی نہیں ہے۔ رہائی کا کلیات ہے۔ سرورق پر صلاح ا
خدابخش نے اپنے قلم سے کتاب اور مصنف دونوں کی تفصیل لکھی ہے۔

(۵۸) صفحہ ۷۴۔ کتاب نمبر ۲۵۵۷، مثنوی اہلی: کتاب کا اصل نام مثنوی سحر حلال چاہیے۔

(۵۹) صفحہ ۸۴۔ کتاب نمبر ۳۷۲۴، دیوان حسن: یہ غلام حسن بیتھوی کا دیوان ہے۔ دوسرا نسخہ نمبر
پر موجود ہے۔

(۶۰) صفحہ ۸۶۔ کتاب نمبر ۲۴۸۵، دیوان صائب: سنہ کتابت ۱۰۰۲ھ لکھا ہے جو صریحاً ناممکن ہے کہ صائب
نے ۱۰۸۰ھ یا بروایت دیگر ۱۰۸۵ھ میں وفات پائی۔ واقعتہً کتابت میں سنہ کتابت ۱۰۹۴ھ موجود

(۶۱) صفحہ ۹۹ - کتاب نمبر ۲۴۰۴، گلستانِ عشق : مصنف سید شاہ غلام حسن ساکن بیتھو (گیا)، صاحبِ دیوان فارسی ہیں دیکھئے خدا بخش لائبریری جرنل ۱۲ - دیوان حسن بیتھوی کے ۲ دو قلمی نسخے نمبر ۱۹۰۲، اور نمبر ۳۷۴۲ پر موجود ہیں -

(۶۲) صفحہ ۱۰۲، کتاب نمبر ۳۹۲۲، مولود شریف مع غزوات و معجزات : یہ کتاب فارسی نہیں اردو نظم میں ہے - اس فہرست کے بجائے اس کا صحیح مقام اردو مخطوطات کی فہرست میں ہے -

(۶۳) صفحہ ۱۲۵، کتاب نمبر ۲۴۹۴: ریاض الحروف (عبرتی) : خانۂ کیفیت میں نسخۂ دیگر کی اطلاع ہے کہ نمبر ۲۵۷۵ دیکھا جائے یہ غلط ہے ۲۵۷ ہونا چاہئے - اسی فہرست میں ریاض الحروف کے دو نسخے اور بھی پائے جاتے ہیں - ملاحظہ ہو ص ۱۳۲ کتاب نمبر ۳۹۴۶ و کتاب نمبر ۴۱۰۳ -

۱۳۸، کتاب نمبر ۲۹۸۶، کلمات الشعرا : خانۂ فن میں اسے 'عروض' لکھا ہے، صحیح تذکرۂ شعرا -
ملاحظہ ص ۲۲ کتاب نمبر ۳۳۶۴
۱۳۹، کتاب نمبر ۳۹۶۷، نصاب عروض - فن نحو غلط - صحیح عروض -
۱۳۹ - کتاب نمبر ۲۶۳۲ (۲)، عروض سیفی : فن نحو غلط، عروض صحیح -
۱۳۹ - کتاب نمبر ۳۸ ۲۷ (۱۰)، مجمع الصنائع : اسے فن نحو میں شمار کرنا غلط ہے، صحیح فن صنائع بلاغت
۲۱۸ - کتاب نمبر ۳۰۶۹ : کتاب کا نام "جواب مکتوب شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری" غلط ہے - حضرت شرف الدین احمد کے ۲۸ مکتوبات ہیں جو مظفر شمس کے مکتوبات کے جواب میں لکھے گئے - خانۂ مصنف میں مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے -

۲۳۶ - کتاب نمبر ۲۴۶۳، کتاب نمبر ۲۶۲۶، کتاب نمبر ۳۰۰۸ اور ص ۲۸۵ پر کتاب نمبر ۳۷۱۱ : مکتوبات صدی کے ان چاروں نسخوں کے بیان میں خانۂ مصنف میں زین بدر عربی درج کیا ہے، جبکہ کیفیت میں انھیں 'جامع مکتوبات' لکھا ہے - جامع کو مصنف قرار دینا درست نہیں - خانۂ کیفیت دوسرے نسخوں کی اطلاع کے ذیل میں کتاب نمبر ۱۳۹۱ تا ۱۳۹۶ کا حوالہ ہے - ۱۳۹۱ غلط ہے، ۱۳۹۲ صحیح -
۲۷۱ - کتاب نمبر ۲۸۷۴، ترکیب میر حسن دہلوی : صحیح ترکیب بند - یہ وہی کتاب ہے جو ص ۹۲ پر کتاب نمبر ۲۸۱۱ کے طور سے درج ہے، جہاں اسے مثنوی کے فن میں ڈالا گیا ہے - لیکن یہاں فن ادب قرار دیا گیا ہے - خط نستعلیق لکھا ہے، یہاں شکستہ - یہ امر بھی قابل ذکر تھا کہ اس نسخہ میں قتیل اور جہاندار کی غزلیں منقول ہیں - دلچسپ بات یہ ہے کہ اس صفحہ پر نمبر ۲۸۷۴ (۲) کے ایک اور نسخہ کا مصنف مرزا حسن قرار دیا گیا ہے -

کتاب کا نمبر ۲۸۶۲ (۲) دیا گیا ہے اور تعداد اوراق ۱۹، سائز بھی مختلف ہے گویا ایک کتاب کا ۳ جگہ اندراج ہے اور تینوں جگہ بیانات مختلف طور سے ہیں جس سے گمان ہوتا ہے تین مختلف کتابیں ہیں جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل تفصیل سے یہ نکتہ واضح ہو جائے گا۔

| صفحہ نمبر | نام کتاب | نمبر کتاب | مصنف | فن | سن کتابت | تعداد اوراق | پیمانہ | خط | پروگریس نمبر |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۹۲ | ترکیب بند میر حسن دہلوی | ۲۳۷۴/۱ | — | مثنوی | ۱۲ ذی الحجہ | ۱۰ | ۲۳ × ۱۴ / ۲۲ × ۱۱ | نستعلیق | ۶۱۴۸ |
| ۱۰۱ | ترکیب بند | ۲۸۶۲/۲ | مرزا حسن | — | ۱۲۹۷ | ۱۹ | ۲۴ × ۱۵ / ۱۹ × ۱۱ | شکستہ | ۶۱۴۲/۲ |
| ۲۷۱ | ترکیب بند (ایضاً) میر حسن دہلوی | ۲۸۶۴ | — | ادب | ۱۳ھ | ۱۰ | ۲۳ × ۱۴ / ۲۲ × ۱۱ | شکستہ | ۶۱۴۸ |

صفحہ ۲۶ - کتاب نمبر ۲۴۵۸ - خسرو شیریں مصنفہ نظامی۔ یہ مثنوی حقیقتاً خسرو کی 'شیریں خسرو' ہے خط بھی شکستہ نہیں نستعلیق ہے۔

صفحہ ۲۹ - کتاب نمبر ۲۷۷۶ 'خسرو شیریں'۔ کیفیت میں اضافہ ہوگا: "ناقص الطرفین"۔

صفحہ ۳۵ - کتاب نمبر ۴۰۶۴ - اسمائے کتب کے کالم میں 'دیوان محمود' کے بدلے 'محمود نامہ' پڑھیے۔

صفحہ ۳۶ - کتاب نمبر ۲۹۸۷ - سفرنامہ سکندر۔ فہرست میں تعداد اوراق ۴۵ - صحیح ۱۰۵۔

صفحہ ۴۰ - کتاب نمبر ۲۷۶۴ - قران السعدین - فہرست میں تعداد اوراق ۸۶ - صحیح ۵۶۔

صفحہ ۴۸ - کتاب نمبر ۳۱۷۳ کلیات خاقانی - فہرست میں تعداد اوراق ۲۲۱ - صحیح ۳۲۸

صفحہ ۵۱ - کتاب نمبر ۳۴۸۱ - نام کتاب مثنوی ابن عماد - نام مصنف کے کالم میں عماد الدین فقیہ کرمانی غلط۔ مصنف کا نام ابن عماد خراسانی۔ یہ مثنوی 'دہ نامہ' کے نام سے بھی مشہور ہے۔

صفحہ ۵۶ - کتاب نمبر ۲۵۹۷ - نام کتاب 'مختار نامہ مع پنجگانہ' - دراصل یہ کتاب نامکمل ہے - آخری صفحہ پر اطلاع ہے کہ مختار نامہ مع پنجگانہ تمام - یعنی مختار نامہ سے پہلے پانچ کتابوں (مثنویوں) کا ہونا تھا۔ یہ پانچ کتابیں غالباً عطار کی مثنویاں ہی ہوں گی۔ اس لئے کہ مختار نامہ سے پہلے ایک مثنوی مکمل 'گل ہرمز' کے نام سے موجود ہے۔ دوسری مثنوی 'منطق الطیر' کا صرف ایک ورق ہے۔ بقیہ کتابوں کا کوئی پتا نہیں۔ ان سب باتوں کا کیفیت کے کالم میں اندراج ضروری تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اوراق کافی غیر مرتب طور پر مجلد ہو گئے ہیں۔

صفحہ ۷۰ - کتاب نمبر ۲۶۵۷ - نام کتاب 'نام خوشبو'۔ اسمائے مصنفین کے کالم میں 'ایضاً' یعنی عطار

(۱) صفحہ ۲۸۔ کتاب نمبر ۲۸۳۲۔ نام کتاب "تحفۃ العراقین"، فہرست نگار نے کاتب کا نام نور الحسن خاں بتایا ہے۔ ترقیمہ میں حسب ذیل عبارت ہے: "۱۲۱۲ھ مطابق ۱۲۰۲ فصلی در مقام کوات مالکانہ سید نور الحسن خاں بہادر مرحوم مغفور تحریر نمودہ شد۔" کوئی کاتب اپنے کو مرحوم و مغفور نہیں لکھ سکتا۔ کاتب کوئی دوسرا ہے جس کا نام معلوم نہیں۔

(۲) صفحہ ۳۱۔ کتاب نمبر ۲۸۰۴، نام کتاب دیوان احمدی۔ فہرست نگار نے مصنف کا نام احمدی لکھا ہے۔ یہ دیوان بھی ماقبل دیوان کی طرح حضرت مخدوم چرم پوش کا ہے۔ ان کا تخلص احمد بھی تھا اور احمدی بھی۔

(۳) صفحہ ۳۳۔ کتاب نمبر ۲۹۰۷، نام کتاب دیوان حافظ۔ کیفیت کے خانے میں ناقص الآخر کا اضافہ کیجیے۔

(۴) صفحہ ۴۱۔ کتاب نمبر ۴۷۰۴، اسمائے کتب کے کالم میں اس مجلد میں فہرست نگار نے چار کتابیں بتائی ہیں: (۱) قصاید ظہیر (۲) پندنامہ عطار (۳) ماقیما (کذا) مصنفہ سعدی شیرازی (کذا) (۴) مثنوی (نام ندارد)۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جلد میں صرف پہلی کتاب قصاید ظہیر ہے۔[۱] (احمد حسین آزاد، جرنل ۱۲۰)

(۵) صفحہ ۴۸۔ کتاب نمبر ۲۹۵۳، نام کتاب قصاید و حکایات۔ فہرست نگار نے کتاب کا نام غلط لکھا ہے۔ یہ سرے سے قصاید میں ہی نہیں۔ مثنویات میں حکایتیں منظوم ہیں۔ سنہ کتابت کے خانے میں ایضاً لکھا ہے جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ ماقبل کتاب کی طرح یہ بھی ۱۲۲۱ف میں لکھی گئی [illegible] لشاندہی ہے۔ مصنف کا نام نہیں لکھا حالانکہ مصنف نے اپنا نام عبدالستار خاں، بن شہباز خاں اور تخلص عبدی بتایا ہے۔

(۶) صفحہ ۵۹۔ کتاب نمبر ۳۴۳۵، نام کتاب "نام حق"، اس مجلد میں اور کتابیں ہیں۔ مثلاً: کریما، ماقیما، پندنامہ وغیرہ۔ مصنف کے کالم میں ایضاً بتایا ہے جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ نام حق کا مصنف عطار ہے حالانکہ مصنف شرف الدین بخاری ہو۔

---

۱- [illegible] ۱۲۹

(۷۷) صفحہ ۵۹ - کتاب نمبر ۲۷۰۴ - نام کتاب 'ہشت بہشت' - اضافہ کیا جائے کہ اس کتاب کے ساتھ مثنوی دیول رانی وخضر خاں بھی موجود ہے۔

(۷۸) صفحہ ۶۳ - کتاب نمبر ۲۷۷۷/۳ کتاب کا نام 'پندنامہ و مثنوی'، ——————— حقیقتاً یہ مثنوی نان وحلوا ہے اور اب اس کا شمارہ ۲۷۷۷/۳ ہے - اور اس کا مصنف بہاء الدین عاملی ہے۔

(۷۹) صفحہ ۶۳ - کتاب نمبر ۲۳۴۳ - نام کتاب 'تحفۃ الاحرار' ہے - سال کتابت کے کالم میں ۸۸۶ھ درج ہے - حالانکہ یہ مثنوی کی تصنیف کا سال ہے -

(۸۰) صفحہ ۶۶ - کتاب نمبر ۲۴۰۹ - نام کتاب 'دیوان حیدر' فہرست میں اس کا نمبر ۴۰۹۲ ہے - مگر یہ غلط اندراج ہے - کتاب کا صحیح نمبر ۲۴۰۹ ہے - پروگرس نمبر بھی غلط مندرج ہے (۵۶۸۴۲) صحیح نمبر ۵۶۸۴ ہے -

(۸۱) صفحہ ۶۷ - کتاب نمبر ۲۳۵۲، نام کتاب 'دیوان عرشی' فہرست نگار نے پوری کتاب پر نظر نہیں ڈالی اس میں کلام عرشی کے علاوہ دو مثنویاں عرفی کی بھی ہیں (فرہاد و شیریں و مجمع الابکار)' فرہاد و شیریں کے خاتمہ پر سنہ کتابت ۱۰۷۳ھ درج ہے اور چونکہ تینوں کتابیں ایک ہی کاتب کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اس لیے قیاس کیا جاتا ہے کہ دیوان عرشی کی بھی کتابت شاید اسی سنہ کی ہو۔

(۸۲) صفحہ ۶۹ - کتاب نمبر ۲۴۳۸ - نام کتاب 'دیوان محتشم کاشی' - دراصل یہ بیاض مراثی ہے اور اس میں ہفت بند کاشی بھی ہے، مگر 'ہفت بند' کا مصنف' کاشی' کمال الدین حسن کاشی ہے، نہ کہ محتشم کاشی۔ اس کو دیوان سمجھنا بھی غلط ہے اور فن میں غزلیات کا اندراج دکھانا بھی غلط - نسخہ دیگر کے لیے جو حوالہ دیا گیا ہے وہ بھی غلط ہو گیا -

(۸۳) صفحہ ۷۰ - کتاب نمبر ۳۳۵۴، ۳۴۴۱، ۳۷۳۶ - ان تینوں کتابوں کے فن کے کالم میں غزلیات درج ہے - ان کو مثنوی ہونا چاہیئے -

(۸۴) صفحہ ۷۱ - کتاب نمبر ۳۴۸۴ - نام کتاب قصاید ثنائی - نام کتاب دیوان ثنائی ہونا چاہیے اور فن کے کالم میں دیوان نہ کہ قصاید -

(۸۵) صفحہ ۷۳ - کتاب نمبر ۳۵۱۵، نام کتاب کلیات جامی - یہ ایک ضخیم کلیات ہے مگر غزلیات کے مقطع میں جامی کا تخلص نہیں پایا جاتا - شاعر کا تخلص جامی نہیں بلکہ تہم ہے - یہ شاعر اتنا مشہور نہیں اور نہ عام متداول تذکروں میں اس کا

سراغ ملتا ہے۔ معرف صحف ابراہیم سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد علی حجم ہشدری کا دیوان ہے۔ علی ابراہیم خان نے جو دو شعر تذکرے میں نقل کیے ہیں وہ اس دیوان میں موجود ہیں۔ فارسی دیوان کا موجودہ نسخہ کمیاب ہے۔ فہرست نگار نے نہ جانے اس دیوان کو جامی سے کیسے منسوب کر دیا۔ جامی کی ساری تخلیقات مشہور و معروف ہیں۔

(۸۶) صفحہ ۷۶۔ کتاب نمبر ۳۹۳۸، نام کتاب مرثیۂ ملا محتشم۔ اس کتاب کے اوراق فہرست میں ۶۸ بتائے گئے ہیں۔ یہ ۱۶۸ ہونا چاہیئے۔

(۸۷) صفحہ ۷۶۔ کتاب نمبر ۳۷۲۰، نام کتاب نل دمن۔ کیفیت کے کالم میں یہ عبارت اضافہ کیجیے: یہ نسخہ کسی مطبوعہ نسخہ کی نقل ہے۔

(۸۸) صفحہ ۷۹۔ کتاب نمبر ۲۵۲۷/۲، نام کتاب قصاید ثنائی۔ یہ صرف قصاید نہیں، بلکہ دیوان ثنائی ہے۔ فن کے کالم میں دیوان ہونا چاہیئے نہ کہ قصاید۔

(۸۹) صفحہ ۷۹۔ کتاب نمبر ۲۵۸۴/۲، نام کتاب دیوان مغربی۔ یہ دیوان مغربی کا نہیں بلکہ ایک غیر معروف شاعر داعی کا ہے۔ اس کتاب کا نام کلام داعی ہونا چاہیئے۔ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے۔

(۹۰) صفحہ ۸۰۔ کتاب نمبر ۳۸۳۴، ۳۸۳۴، نام کتاب 'بلدمادت'، کیفیت کے کالم میں یہ عبارت اضافہ کیجیے: "درترقیمہ نام مصنف فیضی فیاضی نوشتہ۔ این اطلاع غلط است"

(۹۱) صفحہ ۸۰۔ کتاب نمبر ۳۹۸۰/۱۰ اس نمبر پر جو کتاب کا نام مندرج ہے وہ یہ ہے: (۱) بارہ ماسا (۲) رسالہ نظم اردو۔ دونوں اندراجات غلط ہیں۔ پہلی کتاب مولانا روم کی ایک حکایت ہے اور دوسری کتاب بارہ ماسا بزبان اُردو ہے۔

(۹۲) صفحہ ۸۱۔ کتاب نمبر ۳۴۰۰، نام کتاب جنگ نامہ، اس کتاب کو نعمت خاں عالی کے نام سے منسوب کیا ہے اور اس کو مثنوی سمجھ کر منظومات میں شامل کر کے فن مثنوی میں داخل کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے۔ منظومات کی فہرست میں اس کی شمولیت غلط ہے۔

(۹۳) صفحہ ۸۳۔ کتاب نمبر ۳۴۷۳، نام کتاب دیوان بے خبر۔ فہرست میں کاتب کا نام ظاہر نہیں کیا گیا۔ کتاب کے مشّہ پر کاتب کا نام اسداللہ مرقوم ہے۔ دیوان بھی اسی خط میں ہے۔ اس لئے کاتب اسداللہ ہی ہے۔

(۹۴) صفحہ ۸۴ - کتاب نمبر ۲۹۴۶ - نام کتاب دیوان خالص۔ فہرست میں شاعر کا نام نواب سید حسن خاں کا ہے۔ صحیح نام سید حسین خاں، مخاطب بہ امتیاز خاں ہے۔ تخلص خالص۔

(۹۵) صفحہ ۸۵ - کتاب نمبر ۲۴۱۵، نام کتاب دیوان شوکت۔ فہرست میں اس کتاب کے اوراق ۱۸ اور سطور ۰ بتائے ہیں۔ مگر حقیقت میں اوراق ۸۸ (اور سطور ۱۳) ہیں نیز اس جلد میں دیوان ناصر علی سرہندی بھی ہے۔ اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ کیفیت کے خانے میں اس کی وضاحت ہونی چاہیئے تھی۔

(۹۶) صفحہ ۸۶ - کتاب نمبر ۲۴۳۲، نام کتاب دیوان صائب، کیفیت کے کالم میں ناقص الآخر بڑھائیے

(۹۷) صفحہ ۸۷ - کتاب نمبر ۲۳۸۹، نام کتاب دیوان ظہوری۔ فہرست میں کاتب کا نام طا باران ولا[illegible] لکھا ہے۔ کتاب میں کاتب کا نام نہیں ملتا۔

(۹۸) صفحہ ۹۰ - کتاب نمبر ۲۵۱۸، نام کتاب دیوان علی۔ یہ دیوان علی نہیں بلکہ دیوان جیلی ہے۔ کاتب کا نام علی حالانکہ کتاب میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ اس کا اصل نام سلومیاں صاحب ہے۔ سنہ کتابت ۲۱۱۲ھ بتایا حالانکہ اس تاریخ کے لئے سات سو سال کا انتظار کرنا ہوگا۔ صحیح سال کتاب ۱۲۱۲ھ ہے۔ کاتب نے اس عدد کو لکھا ہے۔ بیچ میں نقطہ سنہ مذکور کے نون کا ہے۔ کیفیت کے کالم میں لکھا ہے کہ "خیلے کرم خوردہ وخستہ" یہ نسخہ کرم خوردہ اور خستہ حال نہیں۔

(۹۹) صفحہ ۹۱ - کتاب نمبر ۲۴۱۹، نام کتاب دیوان واثق۔ کاتب کا نام فہرست میں نہیں لکھا گیا۔ اس کا نام غلام قادر ہے۔ کیفیت کے کالم میں اضافہ کیجئے: "دو مہریں خود کاتب کے نام کی اوّل و آخر میں ہیں"

(۱۰۰) صفحہ ۹۱ - کتاب نمبر ۲۵۱۶ - نام کتاب دیوان نظری - فہرست میں کتاب کا نمبر غلط درج ہے۔ اس کا نمبر ۲۵۶۱ ہے۔ کاتب کا نام بھی فہرست میں درج نہیں ہوا ہے۔ اس کا نام رحم علی لکھنوی ہے۔

(۱۰۱) صفحہ ۹۱ - کتاب نمبر ۲۸۱۹ - نام کتاب دیوان ولی۔ مصنف کا پورا نام فہرست میں نہیں۔ پورا نام ولی دشت بیاضی ہے۔ دیوان کا ایک نسخہ نمبر ۶۳۹ اس کتب خانہ میں موجود ہے۔ کی تصریح، کیفیت کے خانہ میں ہونی چاہیئے تھی۔

---

یہ بڑا ناقص نسخہ ہے۔ اکثر اوراق کے حروف غیر واضح ہو گئے ہیں۔ کیفیت کے

ان باتوں کی وضاحت ہونی چاہیے تھی۔

(۱) صفحہ ۹۲ - کتاب نمبر ۳۵۰۰- نام کتاب دیوان یحییٰ کاشی- فہرست میں سطور کی تعداد ۱۰ بتائی گئی ہے، حالانکہ اس میں ۱۴ سطور ہیں۔

(۲) صفحہ ۹۳ - کتاب نمبر ۳۵۱۷، نام کتاب مثنوی سحر بیان مسمیٰ بہ شورش عشق۔ سحر بیان، اس مثنوی کا نام نہیں یہ محض صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس کا نام صرف 'شورش عشق' ہے۔

(۳) صفحہ ۹۳- کتاب نمبر ۳۵۷۲- نام کتاب فتوح الحرمین (مصور)- فہرست میں مصنف کا نام محمد یوسف ابن محمد اشرف واسطی بلگرامی لکھا ہے۔ حالانکہ یہ مشہور کتاب محی لاری کی تصنیف ہے اور اس کے کئی نسخے خود اسی کتب خانے میں موجود ہیں۔ محمد یوسف مذکور اس کتاب کے مصنف نہیں بلکہ کاتب ہیں اور مالک بھی۔ ان کی مہر بھی کتاب میں ثبت ہے۔

(۴) صفحہ ۹۴ - کتاب نمبر ۳۵۴۳، نام کتاب راز و نیاز۔ دراصل یہ مثنوی میر سید محمد بلگرامی کی ہے اور اس کا صحیح نام 'ناز و نیاز' ہے۔ راز و نیاز فہرست میں غلط درج ہے۔ اس کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ اور بھی ہے اور اسی فہرست کے صفحہ ۹۹ پر اس کی نشاندہی ہے۔

(۵) صفحہ ۹۴ - کتاب نمبر ۳۴۴۲، نام کتاب 'کلیات طالب آملی'۔ فہرست کے کیفیت کے کالم میں یہ اطلاع دی گئی ہے کہ اس پر شاہ عالم بادشاہ غازی کی مہر ہے۔ حالانکہ یہ مہر اس کی نہیں بلکہ اس کے ایک کسی امیر ابوالخیر خاں کی ہے جو اپنے کو خانہ زاد شاہ عالم بادشاہ غازی کہتا ہے۔ مہر کی عبارت یوں ہے: "ابوالخیر خاں خانہ زاد شاہ عالم بادشاہ غازی ۱۱۹۰ھ"۔ یہی مہر کلیات کے دوسرے ورق پر بھی ثبت ہے۔ اس کے علاوہ دو اور مہریں بھی ہیں جو صاف پڑھی نہیں جاتیں۔

(۶) صفحہ ۹۴- کتاب نمبر ۳۲۱۷- نام کتاب قصیدہ لامیہ- فہرست نگار نے اس کو قصیدہ سمجھا۔ حالانکہ یہ قصیدہ لامیہ کی شرح ہے جو نثر میں ہے۔ اس جلد میں حزیں کی اور بھی نثری تصانیف ہیں۔ ان کو منظومات میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔

(۷) صفحہ ۹۴ - کتاب نمبر ۳۴۸۵، نام کتاب 'قصاید نظیری'۔ دراصل یہ کتاب بیاض کی نوعیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک قصیدہ بھی نظیری کا نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے صرف منفرد اشعار ہیں اور صرف اس کے نہیں بلکہ زلالی، غنی، مہاراجہ بہادر عاشق، سلان ساوجی وغیرہ کے اشعار ہیں۔ ان کے علاوہ سید صاحب عالم مارہروی کے ایک خط کی نقل ہے جو انھوں نے مارہرہ سے ۱۲۳۹ھ میں لکھا تھا۔ اس کو فہرست نگار نے

غلطی سے پوری کتاب کا سنہ کتابت سمجھا۔ ایک رقعہ انور علی یاسن کا غیر منقوطہ جو انھوں نے افتخار علی صاحب کو لکھا تھا جس کو فہرست نگار نے کتاب کا کاتب سمجھا۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت دونوں کالعدم سمجھئے۔

(۱۰۹) صفحہ ۹۵۔ کتاب نمبر ۲۴۳۵۱۔ نام کتاب "کلیاتِ غالب" فہرست میں مذکور ہے کہ یہ کتاب عطیہ صلاح الدین خدابخش ہے۔ حالانکہ کتاب پر مرقوم ہے کہ یہ عطیہ سید ضمیر الدین احمد ہے۔ شاید صلاح الدین کو ان سے پہنچی ہو اور لائبریری کو صلاح الدین کو۔

(۱۱۰) صفحہ ۹۵۔ کتاب نمبر ۲۸۵۱، نام کتاب "کلیاتِ حزیں"، فہرست نگار نے اس کتاب کے مشمولات حسب ذیل بتائے ہیں: (۱) صفیر دل (۲) قصاید (۳) رباعیات (۴) غزلیات۔ حالانکہ ابتدا میں قصاید و قطعات ہیں؛ اس کے بعد غزلیات پھر رباعیات اور آخر میں مفردات۔ صفیر دل حزیں کی ایک الگ مثنوی ہے جو اس کلیات میں شامل نہیں۔ کاتب کا نام سید محمد اصلح تو ٹھیک لکھا ہے لیکن اس کلیات میں جو رباعیات کا حصہ ہے اس کے کاتب کا نام نند کشور لکھا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ پورے کلیات کا طرز کتابت یکساں ہے۔ بادی النظر میں دونوں کاتبوں کے طرز تحریر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ممکن ہے کہ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد ہوں۔

(۱۱۱) صفحہ ۹۵۔ کتاب نمبر ۱۔۳۹۰، نام کتاب "کلیاتِ بیدل"، یہ بیدل کا "کلیات" نہیں بلکہ صرف دیوان ہے۔

(۱۱۲) صفحہ ۹۶۔ کتاب نمبر ۳۵۵۸۔ نام کتاب "کلیاتِ قاصر"۔ فہرست نگار نے شاعر کا نام کے ساتھ خاں کا اضافہ کر دیا ہے، جو غلط ہے۔ خاں شاعر کے نام کا جزو نہیں بلکہ اس کا تعلق اس کلیات کے ہبہ کرنے والے یعنی خاں صاحب .... نور الحسن، سے ہے۔

(۱۱۳) صفحہ ۹۶۔ کتاب نمبر ۳۸۸۳۔ نام کتاب "کنز التواریخ"، مصنف کے کالم میں مصنف کے نام کے بعد لفظ "عظیم آبادی" اضافہ کیجئے! (فہرست نگار نے نام "کنز التواتح" لکھا ہے، صحیح کنز التواریخ)

(۱۱۴) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۲۴۳۵، نام کتاب "مثنوی حزیں"، فہرست میں کاتب کا نام جمال الدین ابو المعالی ہے۔ حالانکہ یہ مصنف کا خود نوشتہ ہے۔ حزیں نے اپنا نام اسی طرح جمال الدین ابو المعالی لکھا ہے۔ فہرست کے اندراج سے شبہ ہو سکتا ہے کہ حزیں کے علاوہ یہ کوئی دوسری شخصیت ہے۔ کیفیت کے خانے میں اطلاع ہے کہ اس کا ایک نسخہ ۶۲۸ھ بھی موجود ہے۔ ۶۲۸ کو ۶۶۸ پڑھا جائے۔

(۱۱۵) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۲۴۴۹، نام کتاب "مثنویاتِ خاور"، فہرست نگار نے اس کو مثنویات سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک مثنوی ہے جو معجزات حضرت علی اور آئمہ اطہار پر مشتمل ہے۔ یہ مصرعہ ہے اس کی نشاندہی کم

کرنا چاہیئے تھی۔ کتابت کا اندازہ ۱۲ویں صدی کا بتایا ہے۔ شاعر کا انتقال ۱۲۲۱ھ میں ہوا ہے۔ قیاس ہے کہ اس کی کتابت ۱۳ویں صدی کی ہوگی۔ فہرست نگار نے کیفیت کے خانے میں اطلاع دی ہے کہ اس مثنوی کا دوسرا نسخہ نمبر ۵۹۶ اس کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ بیان صحیح نہیں۔ نمبر ۵۹۶ مثنوی نہیں بلکہ دیوان فاخر ہے۔

(۱۱۶) صفحہ ۹۷ کتاب نمبر ۳۲۹۹، نام کتاب مثنویات و رباعیات و قطعات۔ اس کا نام کلیات ہونا چاہیئے۔ فن کے خانے میں اس کو ایضاً (= مثنوی) ظاہر کیا گیا ہے جو غلط ہے۔

(۱۱۷) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۳۴۷۶، نام کتاب مثنوی بلگرامی۔ اس مثنوی کا موضوع جشن کتخدائی فرخ سیر و دختر اجیت سنگھ راٹھور ہے۔ اس کی نشاندہی کرنا تھی۔ کاتب کا نام فہرست نگار نے محمد کریم بتایا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب محمد کریم کی فرمائش سے مکتوب ہوئی ہے اور اس کا کاتب رام دھن نامی ایک دوسرا شخص ہے۔

(۱۱۸) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۳۴۷۹، نام کتاب لیلیٰ مجنوں، فہرست میں سنہ کتابت ۱۲۱۵ھ درج ہے۔ لیکن یہ سنہ کتاب مذکور پر کہیں درج نہیں۔

(۱۱۹) صفحہ ۹۸۔ کتاب نمبر ۳۴۸۸، نام کتاب محمود و ایاز۔ اس کتاب کے علاوہ مثنویات طغرا بھی اسی کتاب میں شامل ہیں۔ کیفیت میں اس کی نشاندہی ہونی چاہیئے تھی۔

(۱۲۰) صفحہ ۹۹۔ کتاب نمبر ۲۸۲۱، نام کتاب مثنوی ناصر، فہرست میں کتابت کے کالم میں ۱۱۱۱ھ درج کیا ہے۔ یہ غلط ہے۔ موجود اطلاع یہ ہے کہ کسی نے ۱۱۵۵ھ میں اس کتاب کو خرید کیا تھا۔

(۱۲۱) صفحہ ۹۹۔ کتاب نمبر ۳۸۰۲۔ نام کتاب "مطلع الانوار" کیفیت کے خانے میں یہ عبارت ہے: "مشتمل بر چند قصاید"۔ لفظ "چند" کو حذف کیجیے۔ اس میں صرف ایک قصیدہ ہے۔

(۱۲۲) صفحہ ۹۹۔ کتاب نمبر ۴۱۱۵، نام کتاب منتخب جلال اسیر۔ اس کتاب کے ساتھ دیوان فطرت بھی شامل ہے۔

(۱۲۳) صفحہ ۱۰۱ کتاب نمبر ۳۲۸۵، نام کتاب "مثنوی ناصر" فہرست میں صفحات اور سطور کا اندراج غلط ہے۔ اوراق ۲۹ کی جگہ ۴۶ صحیح اور سطور ۱۵ کی جگہ ۱۹ صحیح۔ تاریخ کتابت ۱۱۳۴ھ غلط ہے۔ کتابت سنہ ۸ جلوس محمد شاہ کی ہے جس کی مطابقت ۱۱۳۸ھ سے ہوتی ہے۔ فن کے کالم میں ایضاً لکھا ہے جس سے دیوان سمجھا جا سکتا ہے حالانکہ یہ مثنوی ہے۔

(۱۲۴) صفحہ ۱۰۱۔ کتاب نمبر ۳۴۳۷، نام کتاب رسالہ تخمیس بیدل۔ کیفیت کے خانے میں درج ہے: "در فارسی و اردوے قدیم" جس سے اشتباہ ہو سکتا ہے کہ بیدل کا اردو کلام ہے۔ حالانکہ یہ اطلاع

غلط ہے۔ اسی جلد میں ایک رسالہ نثر کا میر عظمت اللہ بے خبر کا ہے جس کا نام "غبار خاطر" ہے۔ اس
بعد رگھوناتھ بنارسی کے کچھ ہندی اشعار درج ہیں جن کا بیدل سے کوئی تعلق نہیں۔

صفحہ ۱۰۱۔ کتاب نمبر ۳۰۲۸، نام کتاب دیوان منشا۔ یہ دراصل دیوان نہیں، بلکہ کلیات ہے
میں نظم و نثر، قطعات تاریخ و دیگر منظومات کے ساتھ غزلیات بھی مندرج ہیں۔ فہرست میں تو
اوراق صرف ۴۶ بتائی ہے حالانکہ اوراق کی تعداد ۱۱۶ ہے۔ سنہ کتابت کے کالم میں کتابت کا
۱۲۰۳ فصلی دیا ہے، ترقیمہ میں ۱۲۰۳ صاف طور پر پڑھا نہیں جاتا۔ یہ سنہ اس لئے غلط ہے کہ مصنف
وفات ۱۲۵۵ھ میں واقع ہوئی اور ان کی عمر وفات کے وقت صرف ۴۰ سال کی تھی، اس لئے ا
پیدائش ۱۲۱۵ فصلی قرار پاتی ہے جو مطابق ۱۲۰۵ھ کے ہے) اس لیے صرف دو سال کی عمر میں دیوان
مرتب ہو جانا حیرت ناک ہے۔

محمد عتیق الرحمٰن

تصحیح و اضافہ

# مفتاح الکنوز: کتابخانۂ خدا بخش کی عربی فہرست
## تاریخ کتابت کے مسامحات

عربی زبان کے مندرجہ ذیل قلمی نسخے ایسے ہیں جن کا سنہ کتابت عربی ہینڈ لسٹ "مفتاح الکنوز" (ج ۱، ۳۴۱)
میں غلط دے دیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اصل نسخے دیکھ کر صحیح سنہ کتابت تحریر کئے گئے
ہیں اور غلط سنہ کتابت کی نشان دہی کردی گئی ہے۔

کتاب الانوار، ہینڈلسٹ نمبر ۷۹۲ : اس کا سنہ کتابت ۸۷۶ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۷۷۶ھ کا اندراج ملتا ہے۔

شرح قواعد الاحکام، ہینڈلسٹ نمبر ۹۳۱ : سنہ کتابت ۹۳۴ھ درج ہے۔ حالانکہ یہ سنہ مقابلہ ہے۔ کتابت
کی تاریخ درج نہیں۔ گو یہ آس پاس ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

فتح القدیر، ہینڈلسٹ نمبر ۱۰۱۲ : سنہ کتابت ۸۷۸ھ درج ہے۔ جبکہ یہ سنہ مقابلہ ہے۔ کتابت
ے چند سال قبل کی معلوم ہوتی ہے۔

فتح القدیر، ہینڈلسٹ نمبر ۱۰۱۴ : سنہ کتابت ۸۵۷ھ درج ہے، جبکہ اصل نسخہ میں یہ سن مقابلہ
کتابت نویں صدی ہجری کی کہی جاسکتی ہے۔ (یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کا مقابلہ اصل نسخہ سے مصنف
ندگی میں مدینہ منورہ میں ہوا، جیسا کہ درج ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے: بلغ مقابلة صحيحة
نسخة المصنف ابقاه الله حيوته فى مدينة رسول الله صلى الله عليه وسلم
م الاربعاء رابع شهر رجب المرجب سنة سبع وخمسين وثمان مائة)

ملتقی الابحر، ہینڈلسٹ نمبر ۱۰۷۴ : سنہ کتابت ۹۲۶ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۲۳ھ لکھا ہے۔

ملتقی البحار، ہینڈلسٹ نمبر ۱۰۷۷ : " ۸۳۸ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۸۲۵ھ لکھا ہے۔

مواہب الرحمٰن، ہینڈلسٹ نمبر ۱۱۸۷ : " ۹۶۹ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۶۸ھ لکھا ہے۔

الفقہ الاکبر، ہینڈلسٹ نمبر ۱۲۴۴ : " ۸۰۶ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۸۲۴ھ لکھا ہے۔

مطالع الانظار، ہینڈلسٹ نمبر ۱۳۲۰ : " ۹۷۵ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۰۵ھ لکھا ہے۔

فتوحات مکیہ، ہینڈلسٹ نمبر ۱۳۵۷ : " ۹۹۳ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۹۶ھ لکھا ہے۔

الحاشیہ علی المطول، ہینڈلسٹ نمبر ۱۴۴۱: سنہ کتابت ۹۶۳ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۹۲ لکھا ہے
الحلیہ، ہینڈلسٹ نمبر ۱۴۸۷: سنہ کتابت ۷۹۷ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۷۷۷ھ ہے
الصحاح، ہینڈلسٹ نمبر ۱۶۹۵ " ۶۳۲ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۶۳۳ھ ہے
کتاب الصفات والحلی، ہینڈلسٹ نمبر ۱۷۰۴: سنہ کتابت ۶۳۸ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۴۸۴ھ ہے
دیوان المتنبی، ہینڈلسٹ نمبر ۱۷۷۶: سنہ کتابت ۹۴۳ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۱۰۳۱ھ ہے
الکواکب الدریہ، ہینڈلسٹ نمبر ۱۸۴۳: سنہ کتابت آٹھویں صدی لکھا ہے۔ اصل نسخہ میں ۹۲۱ھ ہے
الحاشیہ علی حاشیہ میرزاہد، ہینڈلسٹ نمبر ۱۹۵۱: سنہ کتابت ۱۲۵۱ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں سنہ کتابت کہیں نہیں ملتا۔ ۱۳ویں صدی کی کتابت کہی جا سکتی ہے۔
رسالہ فی الشعاعات، ہینڈلسٹ نمبر ۲۰۴۸: سنہ کتابت ۹۷۰ھ درج ہے۔ اصل نسخہ میں ۸۹۰ ہے۔
مفتاح الجفر، ہینڈلسٹ نمبر ۲۰۸۲: سنہ کتابت ۸۲۲ھ لکھا ہے۔ اصل نسخہ میں اس کا کوئی سنہ کتابت درج نہیں۔ اس کے شروع صفحہ پر مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے: اھداہ الی السلطان الملک المؤید الشیخ محمود وذلک فی سنة ۸۲۲ من الھجرة کیٹلاگر نے غلطی سے اس کو سنہ کتابت سمجھ لیا اور پھر اس کا ہینڈلسٹ میں اندراج کر دیا جبکہ یہ سنہ کتابت نہیں، بلکہ جس سال یہ نسخہ سلطان محمود کی خدمت میں پیش کیا گیا اس کا یہ سال ہے۔ تخمیناً سال کتابت ۹ویں صدی ممکن ہے۔
تذکرۃ الکمالین، ہینڈلسٹ نمبر ۲۰۹۱: سنہ کتابت ۵۲۵ھ لکھا ہے۔ جبکہ اصل نسخہ میں ۵۵۵ھ درج ہے۔
منہج السالک، ہینڈلسٹ نمبر ۲۰۹۹: سنہ کتابت ۹۸۳ھ درج ہے، جبکہ اصل نسخہ میں ۸۸۳ھ ملتا ہے۔
حلیۃ الواصلین، ہینڈلسٹ نمبر ۲۱۰۴: سنہ کتابت ۳۷۷ھ درج ہے، جبکہ اصل نسخہ میں کہیں سنہ کتابت درج نہیں۔ سنہ کتابت ۱۲ویں صدی لکھا جا سکتا ہے۔
کتاب الاغذیہ، ہینڈلسٹ نمبر ۲۱۴۴: سنہ کتابت ۹۱۴ھ درج ہے، جو غلط ہے۔ شروع صفحہ پر مندرجہ ذیل تحریر ملتی ہے: استعارة من الزمان الفقیر المدعو لمحمد عبد الرحمن بن علی بن المؤید عفی عنھم بنھار الجمعة الثامن من ربیع الاول سنة اربع عشرة وتسعمائة ھجریة بمحروسة قسطنطنیہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ کیٹلاگر نے غلطی سے اس تحریر کے سنہ (۹۱۴) کو سنہ کتابت سمجھ لیا۔ جبکہ یہ مالک کتاب کی ملکیت کا سن ہے۔ سنہ کتابت آٹھویں صدی لکھا جا سکتا ہے۔

**نہایۃ الارب من ذکر ولاۃ حلب**، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۳۳۷ : سنہ کتابت ۱۰۲۹ھ درج
جبکہ اصل نسخہ میں کہیں سنہ کتابت درج نہیں۔ ۱۱ ویں صدی کی کتابت قرار دی جا سکتی ہے۔

**تاریخ سلاطین آل عثمان**، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۳۴۱ : سنہ کتابت ۹۲۷ھ درج ہے، جبکہ اصل
ں کہیں سنہ کتابت درج نہیں۔ اس کی ۱۱ ویں صدی کی کتابت ہو سکتی ہے۔

**نہایۃ الکمال**، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۴۱۶ : سنہ کتابت ۷۱۸ھ درج ہے جبکہ اصل نسخہ میں کہیں سنہ
ت نہیں ملتا۔ یہ آٹھویں صدی کا نسخہ ہو سکتا ہے۔

**رسالہ فی معرفۃ اخراج القبلۃ**، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۵۲۰/۱۱ : اس کی کتابت ۹ ویں صدی کی لکھی ہے۔
اصل نسخہ میں سنہ کتابت درج ہے اور وہ ۸۷۶ھ ہے۔

**کتاب البرہان فی علم المیزان**، ہینڈ لسٹ نمبر ۲۸۲۳ : سنہ کتابت ۹۴۰ھ درج ہے جبکہ
نسخہ میں ۹۴۸ھ ملتا ہے۔

**الصحیفۃ الکاملۃ**، ہینڈ لسٹ نمبر ۳۳۶۶ : سنہ کتابت ۹۱۸ھ لکھا گیا ہے جبکہ اصل نسخہ میں ۱۱۰۱ھ ہے۔

●●

# خدا بخش لائبریری کی مطبوعات

- خدا بخش لائبریری جرنل (سہ ماہی تحقیقی مجلہ) ۱۹۷۷ء سے جاری: اب تک ۴۰ شمارے چھپ چکے ہیں۔ فی شمارہ ۱۵ روپے
- ڈسکرپٹو کیٹلاگ (خدا بخش کے عربی، فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست انگریزی میں
شعرِ فارسی، تاریخِ ہند، فقہِ اسلامی، قرآنیات، حدیث، تذکرہ = ۱۲ جلدیں۔ فی جلد ۳۵ روپے
- خدا بخش مخطوطات کی مجمل فہرستیں (فارسی ۳ حصے؛ عربی ۳ حصے؛ اردو ۱ حصہ) مجموعی قیمت: ۸۵ روپے
- شمس البیان فی مصطلحات الہندستان (شاہ عالم کے عہد میں مرزا جان طپش دہلوی کی لکھی ہوئی محاورات اردو کی لغت
- تصویرِ محبت (شمس الدین فقیر کی فارسی مثنوی جو میر کی "شعلۂ عشق" کا ماخذ بنی) ۱۰ ر
- بارھویں صدی کے شعرای فارسی کے معاصر تذکرے: ▪ خان آرزو کا مجمع النفائس؛
▪ نقش علی کا باغ معانی ▪ علی ابراہیم خلیل کا صحفِ ابراہیم۔ ہر ایک ۱۰ روپے
- خدا بخش خطبات: فارسی اور ہندوستان (نذیر احمد) • میری تنقید — ایک بازدید
(کلیم الدین احمد) ہر ایک ۱۰ روپے • افکارِ رومی (عبدالسلام خاں مکتبۂ جامعہ) ۴ روپے
- خدا بخش خطبات (انگریزی میں)، عہدِ نبوی کی تقویم کی تشکیل نو (ہاشم امیر علی) • صوفی لٹریچر عہدِ
سلطنت میں (بروس لارنس) • صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ
(سید حسن عسکری) ہر ایک ۱۰ روپے • فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ، جدید تحقیقات
کی روشنی میں (امیر حسن عابدی) • اسلام کی چودہ صدیاں پوری ہونے پر چند خیالات ہندو مسلم
اور اسلام و عصرِ جدید کے بارے میں (بدر الدین طیب جی) ہر ایک دس روپے
- خدا بخش، صلاح الدین خدا بخش، سچد انند سنہا اور جادو ناتھ سرکار کے قلم سے۔ دس روپے
- خدا بخش لائبریری: ایک تعارف (اسکاٹ اوکونر کے قلم سے) ۱۰ روپے
- تاریخہای پیدایش و وفات: (شمس العلما محمد سعید حسرت عظیم آبادی م ۱۳۴۴ھ کے قلم سے)
- یو پی کانگریس کے پہلے اجلاس کا خطبۂ صدارت (موتی لال نہرو) دس روپے
- فرہنگِ آصفیہ: ایک جائزہ (قاضی عبد الودود) دس روپے
- رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت: پہلی جلد ادیب (الٰہ آباد)؛ دوسری جلد العصر
تیسری جلد صبحِ امید؛ چوتھی جلد معیار ہر ایک ۴۵ روپے
- تدوینِ متن کے مسائل (خدا بخش سمینار) ۱۵ روپے

## PUBLICATIONS OF KHUDA BAKHSH LIBRARY, PATNA

| No. | Title | Author | Price |
|---|---|---|---|
| 1. | Khuda Bakhsh Library : An Introduction | by Scott O'Connor | Rs. 10/- |
| 2. | Khuda Bakhsh (Biography) | by S. Khuda Bakhsh & Jadunath Sarkar | Rs. 10/- |
| 3. | Contemporaries in Chronograms (Persian) | by Hasrat Azimabadi | Rs. 10/- |
| 4. | My Criticism — A Retrospect (Urdu) | by Prof. Kalimuddin | Rs. 10/- |
| 5. | Sufi Literature in the Sultanate Period | by Dr. Bruce Lawrence | Rs. 10/- |
| 6. | Maktub & Malfuz Literature — As a Source of Socio-Political History | by Prof. S. H. Askari | Rs. 10/- |
| 7. | Reconstruction of Islamic Chronology | by Dr. Hashim Amir Ali | Rs 10/- |
| 8. | Persian Language and Literature in India | by Dr. Nazir Ahmad | Rs. 10/- |
| 9. | Shamsul Bayan : An early Urdu Dictionary | by Mirza Jan Tapish | Rs. 10/- |
| 10. | Bagh-i-Ma'ani : A Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets | by Naqsh Ali | Rs. 10/- |
| 11. | Majma'un - Nafais : Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets | by Khan Arzu | Rs. 10/- |
| 12. | Suhuf - i - Ibrahim : Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets | by Ali Ibrahim Khalil | Rs. 10/- |
| 13. | Masnavi Tasweer-i-Mahabbat | by Shamsuddin Faqir | Rs. 10/- |
| 14. | Presidential Address of the 1st Session of the U. P. Congress | by Pt. Motilal Nehru | Rs. 10/- |
| 15. | Rich & Valuable Contribution of India to Persian Literature | by Dr. S. A. H. Abidi | Rs. 10/- |
| 16. | Urdu Literature as selected from Old Periodicals Vol. I (Adeeb, Allahabad) | — | Rs. 45/- |
| 17. | Urdu Literature Vol. II (Al - Asr, Lucknow) | — | Rs. 45/- |
| 18. | Urdu Literature Vol. III (Subh - i -Ummid. Lucknow) | — | Rs. 45/- |
| 19. | "Miyar" of Qazi Abdul Wadood, in 1936, (Urdu) | — | Rs. 45/- |
| 20. | Catalogues of Arabic & Persian Manuscripts of Khuda Bakhsh O. P. Library. Vols. 1-3, 7. 8, 19, 29-34 | | Rs. 35/- (Each) |
| 21. | Hand List of Persian Arabic Manuscripts 3+3 Vols | | Rs. 60/- |
| 22. | ,, ,, Urdu Manuscripts | — | Rs. 10/- |

overlooked. I hope I am wrong in thinking that they are being relegated well into the background. The general assumption seems to be that if those who call themselves Muslims had more jobs in the Services, more seats in Parliament, more say in the public and private enterprises, business houses, etc., all would be well with Islam in this country; it would become a vital factor once more in shaping its destiny.

It is quite evident that, if this were to happen, the individual lot of many such deprived and neglected persons would improve out of all recognition. But would this ipso facto be a contribution of Islam to the civilising, humanising and spiritual enlightment of India ? One may be forgiven for doubting it. Would all these new "Muslim" office-bearers and business-men bring into the affairs of this country, its administration, rule of law, probity and general standard of efficiency any element that could be considered as a direct consequence of their being Muslims ? — of trying their best to follow in the footsteps of the Prophet ?

Surely, this would only happen, if the persons concerned were, in their public and private life, as determined in demonstrating in practice the spiritual and moral aspects of their religion as they were concerned in acquiring the material benefits that they sought from it.

These are the kinds of "Prospects and Problems" of Islam in the next century that come to my mind. To bolster up our courage for facing them, I shall end with quoting a saying of the Prophet. It has brought me personally much solace :

"Verily, we are in an age in which if we abandon one-tenth of what is ordered we shall be ruined. After this a time will come when he who will observe one-tenth of what is now ordered will be redeemed "

Is the beginning of the 15th century of Hijri the time that the Prophet was thinking of ?

---

of this fertilisation, had as much of the new Islamic spirit and contents in them as the formal Islamic teachings and principles had those of the messages and teachings of the earlier prophets and divines. How could it have been otherwise ? Had not the Prophet himself declared that he was bringing no new message; only the old one in its true form !

Due to a loss of self-confidence, particularly in the last few centuries, and especially in India with the loss of temporal dominion, Muslims have become almost pathologically anxious to demonstrate their "separateness" from the rest of mankind. They progressively tend to emphasize their differences from them instead of trying to do, what they so brilliantly did in their heyday, to bring out the "commonality" in human beings, their common ends, and to bridge the different paths by which they seek to reach them. This reversal of attitude and, even more, the mentality that inspires it, seems to me to go contrary to the spirit of Islam, its traditions, and above all the glorious example set by the Propeet by his life and pragmatic day-to-day conduct. In that the importance of judging each action by the nature of the intention (*niyat*) behind it, has been so often stressed and given so much significance, that to continue to judge acts only on the basis of their conformity to tradition, for even the letter of laws formulated centuries after the Prophet, seems to me un-Islamic in spirit. To me, therefore, the lack of initiative shown, the fear-complex manifested, and the abject withdrawal into their shells with all windows and doors barred, by Indian Muslims, whenever any question of taking joint action with their fellow non-Muslim compatriots on matters concerning social reforms is raised, as for instance for framing a Common Civil Code, it is a source of deep disappointment.

It seems to me that in India most of the eagerness, self-introspection, organisational effort and community-concern that is now being manifested by Muslims in the future of Islam as a catalytic element in Indian civilisation, seems to be almost wholly focussed on efforts to better their own economic, political and temporal-power position. In brief, it is towards the material aspects of Islam as a way of life and conduct that their eyes and energy are turned. The spiritual qualities required to make a man a good Muslim are

yard-stick for assessing the position of Islam or its problems and prospects in this country or anywhere else. The latter encompass a much, much wider field — that of humanity as a whole. How has Islam affected it in the last 1400 years ? How is it likely to affect it in the coming centuries ?

I have an uncomfortable feeling that in our absorbtion with ourselves as Muslims, in our desire to make ourselves out as the "chosen" people in contravention to the Prophet's warning and injunctions against the indulgence of any such conceit or complex, we have tended to ignore the enormous contribution that Islam has made to the way of life, thinking and praying, of mankind as a whole, merely because it has not been made directly by Muslims as such. It has been made through the agency of non-Muslims who have appreciated Islam — its values, its principles, way of thinking, and attitude towards God and other fellow human beings. Islam's influence on all these aspects of human activity, feelings and understanding of man and God, has been profound. Soon after it burst on the world in a remote desert, it fanned out from there and flamed over a good part of the then known world. Its physical confrontation and conflicts with rival forces and ideologies metamorphosed the political, ethical and intellectual climate of the times and of those regimes, in particular. The so-called "Dark Ages" prevailing there ultimately blossomed forth into the Renaissance. A new age of enquiry, discovery, speculation and experiment began. Literature, law, science and even religion were revitalised, rehabilitated, transformed and, sometimes, transfigured by a new infusion of energy, inspiration, and enthusiasm as a result of this encounter with Islam. Muslims and non-Muslims collaborated in this — an early example of joint ventures — Islamic forthrightness, clear-cut guidelines, gave a new sense of direction, of self-confidence, and helped to clear much of the doubt, mystification, confusion, and double-talk that had accumulated round the divine messages that had earlier been sent down from high through successive prophets and seers. It thus liberated the consciences and set free from shackles the minds and hearts of an infinitely larger number of persons than only those who formally chose to enrol themselves as Muslims The new laws, the new social order, the new sciences that germinated as a result

particular bent of mind and interests, or the school of theology to which they subscribed. Is it really possible — is it within the competence of man, to judge what the relative Islamic contents was in the lives of the people who lived under these regimes, let alone to split its impact into separate spiritual and material components?

To come nearer home, is it really possible to judge whether the contribution of Islam to India was greater or lesser during the time of the Sultans of Delhi, compared to what it was in the different reigns of the Great Mughals, the Qutub Shahis, or Hyder Ali and Tipu Sultan? In my personal opinion, Islam made its greatest impact in the material sense, as well as in the spritual sense of influencing the way of life and thought of its people as a whole, during the reign of Akbar. The Editor of a paper whose whole ostensible object is to champion Islam and propagate its principles and values has, however, recently dubbed Akbar as "that great misguided buffoon" I was struck not so much by his perspicacity, as by the particular expression used; it so pithily demonstrated the perfect harmony prevailing between his knowledge of Akbar's character and of English idiom. Unfortunately, it does not lead us any further in answering the questions that I have put before you. Those, I am afraid will have to be left for answer at our final reckoning with the Creator.

This, however, leads me on to an aspect of Islam that I think has been neglected. It deserves in my opinion to be specially emphasised in a country like ours, where the bulk of its citizens are non-Muslims. Earlier, I had referred to the significance of the Prophet's stress on linking Islam with the message preached by the prophets and divines who had preceded him. I should like now to associate this in, your minds, alongwith his insistence on the universality of Islam. It was to be a blessing for all mankind, not just for the comparative few (that was particularly so in his own life-time) who formally call themselves Muslims. Considered in this light, the ups and downs of Muslim — Kings and Princes, Ministers and MPs., Clerks & I A.S. Officers — though certainly of great interest and importance to other aspiring Muslims, in particular, is not and cannot be either a very reliable or even significant

spiritual sense. In fact, one might even say that a good life in the Islamic sense, means a life that is harmonious in both its material and spiritual aspects. The two are inextricably linked together they are a part of the same conception and not separate entities Both are God given and depend on his bounty, that has to be earned by conforming to his injunctions.

Nonetheless, Islam cannot be judged only on the basis of the material success or failure of the persons who claim to be Muslims It has to be judged by the spiritual and ethical values that it has succeeded or failed to bring into their lives, and in those of the people among whom they live or are associated with, as well as by its success or failure in the material aspects of their existence.

If one looks back on the history of Islam during the last fourteen hundred years, one will find that there have been periods when the material prosperity of those who called themselves Muslims at that time was enormous, but the spiritual and ethical values of Islam were at a low ebb and vice versa.

Obviously, we cannot put the spiritual and the material contents, success, value, received from Islam ( or whatever other encompassing term we may choose to apply to it) during the various phases, developments and turns, through which Islam has passed in its fourteen centuries of existence, into separate weighing pans. Any attempt to assess what their individual contribution has been to life-on-earth would be even more futile. What would be the criterion on which we would judge their respective weights ? How shall we determine what the right proportion should be between them — the spiritual and the material ? My mind boggles at the complicity of the exercise. Of only one thing I am certain, that to whatever conclusion I would arrive at, it would promptly be proved wrong.

To take some of the best known periods of Islamic history, for purposes of illustration; the Ummayyad, the Abbasid, the Fatimid, the Safavid, the Osmanli, the Spanish *tour de force*, how differently have they been viewed and judged by various historians, scholars, soldiers, statesmen and Ulema, depending on their

distortion and dishonesty with which Islam has been riddled and exploited in the centuries since its birth is immense.

The normal reaction of most Muslims to it is either to dismiss it as anti-Islamic propaganda, or to consider the shortcomings and failures as the inevitable impact of time and circumstances on the effectiveness of the implementation of any principle or rule of conduct over the years. There is of course much to be said for both these points of view. Both can be justified by taking up specific examples of individuals, incidents, periods and places. To me, trying to be as dispassionate as possible, but knowing well that in matters such as these, that concern one's inmost beliefs, it is impossible to be wholly dispassionate. One can only make an attempt to do so.

On that basis, I cannot help feeling that, paradoxically, the answer lies in the earlier overwhelming success of Islam in the temporal world, the astonishingly facile, and unprecedented victories that the Muslims won against the then decadent empires of the East and the West. The latter had originally been founded by people whose principles and conduct had once been as noble and pure as their own They had corrupted them, through the centuries for the sake of acquiring greater and greater temporal and material power. When the Muslims installed themselves in their place and began aping their ways, it was almost inevitable that they too should suffer the same fate. Once the Muslims got involved in problems that concerned not so much man's equation with his Creator, and the regulation of his relations with his fellow human beings on the basis of humanity, brotherhood and equality, but with the acquisition of power and dominion and domination over other human beings and lands, their fate was sealed. Islam as such had little to do with it, as Muslims had begun to consider Islam more as a talisman for acquiring material success in this world, than as a principle for leading a good life in conformity with the spirit of the Qur'an and the Prophet's example.

Now, it is perfectly true that in Islam, unlike, perhaps, in Christianity and in Hinduism, the pursuit of a successful life in a material sense is not incompatible with leading a good life in the

of the earlier established great religions that still continue to prevail on earth. There is *prima facie*, therefore, no valid reason on this count to doubt or fear that Islam will not be able to provide an answer to contemporary problems.

I must make it clear that I am not dealing here with the doubts, and hopes (?) of those who believe ( and I should like to repeat, **believe**) that spiritual beliefs are false illusions, and that the sooner the belief of those, who do not share their disbelief in them, are dissipated and destroyed, the better will the human race thrive. I can only marvel at the utter belief of such unbelievers in their own disbelief !

To return to my theme : Indeed, in my understanding of Islam, this was one of the main thrusts of the Prophet's preaching. He emphasized, when he enjoined the people whom he addressed to accept the message that he had brought to them, that it was the latest and the last that they would receive on the subject directly from the Creator. Alongwith that, he stated in most unambiguous terms that the message he had brought was not a new one. Since the beginning of life on-earth, a series of Prophets and divine messengers had been sent to communicate it to them. All of them had to be honoured for the work that they had done in spreading it. His main task, he repeatedly reiterated, was to correct the abuses and the distortions to which the divine message had been subjected by human beings during the course of the millenniums that had elapsed since its original dissemination by the series of prophets and seers sent down to preach it.

Therefore, it seems to be incumbent, particularly on an occasion like this, that we in our turn should search our hearts and minds to ascertain how far the teachings of the Prophet, and the message that he had communicated to us 1400 years ago, still prevail and operate in their original spirit among us. To what extent and where, as Pandit Sunderlal and many others, Muslims and non-Muslims, students and critics, admirers and opponents of Islam, have written and spoken about it, have we gone astray, stumbled, or been misled ? The literature on the alleged corruption,

legends like those of the other great prophets who preceded him It is the same with the message that he communicated. Its authenticity is unchallenged and unchallengeable. Together they represen Islam in corporal and spiritual form on earth. In contrast to the picture of Islam that they present, look at what the Muslims have done to Islam in the last 1300 years !"

He then went on to say "The Hindu religion is some 5000 or 6000 years old. Its facts, myths and legends, its prophets and its Godhead have all got mixed up. It requires much perseverance, perspicacity and discrimination to understand its basic spiritual insights and revelations. Hinduism over the millenniums has become a victim of its own subtleties. The caste system has even imposed limits on the understanding of its real message by all its followers.

The Prophet removed all such barriers and impediments for his followers. He put everyone of them in direct communication with his God. He scrupulously refrained from making even the slightest suggestion that he was in any way an intermediary between God and man. He insisted that he was only a messenger conveying God's message to man. The Prophet as an intermediary is only being brought in, against his own express injunctions to the contrary, by those who either love him too much, or by those who wish to exploit his unique mission in Islam, to impose their own authority over its followers. The first border on idolatry, and have, therefore, to be guarded against. The latter have to be exposed and, if need be, resisted !"

He concluded by saying : "If Muslims go on, as they have been, corrupting the true message of Islam, I shudder to think what they will reduce it to, in even half the span of time that Hinduism has experienced since its inception !"

This may sound a rather dismal note at the opening of the next century of Islam in the Modern world, or as I would prefer to call it, the Contemporary world. That is not my objective. Primarily, what I want to draw attention to is the comparative "newness", the modernity of Islam viewed in juxtaposition to many

by those who had come in time. How they glare round the room at the occupied seats with dislike; their eyes focussed only on the front and most conspicuous seats. With what disdain do they stare on the occupants of those seats to make them feel uncomfortable to wonder whether they had not inadvertently taken the place reserved for these late-comers The ushers at such functions, alway anxious to add to its numbers and avoid unpleasantness, if it can be done at someone else's expense, promptly take advantage of the uncertainty already implanted in the minds of the lawful occupants They induce them to vacate their places, and the VIPs ensconce themselves there with great self-satisfaction.

In this what man has done on earth ? Is this somewhat the light in which Islam too is looked upon by the older religions ?

Now, Islam among the great religions of the World is a late comer — being only 1400 years old. How should it project itself ? How is it projecting itself ? How will it project itself in the nex Hijri century ?

As I repeat these questions to myself, my memory goes bacl to an occasion when I was in Aligarh, and the late Pandit Sunderla — that splendid man ! — had come there on a visit. We were talk ing during an 'Id-e-milad' function in the City. He had jus delivered a most moving panegyric on the life and teachings of the Prophet. Our conversation concerned the seemingly eternal topic of the Hindu-Muslim syndrome — its quirks, twists, tragedy and comedy. Pandit Sunderlal then said something that I am always reminded of when I think of this question. He spoke with a tinge o asperity and sarcasm. This was a novel tone for him to employ when discussing Hindu-Muslim issues. I have not got his words but this is what they conveyed to me:

"It is only some 1300 years ago that the Muslims had a teacher, a messenger of God like Mohammad, an incomparable historical figure", he began.

"The Prophet's life, words and deeds have been vividly re corded by his contemporaries. They are not based on myths and

Further, according to this investigation and computation, the emergence of man as we know him ( or think we know of him ) on the scene was millions and millions of years after the first stirrings of life manifested themselves on earth. In a telling passage, the substance of which even penetrated into my anti-numerology-oriented consciousness, the narrator summed up this aspect of life on earth, by a simple analogy. He said that if we were in our imagination capable of telescoping the whole inception of the life-on-earth process and evolution, into the time-span of a calendar year, retaining its customary divisions into months, weeks and days, of course with the appropriate multiplication of its years, months, weeks and days, as the case may be, by billions or millions, we would reach the conclusion that man appeared on the scene only on the 31st of December of that year ! A very young person indeed in comparison to the billions and millions of years older species of living creatures with which the planet abounded then, and many of which it still sustains !

As I grow older, my regard for age has, perhaps disproportionately, increased; and I must confess that this fact about man, being so low down, when viewed in this context, in the scale ( the protocol rating as it were, dating from the time of his presentation of credentials on earth ) of sentient creatures on this planet, occasionally disturbs me. I begin to question our facile assumption that man is its central feature, and all else has to be viewed not only through his eyes, but judged in accordance with man-made laws, principles and perceptions. Is this not a gigantic self-delusion of living, if not in a fool's paradise, in vacuity ?

Almost automatically then, human-ego rushes to the rescue, it smartly slams the door shut on such subversive and disturbing speculation. If man came so late on the living stage, it insinuates, is he not on that account itself entitled to the highest place on it ? But then again, when the stimulant of the ego upsurge subsides a little, the rather absurd analogy between this late-entry on earth of man and that of VIPs in private drawing rooms and public halls comes to mind. How the latter stalk into gatherings well after the appointed time, when every seat has already been occupied

particularly after a revolution. We can, therefore, still hope that something really Islamic, chivalrous, hospitable, brave and generous will emerge to justify its being called an Islamic revolution, and the State, an Islamic State.

I refer to this, not with the intention of denigrating: making a value-judgement on the Islamic nature and contents of the Iranian revolution. That would be a presumptuous exercise ; we know too little and it is yet too early, considering its cataclysmic nature, and the throes that still beset it. I wish only to underline the difficulty with which one is faced, even when confronted with a living example, right before one's eyes, of distinguishing, let alone separating, the spiritual Islamic element from the human element of, if you like, frailties, animating the actions and attitudes of persons, sincerely professing Islam who claim to be carrying out its behests according to their own lights.

A month or two ago, I saw an absorbing series of films depicting "Life on Earth". They were done for the B. B. C. Television by David Attenborough Some of you may not have seen them. As they impressed me greatly I shall dwell on them somewhat. They illustrated in a systematic sequence the principal elements of the extant evidence that natural scientists and historians have so far been able to find of the origin of life on this planet. Through examples of insects, animals, birds, fishes and plants, and intermediate and undermined creatures, found surviving or extinct on land, in the sea and air, or rocks and fossils, they vividly, and I thought convincingly, demonstrated the process by which the Creator animated the world. According to these scientists, this process began some 5000 billion years ago. That is at least what I now remember. I may be making a mistake, as, frankly, I am bad at remembering figures, being congenitally indifferent to those that lie far beyond my ken. Here, it seems to me, however, that it matters little whether it was a hundred or two hundred billion years ago, or thousands of them. What is worthy of note is that in this context, the passage of the span of 1400 years that we are celebrating, seems almost like a flash in the pan, or the momentary bedazzlement by a streak of summer-lighting.

To-night, I should like to concentrate attention, primarily, not so much on "Islam in the Modern World", as on Muslims in the Modern world; not so much on the principles and ideals of Islam, as on how its principles and ideals are being currently interpreted, applied, and realised both by Muslims and non-Muslims, in other words, by humanity as a whole. Even more relevant to our purpose, to my way of thinking, would be to get the second-half of my subject, viz. "Problems and Prospects", framed in the right perspective. According to me, this would concern the problems and propects of persons professing Islam, and not of "Islam" as such. To me, it seems almost blasphemous to identify the "problems and prospects" of Islam with the "problems and prospects" of persons professing Islam or claiming to be Muslims. How can one be certain that the principles and ideals of the former were being faithfully reflected in the actions of the latter ? There will be, and there always have been, wide differences of opinion over this.

This thought was uppermost in my mind when I had the privilege of calling on Ayatollah Khomeini. It was just a few weeks after his triumphal return from exile to Qum in 1979 and the formation of the Islamic Government of Iran under his aegis. So much was I stirred by the occasion and his personality that I actually voiced my hopes and fears to him. By calling a State "Islamic", I said, it did not become Islamic. How often in the past, had not the assumption of such a nomenclature done incalculable injury to the reputation of Islam and the Prophet's teachings and example ? What grievous wounds had it not inflicted on the amour-propre of millions of Muslims all over the world when by its subsequent conduct, outlook and performance it had failed to live up to the Islamic principales, ideals and prospectives that they cherished ? The Ayatollah had replied to me shortly. "You wait and see what we shall do".

I confess that in the last two and a half years, I have not seen much evidence of the prevalence of the Islamic spirit there — of rituals yes, but little of the spirit as I conceive it. Two years and a half is of course a very short spell of time in the life af a nation,

*Lecture—II*

# Islam and the Modern World

## *Problems and Prospects*

Last night I spoke about one particular aspect of the impact of Islam during the course of its long history — its effect on Hindu-Muslim ralations in India. Indeed, in our different ways we have all been affected by the revelation of Islam to the Prophet and his communication of the message to all who would hearken to it, 1400 years ago. And we are celebrating it. I am sure, though, that in many of us, there must lurk a guilty feeling that we have done so little, if anything at all, to make that message meaningful. What have we done to give it a worth-while content in promoting human understanding, well-being, good-will, or even for its own honourable survival ? All that most of us can claim is that, as we ourselves still exist, and as many of us profess to be Muslims, Islam has survived this span of 1400 years, through the sheer fact of our presence. If, however, we were prepared to be perfectly honest about it with ourselves, we would be led to admit that what we are really celebrating is not so much the survival or the impact of Islam as such during this span of centuries, as that of Muslims, or rather of those who presume to call themselves such.

Well, there is nothing wrong in celebrating any event, no matter, whether we have had anything to do with it or not, provided it offers one either entertainment or instruction; preferably both.

In this lecture, I shall try to be as straightforward and direct with you as it is possible to be in such circumstances and in such surroundings.

the arts — should decide to take up the issue from where it was lef
hanging in the air, much could be achieved. It should be possible t
utilise the possibility of such a rapprochement between th
principal organisations concerned with the ethos of the two grea
communities, and those of others, to work out in detail wha
should be attempted, how, and in what stages in each field.

No short term solution for the communal problem can o
course be expected from it. That, at the moment, can unfortunatel
only be effected by an efficient deployment of the law anc
order machinery. But for finding a permanent resolution of the
Hindu-Muslim syndrome — the basic cause of Hindu-Muslim
conflict—I do not think that we could do better than follow the
Akbar pattern.

———

Complete isolated exclusive efforts are still being made for
couragement of Sanskrit studies. To a lesser degree the
is being done for Persian and Arabic. Hardly any effort is
made (as was done by Akbar) to encourage the compara-
udy of these great languages and literatures through the joint
of Hindu and Muslim scholars. For promoting national
ation it is essential to induce Hindus and Muslims to explore
joint heritage together. A true secular society in India
ly be built up if there is mutual appreciation by the different
of people inhabiting India of each other's contribution to
ilization. Ultimately, this would enable a consensus to be
ed on the contents of a really secular composite culture of
every Indian could be proud of, and acknowledge as
n.

For this purpose, it is necessary to mobilise the energies
dealism of the various cultural and social organisations in
as for example this one, that at the moment seem to
ughing their own exclusive lonely furrows in this field.

A signaficant sign of the possibilities of this happening occur-
t the time of the 1977 general elections. By a strange
of history, the RSS and the Jama'at-e-Islami leaders found
elves confined in the same jail Their surprise was even
r when they discovered that they had much in common
nly in regard to the political situation, but about many
s of their material and spiritual lives.

As a result, friendly feeling developed between them, and on
e, much talk of their coming to some basic understanding on
ys in which they could cooperate for promoting Hindu-
m relations and advancing the spiritual and moral health of
untry.

Unfortunately like most good things aired during the Janata
e, all this soon evaporated.

Nevertheless, if a more purposeful government, with a
conception of the secular policy that it was resolved to
nent — a positive policy patterned on the Akbar model in
lds, not only of administration but education, culture, and

A single illustration of how things worked or were manipulated will suffice. The two great educational institutions set up by the two communities for keeping alive their own classical traditions, cultural heritage, and religious ethos were the Banaras Hindu University and the Aligarh Muslim University. Yet, they were allowed to work almost in isolation of, if not in antagonism to, each other. No conscious attempt was made in either of them to promote the Akbar type of secularism. This gave a free field to the propagation of the "two nation theory." It is not without significance that its most ardent champion, Mr. Mohammad Ali Jinnah, was in many ways an epitome of Lord Macaulay's "Brown Englishman" A Muslim with scant knowledge of Islamic history or its classical literature, and of course, almost wholly ignorant of Sanskrit literature, Hindu civilization and culture, his credentials for judging the incompatibility of the two cultures coexisting and cohering on the same soil were impeccable. He was almost equally uninformed by both.

Broadly speaking then, the position at the time of Independence was that there was only a dwindling number of Hindus and Muslims in what might be called the Indian intelligensia, who were really reperesentative of Indian civilization as a whole. Only a few were aware of the respective contributions made to it by its Islamic and Hindu donors. The general awareness of the contribution made to it — and no doubt it is considerable — by western civilization was far greater. If a Hindu was asked about Indian civilization, he would talk of it almost exclusively in Vedic terms together with a few references to borrowings from the West. If a Muslim, he would know little about its Vedic foundation; he would speak only of its Islamic elements and some newly acquired western features.

After Partition, the position worsened further; and though since then there has been a slow climb-back to what may be called the Akbar pattern of secularism in administration and politics, there is still almost no sign of a positive approach being made in the eduational and cultural fields, where it is most needed.

ıower had slipped from the hands of Muslim and/or Hindu rulers ıurtured in the Akbar tradition of secular government and :ivilization into those of the British. To most, the British success in 'anquishing Indians by using western techniques for waging war ırovided irrefutable proof of the superiority of western civilization ıver the oriental.

In fairness, it must be noted that the thrust of the demand for xtending facilities for imparting knowledge of western civilization ınd teaching English in India came not from the English-nan ruling India as a part of any plot to derail Indian nationa-ism and civilization, but from Indian leaders of the calibre of Raja Ram Mohan Roy, Tagore, etc.

At its inception, its effect on upsetting the social relations etween the two major communities of India, and on their still ather precariously balanced cultural and aesthetic equation with 'ach other, was not realised : It could hardly have been, as far oo many imponderables were involved. Nonetheless, just as the ressure for a wider and wider extension of facilities for imparting vestern and English education grew, the demand for sectarian edu-'ation among both Hindus and Muslims also gathered momentum.

If the British Indian administration at the time had been ınxious (as presumably a national secular government would have een ) to develop unity among the Indian people and promote :ohesion between its different cultural elements, it would have taken teps to remedy this. On the contrary, however, the whole rather ragile myth-sustained fabric of British administration in India ested on its ability to ensure that it should not have (after the 857 experience) again to face a common Hindu-Muslim front on ıny major issue. Naturally therefore they did nothing about it, even f they actually did not provoke it.

Thus, the prospects, during British days for establishing a sychological and emotional understanding between Hindus and Auslims through the promotion of mutual knowledge and appreci-tion among them of each other's basic culture and traditions rogressively receded. By the time the British decided to quit India, ey had altogether disappeared.

The Akbar pattern of Indian civilization was now definitel down-graded.

The current ruling class, whether British or Indian, strov increasingly to mould themselves on the western patten. They se the standard for the emulation for all those who aspired to achiev worldly success.

The former urge to study classical oriental literature - Persian, Turkish, Arabic — favoured by the earlier rulers of th country, that had become hereditary in a wide range of castes an classes traditionally engaged in state service, progressively atro phied. No longer was a knowledge of them considered a passpor for entry into the ranks of the gentry or even the intelligentsia Even more disastrous was its effect on the parallel movement on a very much more limited scale, but nonetheless of almost equa significance, of a small but influential segment of the Muslim intelligentsia to acquire a real knowledge and appreciation o Indian classical languages, litrature, traditional customs, anc habits. This ceased almost entirely.

Practically, all such efforts now began to be concentrated on a study of western civilization, English literature and language and Christianity. Even those Indians who personally reacted against becoming wholly westernised — the "Brown Englishman" of Macaulay's conception — almost automatically slipped into the habit of bringing up their own children entirely on western lines, leavened with some grounding in their own particular community's traditicnal lore and literature.

Thus, a Hindu gentleman would give his son a western education plus some grounding in Sanskrit/Hindi, but unlike his own father or grand-father would no longer consider it necessary to teach him any Presian/Arabic/Urdu.

Similarly, or even more markedly the former interest that at least a small segment of the Muslim intelligentsia had taken in traditional Hindu literature, religion and philosophy almost completely ceased.

This cultural about-turn was a spontaneous manifestation of the age-old practice of worshipping the rising sun. The reins of

eadership and soldiery were taking place all over without regard to religious affinities. Their value was judged not by their religious complexion as by their capacity for delivering secular gains.

Above all, in spite of political and administrative fragmentation, culturally and socially the country remained remarkably united. The composite culture deliberately fostered by Akbar had in the succeeding centuries seeped into every nook and corner of India. Whether it was a Maratha court, or a Sikh or Rajput or South-Indian, the norms were those set in Delhi, Agra and Lahore. It had also found acceptance among the people. A new language compounded of well-known elements, new styles of dress, art, food, music, architecture, drawing on the best from both the cultures, had won widespread acceptance. Their harmonious blending was regarded as the true expression of Indian civilization.

Why then did this cultural and social rapprochement get arrested with the establishment of British rule in India ? Why ignorance and prejudice in regard to each other among Muslims and Hindus become progressively more marked ?

The advent of the British and their rapid ascendency over the other rival contenders for supreme power in India — Mughal, Maratha, and others — indeed dealt a stunning, if not a death, blow to its burgeoning composite culture and civilization.

That culture had in past two centuries been taking root and spreading throughout the country. It had spread rapidly in the good years, languished or stood still in the lean years, and just managed to survive the years of drought. Nevertheless, by and large, it had taken firm roots and continued to spread, despite, and in some ways perhaps even as a conseqence of, the political disintegration of the Mughal empire.

With the British however increasingly dominant — and soon to be supremely dominant — over all Indian affairs, the value and prestige of the composite culture, fashioned jointly by Hindus-Muslims not only for the purpose of co-existence but for fraternisation, slumped. It had to yield pride of place to western civilization, and Persian/Hindi/Urdu as the prime lingua franca of India had to surrender to English.

powerfully influenced the lives and thinking of both Muslims and Hindus. Their message of love, tolerance and brotherhood among all God's creatures spread. Saints like Kabir and Nanak carried on the good work.

The Mughal conquest did not seriously disrupt this. On the contrary, the wisdom and long reign of Akbar succeeded in setting up an enduring social and administrative pattern of secular toleration, understanding, mutual appreciation and exchange of ways of thinking and expression. It was ethically so just, and administratively so expedient that deviation from it was demonstratively suicidal. When Aurangzeb tampered with it, the retribution was terrible. His successors desperately tried to revert to the old pattern, but it had lost some of its credibility. Nevertheless, when the Mughal Empire finally disintegrated it was due mainly to the feebleness of the ruling class, both Muslim and Hindu. Sectarianism or religious fanaticism had little to do with it. After all, the last attempt in 1857 to save the Empire was fought under a secular banner—that of an Urdu loving poet, Bahadur Shah Zafar.

The intrusion of the British changed its complexion. Initially, they too fought their wars and maintained their position on more or less the same lines as the Mughals and other Indian contenders for supreme power. Once established, however, as the supreme imperial power, they had necessarily to exploit every opportunity available and — if not available to create it — to keep the opposition against them divided. Otherwise they could hardly have ruled India for as long as they did. It was not difficult for the British to keep Hindus and Muslims psychologically and emotionally divided as they had really never got united on their own. Even in Akbar's time it had largely been only a marriage of convenience.

Perhaps, if the British had not thrown in a new, highly combustible dynamic element — the Western —into the simmering cauldron of Indian civilization at that particular moment, things might have taken a different turn.

The break-up of the Mughal Empire splintered the country into distinct territorial and dynastic units. But there was no sharp cleavage on communal lines. Alliances between Hindu and Muslim

Then in 712 A. D., more or less an outcrop of the Arab conquest and conversion of Iran, the 17 years old Mohammad bin al-Qasim overran Sind. That physical confrontation too did not poison the phychological and ideological relations between the conquering Muslim Arabs and the local inhabitants. It was not a religious war but of conquest — a stronger power preying on a weeker. Indeed, toleration of Hindu beliefs was proclaimed. Al-Qasim notably declared that "temples shall be regarded in the same light as the churches of the Christans, the synagogues of the Jews and the Fire temples of the Magians."

Three hundred years later this picture of Islamic tolerance was however shattered. The Ghaznavid incursions — hordes of former Budhists, converted to Islam, who poured down Central Asia and Afghanistan—were animated almost equally by lust for plunder as by vengeance against all they themselves had previously worshipped. Started by Subuktagin in 977 A. D., they continued regularly under Mahmud from 1000 A. D. to 1027 A. D.

This was a period when even so scholarly a traveller like Al-Beruni (1010 A. D.) declared : "We believe in nothing in which they believe and vice-versa." Hindu-Muslim relations and understanding plummeted to rock bottom.

When, however, the Delhi Sultanate was established (1206 A. D.) and regular government under Musim leadership spread over a major part of North India, a marked change for the better occurred. The oft-quoted words of Amir Khusrau (1218 A. D.), (a favourite both of the Tughlaq monarch and Sheikh Nizamuddin Aulia, the Sufi saint) can be taken as a reprsentative index of the prevailing sentiment :

"I know that in this land lie concealed wisdom and ideas beyond compute. Greece has been famous for philosophy but India is not devoid of it. All branches of philosophy, astrology, divination of the past and future are known. In divinity alone the Hindus are confused, but then, so are all the other peoples. Though they do not believe in our religion, many of their beliefs are like ours."

The influx of Sufi divines and saints, the establishment of their orders in India, the Chishti, Suhrawardi, Naqshbandi, etc.,

ceremonies or festivals, in brief of what lies at the heart of the other's inner life, will be able to answer coherently. Usually there will be no response; the enquiry being shrugged off by some such hackneyed phrase "God knows. They go their own way and we go our's." And that will be the literal truth. He really will not know nor will want to know it, being content to let the matter rest in the mind of the All-knowing.

Take even the reference to the Hijri (in English dictionaries "Hejira") calendar that I have made. Few non-Muslims will be able to explain its significance, why it is so called, or why it began from that date. And, what is more, they will not care. To forestal this here, I might explain that it refers to the migration of the Prophet from Mecca to Yathrib in 622 A.D. His life was then being increasingly threatened in his home town, Mecca, for preaching Islam. In Yathrib, in contrast, he was enthusiastically received. Its inhabitants whole-heartedly accepted Islam. To mark this historic turning point, the Muslims called their calendar the Hijri calendar, starting from that event. Yathrib was also renamed al-Madina (the City of the Prophet) in its honour.

How to explain this paradox, this hiatus in Hindu-Muslim relations ? Centuries of cohabitaiion in the widest sense, and yet such frigid psychological remoteness from each other ! Probing into it involves delving into history. This may become tedious but must be inflicted.

The first contact of India with Islam was through Arab traders calling on the west coast. Commerce between India and Arabia dates back of course to pre-Islamic times — now, however, due to the florescence of Istam in the latter, along with goods it also brought in new ideas. Both were equally welcome to the local Hindu Rajas. Some Arabs even settled down among them, being freely allowed to build houses and mosques. The rigid caste system and social taboos prevalent locally no doubt ruled out close fraternization, but otherwise Hindu-Muslim relations thrived. Both sides were intrested in and respected each other's customs and beliefs. If they found something congenial in them they did not disdain adopting it.

*Lecture—1*

# The Hindu-Muslim Syndrome

Towards the close of A.D. 1980, the 1400 years of the Muslim Hijri calendar ended. Right from its inception, through all these centuries, Islam has influenced India, and in turn been influenced by her. Indeed, in recognition of this, the Government of India has made a special effort to celebrate this event worthily.

The moment, therefore, seems opportune for attempting an evaluation of one of its most, if not the most, momentous of the consequences, its impact on India. Obviously, in a lecture of this kind, I shall have to restrict myself to only one facet of it. Broadly, I shall call it the Hindu-Muslim equation in India.

Significantly, the political and material aspects of this equation are much better known than its psychological and emotional factors. This is symptomatic of the post-independence position of Muslims in India. Though its largest minority (even sometimes alleged by their friends or agents-provocateurs, as the case may be, to be its largest single homogeneous community) they are progressively apt to be reckoned only in physical terms. Their percentage in the population of every state is noted. But this is about all.

It is indeed paradoxical when one considers that there is hardly any aspect of Indian life and civilization that has not been affected by Islamic influence, or for that matter any aspect of an Indian Muslim's way-of-life that does not show marked traces of what may be called the pre-Islamic components of Indian civilization, how little Hindus and Muslims really know about each other. It is a rare Hindu or Muslim who, when asked even about the fundamental features of the other's beliefs, principal religious

**Mr. Badr-ud-Din Tyabji** ( b. 1907 ), belonging to the distingui shed Tyabji family, educated at Oxford, held the position of an ICS. He was also in the Constituent Assembly Secretariat, where incidentally he designed the National Flag Emblem. After indepen dence he joined the Indian Foreign Service and was the first Indian representative to Belgium, Commonwealth and Special Secretary External Affairs Ministry, Ambassador to Indonesia, Iran, Germany (w) and Japan ; and in between, Vice Chancellor, Aligarh Muslim University ( 1962-65 ). Mr. Tyabji is a versatile man : a keen and accomplished sportsman, connoisseur of literature and the arts writer and public speaker. He has written for many leading Indian papers and magazines, a selection of which was published under the title "Chaff and Grain" ( 1962 ) and another one as "The Sel in Secularism" ( 1971 ).

India declared itself a secular state more than thirty years ago, bu the problem of national integration still looms large on the horizon It is here that Tyabji becomes most relevant. He is convinced tha secularism does not mean the obliteration of individualism ; rathe it should create conditions in which "a thousand flowers may bloom irrespective of their colour, size, shape or perfume."

**Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1981**

*Khuda Bakhsh Annual Lectures*
*are delivered every year*
*by some eminent scholar of*
*Persian, Arabic or Islamic*
*Studies.*

*Mr. Qazi Abdul Wadood,*
*Dr. Md. Zubair Siddiqui,*
*Prof A. A. A. Fyzee,*
*Prof. Nazir Ahmad,*
*Dr. S. A. H. Abidi,*
*Prof S. H. Askari,*
*Dr. Hashim Amir Ali,*
*Prof. S. Maqbool Ahmad,*
*Dr. Bruce B. Lawrance,*
*Prof. S. Vahiduddin,*
*Prof. M. S. Agwani and*
*Prof. S. Nurul Hasan*
*were the forerunners*
*in the series to which*

*Mr. Badr-ud-Din Tyabji*
*contributed in 1981.*

*Published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna, 19*

*Khuda Bakhsh Annual Lectures Series – 13*

# Reflections on the completion of the 1400 years of the Hijri calendar

*by*

Badr-ud-Din Tyabji

## OUR CONTRIBUTORS

Mr. Badr-ud-Din Tyabji (b. 1907), educated at Oxford, held the position of an ICS. As a member of the Constituent Assembly Secretariat, he designed the National Flag Emblem. After independence he joind Indian Foreign Service and was India's first representative to Belgium, and Common-Wealth. Served as Special Secretary External Affairs Ministry, and as Ambassador to Indonesia, Iran, West Germany and Japan. In 1962-1965 he was the Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University.

Among his Works : "Chaff and Grain" and "Self in Secularism" are worth mentioning.

Prof S. Ataur Rahman Ata Kakvi (b. 1907), formerly Head, Department of Persian, Patna University, Professor of Persian & Director Institute of Post-Graduate Studies and Research in Arabic and Persian Learning, Patna, and Honorary Secy., Khuda Bakhsh Library, Patna. Among his works "Mutala-i-Hasrat, Mutala-i-Shad, Tanqidi Mutaley Tahqiqi Mutaley and Taqabuli Mutaley are worth mentioning. Besides he edited a number of books, among them, Safina-i-Khusgu Safina-i-Hindi, Diwan-i-Amin Azimabadi. At present he is engaged in the preparation of Descriptive Catalogue of the Persian manuscripts preserved in the Khuda Bakhsh Library.

For others *see* Journal nos. 1, 12 & 19.

# CONTENTS

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journ specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu lan uages, covering meaningful research based on the material prese ved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or having a concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

3. Notes and Addenda, by way of corrections and additions to a information published in this Journal or in any publication of t Library e. g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

**Rs. 15-00 per copy**
Annual subscription Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S A. & Other Countries : 24.00 Dollars

*Printers* : Tara Press, Tripolia, Patna and
Patna Litho Press, Patna-4
*Publisher* : Mahboob Hussain, for Khuda Bakhsh O. P. Library, Pat
*Editor* : Dr. A. R. Bedar

# KHUDA BAKHSH LIBRARY

# JOURNAL

No. 20

**Khuda Bakhsh Oriental Public Library**

**PATNA - 800 004**

**( INDIA )**

۲۱ ۲۲ ۲۳

۱۹۸۲

● خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۷۷/۳۲۰۲۴



اکیسواں، بائیسواں اور تئیسواں شمارہ ۱۹۸۲ء

اِس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت : ۴۵ رُپے

| سالانہ خریداری | | | |
|---|---|---|---|
| | اندرونِ ملک | : | ۶۰ رُپے |
| | پاکستان | : | ۱۲ ڈالر |
| | یوروپ | : | ۸ پونڈ |
| | امریکا اور دیگر ممالک | : | ۲۴ ڈالر |

مجیب حسین نے محمد حسن، پٹنہ لیتھو پریس، نعمت لین پٹنہ ۴ میں اور انگریزی حصہ ہندوستان پرنٹنگ ورکس، رامپور، یوپی میں چھپوا کر خدابخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

# فہرست

## ذاکر صاحب : ذاتی یادیں :

# اس شمارے کے لکھنے والے

• ڈاکٹر برکات احمد: (پ ۱۹۱۹ء) سڈنی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے؛ امریکن یونیورسٹی بیروت سے پی ایچ ڈی اور تہران یونیورسٹی سے ڈی لٹ۔ مختلف ممالک میں ہند کے ہائی کمشنر۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۵ ملاحظہ ہو۔

• جناب حسنین سید: (پ ۱۹۱۷ء) ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی اے؛ جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے سابق ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالہ "جوہر" کے سابق ایڈیٹر۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۷۴ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شیروانی: (پ ۱۹۲۴ء) قاہرہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، علیگڑھ سے عربی ادب میں پی ایچ ڈی؛ یکم مارچ ۱۹۸۳ء سے کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۱۸۷ ملاحظہ ہو۔

• جناب اشتیاق محمد خاں: (پ ۱۹۳۱ء) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے بی اے اور بی ایڈ؛ علیگڑھ کے محبوب ترانے کی دُھن کے خالق؛ بمبئی میں یونین بینک آف انڈیا میں کنٹرولنگ آفیسر ہیں۔ لوجعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل کے وارڈن۔ تفصیل کیلئے صفحہ ۲۰۶ ملاحظہ ہو۔

• جناب امان اللہ خاں شیروانی: (پ ۱۹۲۶ء) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ اور برمنگھم یونیورسٹی (برطانیہ) سے تعلیم یافتہ، معاشیات اور سیاسیات میں ایم اے۔ ایک تعلیمی پروجکٹ کے لیے حکومت اتر پردیش کی طرف سے انعام یافتہ۔ تفصیل کیلیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۱۲ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر سید عبد المجید شمس: (پ ۱۸۹۷ء تقریباً) علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے، لندن سے پی ایچ ڈی۔ کالج آف کامرس پٹنہ کے سابق پرنسپل۔ فروری ۱۹۸۳ء میں وفات پائی۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۲۴ ملاحظہ ہو۔

• جناب سید بہار الدین احمد: (پ ۱۹۱۱ء) بہار کے سابق ڈسٹرکٹ و سیشن جج۔ ۱۹۴۷ء میں بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۲۴ ملاحظہ ہو۔

• جناب سعید انصاری: (پ ۱۹۰۴ء) کاشی ودیا پیٹھ بنارس اور جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ سے تعلیم یافتہ؛ کولمبیا یونیورسٹی نیویارک سے تعلیمات میں ڈگری۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۲۶ ملاحظہ ہو۔

• حکیم عبد الاحد: (پ ۱۹۱۲ء) مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے عالم اور طبیہ کالج دہلی سے فاضل طب و جراحت، حکومت بہار کے شعبۂ صحت عامہ کی طبی شاخ کے سابق ڈپٹی ڈائرکٹر۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۳ ملاحظہ ہو۔

• جناب اوتل ٹے: (پ ۱۹۱۹ء) پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء بہار اکیڈمی آف میوزک ڈانس اینڈ ڈراما کے اسوسیٹ سکریٹری رہے۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۳۹ ملاحظہ ہو۔

• حکیم ظل الرحمٰن: (پ ۱۹۴۴ء) دار العلوم ندوہ اور اجمل خاں طبیہ کالج، علیگڑھ کے تعلیم یافتہ، ۱۹۷۸ء سے شعبۂ طب اللہ اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے صدر شعبہ ہیں۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۴۵ ملاحظہ ہو۔

• جناب نقی احمد ارشاد: (پ ۱۹۱۰ء) سید حسین خلف شاد عظیم آبادی کے صاحبزادے، تاریخ میں ایم اے۔ ۱۹۷۰ء میں ڈپٹی اور ۱۹۷۷ء میں جوائنٹ سکریٹری ہوئے، ۱۹۷۹ء میں پنشن پائی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۴۹ ملاحظہ ہو۔

• جناب عبد الحی بتاب صدیقی: (پ ۱۹۲۷ء) مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل، جنگ آزادی کے رضاکاروں میں سے ایک، پہلے جرنلسٹ رہے، پھر ۱۹۴۹ء سے رام موہن رائے سمنری میں اردو فارسی کے اُستاد ہیں۔ تفصیل کیلئے اسی شمارہ کا صفحہ [illegible] ملاحظہ ہو۔

• جناب سید محمد احمد: (پ ۱۹۳۵ء) علیگڑھ سے ابتدائی تعلیم، رانچی سے زراعت و کاشتکاری میں ڈگری اور ٹوکلائی (آسام) سے چائے کا اعلیٰ ڈپلوما۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۵۷ ملاحظہ ہو۔

• شاہ ریاض الرحمٰن: (پ ۱۹۲۱ء) پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ، پٹنہ میونسپل کارپوریشن کے سابق ممبر، تفصیل کے لیے صفحہ ۲۶۰ ملاحظہ ہو۔

• جناب انوار کریم: (پ ۱۹۱۶ء) ۱۹۳۹ء میں علیگڑھ سے ریاضی میں ایم ایس سی، ۱۹۴۱ء میں بہار میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں آئی اے ایس کے سینیر اسکیل پر ترقی پائی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۱ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر مسعود الحق: (پ ۱۹۰۱ء) پٹنہ میڈیکل کالج سے گریجویشن، پٹنہ میڈیکل کالج کے شعبۂ اناٹومی کے سابق صدر اور نالندہ میڈیکل کالج پٹنہ کے سابق پروفیسر ایمرٹیس۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۴ ملاحظہ ہو۔

• جناب سید علی عباس: (پ ۱۹۱۱ء) پٹنہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، ۱۹۳۶ء میں انڈین پولس سروس (آئی۔ پی ایس) میں داخل ہوئے۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۵ ملاحظہ ہو۔

• جناب حسن احمد قادری: (پ ۱۹۲۳ء) ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ اور مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے تعلیم یافتہ۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۸ ملاحظہ ہو۔

• جناب سید احمد علی آزاد: (پ ۱۹۰۷ء) جامعہ سے تعلیم یافتہ، جامعہ کے جاں نثاروں میں سرفہرست، ۱۹۷۶ء میں وفات۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۶۹ ملاحظہ ہو۔

• ڈاکٹر رشید الوحیدی: (پ ۱۹۴۲ء) دیوبند سے فاضل، دہلی یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے اور پی ایچ ڈی، ۱۹۷۳ء سے جامعہ میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۲ ملاحظہ ہو۔

• جناب سدا نند منڈل: (پ ۱۹۲۶ء) سبور ایگریکلچر کالج (بھاگلپور) سے زراعت میں ڈگری۔ راج بھون پٹنہ میں شعبۂ باغبانی کے انچارج ہیں۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۳ ملاحظہ ہو۔

• حکیم اشرف کریم: (پ ۱۹۲۳ء) مدرسہ شمس الہدیٰ سے فاضل، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے سابق پرنسپل تفصیل کے لیے ص ۲۷۶ ملاحظہ

• جناب شاہد رام نگری: (پ ۱۹۲۷ء) ابوالکلام اکادمی کے 'النظام' کے سابق ایڈیٹر اور امارت شرعیہ بہار کے ترجمان "نقیب" کے مدیر اعلیٰ۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۷۷ ملاحظہ ہو۔

• جناب محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی: (پ ۱۹۲۹ء) جامعہ کے تعلیم یافتہ، آگرہ یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم اے۔ دیدار بخش ہائی اسکول بیر نگر پورنیہ سے منسلک۔ تفصیل کے لیے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۸۱ ملاحظہ ہو۔

• جناب شاہ منظر حسین: (پ ۱۹۲۴ء تقریباً) علیگڑھ کے بی۔ ایس سی۔ تفصیل کے لئے اسی شمارہ کا صفحہ ۲۹۹ ملاحظہ ہو۔

• پروفیسر سید وحید الدین: (پ ۱۹۰۹ء) عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور ماربرگ یونیورسٹی جرمنی سے تعلیم یافتہ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے سابق پروفیسر اور صدر شعبہ، ۱۹۷۳ء سے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن نئی دہلی میں ریسرچ پروفیسر اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی کے شعبۂ فلسفۂ مذاہب کے صدر۔

تصانیف: فلسفہ، تصوف، اخلاقیات اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے علاوہ اقبال، حافظ گوئٹے وغیرہ پر پچیس سے زائد کتابوں کے مصنف۔ آپ کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی جو جرمن زبان میں 'تجربۂ قدر' (Experience of value) کے نام سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔

●● (بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱۹، ۱۲۱ اور ۲۰)

# پیشگفتار

**دیوان موبد :** یہ مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ پر پہلی معروف کتاب "دبستان مذاہب"
جو غلط طور پر محسن فانی سے منسوب چلی آتی ہے) کے مصنف کا دیوان ہے، جس کا تخلص موبد تھا۔ دبستان مذاہب
(نو)لکشوری طباعت کا آغاز مندرجہ ذیل غزل سے ہوتا ہے، جو دیوان کے صفحہ ۲۱ پر دیکھی جا سکتی ہے:

ای نام تو سر دفتر اطفال دبستان ؛ یاد تو بہ بالغ خردان شمع شبستان الخ

دیوان کا یہ نسخہ جو غزلیات، مثنویات، قطعات، رباعیات اور فردیات پر مشتمل ہے، اب تک
(اطل)اعات کے مطابق دنیا کا واحد نسخہ ہے جو خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ نسخۂ خدابخش کا عکس پیش خدمت ہے۔

یہ دیوان جو املاً ۱۱۰ اوراق پر مشتمل ہے اور جو ۱۹۶۰ء میں خدابخش لائبریری میں منجملہ متعدد
پارسی دینی کتابوں کے ایک پارسی کی معرفت داخل ہوا، قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) کی رائے میں اس
دیوان کا مصنف 'موبد'، دراصل آذر کیوان کا بیٹا ہے۔ اور آذر کیوان آبادیوں / سیاسیوں آذریوں کا [illegible]
ہے جو اکبر کے عہد میں ایران سے ہندوستان آیا اور عہد جہانگیر میں جس کا انتقال پٹنہ میں ہوا۔

مشکل پسندی کی وجہ سے موبد نے اپنے دیوان کی تدوین کو خاصا دشوار بنا دیا ہے۔ دیوان موبد کے
کاتب نے 'نہلے پر دہلا' لا کے جا بجا ایسی بے احتیاطی یا لاپرواہی کے ساتھ لکھا ہے کہ موبد کی مغلق پسند روح
بے حد خوش ہوئی ہوگی کہ میرا اصل قدردان تو یہ کاتب نکلا جس نے ہر پانچویں شعر کو شمع کا معمہ بنا کے رکھ دیا ہے۔
بلکہ یہ پیشکش اس لحاظ سے ہند و ایران کے فارسی عالموں کی امتحان گاہ بن جاتی ہے، اس امر کی آزمائش کے لیے
کہ اس کے متن کو کہاں تک صحت کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔

موبد، جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۵ھ کے آس پاس پٹنہ میں پیدا ہوا۔ والد کے بچپن میں انتقال کے بعد
مربی موبد ہوشیار کے ساتھ ۱۰۳۳ھ میں بنارس میں کچھ عرصہ چتر وید اور گنیش من برہمنوں میں گزار کے
اکبر آباد میں مقیم ہو گیا۔ ۱۰۴۰ھ سے ۱۰۵۲ھ تک کشمیر اور پنجاب (خاص کر لاہور) میں گشت کرتا رہا۔ ۱۰۵۳ھ
میں لاہور سے کابل ہوتا ہوا مشہد پہنچا۔ ۱۰۵۴ھ میں ملتان ہوتا ہوا ہندوستان کے مختلف مقامات میں پھرتا
رہا۔ ۱۰[illegible]ھ میں حیدرآباد کو پسند کیا۔ ۱۰۵۹ھ میں اور پھر ۱۰۶۳ھ میں جنوب اڑیسہ کے اس وقت کے

دارالسلطنت سرہی کاکل میں اس کے قیام کے شواہد ملتے ہیں (یہ سب شواہد خود دبستانِ مذاہب میں پائے جاتے ہیں)

موبد ایک اہم علامت ہے اس معروضی علمی بیداری اور سچ کی پیاس کی جو سولھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی اور سترھویں صدی کے اواخر تک چلتی رہی۔

اس پیاس اور اس بیداری کا جیسا اظہار دبستانِ مذاہب کی شکل میں ہوا، اس سے بہتر ممکن نہ تھا لیکن یہ ایک معروضی مطالعہ تھا۔ اس میں وہ اپنے ذاتی افکار و عقاید کو منعکس نہیں کر سکتا تھا ورنہ معروضیت کا توازن کھو بیٹھتا۔ اس کے لیے اظہار کا راستہ اُس نے فنِ شعر میں تلاش کیا اور دیوان کی صورت میں وہ سترھویں صدی میں دانشوری کی ایک اہم دستاویز محفوظ کر گیا! اس دانشوری کے پرت مطالعہ کے بعد آپ پر خود ہی کھلتے چلے جائیں گے، میں چند اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں:

دانشوری اور ابلہی کے مختلف جہات پر کسی ایک شاعر نے بھی ہیچ کے اور پلٹ پلٹ کے اتنا اور ایسا کچھ ابھی تک نہیں لکھا جتنا اور جیسا موبد لکھ گیا۔ چند شعروں سے اندازہ کیجیے:

زیرکی اندوہ را و عاقلی ایذا بود — ابلہی دنیا فزا و ابلہان جنت فزا

ابلہی دارد صبوح راتن آسان در وطن — بوعلی از دانش خود میگریزد جا بجا

پای فرعون است بر تخت تن آسانی بخواب — باید بیضا شناسی میکند موسای ما

من گنگ خواب دیده و عالم تمام کر — بی بہرہ من ز گفتن و قوم از شنیدن اند

موبد زبان دراز مکن زانکہ ابلہان — از گفتہای خود ہمہ در لب گزیدن اند

ہندستان کے عہد ما بعد کے عظیم ترین دانشور شاعروں کی پیشرو آواز جس صفائی سے دیوانِ موبد میں سنائی دیتی ہے دوسری کسی جگہ مشکل سے ملے گی۔ اس سلسلے میں پہلے موبد کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو پھر چند

جمعی از پروانگان گفتند با پروانۂ — رو برای ما خبر آر از چراغ خانۂ

زین سخن پروانۂ بیرون شد و ہم باز گشت — گفت دیدم گشتہ روشن شمع در کاشانۂ

زان میان پروانۂ خندید و گفت ای بیخبر — یا نۂ پروانۂ یا گفتی در دروغ افسانۂ

از گدائی و شہی فرقی جز این ظاہر نشد — سنگ شہ را بر سر و درویش را زیر سر است

این کعبہ و تبخانہ دو جلوۂ یک ذات است — این جا حجر الاسود آنجای جگنات است

موبد ما آن کز اوّل خسرو آزادہ ہاست — تا کہ ترک مذہب و ملت نکرد اصلا نرست

## تین

رستگان رانکر دین ومذہب وارشاد نیست — آنکہ او در بند آزاد نیست ہم آزاد نیست

جز وجود گو ہر عرفان درین فانی سرا — آدمی را بہر غیر از خورد و مرد و زاد نیست

دوزخ و رنج وعذاب قبر بدخوئی بود — خلق نیکو بود خواہد حور و غلمان شما

زراست وعدہ گوید دیدار دوست زاہد — موبد ترا خدا داد امروز چشم فردا

از مسلمانی وطاعت میگریزم زاہدان — تا نگردد از وجودم تنگ جنت بر شما

برای خویش خواہد ہر کسی کس — ز بہر کس نخواہد کس کسی را

چون کشور خوبی ہمہ را محبوب ست — ہر راہ بسوی خانۂ مطلوب ست

پوبندۂ ہیچ کیش گمرہ نبود — از ہر رہ و ہر کو کہ در آیی خویست

واقف ز دین احمد امی فقیہ نیست — انعامان مجوی رہ انبیا نہ را

از سجدہ و قدسیان ہمگی آدمی شدند — باشد خدای آدم و ہم آدمی خدا

بگذشت ثلث عمر اطاعت ولی چہ سود — چون زین دوگانہ روی نپویم یگانہ را

غسل و تیمم تو نمازی نمی شود — باحرص ز آب زمزم و از خاک کربلا

وقت نماز مرتبۂ آدمی بود — دریاب وقت را کہ مبادا شود قضا

پا بر فراز عرش نہ و دست زن بدوست — بگذار کفش جسم نشیب آشیانہ را

نی مسلمانم نہ مومن زین سبب روز جزا — حشر من جز با خدا با دیگری نبود روا

بہشت چیست جز ادراک مطلب موبد — صراط دقت معنی کہ در کلام منست

موبد کے بارے میں اشعار میر کی طرح میں یہ تو نہیں کہتا کہ پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند
ن جا بجا وہ اچھا خاصا فضول گو نظر آتا ہے، اور کبھی کبھی تو شبہ ہوتا ہے کہ یہ شخص محض اپنے چھلکتے
ے جام علم کی نمائش کر رہا ہے۔ اس کے باوجود جہاں جہاں وہ سنجیدہ ہے اور راست اظہار پر
ا گیا ہے، اپنے معاصروں سے بڑھ گیا ہے۔ کس کا جگرا ہے کہ ہندستانی دانشوروں کے ارتقا کی
ازل کی مختصر ترین تاریخ میں بھی ان اشعار میں سموئی ہوئی کنواری فکر کو نظر انداز کر سکے! ●●

O

**اہلِ نظر فارسی دانوں کی خدمت میں :** غلط نویس کم سواد کاتب کے ہاتھوں ریش ریش اور داغ داغ اس مشکل پسند لیکن بڑے شاعر کے دیوان کے اس تنہا خطی نسخہ کے متن کی اشاعت صحیح قرأت کے ساتھ منظور ہے۔ یہ تنقیدی متن تیار کرنے کے لیے تمہیدی مرحلے کے طور پر اس عکسی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک پروف نسخہ بھی الگ سے چھاپ لیا گیا ہے، جو اہلِ نظر کے آخری مشوروں کے بعد اشاعت پذیر ہوگا۔ عکسی اشاعت تو اس جرنل میں شامل ہے۔ یہ تمہیدی (پروف) نسخہ تحفۃً ہند و پاک کے تمام اہلِ نظر فارسی دانوں کی خدمت میں ان کی فرمائش پر بھیجا جا سکتا ہے جو اس کام میں شرکت کرنا پسند کریں گے اور جن کی فرمائش لائبریری کو موصول ہوگی۔ پھر انھیں یہ زحمت کرنی ہوگی کہ پروف کاپی اور اس اصل (عکسی اشاعت) کو سامنے رکھ کے پروف کاپی کے حاشیہ پر اپنی تصحیحات اندراج کرتے جائیں۔ ان کی تصحیحات موصول ہونے پر ان کے نام اور شکریہ کے ساتھ تنقیدی متن میں درج کی جائیں گی۔ اس طور پر یہ دیوان جس کا تمہیدی نقش تیار کر دیا گیا ہے، ایک مشترکہ پنچایتی کام ہوگا، اپنی نوعیت کا پہلا کام، ——— جو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ اس دیوان کے باب میں ضروری تھا!

پروف کاپی کی 'تصحیحِ اغلاط' کے سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ 'نقطوں شوشوں کی طباعتی اغلاط' ایسی جو قاری خود ہی بآسانی درست کر سکے، ان کی طرف توجہ دلانا ضروری نہیں ہے۔ تصحیح ان واقعی اغلاط کی کرنی ہے جو غلط کتابت یا غلط قرأت کے نتیجہ میں پروف کاپی میں راہ پا گئی ہیں۔ تصحیح کا کام جاری ہے اور اس میں اہلِ نظر کی شرکت کی توقع بھی جاری ہے۔

اہلِ نظر کے مشوروں کا ہمیں نومبر تک انتظار رہے گا۔ دیوان کا یہ تنقیدی متن ان مشوروں کی روشنی میں دسمبر ۱۹۸۲ء میں شائع کر دیا جائے گا۔

●●

# دیوان موبد

(نسخۂ خطی)

مخزونۂ

خدابخش لائبریری، پٹنہ

نفس کاوسی بکام خویش کردن آسمان
کر عقاب همت مرغ قفس باشد ترا
در راه کرت کعبه و دیر است چه پروائی
خود مسلک رندانه نیست جز این راه رهنما

بجز رستم نگردد تاج و تخت خسروانی را | که تنها نیست خواهی زود باشد کوز خانی را
بنفس خویشتن باکاه آسیاب آسیا بودم | کنار شعوه یابی دستگیر یاران نانی را
مکر عرفان پرستی بیوفائی های دنیا را | بیابان جان سپاری ساز شهریاران جانی را
بسی جادو و آئین دیو سپید روزی آید | شبستان می کند کاوس چشمان کیانی را
ازین دیو سپید جهل پیری گشته ویرانم | درین مازندران عمر کاوس جوانی را
ازین دیو سپید ریش شیخ مکر می سوزم | مرا زاولاد رستم خسرو مازندرانی را
برون از خانه تن مرگ خواهد کرد جانا | جزین معنی سپید ایم نامیری و خانی را
جوانی میرود آزرده غم شد زان قد پیرم | تو رضع سیکم شاید که گردانم جوانی را
خمیدن از سبب آنست که عمر بیهوده | زدوش فکند خواهد بیرا زندگانی را
بجوب از خویشتن میزند گرند زندگی | عصا منبود برای تکیه در نفس فانی را

زشیخ العقلا محمدی خلق وسو | بیشک ملک الملوک اقلیم د ق

از حاسه بنر طرازا و املا یو ر | یونان هنر شد است و مصر حکما
تا بر دیت امتحان شد سکان نظام | پهلوانی زامره از شکست دنها

جانشه دارائی بالای والای ترا | چرخ اطلس کمر باد از خیاط قضا
فی مسلمانم نه من زین سبب رو جزا | حشر من جز با خدا با دیگری نبود روا
بهر حق مانده ام چو کفر و دین خریدارم نبود | کس ز خاوندش نگیرد شد چو کالا نام را
از مسلمانی و طاعت میگریزم زاهدا | تا نکرد از وجودم ننگ جنت بر شما
آتش دوزخ شود خوش فرق من برهند جنوف | شد کتا هم رستگاری بخشش جیل اشقیا
بیش آه گرم من دریوزه دوزخ زکال | نیز دمس گرمی چه باشد دوزخ افسرده را
هر زمان پرسی ز موبد کیست بیچون و چرا
گفت بیچون و چرا او راست از چون و چرا
منطق آمد عالمم ذهن از خطا | شد خطا موجود دیدن جز خدا
پنج قسم آمد نظم او را نیز دی | کلیات خمس این شد مو بدا

[illegible]

زرد شاه از غم زابل دو جام زهر کیست　　　می چشم است پان دیده مهر نیل الماس نیست
زاغان و ذات تیر پاکست و کو کنار آبادان　　　گفت سیبی درخت بجز کست لیکن بر و سر
بگوشم قلقل مینای جمرانی حدیث آمد　　　خطا یاقوت مس بنده می چه باده نابست
بروز رزم در ایران و زبانی است دوش تو　　　بتوران در رست خوان سر و هو مان بگهر است
غبار خاک ادم راه سوی اعجاز علی آرد　　　مکو از آتش زاد دشت حمی جون معالم است

لب سبزان هندی راز می اب بهشت مو بد
سیه چشمان کابل را مل کارنگ سر خاست

انعام طلب باقی بجی از شده است　　　یا مسجد بساز بوم و برلم نشده است
بی یاد خدا بهر عیش و شغل خلق　　　هو بد حسمه مسجد تلنگانه شده است

از کینه یزید پر ندامت خاست است　　　حق حسین نیست عدل زشت یا لعنت
در شام از یزید پشیمان ندامت انجوان　　　کور یزید و نقش ندید است مروت

منجنیق آسمان به سنگ های خبر است　　　تا رک دارا نشان یا افسر اسکندر است

آتش آشوب مینو سر مو دیا باد و هوا　　　شد بکند رخاک جسم و کید تن خاکستر است
ن چه نوامش شام فرصت عدو بتان طلب　　　از سطول اطول دو ز مختصر بس خبر است
راز دان حق نخواهد گشت این راز فقیه　　　فخر رازی دیگر و مر فخر رازی دیگر است
خواستن شد گدیه نزد شاه اقلیم غنا　　　کاسه دست گدائی شاه را تاج سر است
مخلد بر پهلوی نادان درون پند حکیم　　　ماده قاسد کند در دار چه سودش بستر است
در گدائی و شهی فرقی جز این ظاهر نشد　　　سنگ شه را بر سر و درویش را زیر سر است
طبل رحلت روز و شب در هر کجا نوبت　　　کر نای کوچ هر کس نشنود هر یک کر است
امر باد دوری بجا دولت بلا ابر مبتلا　　　دور باش چوبداران دغل دور از کر است
پیشکان را زود بکش راه کوبان تیز　　　یعنی این دولت و ان شد در جای دیگر
چار بالش چار بال آمد پیر و از غنا　　　تا ندانی بی سبب بالش پر از بال و پر است
شکر لله است باقی میر میر دو لیک　　　غیر از این معنی نیاید هر که میر لشکر است
پشته هر جا که پای پشت کوه حریر است　　　هر کجا بینی نشینی او فقر قیصر است
جلوه معنی بیار هستی صورت بجست　　　پیش هر اختر شماری مشکل است خطر است
تخته از حیثیه غفلت بیار سند کند　　　حیدر آباد از کنون بر تخت های حیدر است
از جهانگیر بست شبها با سیان نفس سلیم　　　نیز شاه نار افغان بند اکبر است
درد دیدار است شب در دمش خار جابجا　　　در دو خواب است آنکه او را روز محمل بستر است

درمیان

درمیان حبیب و من حجاب   بر کنون رو بروی با یارم

درکسوت بوالبشر بعالم گشتم   انگشتری وجود حاتم گشتم
زین پیش مرا اگرچه آدم خوانند   کردند غلط کنون حسن آدم گشتم

ره دور است در بر و کعبه منزل   دو منزل را یکی کردیم و رفتیم

آشفته و آزرده و درمانده و رندم .   آتشکده دل دیده بود در جله سندم
فرسوده ز افلاس حیاتم که تو گوئی   شهزاده ایرانم و خانزاده سندم

قربان ابروان سیاه مست و فراخ چشم   شد روغن کمان تو نو چراغ چشم

از غنچه حدیث لب جانانه شنیدیم   وز چشمک نرگس سوی میخانه دویدیم
مژگان سیه مست تو شوخ جفا جو   ما مردم هشیار درین خانه ندیدیم

موبد نشنیده چه فرمود حکیم   هرچند بدست مال نزدیک کنیم

نا روی لئیم را نباید دیدن   نیکت بخیل وار کردار کنیم

درکشتی شریعت دانسته ناخدائیم   در خلوت حقیقت یکسر جدا نمائیم
زاهد ز ما خدا خوان عارف ز ما چه داند   از آن خدای پوشیم این با خدا نمائیم

ما هر کس ختم مقام را فهمیدیم   هم شهد شیخ و جام را فهمیدیم
حق کرد حرام باده چه که در جنت   بیت الله الحرام را فهمیدیم

گرچه از کابل بسی دوریم لیک از پرتگال   درمیان هند سیر آب ما ملا میکنیم

آرزو گر بودی به تو ریک جم   ناحق کردی شدی لب شب غم
آهو بکار شت و شد نکس طره تو   دین پس چه شوی که خشک بود این دم

جز حق که بود طبیب راز دردم   جز دوست که پاس دارد دردم
دانی که حکیم است عبث می نکند   پیدا کردم قلبش پیدا کردم

زسیم و زر و روی گفتند باز    جدا کانه هر یکی قصه ساز

چو الیسه و رحمتی پیل پیش    سخنها بگفتند از دین و کیش
یکی گفت دیگر گفت خام    دگر گفت از جامه و یخ تمام

گروهی ز دانشوران زین سبس    نشستند باهم بکر چند کس
یکی گفت هر پیل باشد روان    برانید آبست نهری روان
دگر گفت ساکن بود دیا بجهان    برانید خاک زمین بستان
یکی گفت هم ساکن است روان    تو غیر هوا پیل را خود مخوان
دگر گفت با خشم و لبس گذشت    برین لذین پیل خود انگشت
یکی گفت گوید بیت مست    کذا مست چیزی که پا هستی است
بود خرم بنیک وفی زیب پیل    پس این قول و [illegible] دلیل
دگر گفت چو پیل و دشمنی گشت    بجر رحمه [illegible] گذشتن
یکی خنجر بس خواه و دیر    یکی مست شمشیر نادک دور

یکی گفت

ز گفت هر پیل باشد سیاه    شبستان بشنید گشتش جایگاه
برانید راحت بود دیده نقش    بباید بینی که نه فهمید نقش
بپایان شد این رفع صاحب پیل    نمایشید داد ار رب خلیل

بنام آنکه آذر گرد روشن    برابر جسم آتش ساخت گلشن
چراغ آشنایی را برافروخت    بپروانه و سگانیکی سوخت
ز بسیار آشکاری ناشکارا    ز هی پنهان پیدا تر ز پیدا
نهان در پردهای آشکارا    نهان آشکارا دیده داری

[illegible] پیش نور محمد    چه گونه کون فسرده به موجود
رضا بصدق او صدیق اکبر    کهی پرتو از نور رشید انور
بحق علی عمر شنا بران نور    که نتوان [illegible] ز دیده دو نور
از آن تا نور ست ذو النورین پیدا    ملک [illegible] سرشته پیدا
نور [illegible] علی از آن نور بیا    [illegible] نور عین مسلم دانا

چنان کشور خدایش حکم فرمود — که گردان چاکری در دار بر زود
چنان پنداشت کز ایزد جدا ماند — سروش آسمان که گفتم باز برخواند
پس از یکچند گشت از جهت یکتا — نماند آن سیم و مال و جاه و دنیا
برافتاد از حصار کدخدائی — چو عشاق حنیف بینوایی
گمان بردایندم از ایزد جدا ماند — سروش آمد نخستین قصه برخواند
که در هر حال موبد با خدا است — چو عشاق حنیف بینوایی
گمان بردایندم از ایزد جدا ماند — سروش آمد نخستین قصه برخواند
که در هر حال موبد با خدایی — مدان گمی ز ذات او جدائی
به پنداری کس از ایزد جدا ماند — فنا داد و نام شد باقی خدا ماند
سخن زین آشکاراتر سرائیم — خدا موجود خود معدوم مائیم
هر آن چیزی که او هستی پذیرست — فروغ اوست ز آتش ناگزیرست
زر از زر شود جز زر نباشد — ز رست آن باره افسر نباشد
سعادت کیش مرد دانش اندوز — شبستان روان زین یافت نوروز
چو همت دید و پدید و گشت یکتا — زرش بگسست و بگذشت از گفتها
سر و سنستان نور دید و جدا شد — ز خود بیگانه با حق آشنا شد
به بی پیوند پیوستن چه نسبت — مراد از زنده و پیوند نیست



درین غلظو سر کردم آشکارا — ز رازستان بی انباز دارا
مطول گر نکردم مختصر را — دلی بخشد اشاراتم شفا ها
نجات منیت در قانون این فن — ز حسن حسن دانه جو و ز دانه خرمن
بنام نامی داراست کو هی — جهانگیر همایون حق پژوهی
خود دیدم سوز بخش سوگوارش — نهادم نام خرم نوبهارش
ز خرم نوبهار از گل بچینی — برادر افتش عیان تاریخ بینی

یکی کوه دیدیم سر در سحاب — نهان گشته در دور او آفتاب
منجم چو بالای این که رسد — کواکب نه بیند به بند در رصد
اگر کوه باشد رحیس را وند — ستون فلک گفتش این را سزد
ز بس بود وسعت رفعت این کوه است — برافراز او لا اخلا ملاست
کناری ما دامنش آشناست — بچشم مهان سدرة المنتهاست
فلک مرغزاریست در پای او — ستاره که هی سنگ در پای او
اگر خود دره را شبر که برد — عجب منیت گر با جل هم چرد
ز بس سیله خوش لشت او — روان حوت با ماهی آب جو
بلند که از ازین ره رصد — رصد تا نه آید روان بر بلند

خداوند تا مهر و ماه آفرید ‌ ‌ ‌ بجز یوگی اینجا کسی بدکه ید
تو گوئی بد تیر بزدای دست ‌ ‌ ‌ بجز یوگی اینجا که از دل نشست

بلشکر هندوان جسم پرور ‌ ‌ ‌ مسلمان وار سایم گشته بکبر
رت بیدار شب چون حق پرستان ‌ ‌ ‌ بیا دو دست بی برنگ دوستان
زکرما روز تا شب سایه جفتند ‌ ‌ ‌ ز سرما با کسی در شب نخفتند
یکی با خار کش تن کرده بیدار ‌ ‌ ‌ دگر از آتش افروخته نار
بغیر از ابله آسیبی کو ارا ‌ ‌ ‌ بشک کس به در و شیر پیدا
بزرگانی که از اهل تمیزند ‌ ‌ ‌ ز فضل خویش در مردم عزیزند
بغیر از کند مک شهری ندانند ‌ ‌ ‌ بجز از کائنات جو بجوانند
بغیر از کائنات جو بجوانند ‌ ‌ ‌ بجز از کند مک شهری ندانند

دل از شکر دگمین شکن از نان انبار است ‌ ‌ ‌ این بشه سو شیه که شهر ز محالات است

بر درگه شش چون رسیدم ‌ ‌ ‌ صد هند دران سواد دیدم
همه در دیده بساط مطلق از رد ‌ ‌ ‌ دیگر کوه سواد اعظم از نو

هر گونه سواد اعظم مو ‌ ‌ ‌ گسترده بری رخان دران کو
سرهای سران بیافتاده ‌ ‌ ‌ مسکینا با پران نهاده
از جان جبین و نقش اندر نک ‌ ‌ ‌ خاک مترات لوح از رنک
از اشک جو باده جو ملستان ‌ ‌ ‌ از روی چو گل زمین گلستان
از سجده هندوان دو و سنک ‌ ‌ ‌ شد خاک سیاه زعفران رنک
آن گنبد نور بخش انجم ‌ ‌ ‌ از پیکر شش جیب هفتم
از سنگ ابد بنای گنبند ‌ ‌ ‌ وز رنگ ازل صفای ستند
گردون گردان بگرد فرش ‌ ‌ ‌ ست جنگ ناران بدو گرش
خورشید فروغ چتر گنبند ‌ ‌ ‌ در آئینه فلک هویدا
از پرتو فیض ایزدی سوز ‌ ‌ ‌ کسند شد رنگ قلعه طور
تو گوئی شده محو آن تماشا ‌ ‌ ‌ نی ساخت شکسته مر عصارا
کشتی است برایش ایوان ‌ ‌ ‌ خورشید روان و جسم کیوان
والای وجود [illegible] هند و رند ‌ ‌ ‌ کالای سواد اعظم هند
کس [illegible] سواد آشنایی ‌ ‌ ‌ رخشنده روان روشنائی
چشم شب قدر راحت آموز ‌ ‌ ‌ جانش نور و رو دانش افروز
او گوهر کان حسن کاملی ‌ ‌ ‌ جسمش شده جان حسن کامل

# فصیح الدین بلخی

احمد یوسف

○

**فصیح الدین بلخی** انیسویں صدی کے اواخر کے آدمی تھے (پیدائش ۱۰ فروری ۱۸۸۵ء انھوں نے
کلکتہ یونیورسٹی سے امتیازی شان سے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔
کی وفات کے بعد تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک پوتامڑی اسکول میں معلم رہے، پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۴ء تک نوٹ فیم کلا
میں معلم رہے۔ اس کے بعد جزیرۂ فجی کی عدالت عالیہ میں بحیثیت مترجم بحال ہوئے۔ لیکن خرابی صحت کی بنا پر وہا
زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکے اور وطن واپس آ گئے۔ یہاں کوآپریٹو کورس کا امتحان دے کر ملازمت شروع کی۔
فوجی ملازمت کے سلسلے میں پہلی جنگ عظیم میں سیریا، مصر، فلسطین، دمشق، بیروت اور بیت المقد
وغیرہ میں رہے۔ وہاں سے واپس آئے تو سب ڈپٹی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحر
سے متاثر ہو کر اس نوکری سے استعفا دے دیا۔ کئی برسوں تک سخت معاشی بحران میں مبتلا رہے۔ بالآخر ۲۶
میں ریاستی سرائے کیلا میں REVENUE OFFICER اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے بحال ہوئے اور ۱
۱۹۴۷ء میں ریٹائر ہونے کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ مخطوطات کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں وہاں سے
بھی ریٹائر ہو گئے۔

تالیفات:-

۱۔ تاریخ مگدھ: سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۴ء۔ ۲۰ ابواب پر پھیلی ہوئی
۴۶۹ صفحات پر مشتمل صوبۂ بہار کی یہ تاریخ ۶۶۳ ق م سے شروع ہو کر ۱۹۴۳ء پر ختم ہوتی ہے۔

۲۔ انشاد شاد: قومی پریس بانکی پور، ۱۹۴۸ء۔ ۲۲ ص۔ شاد عظیم آبادی کی شاعری
کے نقائص بتائے ہیں۔

۳۔ تذکرۂ نسوانِ ہند: شمسی پریس پٹنہ، ۱۹۵۶ء۔ ۲۲۵ ص۔

۴۔ تذکرۂ ہندو شعرائے بہار: نیشنل بک سنٹر، ۱۹۶۲ء۔ ۲۶۹ ص۔
مقدمۂ کتاب کی تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۶۱ء (مصنف کا انتقال ۱۴ مارچ ۱۹۶۲ء کو ہوا) صاحبزاد

نادم بلخی نے ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی مونغہ "احوال ضروری" کے عنوان سے فصیح الدین بلخی صاحب کی مختصر سوانح عمری کا اضافہ کیا ہے۔ ایک تصویر بھی شامل ہے۔ اس میں ۱۲۰۰ھ سے ۱۳۸۰ھ تک کے بہار کے ابتدائی شعرا کے حالات مع نمونۂ کلام (اُردو فارسی) کے درج ہیں۔

رسائل میں شائع شدہ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) شوق قدوائی اور شوق نیموی کا ایک شاگرد۔ شائع شدہ "کومل" ڈالٹین گنج اپریل ۱۹۶۲ء
(۲) امیر مینائی "صبح نو" اگست ۱۹۵۸ء (۳) مخالفت قیاسی "اشارہ" پٹنہ مارچ، اپریل۔ (۴) اطراف پورنیہ کے بعض صوفیائے کرام "انسان" پورنیہ نمبر ۱۹۵۶ء (۵) روضۂ وصال کی سرگزشت "تہذیب" دسمبر ۱۹۵۲ء (۶) عظیم آباد کا ایک جوان مرگ شاعر "تہذیب" اگست ۱۹۵۳ء (۷) اُردو قواعد و لغات کی تدوین "تہذیب" اپریل ۱۹۵۳ء (۸) تاریخ شعرائے بہار کا مولّف "اشارہ" فروری ۱۹۵۹ء (۹) اجاگر چند الفت "اشارہ" جنوری، فروری ۱۹۶۰ء (۱۰) پیاسوں کی تاریخی سرگزشت "کومل" ڈالٹین گنج ستمبر ۱۹۶۱ء (۱۱) شبلی نعمانی "صبح نو" اگست ۱۹۶۱ء (۱۲) موسیقی اور شاعری "معاصر" پٹنہ جولائی ۱۹۵۶ء (۱۳) راسخ عظیم آبادی "صنم" پٹنہ بہار نمبر ۱۹۵۹ء (۱۴) امیر مینائی اور داغ دہلوی کی قربت "صبح نو" مئی ۱۹۵۸ء (۱۵) فردوی پر ایک مسدس "معاصر" پٹنہ حصہ دوم ۱۹۵۴ء (۱۶) بابو رام نرائن موزوں "اشارہ" پٹنہ دسمبر ۱۹۵۹ء (۱۷) سرقہ اور توارد "اشارہ" پٹنہ (۱۸) صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت "نگار" لکھنؤ (۱۹) عظیم آباد کا ایک خوش نویس شاعر "صدائے عام" خاص نمبر (۲۰) عظیم آباد میں شعرا کے مراثی [illegible] نواب امداد امام اثر۔
(۲۳) منیر و بہار میں مسلمانوں کی آمد "ندیم" بہار نمبر گیا ۱۹۳۳ء (۲۴) قلعۂ رہتاس کی تاریخ "ندیم" گیا (۲۵) مثنوی گوہر جوہری "اشارہ" پٹنہ (۲۶) شوق نیموی [illegible] مولوی شہاب الدین "صبح نو" پٹنہ۔

فصیح الدین بلخی کے وہ مضامین جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شامل ہیں۔

۱۔ علی ابراہیم خان خلیل (؟) ۲۔ ملا غلام یحییٰ بہاری۔

ان کے کچھ اہم ریڈیو ٹاک درج ذیل ہیں:-

۱۔ صوبہ بہار کی تاریخی اہمیت ۲۔ بہار شریف کا میلہ ۳۔ محمود گاواں
۴۔ ملک بیا شرقی اور سپر ماحت ۵۔ اکبر کے دور میں فیضی اور ابوالفضل ۶۔ تاریخی کتابیں

فصیح الدین بلخی کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ علم نجوم (سائز ۵ × ۱۰، صفحات ۱۰۹ ۲۔ تحریک وہابیہ بہار میں THE WAHABI MOVEMENT IN BIHAR ۳۔ آثار بلخیہ ۴۔ آثار قدیمہ ۵۔ دستور سخن۔

## غیر مطبوعہ کتابوں کی تفصیل:

### ۱- علم نجوم (مخطوطہ)

### باب اوّل

۱۔ فصل اوّل: تعداد اسمائے بروج ۲۔ فصل دوم: حالات بروج ۳۔ فصل سویم درجات بروج ۴۔ فصل چہارم: زمانہ وقیام بروج ۵۔ فصل پنجم: تعلقات بروج۔ ۶۔ فصل ششم: نوالسا ۷۔ فصل ہفتم: اعداد بروج ۸۔ فصل ہشتم: خواص بروج۔

### باب دویم — منازل یعنی نچھتّر

۱۔ فصل اوّل: تعداد واسمائے نچھتّر ۲۔ فصل دویم: بیان حروف متعلقہ نچھتّر ۳۔ فصل سویم: خواص نچھتّر۔

### باب سویم — تاثرات

۱۔ فصل اوّل: ایّام اوقات ولادت ۲۔ فصل دویم: خاصیت ماہ تولد ۳۔ فصل سویم: خاصیت بچھری ۴۔ فصل چہارم: خاصیت تاریخ یعنی تتر ۵۔ فصل پنجم: خواص روز ۶۔ فصل ششم: خواص نوانسا ۷۔ فصل ہفتم: خواص کرن۔

### باب چہارم — ستارگان

۱۔ فصل اوّل: تعداد اسمائے ستارگان ۲۔ فصل دویم: حالات ستارگان ۳۔ فصل سویم دوستی و دشمنی ستارگان ۴۔ فصل چہارم: خواص ستارگان ۵۔ فصل پنجم: سختی و نرمی ستارگا ۶۔ فصل ششم: مدارج ستارگان ۷۔ فصل ہفتم: جمعیت واستقامت ستارگان ۸۔ فصل ہشتم صورت وسیرت ستارگان ۹۔ فصل نہم: خواص از روے مدارج ستارگان ۱۰۔ فصل دہم: تعلقات ستار

### باب پنجم

۱۔ فصل اوّل: طریقہ کنڈلی بنانے کا ۲۔ فصل دویم: حقیقت طالع ۳۔ فصل سویم

امتحان صحت زائچہ (الف) امتحان اوّل۔ پدر مولود و قمر کا۔ (ب) مکان پیدائش (ت) امتحان مکان نو۔ (ث) امتحان تعداد عورت زچہ خانہ (ج) امتحان چراغ زچہ خانہ (ح) امتحان چارپائی حاملہ (خ) طریقۂ دریافت بابہ (د) امتحان صحت پرس کنڈلی (زائچہ سوال) ۴۔ فصل چہارم: اقسام خانہ ۵۔ فصل پنجم: منسوبات دروازخانہ ۶۔ فصل ششم: سرخیٔ مدارج ستارگان ۷۔ فصل ہفتم: خواص ستارگان مطابق دروازہ خانہ۔

مجموعی طور پر اس کتاب میں پانچ ابواب ہیں۔ ہر باب میں علم نجوم سے متعلق رموز و نکات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ جابجا ڈائگراموں اور جدول سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اگر کبھی یہ کتاب شائع ہوئی تو اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہوگی۔

## زائچہ پیدائش جو بلخی صاحب نے خود ہی بنایا تھا

عطارد، مریخ و زہرہ
۹
۸
۱۱
ماہتاب
۷
۱۲
ذنب
۶
راس
۵
مشتری
۱
۳
۲
زحل
۴
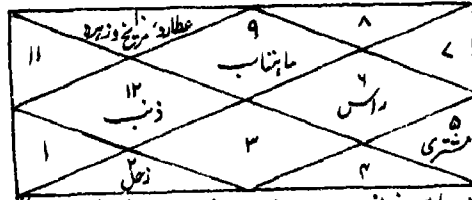
۱۰ فروری ۱۸۸۵ء مطابق ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ روز چہارشنبہ ۳ بجے شب مطابق پھاگن بدی ۱۰ سمبت ۱۹۴۱

۲۔ **تحریک وہابیہ بہار میں:** یہ کتاب انگریزی میں ہے اور اس میں کل ۲۳ ابواب ہیں۔ ابواب کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) The wahabi creed (2) Patna made a centre of the movement (3) character of Patna Muslims (4) Patna Maulavis join Syed Ahmad (5) The doctrine of Hijrat (6) War on the Frontier (7) The Balakot disaster (8) Maulavi Nasiruddin's defeat of Ghazni (9) Wilayat Ali and Enayet Ali as leaders (10) At kanpur (11) Resumption of activities in 1850 and Sermon in the Fort of Delhi (12) Non-cooperation, Passive resistance and paralell government. (13) Enayat Ali against the Britishers (14) Arrest of Wahabi leaders in 1857 (15) British Military expedition to the frontier (16) Maulavi Abdullah resumes leadership (17) Ambala Trial of 1864 (18) Patna Trial of 1869

(19) Confiscation of Properties and destruction of Graves (20) The After-Math (21) Arrest and Convictions of Amir Khan and Hashmat Dad Khan 1869-70 (22) Indiscriminate Proceedings (23) Release in 1884.

علاوہ ازیں صادق پور کے گھروں اور قبرستان کے نقشے وغیرہ خصوصی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے برٹش سامراج کے مظالم کی بڑی سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کتاب کے آخر میں متعدد ضمیمے ہیں جو ۴۲ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب کلاسیکل پبلشنگ کمپنی نئی دلی سے جلد ہی شائع ہو جائے گی۔

۳- آثار بلخیہ :- بلخی صاحب کی یہ تیسری غیر مطبوعہ کتاب ہے یہ تاریخی نام ہے جس سے اس کا سال تالیف ۱۳۴۹ھ نکلتا ہے کتاب کی ابتدا میں بلخی صاحب کی تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم ادھم بلخی، حضرت شمس مظفر بلخی، حضرت حسین نوشہ توحید بلخی جیسے نامور اولیا اور ان کے خاندان کا حال قلمبند کیا گیا ہے ساتھ ہی خاندان بلخیہ کا نسب نامہ بھی ہے۔

اس کے بعد کے باب میں شہر بلخ کے حالات اور حضرت ابراہیم ادھم بلخی کے واقعات ملتے ہیں۔ تیسرے باب کا عنوان ہے 'بلخیوں کی ہندوستان و بہار میں آمد'۔ آگے ایک چھوٹی سی سرخی ملتی ہے 'بلخی شاہزادے کا باغ'۔

چوتھے باب کا عنوان ہے "مولانا شمس بلخی"۔ پانچواں باب ہے 'مولانا بہاء الدین شمس مظفر بلخی' چھٹے باب کی سرخی ہے حضرت حسین ملقب بہ نوشہ توحید بلخی۔ ساتویں باب کی سرخی ہے مولانا حسن بلخی۔ آٹھویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم احمد بلخی ملقب بہ لنگر دریا بلخی'۔ نویں باب کی سرخی ہے 'مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی'، اس باب میں مخدوم محمود بلخی اور مخدوم ابراہیم بلخی کا بھی ذکر آیا ہے اور لکھا ہے حافظ بلخی، مخدوم ابراہیم بلخی کے منجھلے بیٹے تھے۔ آپ ہی کی اولاد سے [illegible] کا نظم و نسق دیکھتی۔ اس کے بعد مخدوم شاہ حبیب بلخی، مخدوم محمود بلخی ابن ابراہیم بلخی کا مختصر ذکر ہے۔ دسویں باب کی سرخی 'مخدوم درویش بلخی'۔ اس کے بعد دو چھوٹے چھوٹے ابواب ہیں۔ ان کی سرخیاں یوں ہیں: "مولوی محمد ابن قاضی طہارت التوحید بلخی و مولوی حمید الدین بلخی متخلص بہ [illegible]"۔ یہاں پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور بھی کچھ لکھنا چاہتا تھا [illegible] کے بعد کے لوگوں کے حالات لکھنے والے تھے

## فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ پدری

حضرت عبد مناف
|
حضرت ہاشم
|
حضرت عبدالمطلب
|
حضرت ابوطالب
|
حضرت علیؓ
|
حضرت امام حسینؓ
|
حضرت زین العابدین
|
حضرت امام علی اصغر
|
سیدنا قاسم
|
امیر سید محمد
|
سید زید
|
سید اسحٰق
|
سید احمد
|
سید یعقوب
|
سید محمد
|
سید ناصر الدین
|
سید امیر سلطان
|
سید سلطان ابراہیم ادہم بلخی قدس سرہٗ
|
سیدنا محمود بلخی
|
سیدنا رکن الدین بلخی
|
سید حمید الدین بلخی
|
سیدنا اسمٰعیل بلخی *

* سیدنا شمس الدین بلخی
(در زمانہ سلطان محمد تغلق عہدہ دیوان شاہی پائی)
|
مولانا قوام الدین بلخی — مولانا سید مظفر بلخی (خلیفہ مخدوم جہاں) — مولانا [illegible] بلخی
|
حضرت مخدوم حسین نوشہ توحید بلخی
|
مخدوم حسن بلخی فردوسی
|
مخدوم احمد لنگر دریا بلخی
|
مخدوم ابراہیم المعروف بہ سلطان بلخی
|
مخدوم شاہین بلخی
|
مخدوم ابراہیم بلخی
|
مخدوم عنبی بلخی
|
حضرت دیوان معین الدین بلخی
|
حضرت دیوان معمور شاہ بلخی
|
حضرت دیوان فخر اسلام بلخی
|
حضرت نعیم اللہ بلخی
|
قاضی سید طہارت التوحید بلخی
|
سید واجد بلخی
|
مولوی سید ڈاکٹر غیاث الدین بلخی
|
حفیظ الدین بلخی — عزیز الدین بلخی — نظام الدین بلخی — فصیح الدین بلخی
|
نادم بلخی

## فصیح الدین بلخی کا نسب نامہ مادری

ملا رکن الدین منیری از اولاد حضرت مخدوم تاج فقیہ در قصبہ منیر شریف
|
ملا عبدالشکور
|
ملا عبدالحکیم
|
ملا عبدالحلیم
|
ملا عبدالرقیب
|
ملا غلام شرف
|
ملا غلام یحییٰ
|
قاضی کمال الحق
|
قاضی امین الحق
|
قاضی واعظ الحق
|
مولوی سید عبدالحق — بی بی مدینہ زوجہ امیر الدین بلخی
|
بی بی ہاجرہ زوجہ ڈاکٹر غیاث الدین بلخی
|
حفیظ الدین بلخی — عزیز الدین بلخی — نظام الدین بلخی — فصیح الدین بلخی ⁂
|
نادم بلخی

⁂ فصیح الدین بلخی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی زیادہ دنوں تک بقید حیات نہیں رہیں۔ دوسری بیوی سے تین اولاد ہوئی، جن میں صرف ایک نادم بلخی رہ گئے۔

۴- **آثار قدیمہ** : اس کتاب کا ذکر فصیح الدین بلخی نے اپنی کتاب تاریخ مگدھ کے مقدمہ میں کیا ہے۔ یہ مخطوط مجلد ہے اور خوش نویس کی تحریر میں ہے۔ سائز ۸ × ۱۲ ہے اور صفحات ۲۴۳ ہیں۔ اس مجلد مخطوط میں کل ۲۰۰ سرخیاں اس طرح ہیں : "عظیم آباد کے جغرافیائی حالات۔ گنگا ندی ، سون ندی، پن پن ندی، مور بر دردیا ندی، پھلگو، متھواس میانہ اور شکری ندی، پہاڑی، عام کیفیت، نباتات، شمار فصل، ربیع، گوبی، آلو کی کاشت، اشجار وغیرہ۔

**قصبہ منیر کا حال** : ۷۹۸ھ کی مسجد، لنگر قلی خاں کی قبر ۹۸۳ھ، بڑی درگاہ اور سنگ صدر کا ذکر، بڑی درگاہ کی مسجد ۱۰۱۴ھ، چھوٹی درگاہ، مخدوم دولت کا مقبرہ ۱۰۳۲ھ، منبر کا کتبہ ۱۰۳۶ھ، چھوٹی درگاہ کی مسجد ۱۰۲۸ھ، مخدوم دولت کا مقبرہ، شاہ دولت کی وفات کا کتبہ ۱۰۱۷ھ، مقبرے کی تعمیر کا کتبہ ۱۰۲۵ھ، قصبہ منیر کی مسجد ۱۱۰۳ھ، دوسری مسجد کا کتبہ ۱۲۱۲ھ، بعض مشاہیر کا ذکر شیر پور کی مسجد ۱۱۵۷ھ، قصبہ داناپور کی بی بی گنج کی مسجد ۱۱۹۷ھ، شاہ محمد اکبر ابوالعلائی قدس سرہٗ کی خانقاہ، کھگول کی مسجد ۱۳۰۴ھ، لان سے شاہ درگاہ ارزان تک ، باقر گنج کی مسجد ۱۲۵۷ھ، تبارک علی کی مسجد ۱۲۰۵ھ، ایک مسجد کا کتبہ جو قبر پہ لگا ہوا ہے' ۱۰۴۰ھ، میں یہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی، اجالت خاں کی مسجد ۱۲۰۴ھ، مسماۃ نورن کی مسجد ۱۲۲۳ھ، ٹھکنا پہاڑی، درگاہ شاہ ارزاں سے مزار کا کتبہ ۱۰۲۸ھ، درگاہ کا کتبہ ۱۰۵۲، شاہ سجادل کا مزار ۱۰۶۳ھ، شاہ شہباز کا مزار ۱۱۳۳ھ، شاہ بسنت کا مزار ۱۱۵۸ھ، شاہ کرم اللہ کا مزار ۱۱۶۱ھ، شاہ غلام حسین کا مزار ۱۲۱۱ھ، شاہ کریم بخش کا مزار ۱۲۵۲ھ، عباد اللہ شاہ کا مزار ۱۲۶۰ھ، کتبہ عیدگاہ ۱۲۵۸ھ، درگاہ کی مسجد ۱۰۷۰ھ، شاہ غلام علی کا مزار ۱۳۰۸ھ

**نمونیہ سے پچھم دروازے تک** : پکی سڑک انگلش روڈ کے انحراف کا حال، شاہ رستم کی قبر ۱۲۳۰ھ، کتبہ ۱۹۲۷، ایک لامعلوم شخص کی قبر اور گنبد، ڈنکے کی املی کی مسجد ۱۱۹۶ھ، ایک مسجد اور ایک لامعلوم قبر اور گنبد، مسجد ۱۲۱۷ھ شاہ باقر کے تکیے کا کتبہ، شاہ حمزہ علی کا کتبہ اور مزار ۱۲۲۶ھ، شاہ کالے کا مقبرہ ۱۱۲۴ھ، لان کی مسجد ۱۲۵۸ھ۔

عدالت کے احاطے میں میجر فاکس کی قبر ۱۷۶۴ء بی بی حاں کی مسجد ۱۲۱۲ھ، بی بی ماد کی قبر ۱۲۲۵ھ۔۔

متصل کٹرہ شائستہ خاں ۱۲۹۶ھ، چوک کی مسجد ۱۲۵۱ھ، خواجہ عنبر کی مسجد ۱۱۰۰ھ، علامہ سیف خاں کے متعلق مدرسہ کی مسجد ۱۰۳۸ھ، عدالت چہل ستون و کلا عظیم آباد، قلعے کے باہر ایک مسجد ۱۲۲۹ھ، خانقاہ مولوی کا قبر۔

**مغل پورہ کے کتبے:** منزلہ بیگم کی قبر ۱۲۱۳ھ، منزلی خانم کی قبر ۱۲۳۳ھ، سید کرامت کی قبر ۱۲۳۳ھ، شیخ احمد علی کی مسجد ۱۲۵۲ھ، شیخ بہاری کی مسجد ۱۲۴۸ھ، خواجہ عطاء اللہ کی قبر ۱۲۶۳ھ، شیخ محمد رفیع کی قبر، مولانا قوام علی کی قبر ۱۲۶۳ھ، علی حسین طلا بخو کی قبر ۱۳۲۰ھ، حاجی عباس کی قبر ۱۳۴۴ھ، منظر حسین کی مسجد ۱۲۴۰ھ، منظر حسین کی مسجد ۱۳۰۳ھ، میاں خاں کی قبر ۱۲۷۱ھ۔

**بجگی چوراہا، گلشن حیدری، کنگھیا ٹولہ، سنار ٹولی، شاہ کی املی، لودی کٹرہ اور دونڈی بازار کا حال:** یام صاحب کی مسجد ۱۲۴۳ھ، باقی کی مسجد ۱۲۰۵ھ، میر قطب الدین کی قبر ۱۱۸۳ھ، گورستان سید علی عظیم کی قبر ۱۲۳۴ھ، سید نظام الدین کی قبر ۱۳۰۵ھ، گمشتو بی بی کی قبر ۱۳۴۱ھ، گلشن حیدری و گلشن حیدر کی مسجد، امام باڑہ گلشن حیدری میں جڑا کتبہ ۱۲۵۰ھ، محبوب علی کی قبر ۱۲۶۱ھ، نواب یوسف علی خاں کی قبر ۱۳۱۴ھ، عبدالحق خاں کی قبر ۱۳۲۱ھ، قبر کلثوم بی بی، بشارت حسین کی قبر ۱۳۰۸ھ، محمد ذاکر کی قبر ۱۳۲۲ھ، سنار ٹولی میں مرزا معشوق کی قبر ۱۳۱۳ھ، محلہ باغ میر گلاب میں شاہ ولایت علی کی قبر ۱۲۲۱ھ، محلہ شاہ کی املی میں ایک مقبرہ ۱۲۱۲ھ، کشمیری کوٹھی میں فضل علی کی مسجد ۱۲۵۷ھ، کنگھیا ٹولہ میں چند کتبے، شیخ غلام یحییٰ حضور کی مسجد ۱۲۰۷ھ، شیخ غلام یحییٰ کی قبر، مرادالنساء کی مسجد ۱۲۳۴ھ، لودی کٹرہ میں دوسری مسجد ۱۲۲۳ھ، حکیم احمد حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، ایک گنبد کی مسجد یادونڈی بازار کی مسجد ۱۰۶۱ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۰۵۰ھ۔

**منگل روڈ کا حال:** پیار النساء کی قبر ۱۱۹۹ھ، منگل تالاب چوک شکار پور کی مسجد ۱۲۰۰ھ، چوک شکار پور کتبہ کی دوسری مسجد، حاجی تاتار کی مسجد، منشی کاظم علی کی مسجد ۱۲۴۱ھ، منشی کاظم علی کی قبر کا کتبہ ۱۲۴۸ھ، حاجی منظور علی خاں کی مسجد ۱۲۱۷ھ، محلہ ڈھول پورہ شیر شاہی محلہ محمد مراد شہید صوفی کا کتبہ ۹۴۹ھ، اشرف علی خاں کی قبر کا کتبہ ۱۱۸۶ھ، مرزا عزیز کی قبر ۱۲۴۳ھ، حسینی بیگم کی مسجد ۱۲۴۲ھ، قبر سید اقبال رضوی بنا سید حیدر علی رضوی المعروف بہ جمال حسین ۱۲۲۹ھ، نجف النساء بیگم کی قبر ۱۲۶۷ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد ۱۰۲۰ھ، ڈھائی کنگرہ کی مسجد کا دوسرا کتبہ ۱۲۰۷ھ، محمد عادل کی قبر ۱۲۰۸ھ، میر افضل کا مقبرہ ۱۱۸۳ھ، میر اشرف کی وفات کا قطعہ تاریخ ۱۱۸۸ھ، میر غلام حسین کی

مسجد ۱۲۹۳ھ، افضل راج کی مسجد، شاہ منصور کی قبر۔

**نواب ہیبت جنگ کا مقبرہ:** واقع محلہ بیگم پور ۱۱۴۸ھ، افضل حسین کی قبر ۱۰۶۲ھ، حاجی علی بخش کی مسجد، کلثوم النساء کی مسجد، شاہ ملک کی مسجد، شاہ کرک کی مسجد ۱۳۵۴ھ، شاہ کیرک کی قبر، سرائے کی مسجد اور آمنے سامنے والی مسجد، عبدالرحمان سجاد کی مسجد ۱۱۵۰ھ، تھانہ مال اسلامی میں ایک قبر کا کتبہ بغیر نام و تاریخ، ڈلیس کوٹھی اور بزرگ کی قبر ۱۷۹۰ء، مسجد سیرہ میر کے پاس ایک لڑکے کی قبر ۱۲۱۹ھ۔ مسجد پیر ڈریا گنگا ندی کے کنارے، منجھلی بیگم کی قبر ۱۲۸۲ھ، شاہ ڈریا کی قبر، محلہ نون گولہ کی مسجد، شاہ قاسم علی کا مقبرہ، شاہ علی کا مقبرہ، شاہ علیم اللہ کی قبر ۱۱۵۵ھ، محمد حسین ولد مصنف سیر المتاخرین، غلام حسین کی قبر ۱۱۹۸ھ، باڑے کی مسجد ۱۲۰۷ھ، عالی النساء بیگم کی مسجد ۱۲۴۴ھ، بزرگ امجد کی مسجد ۱۱۰۳ھ، شاہ غلام حسین کی مسجد ۱۲۵۵ھ، مولوی نہال حسین کی قبر ۱۱۴۰ھ، فرزند علی کا امام باڑہ ۱۲۳۰ھ، گلن کا مقبرہ، کٹرہ مال اسلامی میں ایک قدیم مسجد، پولیس چوکی کے پاس، ایک مندر، باغ جعفر خاں، قدم رسول کی مسجد، نادر گنج محمد علی خاں کی قبر ۱۱۰۸ھ، نوری حیدر کا مقبرہ، بوا جی کی باؤلی، سبل پور کا حال، مخدوم شہاب الدین پیر جگجوت کا مزار (کچی درگاہ)، شاہ آدم صوفی (پکی درگاہ)، اللہ جلالی کی قبر ۱۲۳۸ھ، بجھلی کی مسجد ۱۳۱۰ھ۔

مجلد حصے کے علاوہ اس سائز پر قصبہ سہسرام کا حال درج ذیل ہے:

قصبہ سہسرام و عالمگیری مسجد، آثار قدیمہ سہسرام و تاراچنڈی مندر، حسین نور کا مقبرہ، حسین نور کے مقبرے کی مسجد، شیر شاہ کا مقبرہ، ایک عجیب صفت، عیدگاہ کے کتبے، دائرے جانب والا کتبہ، اندر بائیں کا کتبہ، دکھن جانب والا کتبہ، سرمست خاں کا روضہ، علاول خاں کا روضہ، صفدر جنگ کا قلعہ، حمام چندن پہاڑی کے پاس مسجد ۱۰۲۲ھ، ایک قبر کا کتبہ ۱۱۹۳ھ، مہدی حسین کی قبر ۱۲۰۱ھ، امام باڑے کا کتبہ ۱۱۹۱ھ، جانی بازار میں ایک مسجد ۱۱۰۵ھ، جانی بازار میں امام باڑہ ۱۲۰۰ھ، ارن رائے کی مسجد ۱۰۹۸ھ، ۱۲۹۷ھ کا عجیب کتبہ۔

اس کے بعد کاپی سائز پر آٹھ صفحات میں اورنگ آباد کا حال ہے۔

**قصبہ اورنگ آباد:** عبدالعلی خاں کی مسجد ۱۱۳۰ھ، موضع سرس شمس الدین خاں کی مسجد ۱۱۰۱ھ، غلام مصطفیٰ کی قبر ۱۲۱۸ھ، نواب غلام حسین کی لڑکی کی قبر کا کتبہ ۱۲۸۳ھ، قصبہ

اُو دِ نگل، مسماۃ فراست کی قبر ۱۲۶۶ء ہے

دستورِ سخن : تجلّی صاحب اس کتاب کا صرف پہلا صفحہ صاف کر سکے تھے ، باقی اوراق سودہ صورت میں ان کے پوتے سید ظفر تجلّی کے پاس محفوظ ہیں، جو ان پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔

صاف شدہ حصّے کے مندرجات : اُردو کی ماہیت، وجہ تسمیہ، اردو کا ارتقا، حروفِ تہجی کی قسمیں، حروفِ تازی کی قسمیں اور اعراب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک سرخی، اصطلاحات کی ملتی ہے جس میں حذف و ترخیم، تخفیف، اشباع و ازالہ، تحریک و تسکین، قلب، تبدیل ابواب مترادف مشترک و توالی، قیاسی و سماعی اور اشتقاق سے متعلق لکھا گیا ہے۔

اس کے بعد "فصاحت" کی سرخی ملتی ہے۔

اس میں تنافر، اتصال، توالی، اضافت، ضعفِ تالیف، مخالفت قیاس، فک اضافت اور استعمال کا بیان ملتا ہے۔

اس کے بعد تکرار اور حشو کی سرخیاں ملتی ہیں۔

اس کتاب میں، حروفِ تہجی سے لے کر قواعد، فن عروض وغیرہ سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

●●

وسیم احمد اعظمی

# خدابخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات

علی ابن سینا (۹۸۰ — ۱۰۳۷ء) کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں محققین کا کافی اختلاف ہے۔ سب سے قدیم اور معتبر ماخذ ابو عبید عبد الواحد بن محمد فقیہ جوزجانی (متوفی ۴۳۸ھ) کی مرتب کردہ سوانح ابن سینا ہے۔[1] ابن ابی اصیبعہ، ابو الحسن بیہقی، شہرزوری اور ابن القفطی نے اسی سوانح کو بنیاد قرار دیا ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے اس سوانح کے حوالہ سے تصانیف ابن سینا کی تعداد ایک سو ایک[101] بتائی ہے۔ لیکن اس سوانح کے دوسرے نسخہ مطبوعہ قاہرہ میں دو کتابوں کا اضافہ ہے اور نسخہ مطبوعہ انجمن دوستداران ایران میں تین کتابوں کا اضافہ ہے۔ اس طرح ان کی تعداد ۱۰۶ ہو جاتی ہے ——— دوسرے تذکرہ نگاروں میں حاجی خلیفہ نے ۶۲، بروکلمان نے ۹۹، ذبیح اللہ صفا نے ۲۳۸، یحییٰ مہدوی نے ۲۴۲، جورج شحاتہ قنواتی نے ۲۷۶ اور سعید نفیسی نے ۴۵۶ کتابوں کو ابن سینا کی طرف منسوب کیا ہے۔[2] سعید نفیسی اپنی فہرست کے بارے میں لکھتے ہیں: "ممکن است در فہرست برخی نامہا تکرار نامی دیگری باشد. و یک کتاب یا رسالہ را بدو نام ذکر کردہ باشند۔"[3]

سعید نفیسی نے ابن سینا کے جشن ہزار سالہ کے موقع پر ابن سینا کی سوانح متعلق استنبول کا جو نسخہ (فوٹو کاپی) حاصل کر کے ایڈٹ کیا ہے اور اپنے فارسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے اس میں تصانیف ابن سینا کی تعداد صرف ۹۵ ہے۔[4]

خدابخش لائبریری میں ابن سینا کے جو مخطوطات اس وقت فراہم ہیں،[5] ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

## ۱۔ رسالہ فی تفسیر قل ھو اللہ احد: ہینڈ لسٹ ۲/۲۵۹۰ (عربی) ص نستعلیق

---

۱۔ اس سوانح کا کچھ حصہ خود ابن سینا کا املا کرایا ہوا ہے، اس حصہ کی انتہا اس شعر پر ہوتی ہے جب ابن سینا امیر قابوس سے ملنے کی سعیٔ ناکام کے بعد جرجان لوٹ آیا تھا اور وہیں ابو عبید جوزجانی اس سے وابستہ ہوا تھا۔

لما عظمت فلیس مصر واسعی     لما غلا ثمنی عدمت المشتری

اس کے بعد کا حصہ جوزجانی کا تالیف کردہ ہے۔ ۲۔ ملخص از رسالہ جودیہ ص ۳۲ از حکیم سید ظل الرحمن۔ ۳۔ ایضاً ص ۳۳

۴۔ اس کا اردو ترجمہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن۔ نئی دہلی نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا ہے۔

۵۔ حکیم سید ظل الرحمن نے خدابخش لائبریری میں [illegible] کے نام سے ابن سینا کا ایک مخطوطہ [illegible] رسالہ جودیہ ص ۵۶ مطبوعہ فہرست خدابخش میں بھی اس کا اندراج ہے لیکن مخطوطہ موجود نہیں ہے۔ ہماری تحقیق سے معلوم ہوا کہ اصل نسخہ کو نہیں دیکھا گیا تھا بلکہ مطبوعہ فہرست پر ہی اکتفا کیا گیا تھا۔ (مکتوب بنام وسیم احمد)

گیارھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ رسالہ فی تفسیر قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ الفلق :۔ ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۳ (عربی) ۳ ص نستعلیق

اس میں تین صفحات ہیں۔ تقریباً گیارھویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۳۔ رسالہ فی تفسیر قُلْ اعوذ برب النّاس : ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۴ (عربی) ۲ص

نستعلیق۔ اس میں دو صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۴۔ تفسیر کا[1] ایک فارسی نسخہ ہینڈ لسٹ ۱۶۴۴ بھی ہے۔ اس میں سورۃ الاخلاص والمعوذتین

کی تفسیر بھی شامل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۳ ویں صدی ہجری کا

۵۔ الارجوزۃ السینائیۃ[2] : ہینڈ لسٹ ۲۲۵۹/۳ (عربی) نستعلیق، کاتب چُنّی لال

اس میں تقریباً بارہ سو انتیس اشعار ہیں۔ ارجوزہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

الحمد للہ الملک الواحد رب السموات العلی الماجد

ارجوزہ کے ابتدائی ۱۵ اشعار حمد باری تعالی پر مشتمل ہیں ۔ ۱۶ ویں شعر سے باقاعدہ موضوع طب کا

آغاز ہوتا ہے۔ شعر یہ ہے : الطب حفظ صحۃ وبرء مرض من سبب فی بدن منہ عرض

موسیٰ ابن ابراہیم البغدادی نے "الجوہر النفیس" کے نام سے اس ارجوزہ کی جو شرح لکھی ہے اس کا

آغاز بھی اسی شعر سے ہوتا ہے ۔۔۔ ارجوزہ کے آغاز سے قبل چھ صفحات پر مشتمل ایک مضمون میں ارجوزہ کی

عروضی حیثیت پر فاضلانہ گفتگو کی گئی ہے۔ مزید پانچ صفحات پر مشتمل ابن سینا سے منسوب ایک مقدمہ ہے جو

اطبا کے طبی شعری سرمایہ کا سرسری جائزہ لینے کے بعد تحریر ہے :

" واتبعت سنن الحکماء فخدمت حضرۃ سیدنا الفقیہ الاجل القاضی

السنی المحل اطال اللہ بقاہ وادام عزہ وعلاہ ....... بھذہ الارجوزۃ المشتملۃ ....."

---

۱۔ اس مجموعہ کے آغاز و اختتام پر تین مُہریں ثبت ہیں، ایک مُہر کسی کتب خانہ میں اندراج کی نشاندہی کرتی ہے۔ امجد علی شاہ والی اودھ کی ہے، تیسری تقریباً غیر واضح ہے۔ صرف ۱۲۴۴ھ پڑھا جا سکتا ہے۔

۲۔ اس کا دوسرا نام " الارجوزۃ فی الطب " یا " الفیۃ الطبیۃ معروف بہ ارجوزۃ السینائیۃ بھی ہے۔ اختتام کی عبارت ہے : " تمت الارجوزۃ السینائیۃ بعون الخالق البریۃ " مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ج ۱ میں " الارجوزۃ فی الطب " تحریر ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۲۶۱ھ میں مطبع مصطفائی سے شائع ہو چکا ہے۔ ابن سینا کی فارسی کتب کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اس کی عربی تصانیف کا ترجمہ ہیں۔ (جشن نامہ ابن سینا ص ۶۴)

ارجوزہ کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے :

وقد فرغت من جمیع العمل　　والآن اقطع[1] بقول مکمل

یہ ارجوزہ طب علمی و عملی پر منقسم ہے۔ اس میں کلیات، معالجات، حفظ صحت اور ادویہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس ارجوزہ کی متعدد زبانوں میں شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں شرح ابن رشد، الجوہر النفیس شرح ابن طملوس، شرح عبدالحمید ابن حتبۃ اللہ، شرح محمد ابن اسماعیل اور شرح احمد بن محمد بن المنہار کافی مشہور ہیں۔ خدا بخش لائبریری میں الجوہر النفیس کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔ لاطینی زبان میں بھی اس پر کام ہوا ہے۔ اردو میں حکیم عبدالعزیز بٹالوی نے جواہر النفیس کے نام سے اس کا ترجمہ مع شرح کیا ہے۔

۶۔ ترجمہ قول الحکیم تیاذق[2] فی حفظ الصحۃ[3] :۔ ہینڈلسٹ[4] ۲۵۵۹/۴، ۳ ص، نستعلیق، کاتب چنی لال کھتری ۱۱۲۵ھ فارسی و عربی مخطوط ہے۔ اس میں ۲۱ اشعار ہیں۔ ۱۱ اشعار عربی میں ہیں اور ۱۰ فارسی میں۔ حکیم تیاذق کے حفظ صحت سے متعلق اقوال کے عربی ترجمہ کا پہلا شعر ہے :

توق اذا استطعمت[5] ادخال مطعم　　علی مطعم من قبل فعل الہواضم

آخری شعر :۔ خصال بہا اوصی الحکیم تیاذق　　اخا العدل نوشیروان ملک الاعاجم

فارسی ترجمہ کا پہلا شعر ہے :

تا طعامی نگذرد از معدہ بالای آن　　ہر طعامی کان خوری باشد ترا عین زیان

آخری شعر :۔ پس بکن توفیر دائم بر بدن بشنو ز من　　کان بود بہر ستون، بہر قوای مردمان

۷۔ الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ[6] :۔ ہینڈلسٹ ۲۶۰۰/۴ (عربی) ۹ ص۔ اس میں ۱۳۸ اشعار ہیں۔ فصول اربعہ کی تعریف، افلاک کی گردش اور بروج وغیرہ سے پیدا شدہ عوارضات وامزجہ

---

۱۔ الجوہر النفیس ص ۳۱۱، از موسیٰ بن ابراہیم البغدادی، متوفی ۸۲۶ھ میں "اقطعہ" تحریر ہے۔

۲۔ حجاج بن یوسف، متوفی ۷۱۴ء کا طبیب خاص۔ ۹۰ ہجری میں "واسط" میں فوت ہوا۔ (تاریخ الاطبا ص ۱۲)

۳۔ حکیم سید ظل الرحمن نے اس کا نام "وصیۃ حفظ الصحۃ (قصیدہ میمنہ)" تجویز کیا ہے۔ (مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۴۲)

۴۔ مطبوعہ فہرست مجمل میں اس کو ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۳ کے ساتھ شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک علاحدہ ارجوزہ ہے لیکن نسخہ مطبوعہ مصطفائی ۱۲۶۱ھ میں الارجوزۃ السینائیہ کے ساتھ ہے۔

۵۔ برلن کے نسخہ میں "اذا ما شئت" ہے۔ (مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۴۲)

۶۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۳۲، ج ۲ میں "رسالہ منظومہ لابن سینا" تحریر ہے۔ لیکن دوسرے تذکروں میں واضح طور پر "الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ" مذکور ہے۔

ا بیان ہے۔ آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے :

یقول راجی ربہ ابن سینا　　　ولم یزل بالله مستعینا

ور اختتام اس شعر پر:　محمد و آلہ و عترتہ　　　القائمین بعدہ بسنتہ

حکیم سید ظل الرحمٰن اس ارجوزہ کے ایک نسخے کی نشاندہی برلن کے کتب خانہ میں کرتے ہیں۔[1] ان کی
ریر کے بموجب اس ارجوزہ کا ابتدائی شعر یہ ہے :

اما الفصول اربع فی العام　　　دائرۃ فیھا علی الدوام

یکن یہاں کے نسخے میں ارجوزہ کا یہ پچیسواں شعر ادر ترمیم کے ساتھ اس طرح ہے :

ثم الفصول اربع فی العام　　　دائرۃ فیہ علی الدوام

طرح گویا یہاں کے نسخے میں ۲۴ اشعار زیادہ ہیں اور یہ نسخہ برلن کے نسخے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ مخطوطہ عربی نسخ میں ہے۔ کاتب
ا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ مطبوعہ فہرست مخطوطات مجل عربی مفتاح الکنوز، ج ۲، ص ۴۲۷ میں گیارہویں
صدی ہجری کا قرار دیا گیا ہے، لیکن میرے خیال میں اس سے زیادہ قدیم ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ ۲۶۳۷/۳ بھی موجود ہے۔ یہ سات صفحات پر مشتمل ہے اور
۹ اشعار ملتے ہیں۔ ابتدائی شعر میں ترمیم کا پتہ چلتا ہے جو یہاں اس طرح ہیں :

یقول راجی عفو ربہ ابن سینا　　　ولم یزل بالله مستعینا

۲۵ ویں شعر میں بھی ترمیم ملتی ہے، شعر اس طرح ہے :

ثم الفصول اربعۃ فی العام　　　دائرۃ فیہ علی الدوام

یہ ارجوزہ مندرجہ ذیل پر ختم ہوتا ہے :-

وبعد ھذا انتظر الزمانا　　　معتدلا ایفا کما قد کانا[2]

ر ہینڈ لسٹ ۲۶۰/۱۲ میں اس کے بعد بھی ۳۹ اشعار ملتے ہیں۔ اس نسخے میں موسم سرما کا آخری شعر اسی کو
رار دیا گیا ہے جب کہ ہینڈ لسٹ ۲۶۰/۱۲ موسم سرما کے اختتام کے بعد دوسری بحث کا پہلا شعر قرار دیا گیا ہے۔
نسخہ خط نسخ میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے لیکن تقریباً بارہویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

---

۱۔ مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۱۵　　۲۔ ہینڈ لسٹ ۲۶۰/۱۲ میں مناسب ترمیم کے ساتھ شعر اس طرح ہے:

وبعد ھذا انتظر الزمان　　　معتدلا اذ کما قد کان

۸۔ الرسالۃ فی الفصد: ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۶ (عربی) ۳ص نستعلیق۔ یہ ۱۳ بابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں فصد کی تعریف، اغراض و مقاصد، نقصانات، فصّاد کی ذمہ داریوں اور فصاد کھولنے کے بعد کے عوارضات کا ذکر ہے۔ کتابت نستعلیق میں ہوئی ہے۔ مخطوط تقریبًا تیرھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۲ بھی موجود ہے، جو ۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۹۔ الرسالۃ فی حفظ الصّحۃ: ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۷ (عربی) ۱۶ص۔ یہ ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں حفظ صحت اور اس کے مبادیات بیان کئے گئے ہیں۔ فصد، حجامت اور اسہال پر بھی ضمنی طور پر گفتگو کی گئی ہے۔ مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ خط کو مدنظر رکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ شاید اس کا کاتب بھی وہی ہے جس نے ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۶ کی کتابت کی ہے۔ اس طرح تخمینی طور پر اس کو بھی ۱۳ ویں صدی ہجری کا قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۳ بھی موجود ہے۔ یہ ۹ صفحات اور ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۔ الرسالۃ فی شطر الغب[۱]:۔ ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۸ (عربی) ۶ص نستعلیق۔ یہ ۶ صفحات اور ۶ فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں شطر الغب کی شناخت، عوارضات اور اصول علاج کو بیان کیا گیا ہے۔ کاتب وہی ہے جس نے ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۶ و ۲۵۵۹/۷ کی کتابت۔ اس طرح یہ مخطوط بھی تقریبًا ۱۳ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۴ بھی ہے۔ یہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ اندازاً ۱۴ ویں صدی ہجری کا ہے۔

۱۱۔ الرسالۃ فی الحرارۃ الغریزیۃ[۲]:۔ ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۹ (عربی) ۵ص۔ جسم انسانی کی حرارتِ غریزیہ پر ایک فاضلانہ مضمون کے بطور متعارف ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اگرچہ تحریر

---

۱۔ مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۳۷۵، ج ۲ میں مصنف کے نام کا اندراج نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ابن سینا کا مشہور رسالہ ہے۔

۲۔ چونکہ مخطوطہ میں رسالہ کا نام تحریر نہیں تھا۔ غالبًا اسی سبب مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۳۷۵، ج ۲ میں مصنف کے نام کا اندراج نہیں کیا گیا۔ یہ ابن سینا کے رسائل میں سے ایک ہے۔

نہیں ہے لیکن مجموعہ کی کتابت غالباً چنی لال نے امجد علی شاہ کے وقت میں ۱۲۶۱ھ کے قریب کی ہے۔ کیونکہ بعض مخطوطوں پر جو مہریں ثبت ہیں وہ واضح طور پر اس کی نشاندہی کرتی ہیں۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۵ بھی ہے۔ یہ ۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۲۔ الرسالۃ للشیخ فی الاسئلہ والجواب[۲]:۔ ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۱۵ (عربی) ۴ ص نستعلیق۔ یہ طب سے متعلق ان ۱۵ سوالوں کے جواب پر مشتمل ہے جو اس سے مختلف اوقات میں کئے گئے تھے۔ کتابت غالباً چنی لال نے ۱۳ ویں صدی ہجری میں کی ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۶ بھی ہے۔ یہ ۸ صفحات پر مشتمل ہے بطور فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص۱۹۱، ج ۳ میں اس کا نام "مسائل معدودہ" درج ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۳۔ الرسالہ الموسومہ بالفصول[۳]:۔ ہینڈلسٹ ۲۵۵۹/۱۶ (عربی) ۵۷ ص، اس میں ۸۷ فصول ہیں۔ اس میں ابن سینا کے ان خطبات کو جمع کیا گیا ہے جو انھوں نے درس میں دیئے تھے۔ خط نستعلیق میں اس کی کتابت چنی لال نے ۱۲۷۵ھ میں کی ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈلسٹ ۳۴۸۷ بھی ہے۔ یہ ۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص۱۹۱، ج ۳ میں اس کا نام " رسالہ معرفۃ النفس والنبض[۴]" درج ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

---

۱۔ مخطوط میں "الرسالہ فی الحرارۃ" تحریر ہے۔

۲۔ مخطوطہ کے آغاز کی عبارت یہ ہے " ھذہ مسائل معدودۃ من املاء الشیخ الرئیس ابن علی سینا " مفتاح الکنوز ص۳۷۵، ج ۲ میں " رسالہ فی الاسئلہ والاجوبہ" تحریر ہے۔

۳۔ اختتام کی عبارت مندرجہ ذیل ہے، " تمت الرسالہ الموسومہ بالفصول المستفادہ من مجلس الشیخ الجلیل رئیس الحکماء ابن علی بن سینا "

۴۔ حکیم سید ظل الرحمٰن نے ابن سینا کے جن تین نادر مخطوطات کا ذکر کیا اور اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ وہ صرف ہندوستان ... فی معرفۃ النفس و النبض " بھی ہے، اس کو وہ ابن سینا کے نادر رسا...

**۱۴۔ الرسالہ فی الھندباء:۔** ہینڈلسٹ ۳۴۷۹ (عربی) ۵ص۔ اس رسالہ کی تالیف کے محرکات میں، یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے ابن سینا سے ھندباء (کاسنی) کے منافع اور ھندباء غیر مغسول کے استعمال سے پیدا شدہ عوارضات کے بارے میں ایک رسالہ لکھنے کی فرمائش کی تو انھوں نے برجستہ یہ رسالہ لکھ ڈالا۔[1]

اس کو ڈاکٹر سہیل انور نے آستانہ سے شائع کرایا ہے۔ کتب خانہ مجلس شوریٰ میں یہی کتاب "رسالہ فی خواص الکاسنی" کے نام سے ہے ـــــــ خدا بخش لائبریری کا یہ مخطوطہ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

**۱۵۔ الرسالۃ فی السکنجبین:۔** ہینڈلسٹ ۳۴۸۰ (عربی) ۴ص، نستعلیق۔ اس کو ابن سینا نے اپنے ایک معاصر[2] کے لئے سکنجبین کے فوائد پر لکھا تھا۔ اس میں سکنجبین سے متعلق قدیم یونانی اطبا کی آراء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۴ ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے اُردو ترجمہ حکیم تبارک کریم تکمیلی مرحوم نے کیا ہے۔

---

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ)

"رسالہ فی النفس" اور رسالہ "فی النبض" کے علاوہ تیسرا رسالہ قرار دیتے ہیں اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کی موجودگی کی نشاندہی کرتے ہیں، جب کہ خدا بخش لائبریری میں موجود "الرسالۃ الموسومہ بالفصول" اور "رسالہ معرفۃ النفس والنبض" ایک ہی رسالے ہیں۔ ایسی صورت میں جب تک نسخہ محفوظ آصفیہ حیدرآباد دیکھ نہیں لیا جاتا اس کی بابت حتمی طور پر کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔

۱۔ عبارت اس طرح ہے:۔ "سئل الشیخ الرئیس ابوعلی بن عبداللہ بن سینا رحمہ اللہ علیہ ان یملی کتاباً کاملۃ فی علۃ امرۃ باستعمال الھندباء غیر مغسول فاخذ الدرج وکتب ارتجالاً"

۲۔ عبارت اس طرح ہے:۔ "رسالۃ الشیخ الرئیس ابی الحسن بن عبداللہ بن سینا قدس نفسہ سألت یا ابا سعید اسعدک اللہ فی جمیع الرک ان ارسم لک جمل منافع الشراب المسمی سکنجبینا واعلمک الحق فی المساجۃ التی جرت بینک وبین نفر من الاطباء فی امر السکنجبین الساذج"

**۱۶- الادویۃ القلبیہ[1]:-** ہینڈ لسٹ نمبر ۳۳۸[2] (عربی) ۳۸ص، نستعلیق۔ اس میں قلب اور ادویہ قلبیہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ابن سینا نے اس کو اپنی پہلی آمد ہمدان پر شریف سعید ابوالحسن علی بن حسین الحسینی کے لئے لکھا تھا ــــــ ابن سینا کے اس رسالہ پر متعدد زبانوں میں کام کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں حکیم عبداللطیف فلسفی (متوفی ۱۹۷۰ء) نے اس پر کام کیا ہے اور ایک پُرمغز مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ "القانون" کے بعد ابن سینا کی جس کتاب کی سب سے زیادہ پذیرائی ہوئی ہے وہ یہی ہے۔ نسخہ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

**۱۷- الرسالۃ فی القولنج:-** ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۸۸ (عربی) ۴۸ص، نستعلیق۔ اس میں تین مقالات ہیں جس میں امعاء، ان کے افعال، قولنج کی تعریف، اقسام اور اسباب و علامات کے علاوہ قولنج کے مریضوں کے تحفظ و علاج کا بھی ذکر ہے۔ ابن سینا نے اس رسالہ کو قید کے ایام میں قلعہ فردجان میں لکھا تھا۔ یہ رسالہ مکمل صورت میں نہیں پایا جاتا[3]۔ ۱۴ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے ــــــ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن سینا جو قولنج کے علاج کا ماہر تھا، اور اس بنا پر شمس الدولہ کے دربار تک رسائی ہوئی تھی، مرض قولنج ہی میں فوت ہوا۔

**۱۸- رسالہ فی الکیمیا[4]:-** ہینڈ لسٹ نمبر ۲/۲۵۲۶ (عربی) ۹ص، نسخ ۹ فصلوں پر منقسم ہے۔ ابن سینا نے یہ رسالہ شیخ ابوالحسن سہل بن محمد السہیلی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ مجموعہ ہینڈ لسٹ نمبر ۲۵۲۶ کے آخر میں کاتب کا نام سید اصغر حسن کشمیری تحریر ہے اور سال کتابت ۱۲۵۸ھ ہے۔ چونکہ مجموعہ کا خط ایک سا ہے اس لئے قوی احتمال ہے کہ کاتب نے ہر رسالہ کے اختتام پر نام لکھنے کی بجائے مجموعہ کے آخری رسالے پر نام لکھنا زیادہ مناسب تصور کیا ہو۔

---

۱- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۱۹۱، ج ۳ میں "الاحکام الادویۃ القلبیہ" آئینہ سرگزشت ص ۳۱ میں "کتاب الادویۃ القلبیۃ" مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۳۶ میں "الادویۃ القلبیۃ" اور ص ۳۶ پر "رسالہ فی احکام الادویۃ القلبیۃ" (کتاب الادویۃ القلبیۃ) لکھا ہے۔ انگریزی ترجمہ تفصیلی تعلیقات کے ساتھ حکیم محمد سعید صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کے اہتمام سے ہمدرد (ہندوپاک) نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔

۲- غالباً یہ وہی نسخہ ہے جس کی نشاندہی حکیم سید ظل الرحمٰن نے مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۵۷ پر شفاء الملک حکیم سید مظاہر حسن پٹنہ کے ذاتی ذخیرہ میں کی ہے۔ میرے خیال میں موصوف نے شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد (متوفی ۱۹۵۸ء) کو غلطی سے شفاء الملک حکیم مظاہر حسن لکھ دیا ہے۔ شبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ اب شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد کے یہاں سے آکر خدا بخش لائبریری پٹنہ کے مخطوطات ــــــ میں موجود ہے نیز شفاء الملک کا خطاب یافتہ مظاہر حسن نام کا کوئی طبیب عظیم آباد میں نہیں گزرا۔ اس بارے میں میں نے حکیم محمد اسرار الحق مؤلف "تاریخ اطبائے بہار" سے بھی رجوع کیا تو انہوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔ اس لئے شبہ کو اور بھی تقویت ملی۔

۳- عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ورق ۱۷۹/ب قلمی نسخہ۔

۴- [illegible]

۱۹- رسالۃ مختصرۃ فی معرفۃ ترکیب الروح والنفس والجسد[1] : ہینڈ لسٹ ۲۵۲۶/۳

اس میں ۵ فصول ہیں جس میں تصعید، تحلیل، تجزیہ اور تدبیر وغیرہ کا ذکر ہے۔ کتابت غالباً سید اصغر حسن کشمیری کی ہے۔ اس لحاظ سے تقریباً ۱۲۵۰ھ میں کتابت ہوئی ہوگی۔ یہ ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۰- القانون فی الطب : ابن سینا کی شہرۂ آفاق اور مہتم بالشان تالیف ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے لکھا ہے کہ "اگر بقراط و جالینوس کو حیات نو مل جائے تو وہ ابن سینا کے قانون کے آگے سجدہ ریز ہوں"[2]۔ سر ولیم آسلر نے اسے "میڈیکل بائبل" کہا ہے[3] ــــ ابن سینا نے جرجان میں قیام کے دوران ابو محمد شیرازی کے مکان میں "القانون" لکھنا شروع کیا تھا جس کی تکمیل ہمدان میں ہوئی۔ القانون کی پذیرائی ابن سینا کی حیات[4] میں شروع ہوگئی تھی۔ اس کی شروح و حواشی کا آغاز بھی ابتدائی عہد سے ہوگیا تھا۔ دنیا کی تمام علمی زبانوں، لاطینی، فرانسیسی، جرمنی، ازبکستانی، انگریزی، عبرانی، فارسی اور اردو میں اس کے ترجمے ہوئے اور شرحیں لکھی گئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ قرون وسطیٰ میں عربی میں اس کی شرح حاشیہ یا تلخیص معیار علم اور کمال فن کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا۔ یہ کچھ اس عہد کا مزاج بھی تھا۔ لیکن کسی طبی کتاب کی نہ اس قدر شرحیں لکھی گئیں اور نہ اس کثرت و عقیدت سے کسی کا مطالعہ کیا گیا۔[4]

دس لاکھ سے زیادہ الفاظ پر مشتمل یہ تصنیف محض ایک کتاب نہیں ہے، بلکہ تمام طبی علوم کا مجموعہ ہے جس میں ہر شعبۂ فن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے[5]۔ اس میں پانچ کتابیں شامل ہیں۔ پھر ہر کتاب کی متعدد قسمیں ہیں جن کو فنون، تعلیم، مقالات اور فصول وغیرہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہاں اس کے متعدد قیمتی نسخے موجود ہیں، جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۶۰ "القانون" کے کتاب اول پر مشتمل یہاں کے "القانون" کا قدیم مخطوطہ ہے۔ اس میں ۴۴۲ صفحات ہیں۔ کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ خط نسخ میں اس کی کتابت ۷۲۶ھ میں ہوئی۔ ناقص الآخر ہے۔

ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۵۴ "القانون" کے کتاب اول و ثانی[6] پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۲۰ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت نفیس خط نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی نے ۱۰۱۲ھ میں کی ہے۔

---

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن مخطوطہ میں یہ عبارت کہیں بھی مندرج نہیں ہے۔ مخطوطہ کی ابتدائی عبارت اس نام کی نشاندہی کرتی ہے "فصل مختصر فی معرفۃ ترکیب الروح والجسد" آئینہ سرگذشت صفحہ ۲۳ میں غالباً اسی کا نام "رسالہ الی السہلی فی امر مستور الکیمیا" تحریر ہے۔

۱- مخطوطہ میں صرف "معرفۃ ترکیب الروح والنفس والجسد" تحریر ہے۔

۲- چہار مقالہ مع حواشی گب ایڈیشن ص ۷۱

۳- بحوالہ مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۴۹

۴- مقدمہ رسالہ جودیہ ص ۵

۵- 'معارف' جون ۱۹۶۵ء

۶- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۳ ج ۱ میں اس کو صرف "جلد اول" قرار دیا گیا ہے، جو درست نہیں ہے، کہ اس میں "القانون" کی کتاب الثانی بھی شامل ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۱۵۵، "القانون" کی کتاب ثالث[1] پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۳۸ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت
[نفی]س خط نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی نے ۹۱۷ھ میں کی ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۱۵۶، "القانون" کی کتاب الرابع والخامس[2] پر مشتمل ہے۔ ہینڈلسٹ ۲۱۵۵ کی کتاب الثالث
[کا] آخری صفحہ بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں ۸۸۸ صفحات ہیں۔ اس کی کتابت نفیس خط[3] نسخ میں حسین بن محمد بن محمود الکرمانی
[نے] ۸ ربیع الآخر ۹۱۷ھ میں کی ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۱۵۷، "القانون" کی کتاب ثالث اور رابع کی ناکمل جلد پر مشتمل ہے۔ اس میں
۹۱ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۲ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۱۵۸، "القانون" مکمل ہے۔ اس میں ۹۲۰ صفحات ہیں۔ نفیس خط نسخ میں کتابت ہوئی ہے۔
[کات]ب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۱۵۹، "القانون" کتاب اوّل پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۲۲ صفحات ہیں۔ کاتب کا نام اور
[سا]ل کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۳ویں صدی ہجری کا ہے۔

ہینڈلسٹ ۲۳۰۱، "القانون" مکمل، اس میں ۱۳۲۶ صفحات ہیں۔ نفیس خط نسخ[4] میں اس کی کتابت
[...]ابن خلال بن امین المتطبب الصدیقی نے کی ہے۔ مفتاح الکنوز ۱۹۵، ج ۳ اور مخطوطہ پر حکیم سید مظاہر احمد
[کے] ایک نوٹ کے مطابق سال کتابت ۱۰ ربیع الاوّل ۸۷۳ھ ہے۔ لیکن میرے خیال میں "سبع عشر ربیع الاوّل" (۱۷
ربیع الاوّل) ہے۔ "سبع" کی "س" اور "ع" کے بالائی دائرہ کو دانستہ طور پر کھرچنے کے نشانات ملتے ہیں۔ "ب"
[کا] نقطہ اور "ع" کا زیریں حصہ واضح ہے۔ یہی نہیں بلکہ شفاء الملک حکیم سید مظاہر احمد کلیکشن میں جس قدر کتابیں
[مخط]وطہ) یہاں دیکھنے کو ملیں متعدد میں اس طرح کی تحریف یا سیاہی گرا دینے کا عمل ملا ہے۔

---

[1] مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ۲۵۳، ج ۱ میں اس کو "جلد ثانی" لکھا گیا جو درست نہیں ہے۔

[2] فہرست " " " " میں اسے "جلد ثالث" لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں "القانون" کی کتاب الثالث
کا آخری ورق اور کتاب الرابع والخامس شامل ہیں۔ [3]۔ مفتاح الکنوز ۲۵۳، ج اول میں خط نستعلیق درج ہے حالانکہ یہ
نفیس خط نسخ میں ہے۔ [4]۔ اضافی ورق الف ۱ پر مندرجہ ذیل کتابوں کا نام مذکور ہے :- المجموع، الحاصل
المحصول، البر والاثم، القانون، الشفا، الارصاد الکلیہ، الانصاف، النجاۃ، الھدایۃ، الاشارات،
مختصر الاوسط، العلائی، لسان العرب، الادویۃ القلبیہ، الموجز، کتاب المعاد، کتاب المبدء والمعاد
فی الحکمۃ، الآلۃ الرصدیہ، عرض قاطیغوریاس، المجلاد، الاجزاء ــــ ورق الف ۱ پر تحریر ہے :ــ
[کتا]ب القانون فی الطب لابو علی الشیخ الرئیس ابن سینا مع بعض تالیفہ وھو علم المنطق وعلم الطبیعی و
الکلام" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں صرف "القانون فی الطب" ہی ہے۔
مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ۱۹۵، ج ۳ میں "خط نستعلیق" تحریر ہے جو درست نہیں ہے۔ کتاب نسخ میں ہے۔
[illegible]

ہینڈلسٹ نمبر ۷۰-۳۴۶۹ "القانون" کی کتاب الثالث[1] پر مشتمل ہے۔ اس میں ۵۹۶ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام تحریر نہیں ہے۔ سنہ کتابت ۱۲ محرم الحرام ۱۲۶۰ھ ہے۔

ہینڈلسٹ نمبر ۷۱-۳۴۷۱ "القانون" کی کتاب الاول والثانی[2] پر مشتمل ہے۔ اس میں ۴۴۰ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ چونکہ طرز تحریر ہینڈلسٹ نمبر ۷۰-۳۴۶۹ کی طرح ہے اس لئے ۱۲۶۰ھ کا معلوم ہوتا ہے۔

ہینڈلسٹ نمبر ۷۳-۳۴۷۲ "القانون" کی کتاب الرابع والخامس پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۸۴ صفحات ہیں۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ طرز کتابت ہینڈلسٹ نمبر ۷۰-۳۴۶۹ کا سا ہے اس لئے ۱۲۶۰ھ کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۲۱۔ **التدارک نوع خطاء التدبیر**[3]: ہینڈلسٹ نمبر ۳۴۹۳ (عربی) ص ۱۰۷، نستعلیق۔ اس میں ، مقالات ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :- فی تعدیل انواع الخطا ، فی الھواء الحار ، فی مضاد الحمام الان یکون ھواء الحمام معتدلاً ، فی ذکر الاغذیۃ ، فی الشراب ، فی الحرکات ، فی امر الاستفراغ من الحوجہ الفصد ۔ مشہور ہے کہ اس کو ابن سینا نے ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کی فرمائش پر لکھا تھا[4]۔ اس کی کتابت جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ میں لکھنؤ میں ہوئی۔ کاتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۲۲۔ **رسالہ کیمیا**: ہینڈلسٹ نمبر ۳۴۷۹ (فارسی) ص ۲۲، نستعلیق۔ اس میں کیمیا اور اس کے مادیات سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں ۶ فصول ہیں۔ اس کے مباحث اور عربی طبی مخطوطہ ہینڈلسٹ نمبر ۲۵۲۶/۲ کے مباحث ایک سے ہیں، لیکن عربی مخطوطہ ۹ فصلوں پر مشتمل ہے اور اس فارسی مخطوطہ میں صرف ۶ فصول ہیں۔ یہ ۱۳ ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

---

۱۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۲، ج ۳ میں اس کو کتاب القانون "الجزء الاول والثانی" تحریر کیا گیا ہے جو درست نہیں ہے اختتام بلکہ یہ ہے "تمت الکتاب الثالث من القانون"۔ ۲۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۲، ج ۳ میں کتاب "القانون" جزء الثالث تحریر ہے جو درست نہیں ہے۔ ۳۔ اس مخطوطہ کے متعدد نام ملتے ہیں مثلاً : "دفع المضار الکلیۃ عن الابدان الانسانیۃ"۔ "کتاب التدارک لانواع خطاء التدبیر"۔ "کتاب التدارک لانواع خطاء فی التدبیر" مقدمہ رسالہ جودیہ صفحہ ۱۲، صفحہ ۵۵، آئینہ سرگزشت صفحہ ۲۳ میں "مقالہ فی تدارک الخطاء الواقع فی التدبیر المطلق" تحریر ہے۔ ۴۔ مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز صفحہ ۱۹۹، ج ۳ میں ابن سینا کو اس مخطوطہ کا اور عبداللہ ابوالحسن السہلی کو اس کا مؤلف قرار دیا گیا ہے۔ جبکہ نفس مخطوطہ میں صرف اس قدر واضح ہے کہ یہ کتاب ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کے لیے لکھی گئی تھی۔ حکیم سید ظل الرحمان کی تحقیق بھی یہی ہے (مقدمہ رسالہ جودیہ صفحہ ۱۲)۔

۲۳- رسالہ فی معاد النفس[1] :- ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۴ (عربی) ص ۳، نستعلیق۔ ابن سینا نے اسے اپنے تلمیذ خاص ابو عبید جوزجانی کے لیے لکھا تھا۔ اس میں نفس سے متعلق مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۲۴- کتاب المبداء والمعاد[2] :- ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۵ (عربی) ص ۷۰، نستعلیق۔ اس مخطوطہ میں ۳ مقالات ہیں اور ہر مقالہ چند فصلوں پر منقسم۔ اس میں مبدأ اول، وحدانیت، تعدید صفات، بقاے نفس انسانی اور آخرت وغیرہ کے بیانات شامل ہیں۔ ابن سینا نے اس کو ابو محمد شیرازی[3] اور مجد الدولہ کی طرف انتساب کیا تھا۔ یہ نسخہ ۱۲ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۲۵- رسالۃ الفردوس[4] : ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۶ ، (عربی) ص ۲۴، نستعلیق۔ اس میں معاد کی ماہیت، وجود معاد، تناسخ، نیز موت کے بعد کے احوال و طبقات وغیرہ کا بیان ہے۔ اس مجموعہ کے ۲۵۹۰/۷ میں کاتب کا نام عبد الکریم تحریر ہے۔ چونکہ خط بالکل ایک سا ہے اس لیے خیال گزرتا ہے کہ ممکن ہے اس کی بھی کتابت عبد الکریم کے ہاتھوں ہی ہوئی ہو۔ تقریباً ۱۲ویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔

۲۶- اجوبۃ المسائل العشرۃ :- ہینڈ لسٹ ۲۵۹۰/۷ (عربی) ص ۶، نستعلیق۔ ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۰ سوالوں کے جواب ہیں، جو ابن سینا سے مختلف مواقع پر کیے گئے تھے۔ کتابت عبد الکریم نے ۹ ذی القعدہ ۱۱۳۹ھ میں انجام دی ہے ——— یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ[5] بھی موجود ہے جس کا ہینڈ لسٹ ۲۶۳۱/۱۴ ہے۔ یہ ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

---

۱- مخطوطہ میں "رسالہ فی معاد امر النفس" تحریر ہے۔ ۲- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۲۳ جلد دوم میں "رسالہ فی المبداء والمعاد" تحریر ہے۔ لیکن آئینہ سرگذشت ص ۳۰ میں اس کا نام "کتاب المبدأ والمعاد" تحریر ہے۔

۳- آئینہ سرگذشت ص ۳۰ جلال تذکرہ ابن سینا میں ابن سینا کو صرف ابو محمد شیرازی کا پڑوسی قرار دیتے ہیں اور اس کتاب کو ابو عبید جوزجانی کے لیے تصنیف کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں" تذکرہ ابن سینا ص ۱۴۱ و ص ۱۵۰ از جلال ص ۱۵۳ در سکیشن خدا بخش لائبریری۔ ۴- مخطوطہ میں ایک اضافی تحریر میں "اضحیۃ فی امر المعاد" درج ہے۔ لیکن اس کے اختتام پر "الفردوس" واضح طور پر تحریر ہے: آئینۂ سرگذشت میں ص ۳۳ میں اس کا نام "الرسالۃ الاضحویۃ فی المعاد"

۵- اگرچہ دونوں نسخے ایک ہی ہیں۔ لیکن مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۱۹ و ص ۲۵۷ جلد دوم میں فن حکمت اور فن ہیئت میں شمار کیا گیا ہے۔

۶- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۲۵۴، ج ۲، اس کا شمار ۲۶۳۱/۱۹ کے ضمن میں کیا گیا

۲۷- رسالہ فی تحقیق جوهر الاجسام السماویۃ[1]:- ہینڈ لسٹ ۸/۲۵۹۰ (عربی) ص ۱۰،
نستعلیق۔ اجرام سماویہ سے متعلق متعدد فصول ہیں۔ مباحث بڑے وقیع ہیں۔ مخطوطہ میں ابن سینا کا کہیں بھی نام نہیں ہے۔
اندازہ ہے کہ عبدالکریم کے ہاتھوں ۱۱۳۹ھ میں کتابت ہوئی ہے۔

۲۸- التعلیقات[2]: ہینڈ لسٹ ۱/۲۶۲۱، ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ منطق، طبیعیات اور
الٰہیات کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸ صفحات ہیں، خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں
ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

۲۹- الرسالہ فی الحروف[3]: ہینڈ لسٹ ۱۰/۲۶۳۱ (عربی) ص ۴، نستعلیق۔ اس کو ابومنصور
محمد بن علی کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ یہ ۶ فصول پر منقسم ہے۔ اس میں حروف کی پیدائش، تعریف اور حنجرہ و زبان وغیرہ
کی تشریح بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آواز ہوا کی لہروں سے پیدا ہوتی ہے اور اس کی ترسیل
بھی اسی کے ذریعہ ہوتی ہے۔ ۱۱ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۰- مختصر الحدود[4][5]: ہینڈ لسٹ ۵/۲۶۳۸ (عربی) ص ۵، نستعلیق۔ اس میں نقطہ،
حد، حرارت، برودت، یبوست، رطوبت، خشونت، صلب، اور سن وغیرہ کی تعریف بیان کی گئی ہیں۔ یہ نسخہ
۱۱ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۳۱- رسالہ فی قوی روح الانسان[6]: ہینڈ لسٹ ۱۱/۲۶۳۱، ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ
فن حکمت میں ہے۔ ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں روح کی تقسیم اور اسی سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے
کاتب کا نام اور سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

---

۱- نظام الدین گیلانی متوفی ۱۰۵۹ھ نے تذکرہ بوعلی سینا عربی ہینڈ لسٹ ۲۱/۲۶۳۱ میں اس کا نام "رسالہ فی معرفۃ الاجرام السماویہ" لکھا ہے۔ آئینہ سرگذشت ص۳۳ میں غالباً اسی کو "مقالہ فی الاجرام السماویہ" لکھا گیا ہے۔

۲- مفتاح الکنوز ص۴۵۶ ج ۲ میں مصنف کا نام درج ہونے سے رہ گیا جب کہ مخطوطہ میں ابن سینا کا نام واضح طور پر تحریر ہے، غالباً یہ مخطوطہ "تعلیقات استفادھا ابو الفرج الہمدانی الطبیب من مجلسہ وجوابات لہ" سے مختا

۳- اسی کو آئینہ سرگذشت ص۳۱ میں "مقالہ فی اسباب حدوث الحروف ومخارجہا" کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ اصفہان میں لکھا گیا۔ ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے اس کو نہایت اہتمام سے شائع کرایا ہے۔ معارف، ص۳۶۴، ۱۹۶۵ء۔

۴- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص۴۵۶ ج ۲ میں اس کو ۵/۲۶۳۱ کے تحت درج کیا گیا ہے، جو میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ ۵- آئینہ سرگذشت ص۳۱ میں اس کو "کتاب الحدود" لکھا گیا ہے۔

۶- مخطوطہ کی ایک اضافی تحریر کے مطابق اس کا نام "ترجمہ کلام ابن سینا" ہے۔

۷- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص۴۵۶ ج دوم میں ۱۱/۲۶۳۱ کے تحت درج ہے۔ میرے خیال میں درست نہیں ہے

۳۲ - الاشارات والتنبیہات : ہینڈلسٹ ۱۸۵۵، ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں منطق، طبیعات اور الٰہیات کے مباحث شامل ہیں۔ یہ ابن سینا کی آخری تصنیف ہے۔ جسے وہ نااہلوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا[1]۔ سال کتابت ۵۲۰ھ ہے۔

ابن سینا کی اس کتاب کی ایک تلخیص فخرالدین رازی نے 'لباب الاشارات' کے نام سے کی ہے۔ بعد میں نصیرالدین محمد الطوسی نے پھر اس کی شرح 'حل المشکلات للاشارات والتنبیہات' کے نام سے کی، ابن النقف المسیحی نے بھی 'شرح الاشارات' کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے[2]۔

یہاں ہینڈلسٹ ۲۶۳۱/۴۸ کے تحت فہرست 'الہباج والاغلاط الاشارات' بھی ہے[3] - یہ صرف دو صفحات پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ ۱۱ویں صدی ہجری کی ہے۔

۳۳ - الاشارات والتنبیہات (فارسی) : ہینڈلسٹ ۱۸۵۸ - ایک فارسی نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔ یہ ناکمل حالت میں صرف ۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۴ - کتاب الشفا : ہینڈلسٹ ۱۹۰۴/۶ (عربی)، ص ۴۴۰ ۴۴۰ + ۴۸ ۲ + ۱۶۸ - نستعلیق۔ یہ کتاب منطق، طبیعات، ریاضیات اور الٰہیات (حکمت) میں ہے۔ یہاں اس کی تین جلدیں ہیں لکھی ہوئی ۱۳ویں صدی ہجری۔

کتاب الشفا ابن سینا کی مشہور ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کو انہوں نے امیر شمس الدولہ کے دربار میں وزارت کے عہدے پر ہوتے ہوئے اپنے شاگرد ابوعبید جوزجانی کے لیے لکھنا شروع کیا تھا۔ دراصل ابوعبید جوزجانی نے ابن سینا سے درخواست کی تھی کہ وہ ارسطو کی کتاب کی شرح لکھے۔ جواب میں ابن سینا نے کہا مجھ کو اس وقت اس طرح کے کام کی فرصت تو نہیں ہے لیکن اگر تم پسند کرو تو ایک ایسی کتاب لکھوں جس میں وہ علوم جو میرے نزدیک درست ہیں ان کی ترجمانی کروں، نہ تو مخالفوں سے مناظرہ ہو اور نہ ہی ان کے خیالات کی تردید ہو، تو البتہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ابوعبید جوزجانی نے اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اور ابن سینا نے اس کے لیے "کتاب الشفا" لکھنا شروع کیا اور تکمیل صرف قوت حافظہ سے کر ڈالی[4]۔

یہاں ہینڈلسٹ ۲۶۳۱/۴۷ کے تحت فہرست فنون الشفا

---

۱- آئینہ سرگذشت ص۳۵، شائع کردہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی۔
۲- حکیم سید غلام مہدی کے غیر مطبوعہ مقالے "ابن القف" - "حیات اور کارنامے" سے ماخوذ۔
۳- اس کا اندراج مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز کی کسی بھی جلد میں نہیں ملتا۔
۴- ابن سینا نے اس کو ۱۸ جلدوں میں لکھا ہے "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ورق ۱۴۳ الف قلمی نسخہ۔
۵- آئینہ سرگذشت ص۱۸۔

کے نام سے ۴ صفحات پر مشتمل ایک مخطوطہ ہے۔ اس کی کتابت نفیس خط نستعلیق میں ہوئی ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

• ہینڈ لسٹ[1] ۲۶۴۱/۱۲ ؛ الشفا کا ایک ورق ؛ دو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں[2] حکمت کے اقسام اور ان کی ذیلی تقسیم کا بیان ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

• یہاں ہینڈ لسٹ ۲۶۴۱/۱۳ کا فارسی نسخہ بھی موجود ہے، جو دو صفحات پر مشتمل ہے اور ہینڈ لسٹ ۲۶۴۱/۲۲ ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

• ہینڈ لسٹ ۲۸۲۲، ابن سینا کا یہ عربی مخطوطہ "کتاب الشفا" کی "الٰہیات" کی بحث پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی ۳۳۶ صفحات ملتے ہیں۔ نفیس خط نستعلیق میں اس کی کتابت عطاء اللہ نے دوشنبہ ۲۳ شوال ۱۰۸۳ھ میں کی ہے۔

۳۵- رسالہ فی تحقیق الزاویہ[3]:- ہینڈ لسٹ ۲۶۳۱/۱۱[4] (عربی) ص ۲، نستعلیق۔ یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ موجودہ صورت میں ۴ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زاویہ کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۱۱ویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۶- الرسالۃ النوروزیۃ: ہینڈ لسٹ ۲۶۳۱/۱۳[5]، (عربی) ص ۲، نستعلیق، یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ ۲ صفحات اور ۳ فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں موجودات کی ترتیب[6] اور تکوین عالم وغیرہ کا ذکر ہے۔ ۱۱ویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ایک دوسرا نسخہ ہینڈ لسٹ ۲۶۴۱/۳۳[7] بھی ہے۔ یہ ناقص الآخر اور صرف ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ نفیس خط نستعلیق میں ہے۔ کاتب کا نام اور سال کتابت تحریر نہیں ہے۔ تقریباً ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

۳۷- رسالہ فی النفس:- ہینڈ لسٹ ۲۶۳۱/۱۲[8] (عربی) ص ۹، نستعلیق۔ یہ کتاب علم ہیئت میں ہے۔ ۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۰ فصول ہیں۔ نفس سے متعلق کامیاب بحثیں ملتی ہیں۔ ۱۱ویں صدی ہجری کا ہے۔

---

۱- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۴۶۲، ج ۲ میں اس کو "ورق واحد من کتاب الشفاء" لکھا گیا ہے اور مجموعہ کا ۱۲واں مخطوطہ شمار کیا گیا ہے۔
۲- ممکن ہے اس کا نام "مقالہ فی اقسام الحکمت" ہی ہو۔ کیونکہ آئینہ سرگزشت ص ۳۲ پر اس کتاب کا اندراج ہے۔
۳- مخطوطہ میں "رسالہ فی تحقیق حقیقۃ الزاویہ" تحریر ہے۔ آئینہ سرگزشت ص ۳۱ میں رسالہ ابی سہل المسیحی فی الزاویہ کے تحت غالباً یہی رسالہ ہے۔ ۴- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص ۴۵۶ ج ۲ میں یہ ۲۶۳۱/۶ کے تحت درج ہے۔
۵- مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز ص ۴۵۶، ج دوم میں یہ ۲۶۳۱/۸ کے تحت درج ہے۔ ۶- مخطوطہ میں ایک الحاقی تحریر میں اس کا نام "رسالۃ الشیخ فی بیان مقدمات" درج ہے۔ اس رسالے کا اندراج مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز میں مجموعہ ہینڈ لسٹ ۲۶۴۱ کے تحت نہیں ملتا۔ ۷- مخطوطہ میں کہیں بھی ابن سینا کا نام درج نہیں ہے۔
۸- مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۴۵۶، ج ۲ ... ۲۶۳۱/۱۰ کے تحت ... ہے۔

# اشاریہ

خدابخش لائبریری پٹنہ میں ابن سینا کے مخطوطات کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست مندرجہ ذیل ہے۔ یہ مخطوطات جن دوسری لائبریریوں پائے جاتے ہیں ان کی نشاندہی کر دی گئی ہے:

۱۔ اجوبۃ المسائل العشرۃ۔ ۲۔ الادویۃ القلبیۃ۔ رضارام پور، عرفانیہ ٹونک، مکتبہ قونیہ، حمیدیہ، ۳۔ الارجوزۃ السینائیۃ ۴۔ الارجوزۃ فی الفصول الاربعۃ۔ ۵۔ (الرسالۃ) للشیخ فی الاسئلۃ و الجواب، رضارامپور، ۶۔ الاشارات والتنبیہات، رضارامپور، سلطان احمد استنبول۔ ۷۔ (رسالۃ) فی تحقیق جوہر الاجسام السماویۃ، رضارامپور۔ ۸۔ التدارک نوع خطا والتدبیر، آصفیہ، رضارامپور، حمیدیہ۔ ۹۔ رسالۃ فی معرفۃ ترکیب الروح والنفس الجسد، ۱۰۔ التعلیقات، رضارامپور۔ ۱۱۔ رسالۃ فی تفسیر قل اعوذ برب الفلق، رضارامپور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۲۔ رسالۃ فی تفسیر قل اعوذ برب الناس، رضارامپور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۳۔ رسالۃ فی تفسیر قل ھو اللہ احد، رضارام پور، حمیدیہ ترکی۔ ۱۴۔ مختصر الحدود۔ ۱۵۔ (الرسالۃ) الفرق بین الحرارۃ الغریزیۃ والغریبۃ۔ رضارامپور۔ ۱۶۔ (الرسالۃ) فی الحروف، رضارام پور، عرفانیہ ٹونک، حمیدیہ ترکی۔ ۱۷۔ (الرسالۃ) فی حفظ الصحۃ۔ آ[illegible] رضارام پور۔ ۱۸۔ (رسالۃ) فی تحقیق الزاویۃ۔ ۱۹۔ (الرسالۃ) فی السکنجبین، آصفیہ، رضارامپور ۲۰۔ (الرسالۃ) فی شطر الغب، آصفیہ، رضارامپور۔ ۲۱۔ (کتاب) الشفا۔ آصفیہ، رضارام پور، آ[illegible] ۲۲۔ (الرسالۃ) فی الفصد، آصفیہ، رضارامپور۔ ۲۳۔ (رسالۃ) الفردوس، حمیدیہ۔ ۲۴۔ (الرسالۃ) الموسومۃ بالفصول، رضارامپور۔ ۲۵۔ القانون فی الطب، آصفیہ، رضارامپور، آزاد، ندوہ، دیو[illegible] دہلی، تہران، استنبول۔ ۲۶۔ (ترجمہ) قول الحکیم تیاذوق فی حفظ الصحۃ۔ ۲۷۔ (الرسالۃ) فی القولنج۔ آصفیہ، رضارامپور۔ ۲۸۔ (رسالہ) فی قوی روح الانسان۔ ۲۹۔ (الرسالۃ) فی [illegible] آصفیہ۔ ۳۰۔ کتاب المبدا والمعاد۔ رضارامپور، حمیدیہ۔ ۳۱۔ رسالہ معاد النفس۔ ۳۲۔ رسالہ فی النفس۔ آصفیہ، رضا، رامپور، ۳۳۔ الرسالۃ الیروزیۃ۔ آصفیہ، رضارامپور، عرفانیہ ٹو[illegible] حمیدیہ۔ ۳۴۔ الرسالۃ فی الھندباء، رضارامپور۔

فارسی مخطوطے: ۱۔ رسالہ کیمیا۔

# ابن سینا کی تالیفات کے بارے میں ایک سوال

## اطبائے کرام اور ابن سینا کے ماہرین کی خدمت میں

ابن سینا سے منسوب تالیفات میں سے بہت سی چھپ چکی ہیں، متعدد ایسی ہیں جن کے مخطوطات دنیا کے بڑے مشرقی کتب خانوں میں محفوظ ہیں؛ لیکن کچھ ایسی ہیں جن کے بارے میں یا تو یہ طے کر لینا چاہیے کہ اب ناپید ہیں یا پھر وہ بعض دوسری کتابوں کا جزو بن کر یا دوسرے عنوانات کی شکل میں ہم تک پہنچی ہیں، ان کا پتا لگانا ہے۔

دوسری طرف ایسے متعدد مخطوطات ہیں جن کا نام "آیینۂ سرگزشت" یا دوسرے قدیم مآخذ میں نہیں ہے۔ ان کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے کہ ابن سینا کی طرف ان کا انتساب کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔

آیینۂ سرگزشت کے پیش نظر، خدابخش مخطوطات کو اولاً اور دنیا کے مشرقی کتابوں کی فہرستوں کو ثانیاً، نظر میں رکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر شاہ سید عطاء الرحمن عطا کاکوی

# مسامحات

## مرآۃ العلوم (فہرست مخطوطات فارسی)

جلد اوّل:

(۱) کتاب نمبر ۳۴۰ - سطور ۱۷ غلط - ۱۷ صحیح - (صفحہ ۶۱)

(۲) کتاب نمبر ۳۷۶ - بجائے ہفت رسالہ سعدی "رسالہ ہفت گانہ" باید۔ (صفحہ ۶۷)

(۳) کتاب نمبر ۴۴۰ - تعداد اوراق ۸۷ غلط۔ ۷۸ صحیح (صفحہ ۷۳)

(۴) کتاب نمبر ۴۹۶ - تعداد اوراق ۲۳۹ غلط۔ ۱۳۹ صحیح (صفحہ ۸۲)

(۵) کتاب نمبر ۵۰۴ - تعداد اوراق ۳۵۸ غلط - ۳۹۸ صحیح (صفحہ ۸۴)

(۶) کتاب نمبر ۵۰۱ - در شمارہ نام کتاب لفظ ایضاً غلط۔ این کتاب لیلیٰ مجنوں نیست بلکہ "شیرین خسرو" است۔ (صفحہ ۸۶)

(۷) کتاب نمبر ۲۹۷ و ہم کتاب ۲۹۸ - و خمسہ لیلیٰ مجنون غلط است۔ نامش مجنوں لیلیٰ است (صفحہ ۵۳)

(۸) کتاب نمبر ۵۲۷ - تعداد اوراق ۳۴۳ غلط - ۳۴۶ صحیح (صفحہ ۸۸)

(۹) کتاب نمبر ۵۶۲ - لفظ عظیم آبادی با اسم مصنف محمد رضا غلط است۔ رجوع کنید بہ فہرست انگریزی صبر در تحت P.257 ADDITIONS NO 424 در ضمیمہ فہرست ہذا (صفحہ ۹۲)

(۱۰) کتاب نمبر ۶۵۰ - نمبر فہرست انگریزی ۱۸۸ غلط۔ ۲۸۰ صحیح (صفحہ ۱۰۰)

(۱۱) کتاب نمبر ۶۷۳ - تعداد اوراق ۴۶۹ غلط۔ در فہرست انگریزی مجلد دوم در تحت کتاب نمبر ۳۴۲ تعداد اوراق ۴۲۹ نوشتہ، این ہم غلط است۔ تعداد اوراق ۴۳۲ صحیح (صفحہ ۱۰۵)

(۱۲) کتاب نمبر ۶۸۱ - تعداد اوراق ۱۱۵ غلط۔ ۱۵۱ صحیح (صفحہ ۱۰۷)

جلد دوم:

(۱) کتاب نمبر ۱۸۰۳ - تعداد اوراق ۲۴۰ غلط۔ ۲۳۶ صحیح (صفحہ ۴۶)

(۲) کتاب نمبر ۱۸۶۷ - در کالم نمبر کتاب انگریزی ۱۷۰۰ غلط۔ ۱۸۸۰ صحیح (صفحہ ۶۱)

(۳) کتاب نمبر ۱۸۶۸ - در کالم نمبر کتاب انگریزی ۱۷۵۰ غلط۔ ۱۸۵۰ صحیح (صفحہ ۶۱)

(۴) کتاب نمبر ۱۹۰۲ - نام مصنف میر غلام حسن دہلوی غلط۔ این دیوان غلام حسن پھلواروی است۔ رہنما

به مضمون نوشته، دکتر طاهر رضوی برق در خدا بخش لائبریری جرنل، شماره ۱۲ - درین مضمون نام مصنف غلام حسین غلط - نامش غلام حسن است - (صفحه ۷۶)

۵) مجموعه کتب نمبر ۱۹۷۴ تا ۱۹۸۰ - نام این کتاب این مجموعه آئینهٔ جهان نما است - ر ک به فهرست انگریزی، جلد ۱۳ صفحه ۲۱۸ - (صفحه ۸۲)

۶) کتاب نمبر ۱۹۹۲ این دیوان وفاست که با مثنوی بشارة الامامت نمبر ۱۹۹۱ باهم مجلد شده - بشارة الامامت تصنیف غلام حسین طباطبائی مصنف سیر المتاخرین است که وفا تخلص میکرد - این دیوان از تصنیف اوست - ر ک به تذکره ریاض الوفاق - (صفحه ۸۶)

۷) کتاب نمبر ۱۹۹۹ - این بیاضیست که دارای تصانیف مختلفه است، از انجمله سه سیپاره زلالی هم است، و لی شش مثنویات شان نقل شده و مثنوی هفتم که "محمود و ایاز" نام دارد درین مجموعه منقول نیست، صرف دیباچه این مثنوی است - (صفحه ۱۰۴)

۸) نمبر فهرست فارسی در کالم اول ۲۰۱۷ طبع شده - ۲۰۱۷ باید (صفحه ۱۱۰)

مراسلات
استدراک

# ابوالکلام آزاد کے خط کے بارے میں

خدابخش لائبریری میں ابوالکلام آزاد کا ایک خط محفوظ ہے جس کا عکس 'جرنل' کے شمارہ ا
میں شائع ہو چکا ہے۔ یادداشت کے لیے اس کا متن حسب ذیل ہے :

۱۱۔ کولوٹولا اسٹریٹ۔ کلکتہ

"جناب مکرم! افسوس ہے کہ کثرت کار اور ہجوم احباب سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ تو حاضر خدمت
ہوں۔ پریس کی نسبت ضروری معلومات بہم پہنچ چکی ہے اور صرف ایک گھنٹہ کا کام رہ گیا ہے۔ میں اس کو بھی ابھی
کر دیتا مگر ہجوم احباب ایک گھنٹہ کی فرصت نہیں دیتا۔ اس لیے آج شام کو ڈھاکہ روانہ ہوں گا اور پہلی جنوری کو
یقیناً واپس آ جاؤں گا۔ پہلی سے ایک کافی وقت ہوا اور انشاءاللہ بہت جلد قیام پریس کی صورت ہو جائے گی۔
لیکن ایک نہایت ضروری معاملہ ہے جو اس وقت اس خط کے لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر ضرورتیں متقاضی
ہوتیں تو میری خودداری اس خط تک لکھنے سے سخت مانع آتی۔
میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک ماہ کی تنخواہ متعلق "اخبار" مجھے اس وقت پیشگی دیدیں بشرطیکہ پیشگی دینے میں کوئی
مانع نہ ہو۔ ڈھاکہ سے واپسی پر اخبار جاری ہو جائے گا اور انشاءاللہ پہلے ماہ میں یہ رقم وضع ہو جائے گی۔
میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس میں عذر نہ ہوگا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ پیشگی رقم اس وقت میرے لیے ایک نہایت کارآمد
اور بہت مفید رقم ہوگی۔
اسکے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ آپکی دوستانہ توجہ کا ممنون ہوں۔

ابوالکلام آزاد
۲۵ دسمبر ۱۹۰۶ء

اس خط کی اس لائبریری میں موجودگی کی تقریب یہ ہے کہ اس خط کے مکتوب الیہ اخبار "دارالسلطنت" (کلکتہ) کے مالک
مولوی کبیرالدین احمد خدابخش خاں کے خسر تھے یعنی ان کی تیسری بی بی رامنیہ خاتون کے والد۔ امنیہ خاتون کے بارے میں جرنل
کے شمارہ ۵ میں ان کے دواوین کے تعارف کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے۔ شمس العلماء خان بہادر مولوی کبیرالدین احمد کے پریس
کا نام "اردو گائیڈ پریس (پریس کا نام پہلے "مطبع مظہر العجائب" تھا) اور اخبار کا نام "اردو گائیڈ" تھا۔ عتیق الحق
صاحب نے اس کے بارے میں مندرجہ ذیل اطلاعات فراہم کی ہیں :

"اخبار اردو گائیڈ ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ اردو کا سب سے پہلا روزنامہ
یہ ٹائپ میں چھپتا تھا اور ۸ ورقی تھا۔ بعد میں مولوی صاحب نے ایک دوسرا اخبار "دارالسلطنت" کے
نام سے نکالا۔"

# مثنوی خوابِ حسرت عرف پٹنے کی کہانی

"حسرت[1] تخلص، غلام رسول نام، محلہ چوراہا آغا حسینا عظیم آباد کے رہنے والے۔ ولادت ۱۲۹۳ھ میں ہوئی۔ اس وقت ۴۱ سال کی عمر ہے۔ مشہور شوقی شاہ کے نواسے ہیں۔ ترکہ میں شان فقیری و قناعت اپنے بزرگوں سے حاصل کی۔ کامل رکھتے ہیں۔ بیماروں کے علاج بھی کر لیتے ہیں۔ فال تعویذ میں بھی دخل ہے۔ صناع و محنتی آدمی ہیں۔ تقریباً ۱۵ سال سے مشق سخن کرتے ہیں۔ برابر شاد سے تلمذ رہا۔ دیوان مرتب ہے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ کلام اچھا اور رنگ میں ڈوبا ہوا، پُردرد، مؤثر ہوتا ہے۔ لکنت کی وجہ کر پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔"

(گلشن حیات: از قبیل فوی ۱۹۲۵ء)

حمد خالق میں سرنگوں ہے قلم — جس کے انصاف سے سوا ہیں کرم

سرِ تسلیم آپ جھکتا ہے — کب یہ اوروں کے در پہ جھکتا ہے

اس کے محبوب کی ثنا کیا ہو — آپ خلّاق جس کا شیدا ہو

آل و اصحاب کی جو مدح کروں — زندگی بھر لکھوں تو پھر نہ لکھوں

بس ہے اپنے لئے یہی تحریر — پڑھ لو قرآں میں آیۂ تطہیر

گو کہ یہ داستاں پُرانی ہے — گو کہ دھندلی سی اِک نشانی ہے

عبرت انگیز یہ نصیحت ہے — خوب دلچسپ یہ حکایت ہے

ایسا گلزار تھا عظیم آباد — شاد ہوتا تھا دیکھ کر ناشاد

رشکِ جنت تھی ہر گلی اس کی — کیا بتاؤں بہار کیسی تھی!

نہر گنگا کی اک طرف جاری — اِک طرف تھی بہار "جھلّے" کی

عیش و عشرت کے ماسوا اس میں — کب گزر غم کا تھا ذرا اس میں

کون ایسا یہاں محلّہ تھا — تھا، نہ مسکن جہاں رئیسوں کا

شہر گلزار تھا گلی آباد — رہنے والے یہاں کے سب تھے شاد

دن کو ہولی کا چرچا تھا سدا — رات کو تھا سماں دیوالی کا

مفلسی اور تنگدستی کا — نام لینا بھی عار تھا گویا

جو تھا خوش حال تھا بہرصورت — مطمئن دل تھا پاس تھی دولت

ہے جو پٹنے میں اک پٹن دیبی — وہ بنا کردہ ہے اشوکا کی

---

۱۔ "حسرت نے ۵ نومبر ۱۹۴۱ء میں رحلت کی اور آغا حسینا کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے" (مکتوب گرامی جناب محمد ولی الحق صاحب شاگرد شاد)

شہر کیا ہے کہ اک نشانی ہے — راجہ پاتن کی راجدھانی ہے
شہر میں دو بڑے تھے دروازے — یہ بنائے گئے تھے حکمت سے
ایک پورب کا، ایک پچھم کا — فوج رہتی تھی اس پہ پہرا تھا
ہیں بزرگوں کی تربتیں بھی یہاں — جس کے باقی ہیں بعض بعض نشاں
شاہ جنگلو کے، شاہ مجنوں کے — ہیں پرانے بہت ہی دو تکیے
ہے محلہ یہاں جو مچھرٹا — داتا لنگن کا ہے وہاں روضہ
وہ جو مشہور شاہ ارزاں ہیں — سارے ولیوں کے آپ دیواں ہیں
سوئے ہیں خاک میں یہیں کی آہ — شاہ کالے بھی اور چھتا شاہ
شاہ حمزہ کا، شاہ باقر کا — متبرک ہے شہر میں تکیہ
ایک ڈنڈیا شنار چمرو تھا — ہے جو بانی امام باڑے کا
رکھی ایسی خلوص سے بنیاد — جس نے مانگی یہاں بر آئی مراد
اہل دل تھا نہ کوئی نوذر سا — تکسی منڈی میں ہے مزار ان کا
کیا زمانے نے غیر حالت کی — لوح تک مٹ گئی ہے تربت کی
ڈھائی کنگورے کی بھی مسجد کا — ہے یقیں نام تو سنا ہوگا
پڑھ لو تاریخ صاف ہے لکھی — ہے وہ تعمیر دور بابر کی
مسجد شیر شاہ اگر دیکھو — تم باللہ تم کو حیرت ہو
وہ جو مسجد یہاں ہے پتھر کی — ہے وہ شاہ جہاں کی بنوائی
ہے جو مسجد حسینی بیگم کی — تھا اسی میں امام باڑا بھی
اینٹ ایسی لگائی تھی اس میں — بال کی کب رسائی تھی اس میں
تولیت اس کے ہاتھ میں آئی — کی شہادت امام باڑے کی
وقف نواب کا ہے حال زبوں — کیا کہوں اور کس زباں سے کہوں
اس عمارت کا بھی ہے حال تباہ — ایک عبرت کا ہے مرقع آہ
بو آجی کی جو ایک "بولی" تھی — آپ ہی تھی نظیر وہ اپنی
کتنے اللہ والے ایسے تھے — فیض جاری ہے جن کی تربت سے

تھے جو کاظم علی خاں نواب ان کی مسجد کا بھی ہے حال خراب
منشی کاظم علی جو تھے مشہور جا بجا سے ہے وہ بھی مسجد چور
دیکھو عزت حلال پیسے کی دیکھو برکت حلال پیسے کی
اک ضعیفہ جو سوئی والی تھی مسجد اس نے بھی ایک بنوائی
کوئی شاعر ہے آج بیدل سا اب کوئی بھی ہے مثل راسخ کا[1]
خود غرض سے ہے آج بھی نفرت آب گل میں ہے آج تک لذت
جیسی ترکاریاں یہاں کھائیں ہند بھر میں نہ ویسی ہاتھ آئیں
مالدہ آم میرے پٹنے کا کہیے اس کو بہشت کا میوہ
ہے عرق یا قوام کا شیرہ نرم شیریں ہے اس قدر گتا
شوق دیکھو شتاب رائے کا ایسا پٹنے میں باغ بنوایا
بیل انگور کی لگائی جب شاخ اس کی ثمر بھی لائی جب
تھے وہ انگور مثل کابل کے اس سے شاداب، ویسے ہی میٹھے
وصف اس کا میں کیا کروں تحریر شہر اپنا تھا خطۂ کشمیر
تھا یہی شہر یہ بہار افسوس یا ہے اجڑا ہوا دیار افسوس
یاد آتے ہیں وہ بزرگ و امیر آج ملتی نہیں ہے جن کی نظیر
ہے محلہ یہاں جو حاجی گنج تھے یہیں تو رئیس نکتہ سنج
میر عباس، میر محسن کا کل رئیسوں میں نام روشن تھا
تھے جو جعفر حسین خاں مغفور ہیں سخاوت میں آج تک مشہور
کتنے مفلس غریب پلتے تھے کتنی بیواؤں کے وظیفے تھے
اب کوئی ہے نہ شاد سے بڑھ کے دور آخر کے میر ثانی تھے
ہے دول پورہ اک محلہ جو پہلے کیا تھا نہ یاد ہے مجھ کو
خواجہ گوہر علی سادہ نواب جن کے دم سے کھلی تھی راہ ثواب
کتنے بیکس یتیم پلتے تھے سب نمک خوار تھے ریاست کے
میر سنگی بھی اور آغا میر باحیا باکرم تھے باتوقیر
وہ علی میر تھے جو خوش القاب ہوگا کیا کوئی اس سخی کا جواب
شیخ ہادی بھی اور نصیر الدین ان کی تمثیل کیا ملے گی کہیں

---

۱- شاد کے قلم سے دوسرا ورژن : نام روشن ہے اب بھی راسخ کا

تھے جو عبدالرحیم خوش انجام
اُن کا چمڑے کا تھا یہاں گودام

گویا حاتم تھے وہ سخاوت میں
کم نہیں تھے کسی سے دولت میں

تھے جو محلی میں وہ نہال حسین
یاد ان کی بھی کرتی ہے بے چین

اور اُن کا بھی فیض جاری تھا
شاد کرتے تھے دل غریبوں کا

ہے جو کٹرا شائستہ خاں کا یہاں
ہائے رہتے تھے خواجگان وہاں

خواجہ عتیق تھے، خواجہ یوسف تھے
کیا لکھوں وصف ان بزرگوں کے

ان کی جا اب ہیں خواجہ ابراہیم
ہیں وہ ڈپٹی ذکی خلیل و فہیم

ان بزرگوں کے نام لیوا ہیں
باحیا، باکرم سراپا ہیں

ان کے اخلاق کی، مروّت کی
مجھ سے توصیف ہو نہیں سکتی

اِک محلہ یہاں ہے جھاؤ گنج
تھے وہاں پر بھی چند نکتہ سنج

وہ جو تاجر وہاں تھے اچھے خاں
ان کو تو جانتا ہے ہر انساں

ان کی پٹنے میں تھی بڑی عزّت
تاجروں میں تمام تھی شہرت

تھا سخاوت کا موجزن دریا
ان کا ہر روز فیض جاری تھا

ہے نہ ثانی کمالی خاں کا آج
تھا سخاوت کا سر پہ ان کے تاج

بیوہ بیکس کی وہ خبر لیتے
جتنا جو مانگتا وہی دیتے

سنگی دالان جو محلہ ہے
اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا ہے

تھے وہاں بھی رئیس باحشمت
سب غنی دل تھے، پاس تھی دولت

وہ منارام جو مہاجن تھا
للّو بابو کا گویا ثانی تھا

اس نے شادی میں اپنے بیٹے کی
سارے پٹنے کی دل سے دعوت کی

میر عبدالسعید امیر کبیر
نام آور تھے اور باتوقیر

جس نے "ختنے" میں اپنے بیٹے کے
کیا ہی بے مثل طغرے بٹوائے

ہر محلے میں حصہ آیا تھا
تھا ہر ایک خوان تین گنّی کا

قلعہ مشہور ہے لب گنگا
تھا محل بھی اسی جگہ ان کا

اب نہیں وہ رئیس گزری کے
تھی غریبوں کی پرورش جن سے

کی تواضع ہر ایک کی زر سے
کوئی خالی پھرا نہیں در سے

وہ محمد نواب بااخلاق
آج تک ہیں وہ شہرۂ آفاق

تھے جو نواب میر لطف علی	مدح توصیف کیا لکھوں ان کی
اشرفی کے وہ ٹکرے کٹوا کے	پاس اپنے ہمیشہ رکھتے تھے
سائلوں کو مدام دیتے تھے	اور جنت وہ مول لیتے تھے
ہے ولایت علی ساکون امیر	لاٹ صاحب نے جن کی کی توقیر
ان کی صحبت تھی یا کوئی دربار	مرجع خلق تھی وہی سرکار
تھے وہ کاظم علی خاں ثانی	ہائے صورت وہ ان کی نورانی
ان کی تہذیب کو سخاوت کو	مختصر بھی لکھوں تو دفتر ہو
تھے جو محبوب خاطر احباب	نام تھا جن کا بادشاہ نواب
ہوں گے پیدا رئیس کب ایسے	نرم دل تھے غریب پرور تھے
ہے یہیں اک محلۂ دیواں	ہندو مذہب کے تھے رئیس وہاں
نندلال اور رائے سلطاں تھے	جن کے جد ناظموں کے دیواں تھے
رائے رادھا کرشن ذی رتبہ	وہ بھی ٹیٹنے کے گویا تھے راجا
وہ مغل پورہ ہے محلّہ جو	حال اس کا سناؤں کیا تم کو
اس محلّے میں تھے رئیس ایسے	دل بھر آتا ہے ذکر سے جن کے
لوگ کھاتے قسم تھے قسمت کی	انتہا تھی نہ کوئی دولت کی
جانے کیا جرم کیا گناہ ہوا	وہ محلّہ بھی سب تباہ ہوا
تھا رئیسوں کو شوق ورزش کا	اس میں صحت تھی، دل بہلتا تھا
فن میں 'بنوٹ' کے کوئی تھا فائق	کوئی گدکے پھری کا تھا شائق
تھے جو یوسف علی خاں نوّاب	ان سے واقف ہیں شہر کے احباب
پہلواں خوشنویس شاعر تھے	ایسے بیسوں فنوں کے ماہر تھے
سب کو بے حد لحاظ تھا ان کا	کون ان کا ادب نہ کرتا تھا
تھے مغل پورے میں علی مرزا	ننھے آغا سے ربط از حد تھا
سب کو حیرت میں ڈالا دونوں نے	ایسا خیمہ بنایا دونوں نے
توڑ کر اس کو ہاتھ میں لے لو	پھر ہے خیمہ جو کھول کر دیکھو
نبتا صاحب صدر گلی والے	خوشنویس و رئیس شاعر تھے

میرے اُستاد سے تلمذ تھا — لکھنؤ میں یہ اُن کا تھا شہرا
ہر غزل میں عجب صفائی ہے — موتخ نے کیا زبان پائی ہے
گویا اُستاد کی نشانی تھے — مختصر یہ کہ شاد ثانی تھے
وہ جو اُستاد بھائی تھے بیتاب — جن کو روتے ہیں آج تک احباب
تھے جو راجہ یہاں نظامت کے — اسری پرشاد ان کے پوتے تھے
معتقد بھی تھے شاد نامی کے — تھے ثناخواں اسی گرامی کے
صاف گو تھے وہ پاک طینت تھی — کیا طبیعت تھی، کیا سخاوت تھی
تھے جو اس شہر میں کنور سکھراج — ان سے پلتے تھے مفلس و محتاج
عربی، فارسی کتابوں کا — کیا کتب خانہ ان کے گھر میں تھا
اچھے احباب، آپ اچھے تھے — سچے احباب، آپ سچے تھے
صاحبِ علم قدر دانِ کمال — تھے وہ رتبہ شناس شانِ کمال
وہ زمین دار لودی کٹڑے کے — شہر میں اک بہار تھی جن سے
سب شریف و نجیب با توفیق — منکسر خوش مزاج اور خلیق
پیارے صاحب لنگھیا لوٹے میں — میر کھجّو تھے لودی کٹڑے میں
تھے مبارک حسین ایسے رئیس — ہوں گے اب حشر تک نہ ویسے رئیس
نہ دشہ لال کی ثنا کیا ہو — حق تو یہ ہے رئیس ایسا ہو
وہ جو یوسف حسین صاحب تھے — تھے وہ مرحوم اچھوں سے اچھے
جس سے کی دوستی نباہ دیا — منھ سے جس کو جو کہہ دیا وہ کیا
ہوگا اب ان کا کوئی کیا ثانی — تھے کفایت حسین لاثانی
میر واجد حسین با توقیر — ان کی بھی دل پہ نقش ہے تصویر
تھے خدا بخش خاں وکیل یہاں — ہیں گنجانے کے وہ روحِ رواں
دیکھیے تو طلسم خانہ ہے — کیا کتابوں کا اک خزانہ ہے
تھے جو مرحوم مولوی یحییٰ — کہیے دریا انہیں سخاوت کا
دارِ عقبیٰ میں گھر بناتے تھے — جو کماتے تھے وہ لٹاتے تھے
کیسے کیسے طبیب تھے اگلے — تجربہ کار تھے، مسیحا تھے

ہوگا عبدالحمید سا نہ حکیم — عالم و فاضل و فہیم و عظیم
میر کاظم حسین صاحب نے — معرکوں کے بہت علاج کیے
میرے پٹنے میں تھے وہ کاریگر — شہر والوں کو ناز تھا جن پر
میں نہ بھولوں گا نام گمرتن کا — اُس نے کیپس اک بنایا تھا
ایسی ایجاد ایسی صنعت تھی — اہلِ یورپ کو جس پہ حیرت تھی
متصنیاں شہر میں ہیں میرے چلد — ان بُزرگوں کا ہے اسی پہ مزار
پیر معروف مہدی و منصور — شاہ نوذر سا اہلِ دل مغفور
ہے جو بیرون شہر اک بستی — متبرک ہے، نام ہے 'جھٹلی'
جلوہ گر ہیں وہاں پہ دو مخدوم — اہلِ پٹنہ کو خوب ہے معلوم
پیر جگجوت حضرتِ صوفی — دھوم دونوں کی ہے کرامت کی
پنج شنبہ کو لوگ جاتے ہیں — ان بزرگوں سے فیض پاتے ہیں
ان کی روحوں سے میں ہوں شرمندہ — نام جن جن کا میں نے سہو کیا
میں نے کی ہے یہ مختصر بہ نظر — پاؤں پھیلائے دیکھ کر چادر
عرض ہے ناظرینِ والا سے — سب کے ناموں پہ فاتحہ دیدے
اب اسی شہر کی یہ حالت ہے — اب اسی شہر کی یہ نوبت ہے
جس طرف کو نگاہ جاتی ہے — ہو کے مغموم لوٹ آتی ہے
کب کسی کو شگفتہ دل دیکھا — جس کو دیکھا تو مضمحل دیکھا
ایسا برباد ایسا ناس نہیں — شہر اتنا کوئی اُداس نہیں
نغمہ خواں عندلیب جس جا تھے — اس جگہ اب ہیں جھونجھ اُلّو کے
کل جہاں پر تھے محل عالیشان — آج گیدڑ رہیں یا سیار وہاں
خشت کہنہ کا ہے کہیں انبار — یا کہیں پہ گری ہوئی دیوار
تھے جہاں پھول سے بھرے تھالے — اب وہاں پہ ہیں ڈھیر کوڑے کے
ہے یہ گلیوں میں حال کیچڑ کا — جیسے دیوار کا بنے گارا
تنگ و تاریک ہے گلی کوچہ — شہر میں اس طرح کا سناٹا
جابجا کھیت اب ہیں گوبی کے — یا گدھے لوٹتے ہیں دھوبی کے
بند بازار ہے تجارت کا — بے زری میں ہے سب کا دل مُردہ

بڑھ گئی جاہلوں کی اب تعداد
مل گیا خاک میں عظیم آباد

ہو گئے الفت سے دل ہوئے خالی
اب مروّت سے دل ہوئے خالی

اب کہاں عاشقی کے چرچے ہیں
سب ہی اپنی غرض کے بندے ہیں

زر سا مشکل کشا جو غائب ہو
کون پھر پوچھتا ہے سنتے کو

چین و آرام سے نہیں کوئی
ایک حالت ہے اعلیٰ ادنیٰ کی

قحط سے غیر سب کا حال ہوا
گھر مریضوں سے اسپتال ہوا

جن کو تم اہلِ زر سمجھتے ہو
فکر سے ہے فراغ کب ان کو

اب نہیں اتفاق آپس میں
رہ گیا ہے نفاق آپس میں

حرص کے ہیں غریب بیماری
اور امیروں پہ بے حسی طاری

منصفی، منصفی سے خالی ہے
بھینس اس کی ہے جس کی لاٹھی ہے

جھوٹی تائید کرنا اچھا ہے
کیا خوشامد پسند دنیا ہے

ایسی پھیلی و با خیانت کی
قدر جاتی رہی دیانت کی

جب سے گو نجی صدائے آزادی
کرتے ہیں اب رذیل غدّاری

اک تو نایاب خود شرافت ہے
پھر شرافت کا نام ذلّت ہے

مٹی کے مول بکتی ہے ہڈی
قدر کیا خاک ہو شرافت کی

ہنستے ہیں عاقلوں پہ اب جاہل
بنتے ہیں بیوقوف اب عاقل

اب ہے مسجد کی جا پہ میخانہ
مذہبی آدمی ہے دیوانہ

گو حقارت ہو خواہ ذلّت ہو
زر کمانے کی کوئی صورت ہو

اس کو خلوت ہی کیا ہے جلوت کیا
جس نے پردہ جلا کے خاک کیا

کیا زمانے کی عقل الٹی ہے
عین تہذیب بدتمیزی ہے

اب مساوات کی یہ منزل ہے
باپ بیٹے کا فرق مشکل ہے

کیوں نہ دنیا کی غیر حالت ہو
بیوقوفی، کہیں مروّت ہو

غیر پر زر کے مینہ برستے ہیں
اور حقدار سب ترستے ہیں

اس میں مطلق نہیں ہے جھوٹ ریا
میں نے جو کچھ کہا، وہ دل سے کہا

میری گستاخیاں معاف کریں
اپنے حسرت سے دل کو صاف کریں

# ذاکر صاحب ـــ ذاتی یادیں

۲

سیّد برکات احمد

● **ڈاکٹر سیّد برکات احمد** (پ ۱۹۱۹ء) دہلی یونیورسٹی سے ایل' ایل' بی اور سٹرنی
یونیورسٹی سے انگریزی (لسانیات) میں ایم' اے، امریکن یونیورسٹی بیروت (لبنان) سے
تاریخ عرب میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور تہران یونیورسٹی سے فارسی ادبیات میں ڈی۔ لٹ۔ مادری زبان
اُردو کے علاوہ عربی، فارسی، جرمن اور ترکی زبانوں سے بھی واقفیت ہے۔ وزارت خارجہ
حکومت ہند کے تحت امریکا، یورپ، آسٹریلیا اور مشرق وسطیٰ کے مختلف ممالک میں ہندوستان
کے ہائی کمشنر رہ چکے ہیں اور اقوام متحدہ اور اس کی مختلف افریقی و ایشیائی کمیٹیوں میں
ہندوستان کی نمایندگی کر چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مجلس عاملہ کے
رکن رہے اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں آپ کی تصانیف میں " جنوبی افریقہ میں قیدیوں
پر مظالم" اور محمدؐ اور یہود" (انگریزی) " خلفاے عباسیہ" (اُردو) قابل ذکر ہیں۔
" قرآنی عربی کا تعارف،" (اُردو) زیر طبع ہے۔

●●

○

دلی کے ایک رئیس جن کے والد محترم کا جامعہ سے گہرا تعلق تھا، صاحب ذوق آدمی تھے۔ گو کتابوں کا شوق خود بھی تھا مگر کتابوں کا بیشتر ذخیرہ انھوں نے والد سے وراثت میں پایا تھا۔ اُن کی داشتہ بھی نہ صرف حسین تھیں، خوش آواز تھیں، بلکہ شعروں کا بھی اچھا ذوق رکھتی تھیں اور دیوانوں کا سارا انتخاب، میرا مطلب اشعار کے مجموعوں سے ہے، ان کے دیوان خانے میں تھا۔ مجھے اس دیوان خانے میں شرف باریابی حاصل تھا۔ میرا لڑکپن تھا جو کچھ ملتا پڑھ ڈالتا۔ ایک دن ایک چھوٹی تقطیع کا دیوان نظر آیا۔ پڑھ تو لیا سمجھ میں بہت کم آیا۔ مگر اس کا کاغذ، طباعت اور سرخ حاشیہ دل کو بھا گیا۔ خریدنے کی کوشش کی مگر نہ ملا۔ چوری کی ہمت نہ ہوئی، چنانچہ مانگ لیا اور اس کے بعد واپس نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میرا کتب خانہ لٹا تو خدا جانے یہ دیوان کس طرح بچ رہا۔ یہ غصب شدہ دیوان اب بھی میرے پاس ہے۔ غالب اور ذاکر حسین سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ذاکر حسین نے برلن کے زمانہ قیام میں یہ دیوان خود کمپوز کر کے مطبع قادیانی میں چھپوایا تھا۔

کچھ دنوں بعد خالدہ ادیب خانم کے ہندستان آنے کا شہرہ ہوا۔ جامعہ اُن دنوں قرول باغ میں تھی اور قرول باغ جانا آسان کام نہ تھا۔ ٹریم صدر بازار سے گذرتی دِلّی کی آخری سرحد پر ختم ہو جاتی وہاں سے تانگہ لیا جاتا اور لوگ خاک پھانکتے، دھکّے کھاتے جامعہ پہنچتے۔ میں بھی خالدہ ادیب کا لیکچر سُننے گیا۔ اُن دنوں میری معلومات ایسی ویسی ہی تھیں اور یہ معلوم نہ تھا ترکی کی تین مشہور لطیفہ، صبیحہ اور خالدہ میں کون کون ہے اور ان کا مصطفےٰ کمال پاشا سے کیا رشتہ ہے۔ میں وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ ہال تقریباً خالی تھا چنانچہ میں سب سے اگلی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو کسی نے کچھ پرسش نہ کی مگر جب معززین حسب دستور آخر میں آنے شروع ہوئے تو جلسے کے ایک مہتمم صاحب نے مجھے اپنی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا میں یہاں سب سے پہلے آیا ہوں اور سب سے اپنی جگہ انتخاب کرنے کا سب سے زیادہ

تی ہے۔ ہال بھر چکا ہے۔ اب آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں نہ صرف یہ کرسی چھوڑ دوں بلکہ پورے لکچر کے دوران
کھڑا رہوں۔ اس بحثا بحثی کوشش کہ ایک باریش اور وجیہ صاحب تشریف لائے۔ واقعہ دریافت کیا اور
فرمایا آپ تشریف رکھیے۔ جن معزز مہمان کے لئے مجھ سے کرسی خالی کرائی جا رہی تھی اُنہوں نے ان کو اپنی
کرسی پر جا کر بٹھا دیا اور خود کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر تو میں اپنی کرسی پر ڈٹا بیٹھا رہا اور اس کے بعد اپنی حرکت
پر شرمندگی کا احساس ہوا اور میں ان باریش بزرگ کے پاس گیا۔ عرض کیا آپ میری کرسی پر تشریف
رکھئے۔ میں کھڑا رہوں گا۔ اُنہوں نے فرمایا کیا بہتر ہو ہم دونوں ہی کھڑے رہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کچھ دیر بعد
یہ کرسی بھی بھر گئی اور یہ بزرگ کہیں چلے گئے۔ بعد میں، میں نے انہیں اسٹیج پر دیکھا۔ پھر معلوم ہوا کہ دیوان
غالب کے کمپوزیٹر یہی صاحب ہیں۔ خالدہ ادیب کی تقریر تو یاد نہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ انہوں نے
اسٹیج کے ایک گوشے سے تقریر شروع کی تھی۔ اور جوش خطابت میں سارے اسٹیج کو ایک مشتاق بیلا رینا
کی طرح دس پندرہ جملوں میں ناپ لیا اور دوسرے گوشے میں پہنچ گئیں۔ جلسہ جب ختم ہوا تو میں ذاکر
صاحب کے پاس گیا، اپنی بدتمیزی کی معافی چاہی اور عرض کیا، جلسے میں آنے کا بڑا مقصد آپ کو دیکھنا اور
آپ کی کمپوزنگ اور ذوق کی داد دینا تھی۔ اپنی حماقت سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر آپ یائے مجہول اور
یائے معروف کا فرق ملحوظ رکھتے تو بہت اچھا ہوتا۔ مسکرائے اور کہنے لگے اور بھی بہت سی غلطیاں تھیں
اب میں کیا کہتا کہ ان غلطیہائے مضامین کو سمجھنے کی لیاقت ہی نہیں۔ یہ نسخہ کیونکہ نایاب ہو چکا تھا اس لیے
دریافت فرمایا مجھے کس طرح ملا۔ میں نے قصہ سنایا۔ فرمایا بھائی آپ نے تو صرف ایک دیوان لے کر ہی واپس
نہیں کیا۔ بعض حضرات نے تو پورے کتب خانے اسی طرح بنا لیے۔ اس کے بعد ایک ایسی بات بتائی جس سے
میرے دیوان کی قیمت اور بھی بڑھ گئی۔ یہ دیوان ذاکر حسین نے ہی رئیس موصوف کے والد کو پیش کیا تھا۔

کچھ دنوں بعد مولانا شوکت علی دلّی تشریف لائے اور قرول باغ میں قیام فرمایا۔ میں ان دنوں
دریا گنج میں رہتا تھا۔ ٹریم اور تانگے کے سفر سے ڈرتا تھا۔ چنانچہ مولانا کے نواسے شاکر ماجد علی خاں کے
ساتھ قرول باغ گیا۔ شوکت علی موجود نہ تھے، کچھ دیر تو ہم نے انتظار کیا۔ میز پر بسکٹوں کا ڈبہ رکھا تھا۔ شوکت علی
اچھا کھانے اور خاص کر میٹھے کے شوقین تھے۔ ڈبہ بھی ہنٹلی اینڈ پامرز کے assorted بسکٹوں کا
تھا۔ شاکر اٹھا لائے اور ہم دونوں نے بسکٹ منتخب کر کے کھانے شروع کر دیے۔ اتنے میں ذاکر حسین
بھی شوکت علی کی تلاش میں آئے۔ ہم دونوں نے یہ ڈبہ ذاکر حسین کی خدمت میں بھی پیش کیا۔ میں نے کچھ

جھینپ کر کہا چوری کا مال ہے۔ فرمایا "نوشِ جان"۔ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا اب غضب کے بعد سرقے کی نوبت آ گئی۔ میں نے کہا "کھانے کا سامان چرانے پر ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ ہماری تالیف قلب کے لیے ذاکر صاحب نے ایک چاکلیٹ بسکٹ لیا اور فرمایا چوری کا مال ویسے بھی مزیدار ہوتا ہے۔ اتنے میں شوکت علی آ گئے اور ہنٹلی اینڈ پامرز کا یہ پورا ڈبہ چائے کے ساتھ اُڑ گیا۔ شوکت علی کے پاس محمد علی لاہوری کا انگریزی کا احمدی ترجمہ قرآن تھا اور قرآن کریم کا یہ نسخہ مولانا محمد علی کا مرحوم کی زیرِ تلاوت رہتا تھا۔ جیل میں بھی ان کے پاس یہی نسخہ تھا۔ اس نسخے کے حاشیے پر محمد علی کا مرحوم کے لکھے ہوئے نوٹ تھے مثلاً ایک آیت کے حاشیے پر لکھا ہوا تھا۔ رات بھر درد اور بے قراری میں گذری۔ صبح تلاوت کے وقت اس آیت پر پہنچا رقت طاری ہو گئی اور درد اور بیقراری سے نجات مل گئی۔ میری اس نسخے پر نظر تھی۔ یہ نسخہ کتابوں کی کھلی الماری میں پڑا ہوا تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے کسی کو یہ احساس بھی نہ تھا کہ یہ collector's item ہے۔ ایک مرتبہ اس نسخے کے فراق میں گیا تو معلوم ہوا گھر پر کوئی نہیں اور مکان بند ہے۔ قرول باغ کا سفر اور اس کی کوفت۔ واپسی کے لئے کوئی سواری نہیں۔ اس خیال سے گیا تھا کہ شاکر اپنی موٹر میں ٹریم کے ناکے تک پہنچا دیں گے۔ اسی ادھیڑ بُن میں ذاکر حسین کا خیال آیا۔ مکان پر پہنچا تو انداز کچھ مرغی خانے کا ہوا۔ باہر مرغیاں ایک طرف بکری اور ایک خالی پلاٹ پر کتوں کا اجتماع گویا جلسے کی تیاری میں مشغول ہوں۔ ذاکر حسین موجود تھے۔ بڑی محبت سے پیش آئے۔ کھانے کے لیے روک لیا۔ میں نے محمد علی کے قرآن کا تذکرہ کیا۔ فرمانے لگے "کیا دیوان غالب والا ارادہ ہے۔ میں نے عرض کی شوکت علی کے پاس ضائع ہو جائے گا۔ گرد پڑی ہوئی ہے اور اس طرح رکھا ہے کہ جس کا دل چاہے لے جائے۔ فرمایا "اسے جامعہ لائبریری کے لیے حاصل کرنا چاہئے۔ میں نے کہا بہت خوب۔ چنانچہ یہ ٹھہرا کہ ذاکر حسین شوکت علی سے یہ نسخہ مانگ لیں گے۔ کچھ دنوں بعد شوکت علی کا انتقال ہو گیا۔ معلوم نہیں قرآن کریم کا یہ نسخہ اب کہاں ہے۔

اس کے بعد ملاقات ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں ہوئی۔ پرانا قلعہ اور ہمایوں کا مقبرہ غدر کی یاد دلا رہے تھے۔ میرے گھر والے بھی گئے پٹے ہمایوں کے مقبرے میں ایک درخت کے نیچے موت و زیست کی کشمکش سے گذر رہے تھے۔ نہ کھانے کو، نہ اوڑھنے کو اور اکتوبر کی شام۔ میرا منجھلا لڑکا جواب ماشاء اللہ نیویارک میں رہتا ہے، سخت بخار میں مبتلا۔ اس دوران دِلّی کے ذو صاحب اثر مسلمان

میر مشتاق احمد اور عزیز حسن بقائی تشریف لائے۔ عزیز حسن اس دھج سے آئے کہ سر پہ گاندھی ٹوپی اور شیروانی پر پستول اور کارتوسوں کی پیٹی۔ دونوں صاحب گشت کرکے چلے گئے۔ اس مایوسی کے عالم میں دیکھا کہ ذاکر حسین تشریف لا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ جامعہ کے طالب علم اور کھانے کا سامان۔ اگرچہ قیامت کا ہنگامہ تھا، مگر مجھے دور سے دیکھا۔ تشریف لائے۔ کھانے کا انتظام کیا۔ میرے بچے کو دیکھا، فرمایا گھبرائیے نہیں سوشیلا نائر پرانے قلعہ میں ہیں۔ میں جاکر انہیں بھیجتا ہوں۔

وقت بیت گیا، ذاکر حسین مسلم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ چلے گئے اور میں وزارت خارجہ میں لے لیا گیا۔ انہی دنوں حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ نے جنوبی مشرقی ایشیا کا عزم کیا اور شفیق الرحمٰن قدوائی کی محبت اور ان کے جذبہ مہمان نوازی نے مجھے انڈونیشیا کھینچ لیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی ان دنوں اقوام متحدہ کی طرف سے جاکرتا میں مقیم تھے اور حکومت انڈونیشیا کا تعلیمی پروگرام مرتب کر رہے تھے جاکرتا سے ذرا فاصلے پر ڈچ حکومت نے گلابوں کا ایک بہت بڑا باغ بنایا ہے۔ وہ دیکھنے گئے۔ دنیا میں گلاب کی جتنی بھی انواع ہیں وہ اس باغ میں تھیں۔ یہاں ایک گہرے براؤن رنگ کا گلاب بھی دیکھا اس کا نام Black rose تھا۔ افسوس اس کے بیج نہ مل سکے۔ ہندوستان واپس ہوا تو ذاکر حسین سے اس کا تذکرہ کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی بھی اتفاق سے موجود تھے۔ کہنے لگے ذاکر صاحب اب گلاب بھی سیاہ ہونے لگا، اب آپ کے پسندیدہ شعر کا کیا ہوگا :

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل ٭ خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

ذاکر حسین صاحب مسکرائے اور فرمایا "بھائی رقیب روسیاہ کا خون بھی سیاہ ہوتا ہے۔ یہ شعر عاشق صادق کے لیے بھی ہے اور رقیب کے لیے بھی۔

صاحبو! اس طویل تشبیب کے بعد مجھے شاید گریز کا اس سے بہتر موقع نہ ملے۔ علی گڑھ کی حالت ان دنوں کچھ اچھی نہیں تھی اور سچ پوچھئے تو اچھی کب تھی۔ وہ کونسا زمانہ تھا جب یہ درس گاہ قوم کے لیڈروں کے برنامہ انتخاب کی سرفہرست عہدہ داران یونین کے فرائض کا عنوان اور وائس چانسلروں کی تنگ مزاجی یا سیاست کا تختہ مشق نہ رہی ہو۔ سید کے زمانہ میں جو غبن ہوا تھا اس کے طویل سائے نے یونیورسٹی کا ساتھ کب چھوڑا، اور آفتاب احمد خاں اور ضیاء الدین احمد کے زمانہ میں جو خانہ جنگی شروع ہوئی تھی اس کی آگ کب سرد ہوئی۔ کبھی سلگی، کبھی بھڑکی۔ یہاں کی وائس چانسلری

ریاضیات و معاشیات کے ماہروں نے بھی کی اور ایک ریاست کے کامیاب وزیر باتدبیر نے بھی کی۔ ایک وائس چانسلر لڑکوں کے ہاتھ پٹنے کی روایت اپنے ساتھ لائے اور ایسے بھی وائس چانسلر آئے جن کا مزاج بچپن ہی سے کلکٹرانہ تھا۔

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سید نے مسلمانوں کو سیلاب بلا سے بچانے کے لیے جو ناؤ بنائی تھی اس کی پتوار کب ٹوٹی۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذاکر حسین نے جب اس ناؤ کو سنبھالا تو یہ بیچ منجدھار میں تھی اس کا ناخدا بادبانوں کو کھلا چھوڑ کر جا چکا تھا اور دوسرے ملاح آہستہ آہستہ ساحل کی طرف تیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ان دنوں ترکی میں تھا اور خالدہ ادیب کے مشہور ناول "سینک نی بقال" کا اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب انقرہ سے استنبول جاتا تو خانم کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ایک دن مسلمانوں کی حالت زار پر گفتگو ہو رہی تھی، بات چلی سلطان عبدالحمید سے اور ختم ہوئی ذاکر حسین پر۔ کہنے لگیں منقسم ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی کے در و دیوار کی مرمت ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ و روپ بھی بدلنا ضروری ہے۔ کچھ پرانے روشندان بند کرنے کی ضرورت ہے کہ وہاں سے اب نہ روشنی آتی ہے اور نہ ہوا۔ کچھ نئے دریچے کھولنے لازم ہیں کہ ہوا اور روشنی کا رخ بدل گیا ہے۔ کہنے لگیں ذاکر حسین نے جس کام کا بیڑا اٹھایا ہے وہ کئی حیثیتوں سے مدحت پاشا کے مشن سے ملتا جلتا ہے۔ میں نے قرول باغ کے مکان بھی دیکھے ہیں اور اوکھلے میں جامعہ کے سنگ بنیاد کی تقریب میں بھی شریک ہوئی ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کی بنیاد پر کہہ سکتی ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کا یہ باغی ہی یونیورسٹی کا معمار ثانی ہوگا۔ خدا کرے اس کا حال مدحت پاشا جیسا نہ ہو۔

رؤف بے ابوالکلام آزاد کے دوستوں میں تھے۔ جب ترکی جانے لگا تو ابوالکلام آزاد کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ انہوں نے مخلص طور پر رؤف بے کا تفصیلی تعارف کرایا اور انہیں سلام کہا۔ رؤف بے ترکی کے انقلابی راہ نماؤں میں نہایت متوازن مزاج کے آدمی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب سلطان نے مصطفیٰ کمال کی گرفتاری کا حکم دیا اس وقت ترکی بحریہ کے افسر اعلیٰ ہوتے ہوئے بھی رؤف بے نے مصطفیٰ کمال کا ساتھ دیا۔ وہ بعد میں ترکی کے وزیر اعظم بھی رہے۔ خالدہ ادیب خانم کی طرح وہ ترکی کو ان راہوں پر لے جانے کو تیار نہ تھے جن پر مصطفیٰ کمال لے گئے۔ میں رؤف بے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ابوالکلام آزاد کا سلام پہنچایا۔ دیر تک ہندوستان کی سیاست پر گفتگو رہی۔ پھر خود ہی پوچھا ذاکر حسین کا کیا حال ہے میں نے

لات تفصیل سے بتائے۔ کہنے لگے شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ ۱۹۲۱ء میں جب جامعہ کا پہلا کانوکیشن ہوا تو میں
ں میں شریک تھا۔ ایک انگریزی حکومت ختم ہوگئی، جامعہ اور علیگڑھ میں کوئی اساسی فرق نہیں رہا۔ ذاکر حسین
سلم یونیورسٹی کے ایک قابلِ فخر فرزند ہیں اور ان کا مقام اب ان کی مادر درس گاہ ہے۔

جو رائے خالدہ ادیب خانم اند رؤف بے کی تھی، وہی ذاکر حسین کی بھی تھی۔ خود انہوں نے اپنے
نام اور کام کی اہمیت کا جو اندازہ کیا تھا وہ بھی یہی تھا۔ ۱۹۵۲ء میں انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا:

"علی گڑھ جس طرح کام کرے گا، علی گڑھ جس جس اسلوب پر سوچے گا، علی گڑھ ہندستانی زندگی
کے مختلف شعبوں کے لئے خدمت کی جو پیش کش دے سکے گا اس سے متعین ہوگا۔ ہندستانی
قومی زندگی میں مسلمانوں کا مقام، اور ہندستان جو سلوک علی گڑھ کے ساتھ کرے گا اس پر،
ہاں اس پر بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی اختیار کرے گی۔"

تقسیم ملک کے بعد مسلمانانِ ہند کی زندگی کا ایک بڑا سانحہ ذاکر حسین کا مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری
سے استعفیٰ ہے۔ یونیورسٹی کی قیادت سنبھالنے کے ایک سال بعد ہی ذاکر حسین پر دل کا نہایت شدید
حملہ ہوا۔ وہ شخص جو جامعہ کے زمانہ میں اپنی جامعہ کی زبوں حالی برداشت کرتا رہا، وہ شخص جو خاموشی
سے "وِدّیا مندر" کے نام پر مطعون ہوتا رہا، وہ شخص جس نے خندہ پیشانی سے ہر مصیبت کو برداشت کیا
وہ جامعہ کے ساتھیوں کو آلام و مصائب میں خوش رہنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا رہا اس
کا شیشۂ دل سال بھر کے عرصہ میں مسلم یونیورسٹی کے اس کیمپس میں چکنا چور ہوگیا جہاں اس نے اپنی جوانی کا
عزیز ترین زمانہ گذارا تھا۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں جب حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوا، تو جامعہ مقروض تھی اور اخراجات کے لیے آمدنی
کی کوئی صورت نہ تھی اور سوال یہ تھا کہ جامعہ کو بند کیا جائے یا زندہ رکھا جائے۔ ذاکر حسین کے دل پر
اس وقت کا رزی انفارکشن کا کاری زخم نہیں لگا۔ نہ وہ بیمار ہوئے، نہ بے کیف۔ رشید احمد صدیقی نے ذاکر حسین
کے استعفیٰ کی بات بیچ بیچ کر لکھی ہے، کہتے ہیں:

"علالت کی مسلسل کم و بیش خلش سے ادھر ذاکر صاحب بے کیف رہنے لگے تھے اور کبھی
کبھی معمولی باتوں پر بھی بے لطف ہو جایا کرتے تھے۔ اس کا سبب تنہا علالت نہ تھی بلکہ کچھ
اور طرح کی ناسازگاریاں تھیں جو یقیناً سنگین نہ تھیں اور عام طور پر اس شخص کو پیش آتی

رہتی تھیں جس کے سپرد اتنا بڑا کام ہو' لیکن ان سب نے مل کر کچھ ایسی صورت پیدا کر دی کہ ذاکر صاحب کو علی گڑھ نہ چھوڑنے پر راضی نہ کیا جا سکا۔''

یہ ایک Understatment ہے۔ رشید احمد صدیقی' ذاکر حسین کے پرانے ساتھی اور دوست تھے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ذاکر حسین نہ آسانی سے ہار ماننے والے ہیں اور نہ ہراساں ہونے والے' انہوں نے مذکورہ بالا بیان میں ایسی بات کہی ہے' جو ذاکر حسین کی پوری شخصیت کا اُلٹ ہے۔ انہی دنوں میرا تبادلہ تہران سے شملہ ہوا تھا۔ دو دن کے لیے علی گڑھ گیا' تو ذاکر حسین سے ملنے گیا۔ جرمن ڈرامہ نویس Bertol Berecht کا اُنہی دنوں ہارٹ اٹیک سے انتقال ہوا تھا۔ بات ان کے فن پر چل پڑی۔ ذاکر حسین نے کہا برخت راسخ العقیدہ مارکسی ہونے کے باوجود اپنی شاعرانہ اقدار کو مارکسی عقاید کا تابع بنانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگر مجھے درست الفاظ یاد ہیں تو شاید ذاکر حسین نے integauty as a poet کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے' جب ان کی خدمت میں ایک طرف کمیونسٹ اساتذہ کی فہرستیں پیش ہو رہی تھیں' تو دوسری طرف رجعت پسند مسلمانوں کی جدولیں برخت کے پردے میں ذاکر حسین اپنا حال دل کہہ رہے تھے۔ ذاکر حسین نے ایک عظیم الشان کام اپنے ذمہ لیا تھا اور ان کی بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ ان کی مادر درسگاہ س کام میں ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ جن باتوں کو رشید احمد ایسی ناسازگاریوں کا نام دے رہے تھے' جو ان کی نگاہ میں سنگین نہیں تھیں۔ وہی دراصل یونیورسٹی کو تباہی کی طرف لے جا رہی تھیں۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ رشید احمد صدیقی نے ذاکر حسین کو استعفےٰ سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی اور ناکام رہے۔

ذاکر حسین کے آفریدی پٹھان ہونے کی بات ان کے خاندان اور نسب کا حال بیان کرتے ہوئے س انداز پر کی جاتی ہے کہ گویا یہ امر اتفاق تھا' ورنہ کہاں ذاکر حسین اور کہاں قایم گنج کے پٹھان۔ میرے خیال میں اگر ذاکر حسین کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ ذاکر حسین آخر وقت تک قایم گنج کے پٹھان رہے اور تمام عمر ان پٹھانی خوبیوں کی نشو و نما اور پٹھانی کمزوریوں کی تہذیب میں لگے رہے۔ قایم گنج کے پٹھانوں کی طرح وہ نہ تلوار کے شوقین تھے اور پنجے اور خنجر کے دلدادہ۔ مگر غصے میں کسی کم نہ تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ یہ غصہ اپنی ذات ہی پر اُتارتے اور اس انداز پر اُتارتے کہ لوگ انکی جھلاہٹ اور طیش کو بھی ان کا لطف و کرم سمجھتے۔ ان کی پوری عمر ایک اندرونی کشمکش میں صرف ہوئی۔ وہ تہذیب نفس میں تو کامیاب ہو گئے لیکن اپنے ساتھیوں' دوستوں اور بیگانوں سے جو کشمکش انہیں کرنی

ا وہی انہیں لے ڈوبی۔ سچ اس بات کا نہیں کہ مریضِ دل جانبر نہ ہوا۔ افسوس اس امر کا ہے کہ جس مقصد
لئے جان دی گئی وہ حاصل نہ ہوا اور جس ادارے نے دِل کا درد دیا اس نے اس درد کا فائدہ نہیں اُٹھایا۔
رثیہ ذاکر حسین کا نہیں بلکہ اس قوم کا ہے جو نہ اپنے محسنوں کو پہچانتی ہے اور نہ ان کی قدر کرتی ہے۔" ابوخاں
بکری" چاندنی کی کہانی نہیں ذاکر حسین کا قصّہ ہے۔

امریکا کے دو ڈاکٹروں Meyer Friedman اور Ray Rosenman نے کئی برس
تحقیق کے بعد ہارٹ اٹیک کے مریضوں پر ایک کتاب لکھی ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس مرض کا حملہ ایک
ص طبیعت اور مزاج کے شخص پر ہی ہوتا ہے۔ اس شخصیت کو انہوں نے Type. A کا نام دیا ہے۔
ے سے قبل کہ میں Type. A کی شخصیت بیان کروں، رشید احمد صدیقی نے ذاکر حسین کی شخصیت کا جو نقشہ
کھینچا ہے ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں:

" ذاکر صاحب کی ایک صفت جو ان کے درجے کے دوسرے لوگوں سے ان کو ممتاز کرتی
ہے یہ ہے کہ کیسی ہی اہم تقریب کیوں نہ ہو اس کے لئے خطبہ لکھنا ہوگا، تو وہ خود لکھیں گے...
چنانچہ اس طرح کے مواقع جب پیش آتے ہیں اور کثرت سے آتے رہتے ہیں، تو وہ اتنے مضطر
ہوتے ہیں کہ آس پاس کے لوگ آسانی سے سمجھ جاتے ہیں کہ موصوف کسی خطبے کی کوفت میں ہیں
خطبہ لکھنے کا اہتمام وہ یہ حساب لگا کر کرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ خطبہ لکھنے کا کام ختم کرنے اور
اس کے پڑھے جانے کے درمیان تھوڑا سا بھی فصل زمانی باقی رہ جائے۔ اور ستم ظریفی یہ
ہے کہ آج تک ایسا نہ ہوا کہ خطبہ نامکمل رہ جائے یا اپنی جگہ پر بے مثل نہ ہو ... ذاکر صاحب
کی قابلیت اور ذہانت کا اظہار یوں تو ہر موقع پر ہوتا ہے لیکن بدیہہ آفرینی اور برجستہ
جوابی کے الماسی ریزے اور برق پارے اس وقت دیکھنے میں آتے ہیں جب وہ حریف کی
نامعقولی یا نالائقی پر برہم ہو جائیں ... ان کی معرکہ کی تقریر وہ ہوتی ہے جب مباحثہ
کے محرک ہونے کی حیثیت سے وہ مخالفین کے جواب میں سب سے آخر میں تقریر کرتے ہیں۔"

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

" ذاکر صاحب کو تمام عمر دشواریوں میں کام کرنا پڑا اور دشواریوں سے ہی کام لینا پڑا۔
اچھے اور بُرے کام کی مشکلات اٹھانے اور اٹھاتے رہنے سے انسان کی بعض غیر معلوم اور

غیر معمولی ذہنی اور روحانی صلاحیتیں برسرکار آجاتی ہیں۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ذاکر صاحب کو 'ذاکر صاحب'
بنانے میں ان دشواریوں کو بڑا دخل ہے۔"

ذاکر حسین کی شخصیت سازی میں جہاں اٹاوہ اور علی گڑھ نے حصہ لیا، وہاں برلن نے بھی
ان پر کچھ کم اثرات نہیں چھوڑے۔ ۱۹۶۲ء میں جب جرمن فیڈرل ری پبلک کے صدر Heinrich
Lubke ہندوستان آئے تو دلّی یونیورسٹی نے اعزازی ڈگری دی۔ اس موقعہ پر
کانووکیشن ایڈریس پڑھتے ہوئے ذاکر حسین نے کہا:

" I feel pardonably proud to be priviledged to this as I personally owe an inestimable debt of gratitude to a German university for my own intellectual and moral make up."

ذاکر حسین نے یہ بات جرمنی کے صدر کو خوش کرنے کے لئے نہیں کی تھی۔ پونا یونیورسٹی کی جرمن
ایسوسی ایشن کو مخاطب کرتے ہوئے بھی انہوں نے ایسی ہی بات کی تھی۔ انہوں نے بتایا:

" I learnt German some fifty years ago and have never allowed myself to forget it... I almost daily read it and I can tell you the I am very much richer for it.... The German tongue has a directness and a strength and in the hands of its great writers a refinement and a delicacy which make it worth a great deal of trouble to learn it."

جرمن thoroughness ان کی فطرت ثانیہ نہیں تھی بلکہ عین فطرت تھی۔ ان کی زندگی
عبارت تھی خوب سے خوب تر کی تلاش اور جستجو سے، اہم سے اہم اور مشکل سے مشکل کام کرنے کے عزم سے، چیلنج قبول کرنے سے۔
اب ذرا Friadman اور Roseman کی بھی سنیئے:

" Type A behaviour is a special, well-defined pattern marked by a compelling sense of time urgency-"hurry sickness", aggressiveness and competitiveness .... Type A's engage in a chronic. continuous struggle against circumstances, against themselves. The behaviour pattern is common among hard-driving and successful businessmen and executive. But excess agression is not always easily detected in type A men, if only because they so often keep such feelings and impulses under deep cover. Indeed, very few of these men are even aware of their excess agression. In almost all type A men is the tendency always to compete with or to challenge other People, whether the activity consists of a sporting contest, a game of cards, or a simple discussion. They tend to bristle at points in a conversation where the ordinary person might either laugh self deprecatingly or pass over the possibly contentious theme."

خالدہ ادیب خانم دو انقلابوں سے گزری تھیں۔ سلطنتِ عثمانیہ کے اختتامی دورِ بغاوت سے
اور مصطفیٰ کمال کے دورِ انقلاب سے۔ وہ کہتی ہیں: "کوئی ہندوستانی تعلیم یافتہ جس میں ملی الیاندہ تاج

یہ سوال نہ کیا ہو کہ ذاکر حسین کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ہموطنوں میں چیستان ہیں۔ اسی کے ساتھ ان سے زیادہ کھرا آدمی ملنا غیر ممکن ہے ... جب میری ان سے میونخ میں ملاقات ہوئی تو ان کی عمر ۳۰ سال سے کچھ ہی اوپر تھی' لیکن داڑھی موجود تھی ... میں نے اس جاذب چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ میں نے اُن کو نہایت غصے میں اور ترس کھا کے آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے۔ تاہم ہمیشہ اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں ... وہ مذہبی آدمی ہیں اگرچہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے۔"

خالدہ ادیب نے جس ترکی میں جنم لیا اس میں داڑھی قدامت کا نشان بنتی جا رہی تھی۔ خلیفہ اور شیخ الاسلام کے لئے تو خیر داڑھی ضروری تھی لیکن Yong Turks. نے داڑھی کو خیرباد کہہ دیا تھا چنانچہ مسجدوں کے پیش اماموں اور موذنوں نے بھی اس اسلامی نشان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ذاکر حسین جس خاندان اور ماحول میں بڑھے' پھلے اور پھولے' اس کی روایت میں داڑھی شرافت کا نشان تھی۔ خاص طور پر اہل علم زمیندار خاندانوں میں۔ میں نے ذاکر حسین کے ایسے دو نزدیکی عزیزوں سے جنھوں نے اپنے بچپن میں انھیں دیکھا ہے' ذاکر حسین کی داڑھی کے بارے میں جب پوچھا تو ایک نے کہا شیو (Shave) کرنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے شائد اس کو بچانے کے لئے داڑھی رکھ لی۔ دوسرے عزیز نے مزاحاً کہا ذاکر حسین کی داڑھی ان کی ذہنی نشوونما اور ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ مرتب سے مرتب تر ہوتی چلی گئی۔ یہ معمولی سی بات لیکن ان کے سوانح نگار کو غلط راہ پر ڈال سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاکر حسین مسلمان کے لئے داڑھی ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی داڑھی سہل پسندی کا نشان نہیں بلکہ ان کے مرد مسلمان ہونے کی علامت تھی۔ ذاکر حسین کہتے ہیں:

"مسلمانوں کو داڑھی رکھنی چاہیے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا کہ تم داڑھی رکھو۔ لیکن یہ ذرا غور کرو کہ آخر داڑھی منڈانے سے کیا فائدہ ہے۔ کیا داڑھی سے صورت بدنما ہو جاتی ہے۔ تم نے شائد داڑھی منڈوں سے مقابلہ نہیں کیا۔ کیا تم نے مغل بادشاہوں کی تصویریں نہیں دیکھیں؟ اُن کی داڑھیاں بدنما ہوتی ہیں؟ آخر تم نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ داڑھی رکھ کر آدمی بدصورت ہو جاتا ہے۔ داڑھی میں ایک خاص حسن ہے' مرد اس سے مرد معلوم ہوتا ہے۔"

رہی ذاکر حسین کی داڑھی کی تراش خراش تو وہ بھی ان کی ذہنی نشوونما ناپنے کا پیمانہ نہیں۔ جن دنوں وہ جرمنی میں تھے اور سوٹ زیب تن کرتے تھے ایسی داڑھی رکھتے تھے جو فرنچ کٹ سے ذرا بڑی

ایڈورڈ کٹ سے ذرا مختصر تھی - یہ داڑھی فرائڈ کی داڑھی سے ملتی جلتی تھی لیکن اس کا اسلامی فرق نمایاں تھا - یہی داڑھی تھوڑی بہت ترمیم و اختصار کے ساتھ تادمِ مرگ ان کے حسین اور وجیہ چہرے کی زینت رہی - ہندستان واپسی پر انہوں نے جو مقطع اور پٹھانی داڑھی رکھی تھی وہ د قتی تھی اس کا میں "Erick somia" تجزیہ تو اس وقت نہیں کر سکتا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ان دنوں گاندھی جی کے دربار میں جتنے بڑے مقطع رنگی بڑے، شوکت بڑے، جوہر بڑے، اجمل بڑے - ڈاکٹر انصاری جیسے لوگ کم تھے - میں نے ذاکر حسین کی داڑھی کی بات برسبیل تذکرہ نہیں کی - میں اسے اہم سمجھتا ہوں اس لئے کہ آدمی اپنے لئے جو وضع قطع اور لباس تجویز کرتا ہے وہ اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے - ذاکر حسین مسلمان کے لئے داڑھی ضروری سمجھتے تھے لیکن روایتی مولوی نے داڑھی کا جو حد و د اربعہ مقرر کیا ہے اس کے قائل نہ تھے -

خالدہ ادیب کی اس رائے کی شہادت کہ وہ مذہبی آدمی ہیں اگرچہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے، نہ صرف ان کی داڑھی سے ملتی ہے بلکہ اس خواہش سے بھی کہ پیشانی پر سجدے کا نشان ایسا نہ ہو کہ چھپائے نہ بنے وہ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ کے فرمان سے بے خبر نہ تھے لیکن ریاکاری سے خوف زدہ تھے - انھیں اپنی عبادت کی تشہیر ناپسند تھی - چنانچہ عبدالماجد دریا بادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں - "مسلمان نائب صدر جمہوریہ" کا تماشا ملا - کیا اب یہ دن آ گئے ہیں کہ کوئی مسلمان جیسے تیسے فرض نماز ادا کرلے تو وہ ایک قابل ذکر خوبی سمجھی جائے اور اس کا ذکر مقتدر جرائد میں ہو" لیکن ایک طرف یہ اخفا ہے، تو دوسری طرف طلبا کی نماز کا اتنا خیال ہے کہ تاکید کے الفاظ میں سختی آگئی ہے، کہتے ہیں :

> "تم لوگ نماز کو بھی ایک بار سمجھتے ہو اور پھر کہتے ہو ہمیں نماز کے معاملے میں مجبور نہ کیا جائے ہم نے تم سے کوئی درخواست نہیں کی تھی، کوئی زور نہیں ڈالا تھا - تمھیں آریہ سماجی سے مسلمان نہیں بنایا - تم نے خود آکر یہ دعویٰ کیا کہ ہم مسلمان ہیں - پھر اگر تمھیں مجبور کرتا ہوں کہ اسلام کے احکام کی پابندی کرو، تو اس میں میرا کیا قصور ہے "

جامعہ میں ایک بزرگ منشی علی محمد تھے - انھیں اس بات پر اصرار تھا کہ وہ ٹخنے جو پاجامہ سے ڈھک جائیں ان کو آخرت میں جہنم کی آگ ڈھکے گی - ذاکر حسین ان کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تو پائنچے اوپر کر لیتے اور بعد میں پھر نیچا کر لیتے ملاحظہ کیجیے یہ اندرونی کشمکش - ایک ذاکر حسین داڑھی کو اسلام کا نشان قرار دیتا ہے اور نماز کی تاکید کرتا ہے - دوسرا ذاکر حسین گٹے دار پیشانیوں اور شرعی داڑھیوں سے علیحدہ رہنا چاہتا ہے

خالدہ ادیب خانم نے ذاکر حسین کی اس دینداری کو دیکھ کر ہی کہا تھا کہ "اسلامی دنیا اگر اپنے مذہب کو جو اس کے اخلاق کی بنیاد ہے، ترک کئے بغیر جدید ہونا چاہتی ہے تو اسے عام طور پر ڈاکٹر انصاری اور ذاکر حسین کی تقلید کرنی چاہیئے"۔

ذاکر حسین کے مداحوں نے، ان سے محبت کرنے والوں نے جہاں ظواہر پر توجہ دی وہاں ان تمام عوامل پر غور نہیں کیا جن کا ان کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ ذاکر حسین کو سمجھنے کے لئے anecdotal narration کی نہیں بلکہ analytical study کی ضرورت ہے۔ میں یہ بات کہتے ہوئے ڈرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ وہ لوگ جو ذاکر حسین کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں، قریب سے جانتے ہیں جنہوں نے ان کے ساتھ کام کیا ہے اور جنھوں نے ان کی معیت میں زندگی گذاری ہے، میری جسارت پر اعتراض کریں گے۔ میں سپر انداز ہوں۔ مگر یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ ذاکر حسین کو صرف جامعہ کے محدب شیشوں سے دیکھنا جائز نہیں۔ اس سے ذاکر حسین کی شخصیت اجاگر نہیں ہوتی، غیر متوازن ہو جاتی ہے۔

ذاکر حسین کی جامعہ اور محمد علی کی جامعہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ محمد علی کی جامعہ جوشیلا پروٹسٹ تھی۔ ذاکر حسین کی جامعہ سر سید کے سوچے سمجھے ہوئے مشن کا نتیجہ تھی۔ سر سید اور ذاکر حسین دونوں ملت کو جامد روایات کو قید و بند سے نکال کر ایک dynamic culture کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے اور عقاید کی سلامتی کا لحاظ رکھتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ سر سید نے انگریز اور انگریزی تہذیب کا چڑھتا ہوا سورج دیکھا اور ذاکر حسین نے پراچین بھارت کی اس تہذیب کو دیکھا جو آزاد ہندستان میں نیا جنم لینے والی تھی مگر اسلام کا پیغام دونوں کے سامنے تھا چنانچہ ذاکر حسین عبدالماجد دریا بادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> " آپ کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ جامعہ "ملیہ" ہی نہیں" اسلامیہ" بھی ہے۔ یہ بات ہمیں ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ اس لئے یہ بات جتنی مرتبہ جامعہ والوں کو یاد دلائی جائے اچھا ہے اور مناسب"۔

لباس اور اس کی شائستگی اور طلباء کا رکھ رکھاؤ کسی درس گاہ کی شخصیت و خصوصیت کے پہلے نشان ہوتے ہیں۔ ذاکر حسین کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اکسفورڈ کی طرح مسلم یونیورسٹی کے academic dress پر کوئی کتابچہ تو نہیں چھپا مگر ذاکر حسین خود اپنی مثال اور عمل سے شائستگی اور انفرادیت کی اس

امت کے نگہبان تھے۔ موٹر سے اُتر کر طلباء کی شیروانی کے بٹن لگاتے اور ننگے سر طالب علم کو خود اپنی ٹوپی
پنہا دیتے۔ ایک مرتبہ کہا:

"مسلمان کا ہندوستان میں ایک خاص لباس ہوگیا ہے، وہ ہمیں پہننا چاہیئے۔ اب آپ لوگوں کا
یہ حال ہے کہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ پتا نہیں چلتا کس قوم کے آدمی ہیں"

ب تو یہ حال ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم سے لیکر اس کے اونچے سے اونچے استاد اور مہتمم کے سر پر بھی ٹوپی
ظر نہیں آئے گی۔ شیروانی کی جگہ نیم آستین بُش شرٹ وہ حضرات زیب تن کئے ہوں گے جن کی طرف طالب علم
ثال اور راہبری کے لئے دیکھتے ہیں اور جن کی تقلید وہ اپنے لئے قابل فخر سمجھتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ
لی گڈھ کا طالب علم اپنی سج دھج، اپنے طور طریقے سے سارے ملک میں پہچان لیا جاتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ ننگے سر
لبا ٹوپی ٹوپی کی صدا بلند کر رہے ہیں اور ان کے ننگے سر اُستاد جنھیں روایت کا نگہبان ہونا چاہیئے تھا
اراض ہو کر اسٹیج سے چلے جاتے ہیں۔ ذرا علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ان اکابر کو مسجد میں دیکھئے کہ نماز کے وقت
دا کے دربار میں حاضری کے لئے ان کی پتلون کی جیبوں سے کیسی کیسی شکنوں سے پُر، بھانت بھانت کی
ٹوپیاں نکلتی ہیں اور مسجد سے نکلتے ہی اس طرح چھپائی جاتی ہیں گویا ان کا سر پر ہونا باعث شرمساری ہے۔

صاحبو! میں چار سال تک یونائیٹڈ نیشنز کے خالی ایوانوں سے اُکتائے ہوئے، تھکے ہوئے، نیم
وابیدہ، اپنے خیالوں میں کھوئے ہوئے ڈیلی گیٹوں کے سامنے لمبی تقریریں کرنے اور پڑھنے کا عادی ہوں۔ ان
یوانوں میں ڈیلی گیٹ اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ جب دل چاہتا ہے اُٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ اخبار پڑھتے
ہیں، کچھ اپنی سفارتوں سے فائل ساتھ لاتے ہیں اور انھیں دیکھتے ہیں۔ کچھ خط لکھتے ہیں اور کچھ سرگوشیاں
رتے ہیں اور ان سب حرکات کے علی الرغم مجھ جیسے بولنگ مقرر اقوام متحدہ کی documentation
کا حجم بڑھاتے رہتے ہیں۔ عادت بُری ہے مگر اب اس عمر میں اصلاح مشکل ہے۔ میں واعظ کی زبان لایا ہوں
دل مدعا کے لئے امید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ میں آپ کے صرف نومنٹ اور لوں گا۔ حکایت لذیذ
ود، دراز تر گفتم۔

ذاکر حسین کی زندگی کے دو دور ہیں۔ ایک دور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے استعفیٰ
سے ختم ہوگیا۔ جب وہ یونیورسٹی آئے تو انکی تمناؤں کا اظہار ان الفاظ میں ہوا:

"علی گڈھ کی تعلیم و تربیت سے اور اس کے پیام و عمل سے ہندوستانی مسلمانوں کا [illegible]

اور وہ اپنے خونِ جگر کی کاوشوں سے جدید ہندستان کی حسین تصویر میں جلال و جمال کا رنگ بھر دینگے"
اور جاتے وقت ذاکر حسین حسب ذیل الفاظ کہکر رخصت ہوئے:

" سب سے پہلے میں اپنے اس تامل کا اقرار کر لوں جو مجھے یہاں آنے میں تھا۔ میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا، لیکن میں اس لئے آ گیا کہ میرے نہ آنے سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو جائے۔ دراصل مجھے آنے میں تامل اس لئے تھا کہ میں اپنے اس رنج اور مایوسی کا اظہار آپکے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا جو مجھے آپکے رویّے سے ہوئی ہے۔ میں اس لئے مایوس ہوں کہ آپ میں ابھی تک پختگی نہیں آئی۔ کوئی بھی شخص آپ کو بہکا سکتا ہے ... آپ کے جذبات بھڑکا سکتا ہے اور آپ نے اپنے جذبات کے سلسلے میں عقل سے کام لینا ابھی تک نہیں سیکھا ... میں آپ کی تعریف پر کیسے اعتبار کروں؟ کون کہہ سکتا ہے کل آپ میرا جنازہ نہ نکالیں گے "

ذاکر حسین کی زندگی کا دوسرا دور ان کی گورنری سے شروع ہوا۔ اس دور کا ایک حصّہ درج گزٹ ہے اور دوسرا ناگفتنی۔ اس زمانہ کے سرکاری کاغذات جب تک official secrets Act کی قید سے آزاد نہ ہوں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ راشٹرپتی ذاکر حسین نے انجمن ترقی اُردو کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کی ۲۲ لاکھ دستخطوں والی عرضداشت پر کیا ایکشن لیا۔ ذاکر حسین گورنر، وائس پریذیڈنٹ، اور پریذیڈنٹ ہو کر مسلمانوں کے حالات سے بے خبر یا بے تعلق نہیں ہو گئے تھے۔ مگر ظاہر ہے ان کا طریقۂ کار بدل گیا تھا۔ وائس پریذیڈنٹی کے زمانہ میں جب مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے علی یاور جنگ کے ساتھ بدسلوکی کی اور محمد کریم چھاگلا نے ان رستے ہوئے زخموں پر نمک چھڑکنے والا بیان دیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ذاکر حسین نے ۲۷ مئی ۱۹۶۳ء کے ایک نجی خط میں لکھا:

" علی گڑھ میں جو کچھ ہوا، وہ بہت ہی شرمناک ہے۔ اس سے دوسرے جو کام لینا چاہتے ہیں وہ اس سے زیادہ شرمناک ہے۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں اور کروں گا۔ اگرچہ لڑکوں نے گنجائش بہت کم چھوڑی ہے۔ دعا فرمایئے کہ یونیورسٹی آزمائش سے صحیح سالم نکل آئے "

میں سمجھتا ہوں ذاکر حسین مسلمانوں کے سلسلہ میں حکومت کو ہر وقت مطلع کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے کیا کہا اور اس کا کیا اثر ہوا اُس وقت کے کاغذات کی اشاعت پر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ تاہم اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ذاکر حسین کی نائب صدارت اور صدارت کا دور اگرچہ مسلمانوں کے لئے قابل فخر اور ہندستان کے

سیکولرزم کے لئے سند اعتبار ہے۔ مگر خود ذاکر حسین کے لئے اس میں اطمینان قلب کم اور ۔ frustrations زیادہ تھیں ۔ ثاقب لکھنوی کی ایک غزل علی گڈھ کے ایک مشاعرہ میں بڑی مقبول ہوئی ۔ اس کا ایک مصرع ذاکر حسین نے کسی اور موقع پر پڑھا تھا ۔ مگر یہ ان کے اس دور کی پوری داستان کہتا ہے : ؎

"ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں"

میں ذاکر حسین کے زمانۂ صدارت کے صرف ایک واقعہ کا تذکرہ کروں گا ، جو کافی غلط فہمی کا باعث بنا ۔ ذاکر حسین صدر ہوئے تو وہ سری نگر کے شنکراچاریہ اور جین منی کے پاس گئے اور انھیں کچھ پھل اور پھول ایک تھال میں پیش کئے اور ان کی آشیرباد حاصل کی ۔ اس واقعہ پر اخبارات میں کافی تبصرے ہوئے ۔ حیرت یہ ہے کہ اس پورے مباحثے میں ذاکر حسین کے اسلام کا ذکر تو ہوا لیکن خود ان کی شخصیت کی تعمیر میں جن عوامل کا گہرا اثر تھا ان کا ذکر نہیں ہوا ۔ ذاکر حسین خاں کے دادا غلام حسین خاں عرف چھمن خاں حیدرآباد کی دکنی کن ٹن جنٹ میں فوجی افسر تھے ۔ ریٹائرڈ ہو کر قایم گنج واپس چلے آئے ۔ کیونکہ دربار داری ان کی سرشت میں نہ تھی ۔ فقیروں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ۔ خصوصاً دو بزرگوں کرم علی شاہ اور رئیس بہاری سے ۔ رئیس بہاری کبیر پنتھی تھے ، نہ بت پرستی کے قائل تھے نہ ذات پات کے ۔ پٹھانوں کے ساتھ رہتے اور ان میں بڑے مقبول تھے ۔ قایم گنج واپس آ کر چھمن خاں نے حویلی تعمیر کرانی شروع کی اور ایک دن طیش میں آ کر مزدوروں کو بہت برا بھلا کہا ۔ جب ان کے پیر و مرشد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے چھمن خاں کو بلوا بھیجا اور فرمایا :

"اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نسلیں اس نئے مکان میں پھلیں اور پھولیں تو ان ناشائستہ الفاظ کے کفارہ کے لئے متھرا جاؤ اور اس کرشن نگری میں فلاں سادھو کی صحبت میں کچھ دن گذارو ، تاکہ تمہاری روح اس غیض و غضب کی کثافت سے پاک ہو ۔ اس آفریدی پٹھان نے مرشد کا فرمان لفظاً لفظاً پورا کیا اور واپس آ کر حویلی کی تعمیر شروع کی ۔ ایسا ہی واقعہ ذاکر حسین کے پیر کے ساتھ بھی گذرا ۔ ذاکر حسین کم عمری میں ہی ایک بزرگ حسن شاہ سے بیعت ہو گئے تھے ۔ یہی حسن شاہ کسی ہندو کے تلک پر اعتراض کر بیٹھے ۔ چنانچہ ان کے مرشد نے اظہار ناراضگی کیا اور حکم دیا تم خود تلک لگا کر کشمیر اور دکن کی پدیاترا کرو اور وہاں کے پروہتوں کی چھٹیاں بطور سند لاؤ ۔ یہ وہ روایات تھیں جو ذاکر حسین کو تہذیب نفس اور انکساری کا سبق حاصل کرنے کے لئے وراثت میں ملی تھیں ۔ غلام حسین خاں کے پوتے اور حسن شاہ کے مرید نے ہندوستان کے سب سے بڑے عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد اگر سب سے پہلے انکساری اور عجز کا سبق یاد کرنے کے لئے خاندانی نسخہ استعمال کیا تو اُسے اس

Perspective میں ہی دیکھنا چاہیئے۔

ذاکر حسین مرد مسلمان تھے اور ظواہر پر اتنی ہی توجہ دیتے تھے جتنی کہ باطنی پاکیزگی پر۔ لیکن ان کے تصوف کو شریعت کی ترازو میں تولنا درست نہیں۔ یہ ان کا ذاتی فعل تھا نہ سیاسی نہ شرعی۔ عابد رضا بیدار نے اپنی صوفی حسن شاہ کا ایک واقعہ لکھا ہے وہ بیدار صاحب کے الفاظ میں ہی سنیئے : "صوفی صاحب نے ایک روز ذاکر صاحب سے پوچھا 'کبھی شراب پی ہے تم نے؟' پھر نفی میں جواب پاکر کہنے لگے : مگر میں نے پی ہے۔ اگر تمھیں کوئی ایسا پلانے والا مل جائے جس کے ہاتھ سے تمھیں پی جانا چاہیئے تو کبھی انکار نہ کرنا۔ نورا ـــــــ نے لکھا ہے پوری زندگی ذاکر صاحب کو ایسا واسطہ نہیں پڑا۔ میرا خیال ہے ذاکر صاحب میں اگر کوئی کمی رہی تو یہی۔ میر کے اس شعر کو انھوں نے پڑھا بہت ہوگا، عمل کبھی نہیں کیا :

اے آہوانِ کعبہ نہ اینڈو حرم کے گرد ✤ کھاؤ کسو کی تیغ، کسو کے شکار ہو۔"

میرے ایک مستشرق دوست ان دونوں قلندروں پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ بیدار صاحب نے ذاکر حسین کی جس کمی کا ذکر کیا ہے اگر وہ ان میں نہ ہوتی تو میں بے دھڑک کہہ دیتا کہ ذاکر حسین مثالی قلندر تھے۔

ذاکر حسین کی سب سے بڑی خوبی ان کی integrated personality تھی۔ سر سید ہندستانی مسلمان کو جیسا مہذب جنٹلمین اور مکمل ہندستانی بنانا چاہتے تھے اس میں تھوڑی بہت جو کمی رہ گئی تھی وہ ذاکر حسین نے پوری کردی۔ وہ خود اس کی بہترین مثال تھے۔

۱۹۶۸ء میں ذاکر حسین کی خدمت میں آخری بار حاضر ہوا۔ سوئزرلینڈ اور ویٹکن کے زمانۂ قیام میں مجھے مغربی موسیقی کا جو شوق ہے اسے پورا کرنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ بات نہ معلوم کس طرح Bach پر چل نکلی معلوم ہوا انھیں اس کے coutatas اور Branden berg concerto خاص طور پر پسند ہیں۔ میں نے ہینڈل کا ذکر کیا۔ فرمانے لگے دونوں میں فرق ہے۔ باخ کے ہاں شوخی کا ایک رنگ ہے اور سنجیدگی کا ایک ڈھنگ ہے اور وہ دونوں کو الگ الگ رکھتا ہے۔ اس کی موسیقی نہایت حسین ہے اور براہ راست دل پر اثر کرتی ہے۔ میں نے کہا یوں کہئے "لگت کلیجوا میں چوٹ" میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا "اس کا بھی ایک مقام ہے"۔

موسیقی اور وہ ریکارڈیڈ موسیقی جو ڈرائنگ روم کی تنہائی میں سُنی جائے محبت اور عبادت کی طرح ایک نہایت ہی پرسنل اور پرائیوٹ چیز ہے اور کسی شخص کے مزاج کی سچی آئینہ دار ہے۔ مصر کی وزارتِ او

نے المصحف المرتّل کے نام سے قرآن کریم کے جو ریکارڈ تیار کرائے ہیں، ذاکر حسین بڑے خشوع وخضوع سے سنتے تھے۔ مگر بھگتی کی دوسری آوازوں سے بھی روح کو محروم نہیں رکھتے تھے۔ پچھلے دنوں ذاکر حسین کی بڑی صاحبزادی سعیدہ خورشید عالم خاں نے ازراہ کرم مجھے اپنے والد کے ٹیپ اور ریکارڈوں کا ذخیرہ دکھایا۔ اس ذخیرہ میں میرا کے بھجن بھی ہیں، Bach کا چرچ میوزک بھی۔ جب ترکیہ گئے تو مولوی سلسلے کے ترکی نغمے بھی لائے خاص کرنے کے ریکارڈ۔ اس مجموعے میں فلمی گانے تو نہیں البتہ محمد رفیع اور لتا منگیشکر کا گایا ہوا بھجن ہے: "جائے گوکل کے نٹ کھٹ چور"۔ گیتا رائے کا بھجن "میں تو گردھر کے گھر جاؤں" بھی ہے۔ ایک ٹیپ جگر کی غزل کا ہے جس پر خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا مصرع ہے "اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیان گذرے" مجھے ان ریکارڈوں میں کلو قوال کی نقلیں تو ملیں مگر قوالیاں نہ ملیں۔ روی شنکر اور احمد جان تھرکوا کے ساتھ ساتھ Negro's کی Meuhin اور یہودی بھی ہے Are Maria ✓ selubart Spiritual Melody بھی ہے۔ خود نیگرو موسیقار Paul Robson کے گانوں کے دو ریکارڈ بھی ہیں اور انہی کے ساتھ ام کلثوم کی یا جیبی، Long playing دروز موسیقار فریدالاطرش کا مشہور نغمہ جیبی اور عبدالوہاب کا نغمہ عاشق الروح بھی۔

ذاکر حسین کی شخصیت عبارت تھی اس حسین امتزاج سے جو ہندستانی کلچر اور تہذیب کی روح ہے ریکارڈوں کے اس مجموعے میں مجھے اندو بالا کا گایا ہوا "لگت کلیجوا میں چوٹ" کا ریکارڈ بھی نظر آگیا اور ذاکر حسین کی آخری مسکراہٹ بھی یاد آگئی۔ اس وقت میں اس مسکراہٹ کو معنی خیز سمجھا تھا۔ اب خیال آتا ہے اس میں ایک اداسی کی بھی جھلک تھی۔ ان ۴۸ ریکارڈوں میں صرف ایک ریکارڈ ٹوٹا ہوا نکلا۔ یہ شکستہ ریکارڈ مجاز کے مسلم یونیورسٹی کے مشہور ترانے کا تھا۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں ذاکر حسین کی نواسی نیلوفر نے کہا یہ ریکارڈ میاں کے زمانہ میں ہی ٹوٹ گیا تھا۔ اس کے پاس ہی بھجن کا ایک ریکارڈ رکھا ہے۔ " میرا کے من کی سونی پڑی ہے ستار۔

●●

(۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء کو خدابخش لائبریری میں سُنایا گیا)

حسنین سیّد

● **جناب حسنین سیّد** : پیدائش ۲۳ مارچ ۱۹۱۷ء، بمقام کوروتی بہپورا (دربھنگہ)۔ ابتدائی تعلیم سوری ہائی اسکول مدھوبنی۔ اگست ۱۹۳۴ء میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں ثانوی سوم میں داخلہ لیا، مئی ۱۹۴۰ء میں جامعہ سے بی۔اے کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں جامعہ کالج کے طلبہ کی تنظیم انجمن اتحاد کے ناظم اور انجمن اتحاد کے ترجمان قلمی رسالہ "جوہر" کے ایڈیٹر، جس کا سالانہ نمبر اقبال پر' جوہر اقبال' کے نام سے شائع بھی ہوا۔

اکتوبر ۱۹۴۱ء سے جماعت اسلامی ہند سے وابستہ ہیں۔

ان دنوں درس گاہ اسلامی دربھنگہ کے ناظم ہیں

●●

## وہ ایک مردِ قلندر تھے

### مروّت حسن عالمگیر تھا اُستاد ذاکر کا

استاد ذاکر حسین رحمۃ اللہ سے میری تین یادگار ملاقاتوں میں سے پہلی ملاقات: اگست ۱۹۳۴ء میں جب میں داخلے کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی پہنچا تو داخلے کے آخری مرحلے پر مجھ کو استاد رحمۃ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ وہ میرے داخلے کے فارم پر دستخط کر دیں۔ انھوں نے تعارف کے لیے میرے حالات دریافت کیے۔ میں ایک خط لکھ کر لے گیا تھا جس میں میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لینے کی غرض بتائی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلے کو چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ اس لئے آیا ہوں کہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ یہاں اسلامی اور دُنیوی دونوں طرح کی تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے۔ مدھوبنی بہار میں جس سکول میں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس میں اسلامی تعلیم کا کوئی موقع نہیں تھا اور میرے والد صاحب کا حوصلہ یہ تھا کہ وہ مجھ کو وکیل بنائیں اور مجھے وکیل بننے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جب میں اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے تعلیمی سلسلہ کو چھوڑ کر جامعہ میں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں، تو ان پر اپنی تعلیم کے مصارف کا بار نہ ڈالوں اور آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میرا داخلہ جامعہ میں ہو جائے تو تعلیمی اوقات کے علاوہ کسی وقت جامعہ کی کوئی خدمت مجھ سے لیں اور اس کے عوض اتنا معاوضہ دیں جس میں کسی طرح یہاں کا خرچ نکال سکوں ـــــ میرے خط کو پڑھ کر وہ خاموش رہے اور فارم پر دستخط کرنے سے پہلے فرمایا ـــ "میں آپ سے ایک عہد لینا چاہتا ہوں" میں نے عرض کیا۔ وہ کیا؟ فرمایا "عہد کیجئے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کی کوشش کروں گا" میں نے عرض کیا "الحمد اللہ میں شعوری طور پر پہلے سے اس پر عامل ہوں" ـــ انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیا۔

جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تھا تو ایک نہایت حسین و وجیہہ پُر وقار شخصیت سے سامنا ہوا تھا اس وقت ان کی عمر ۳۵ ـ ۴۰ سال کے قریب رہی ہوگی) سرخ، سفید چہرہ اور اس پر بھرپور سیاہ داڑھی، بقول حفیظ جالندھری: جلال بھی ہے جمال بھی ہے ـــ یہ شخصیت کا کمال بھی ہے۔

وں نے ہنستے ہوئے گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ایک نہایت نفیس فرشی پر بیٹھے
تھے فرش کے اوپر ماربل کی چٹائی تھی۔ سامنے فرشی میز تھی جس پر ہر چیز اپنی جگہ انتہائی سلیقہ سے سجی ہوئی رکھی
تھی۔ ان کی بائیں طرف دیوار پر شیشے کا ایک فریم آویزاں تھا جس پر یہ شعر خوشخطی کا بہترین نمونہ پیش کر رہا تھا :

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است ÷ با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

جب انھوں نے میرے فارم پر دستخط کر دیا تو ان سے الوداعی مصافحہ کر کے کمرے سے باہر آیا اور بہت خوش اور مسرور تھا۔

چند دنوں کے بعد جامعہ کے احاطے میں ان سے آمنا سامنا ہوا۔ انھوں نے مجھے روک کر فرمایا "تعلیم ختم ہو جانے کے بعد دو گھنٹے صدر مدرس کے دفتر میں آپ کام کیا کریں گے۔ اس کے عوض آپ کو ۸ روپے ماہانہ ملا کریں گے جس سے آپ اپنا جامعہ کا خرچ پورا کرنے کی کوشش کریں۔" اس پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

میں نے اپنا داخلہ جامعہ میں غیر مقیم طالب علم (DAY SCHOLAR) کی حیثیت سے کرایا۔ کیونکہ اس وقت جامعہ میں دارالاقامہ میں قیام وطعام کے مصارف ۱۶ روپے ماہانہ تھے۔ اس وقت میں جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی سے اتر کی جانب سبزی منڈی کے ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں ایک مسجد میں رہتا تھا جس کی دوری جامعہ قرول باغ سے دو میل سے کم نہ تھی۔ ایک روز پھر جامعہ میں میرا ان کا آمنا سامنا ہوا اور یہ پوچھا کہ "آپ کہاں رہتے ہیں؟" میں نے بتایا کہ سبزی منڈی ریلوے اسٹیشن کی مسجد میں۔ سن کر خاموش ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد پھر اسی طرح سر راہ ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے فرمایا "قرول باغ میں جامعہ سے متصل ہی ان کے عزیز احمد خاں رہتے ہیں، جو طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا ہے۔ ان کے کمرے میں گنجائش ہے آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں"۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور چند دنوں میں سبزی منڈی سے قرول باغ منتقل ہو گیا۔ احمد خاں صاحب نے اپنے کمرے میں جگہ دی لیکن کرایہ قبول نہیں کیا۔ ایک سال تک ان کے ساتھ رہا۔ نہایت مخلص اور شریف آدمی ثابت ہوئے۔ ۸ روپے جامعہ سے جو بطور معاوضہ کے ملتے تھے اس میں سوا دو روپے میں نے جامعہ کی فیس تعلیم ادا کی اور چار روپے ماہانہ میں جامعہ کے مطبخ سے دو وقت کھانا جاری کرالیا جس میں صرف دال اور چپاتیاں ملا کرتی تھیں۔ باقی پونے دو روپے ناشتہ اور اوپر کے خرچ کے لئے کافی ہو جایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد پھر ایک روز جامعہ میں سر راہ ملاقات ہوئی تو استاد علیہ الرحمہ نے مجھے روک کر فرمایا: "ڈاکٹر سلیم الزماں صاحب کے چھوٹے بچے کو شام کو ایک گھنٹہ ان کی کوٹھی پر جا کر پڑھا دیا کریں۔ دس روپے ماہانہ معاوضہ کے طور پر وہ دیا کریں گے۔" اس طرح جامعہ میں بہ سہولت تعلیم حاصل کرنے کا موقع میرے لئے پیدا کر دیا

اور جب تک جامعہ میں قیام رہا ان کی نوازشوں اور کرم فرمائیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ساری نوازشوں کا تذکرہ اس وقت نامناسب ہے لیکن ایک واقعہ کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک روز جامعہ لائبریری کے برآمدے یا اسٹینڈ پر جہاں روزنامہ اخبار لگے رہتے تھے، لوگ کھڑے ہو کر اخبار پڑھ لیتے تھے، میں بھی اخبار دیکھ رہا تھا۔ بائیں طرف کے راستہ سے استاد علیہ الرحمہ گذر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو ان سے آنکھیں چار ہوئیں اور بغیر ان کو سلام کیے میں دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ استاد علیہ الرحمہ چلتے چلتے رُک گئے اور پھر جب میں نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا تو انھوں نے جھک کر مجھ کو فرشی سلام کیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں نے جواب تو دیا لیکن سلام نہ کرنے کی کوتاہی پر بڑی ندامت محسوس کی ـــــ یہ تھا ان کا ایک انداز تربیت ـــــ

**دوسری ملاقات کا تاثر:** ۱۹۴۰ء میں جامعہ ملیہ سے فارغ ہو کر میں دربھنگہ آگیا ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی اور میں اس سے وابستہ ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا مرکز لاہور سے پٹھان کوٹ منتقل ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا میں رکن بنایا گیا مجلس شوریٰ میں شرکت کے لیے پٹھان کوٹ آتے جاتے میں دہلی میں رُک کر احباب سے ملاقات اور اپنے اساتذہ کرام کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا۔ استاد علیہ الرحمہ جب علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تب بھی دہلی آتے جاتے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ جماعت کا لٹریچر ان کی خدمت میں پیش کرتا اور جماعت کی سرگرمیوں سے ان کو واقف کراتا تھا۔ وہ ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تا آنکہ وہ ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر ہو کے پٹنہ تشریف لائے۔ ان کا گورنری کا عہدہ قبول کرنا مجھ کو پسند نہ آیا۔ میرے خیال میں یہ منصب ان کے مقام سے بہت فروتر تھا۔ نہ میں ان سے ملنے گیا اور نہ ان کی خدمت میں خیر مقدم کا کوئی خط ارسال کیا۔ تقریباً چھ مہینے کے بعد انھوں نے پٹنہ کے کسی صاحب سے میرے متعلق تذکرہ کیا کہ "یہاں بہار میں میرے ایک شاگرد ہیں حسنین۔ وہ اب تک ملاقات کے لئے نہیں گئے، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ کبھی کبھی وہ میرا ایمان تازہ کر دیا کرتے تھے"ـــ ان صاحب نے پٹنہ میں محبی شبیر احمد (جو ان دنوں پٹنہ میں ایک سوڈا واٹر فیکٹری کے منیجر تھے) سے میرے بارے میں استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو دہرائی۔ ایمان تازہ کرنے کی بات یہ ہے کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا تھا تو جماعت کی کوئی نہ کوئی کتاب ان کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔ محبی شبیر احمد صاحب نے مجھ کو خط لکھا کہ تم اب تک اپنے استاد سے کیوں نہیں مل سکے اور استاد علیہ الرحمہ کی گفتگو نقل کی۔ ان کا خط ملنے پر میں نے استاد کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا، بعد القاب و آداب میں نے عرض کیا تھا:

" گورنر کی حیثیت سے آپ کو پٹنہ تشریف لائے ہوئے کافی دن ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ نہ تو میں آپ
مت میں حاضر ہو سکا اور نہ خیر مقدم کا کوئی خط ہی ارسال کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس اُلجھن میں ہوں کہ
کے لئے گورنری، قلندری سے کیسے افضل ہو گئی؟ اور آپ نے اسے کیسے پسند فرما لیا؟ اخبارات میں یہ پڑھ کر
شی ہوئی کہ آپ اس ریاست کو ایک نمونے کی ریاست دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن جس کے کارپردازوں کا
ظلم و جور کا ہو، اس کو نمونے کی ریاست بنانے میں آپ کو بہت دشواری پیش آئے گی۔ جماعت اسلامی ہند
ذ آپ بہت حد تک واقف ہیں۔ جماعت اسلامی کے سلسلے میں حکومت بہار کا جو رویہ ہے اس کے متعلق
ت " اخبار میں میرا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ اس کا تراشا ارسال خدمت ہے۔" (ان دنوں حکومت بہار نے
ت اسلامی پر SUBVRSIVE ACTIVITIES کا الزام لگایا تھا اور سرکاری ملازمین کو
یت کی گئی تھی کہ وہ لوگ جماعت کی سرگرمیوں سے دُور رہیں، ورنہ CONDUCT RULE دفعہ ۲۴
ت ان کے خلاف کارروائی کی جائے گی)۔ دوسری بات میں نے یہ عرض کی تھی کہ " آپ مجھ جیسا معمولی
ا اگر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بھی چاہے تو کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟ اور جماعت کا کچھ تازہ لٹریچر بھی خط کے
ھ رجسٹرڈ ڈاک سے استاد علیہ الرحمہ کی خدمت میں ارسال کر دیا لیکن پندرہ دنوں تک نہ ان کی طرف سے
جواب آیا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اس پر میں نے معمولی ڈاک سے دوسرا عریضہ ان کی خدمت میں ارسال کیا
اس میں یہ عرض کیا کہ دو ہفتوں سے زاید ہو گئے آپ کی خدمت میں ایک عریضہ اور چند کتابیں ارسال کی تھیں
یے کہ اس کے جواب میں نہ تو آپ کا کوئی گرامی نامہ ملا اور نہ خط کی رسید ہی ملی۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں
ت تک نہیں پہنچ سکیں ورنہ آپ سے ایسی توقع نہیں ہے کہ آپ میرے عریضے کا جواب نہ دیں گے۔ میرے اس عریضے
جواب میں رانچی سے ان کا گرامی نامہ ملا۔ اس خط کا مضمون یہ ہے:

راج بھون۔ رانچی کیمپ
۱۰ ستمبر ۱۹۵۷ء

عزیزم حسنین صاحب — السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے دونوں محبت نامے ملے۔ آپ کا بھیجا ہوا لٹریچر بھی ملا۔ معافی چاہتا ہوں کہ پہلے خط کے جواب
، اتنی دیر ہوئی کہ آپ کو یاد دہانی کرنی پڑی۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہو، اس لیے وجہ لکھے دیتا ہوں۔ میں ذاتی خطوط
لکھنے میں بہت کاہل ہوں۔ پھر اگر کوئی دوست یا عزیز اپنے خط میں کوئی ایسا سوال کر دیتا ہے، جو میری شخصی

داخلی زندگی سے متعلق ہو تو مجھے اس کا جواب لکھنا اور دشوار ہو جاتا ہے ۔ آپ نے اپنے خط میں پہلی الجھن یہ بتائی ہے کہ گورنری قلندری سے کیسے اور کب سے افضل ہو گئی اور میں نے گورنری کو قلندری پر کیسے ترجیح دی ۔ اس کے جواب میں اگر کچھ رُکا تو آپ کو ہمدردی ضرور ہونی چاہیئے۔

پہلے تو عزیزمن! میں قلندر کب تھا؟ لیکن سوال کو اپنی ذات سے الگ کر کے ایک اصولی سوال سمجھوں تو اس کا بہت اچھا جواب حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ المعروف بہ داتا گنج بخش ؒ نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ایک جگہ دیا ہے ۔عبارت نقل کئے دیتا ہوں اور اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتا :

"از استاد ابو القاسم قشیری ؒ شنیدم کہ گفت مردمان اندر فقر و غنا ہر کسی سخن گفتہ اند و خود را چیزی اختیار کردہ و من آن اختیار کنم کہ حق مرا اختیار کند ۔ و من را اندر آن نگاہ دارد، اگر توانگر دارم غافل گذاشتہ نباشم و گر درویش دارد حریص و معترض نباشم پس غنا نعمت و اعراض اندر وی آفت و فقر نعمت و حرص اندر وی آفت [1] "

(مطلب :۔ استاد ابو القاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے سنا فرمایا : فقیری اور مالداری کے سلسلے میں لوگوں نے بات کہی ہے اور اس کو اختیار کیا ہے، میں اس کو اختیار کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لئے پسند فرمائے اور مجھ کو اپنی نگاہ میں رکھے ۔ اگر مالداری کی حالت میں رہوں تو اللہ سے غافل نہ ہونے پاؤں اور اگر غربت کی حالت میں رہوں تو حریص اور لالچی نہ ہوں ۔ لہٰذا مالداری نعمت ہے اور اس حال میں اللہ سے غفلت آفت ہے۔ غریبی اور فقیری بھی نعمت ہے اور اس حال میں حرص آفت ہے ۔)

دوسری الجھن کا جواب سہل ہے ۔میں ابھی کوئی تین چار ہفتہ یہاں ہوں ۔ وسط اکتوبر سے انشاءاللہ پٹنہ میں رہوں گا ۔آپ ایک کارڈ میرے سکریٹری کو لکھ دیں وہ مجھ سے پوچھ کر آپ کے لئے وقت مقرر کر دیں گے۔ ضرور تشریف لائیے ۔مفصل گفتگو کو بہت جی چاہتا ہے ۔خدا کرے کہ آپ خیریت سے ہوں اور خوش بھی۔"

خیر طلب : ذاکر حسین

میں نے استاذ ؒ کی ہدایت کے مطابق ان کے سکریٹری کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا ۔ انھوں نے وقت مقرر کر کے مجھے مطلع کیا ۔ مقررہ وقت پر میں راج بھون پہنچا ۔ ان کے ملٹری سکریٹری نے میرا استقبال کیا اور ان کے کمرے تک میری رہنمائی کی ۔میں کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو انھوں نے دروازہ بند کر دیا ۔استاذ ؒ کو میں نے سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا ۔ انھوں نے کھڑے ہو کر معانقہ کے لئے

---

[1] کشف المحجوب ۔ [illegible]

ہ لیا اور اسی حال میں فرمایا کہ آپ لوگ حکومت پر بہت تنقید کرتے ہیں۔ پھر اپنے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت
۔ میں نے جواب میں عرض کیا "جب ہم مجبور ہوتے ہیں تبھی حکومت پر تنقید کرتے ہیں"۔ اس کے بعد دوسرا سوال
وں نے یہ کیا کہ کیا ابھی مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے کہیں یہ کہا ہے کہ "جماعت اسلامی
پاکستان نہیں چاہتی تھی ـــــ ؟" میں نے عرض کیا "کہا ہوگا"۔ جماعت اسلامی تو پوری دنیا
، اللہ کی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ہندوستان کے دو ٹکڑوں پر ہی قناعت کر
ہے"۔ انھوں نے فرمایا کہ "حسنین صاحب آپ لوگ حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن عام طور
ے ہندوستان کے مسلمان حکومت الٰہیہ نہیں چاہتے ہیں"۔ میں نے ان سے کہا یہ ان کی کم حوصلگی اور
ت ہمتی ہے ورنہ مسلمان کی حیثیت سے : "ہر ملک ملک ماست، کہ ملک خدا ماست" ہر ملک میں حکومت
ٰہیہ یا اللہ کا دین قائم ہونا چاہیئے"۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا "آپ کی حکومت نے جماعت اسلامی کو
SUBVERSIVE کیسے قرار دیدیا، ہم لوگ تو پُر امن طریقے پر لوگوں کو اللہ کے راستے پر بلاتے
یں کوئی توڑ پھوڑ، قتل و غارت گری کا طریقہ نہیں اپناتے ہیں"۔ انھوں نے فرمایا "SUBVERSIVE
ونے کے لئے اتنا کافی ہو سکتا ہے کہ حکومت کے دستور کو تسلیم نہ کیا جائے اور غیر پارلیمانی طریقے سے حکومت
۔ تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ دیکھئے کمیونسٹوں نے ملک کے دستور کو مان کر کیرالا میں الکشن میں
حصہ لیا اور الکشن میں کامیاب ہونے پر وہاں حکومت بنالی۔ آپ لوگ بھی دستور کو مان کر پارلیمانی طریقے سے
حکومت کو بدل سکتے ہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ اگر SUBVERSIVE سے یہ مطلب ہے تو ہم اقراری مجرم ہیں۔
فرمایئے کیا ہم آپ کی ریاست میں اللہ کا نام لے سکتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا کہ اس سے آپ کو کون روک
سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ جب ہم لا الٰہ الا اللہ کی تشریح کریں گے تو پھر SUBVERSIVE آجائے گا
س پر آپ نے فرمایا کہ ایک چیز ہے پھل اور ایک چیز ہے درخت۔ پھل سے اگر لوگوں کو اختلاف ہے
و قبل از وقت پھل کا تذکرہ مت کیجئے۔ درخت لگانے کی کوشش کیجئے۔ جب لوگ اس کے میٹھے پھل
دیکھیں گے تو مخالفت ترک کر دیں گے"۔ میں نے با ادب عرض کیا کہ "درخت لگانے کا عمل چپکے سے اور
کیلے سے تو نہیں ہوگا اس کی خوبیوں کو بتا کر کچھ لوگوں کو تو اپنے ساتھ لینا ہی ہوگا اور ان کے تعاون ہی سے
یہ کام انجام پا سکتا ہے۔ میں نے جماعت اسلامی کی دعوت اور طریقہ کار کا مختصراً تعارف کرایا۔ آپ نے
توجہ اور صبر سے میری باتوں کو سنا اور فرمایا "ٹھیک ہے جس بات کو آدمی حق سمجھے اس کے لئے جدوجہد کر"

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ "آپ کی حکومت میری ہمہ وقت نگرانی کیوں کرتی ہے؟ سی، آئی، ڈی کے دو آدمی سائے کی طرح میرے ساتھ رہتے ہیں۔" جواب میں انھوں نے فرمایا "یہ آپ کے لئے ہی مخصوص نہیں ہوگا، تمام سیاسی ورکروں کی نگرانی کی جاتی ہے آپ کی بھی کی جاتی ہوگی۔ اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اپنا کام کرتے ہیں آپ اپنا کام کیجئے۔ راہِ حق میں دشواریاں تو پیش آتی ہی ہیں۔"

جب میں استاذؒ سے ملاقات کے لئے پٹنہ پہنچا تھا تو برادرم سید وسیم اللہ صاحب کے یہاں قیام کیا تھا جو ان دنوں سکریٹریٹ میں ملازم تھے اور کسی اونچے منصب پر فائز تھے۔ جماعت اسلامی سے ان کا تعلق 'ہمدردی' کا تعلق تھا لیکن اس تعلق کی بنا پر ان کے خلاف کارروائی چل رہی تھی۔ استاد محترم سے پہلے جو گورنر صاحب تھے انھوں نے کوئی آرڈیننس جاری کیا تھا کہ جو سرکاری ملازم کسی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا جائے گا اس کا COMPULSORY RETIREMENT ہوسکتا ہے۔ اسی آرڈی ننس کے تحت وسیم اللہ صاحب کے خلاف کارروائی ہو رہی تھی۔ حالانکہ اس آرڈی ننس کی مدت ختم ہو چکی تھی اور گورنر صاحب بھی تشریف لے جا چکے تھے۔ میں نے وسیم اللہ صاحب سے کہا کہ اس آرڈی ننس کا نام اور نمبر وغیرہ لکھ کر دیدیں۔ میں استاد محترم سے اپنی ملاقات میں اسے پیش کردوں گا۔ وسیم اللہ صاحب نے ایک کاغذ پر اس کا نام اور نمبر وغیرہ لکھ کر دے دیا۔ میں نے اس کو استادؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے چشمہ بدل کر بغور اس کو پڑھا اور پوچھا کہ "اس طرح کے کتنے آدمیوں کے خلاف کارروائی ہوئی ہے؟" میں نے عرض کیا "بہار میں تقریباً ۲۰ اشخاص کو جو جماعت اسلامی کے رکن تھے اور سرکاری ملازم بھی تھے، پرائمری اسکول کے ٹیچر سے لے کر گزیٹیڈ آفیسر تک کو جماعت اسلامی کی رکنیت کے جرم میں برطرف کیا جا چکا ہے۔ ان لوگوں نے ملازمت سے برطرفی کو گوارا کیا اور جماعت سے اپنے تعلق کو برقرار رکھا۔ لیکن وسیم اللہ صاحب جماعت کے رکن نہیں ہیں۔ ان پر جماعت کی رکنیت کا غلط الزام لگا کر ان کو پریشان کیا جا رہا ہے۔" استادؒ نے اس پرزے کو رکھ لیا۔

ہماری یہ ملاقات بہت زیادہ طویل ہوگئی تھی اور ان کے پاس یاددہانی کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ جب ہماری گفتگو ختم ہوئی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ مقررہ وقت سے زیادہ ہی وقت صرف ہو چکا ہے اور لوگ انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔ باقی ان شاء اللہ آئندہ ـــــ اس طرح ان سے مصافحہ کرکے رخصت ہوا اور وہ دروازے تک پہنچا گئے۔

کچھ دنوں کے بعد جب وسیم اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ان کے خلاف

روائی ختم ہو چکی ہے اور ان کی ترقی کے ساتھ ان کی تنخواہ میں بھی اضافہ کیا گیا ہے اور میرے ساتھ جو
سی.آئی.ڈی کی جو وقت نگرانی تھی وہ بھی ختم ہو گئی۔ دربھنگہ میں سی، آئی، ڈی کے ایک آفیسر نے آکر اطلاع دی
ہمارے پاس آرڈر آگیا ہے کہ اب آپ کی نگرانی نہ کی جائے۔

**تیسری اور آخری ملاقات:۔** جماعت اسلامی ہند نے مجھ کو ۶۲ء میں جماعت کی
دعوت کے تعارف کے سلسلے میں آسام کا امیر حلقہ بنا کر گوہاٹی بھیجا۔ ۶۲ء سے لے کر ۷۰ء تک میں گوہاٹی
آسام میں رہا۔ ابتدائے ۷۰ء میں جماعتِ اسلامی ہند کے اجتماع میں شرکت کے لئے مجھ کو دلی جانا تھا۔ میں نے
استاد محترم کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا کہ میں دلی حاضر ہو رہا ہوں اور ان تاریخوں میں مرکز
جماعت اسلامی میں مقیم رہوں گا۔ آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ اگر موقع ہو تو وقت مقرر فرماکر
مرکز جماعت اسلامی کے پتہ پر مجھے مطلع فرمائیں۔ اس کے جواب میں استادؒ کا جلد ہی ایک گرامی نامہ ملا جس میں
درج تھا کہ "جن تاریخوں میں آپ دلی میں رہیں گے، ان تاریخوں میں افسوس ہے کہ میں دہلی میں نہ رہ سکوں گا
پہلے سے جنوب کا پروگرام بن چکا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ملاقات ہوگی۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد گوہاٹی میں
استاد کے پرائیوٹ سکریٹری اور ملٹری سکریٹری کے خطوط ملے۔ جس میں درج تھا کہ وہ' استادؒ ۲۵ اپریل کو
گوہاٹی پہنچ رہے ہیں۔ اس دن شام کو ساڑھے پانچ بجے سرکٹ ہاؤس میں مجھ سے مل کر وہ خوش ہوں گے
اس کے بعد دوسرے دن سی، آئی، ڈی کے ایک افسر میرے پاس آئے اور بتایا کہ پریسیڈنٹ ۲۵ اپریل کو
گوہاٹی آرہے ہیں۔ ان کے پروگرام میں آپ سے ملاقات بھی شامل ہے۔ مہربانی کر کے سی، آئی، ڈی آفس
آیئے آپ کو ایک پاس دیا جائے گا اُسے لے کر ہی آپ اُن کے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ میں سی آئی ڈی دفتر گیا۔
سی، آئی، ڈی افسر نے مجھ سے پوچھا کہ صدر جمہوریہ ہند کس سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور ان سے آپ کا کیا تعلق ہے؟
میں نے ان کو بتایا کہ وہ میرے استاد رہ چکے ہیں۔ میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ ۳۴ء
سے لے کر ۴۰ء تک میں وہاں رہا۔ وہ ہمارے استاد بھی رہے اور وائس چانسلر بھی رہے۔ اسی تعلق سے اُن
سے ملنا ہے۔ چنانچہ مجھ کو ایک پاس دیا گیا اس کو لے کر میں ان سے ملا۔ میری ملاقات سے پہلے گوہاٹی کے
ایک بڑے میدان میں ان کی تقریر تھی۔ پہلے میں اس جلسے میں شریک ہوا اور ان کی تقریر سُنی۔ اس کے بعد مقررہ
وقت سے چند منٹ پہلے سرکٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ مجھے وٹینگ روم میں بٹھایا گیا۔ اُن کے ملٹری سکریٹری
میرے پاس آئے اور بتایا کہ سب سے پہلے آپ کی ملاقات ہے اور آپ کی ملاقات کے لئے پانچ منٹ کا وقت

دیا گیا ہے۔ جب آپ کی طلبی ہوگی تو میں آپ کو ان کے ملاقات کے کمرے میں پہنچا دوں گا اور کمرہ بند کردوں گا۔ جب آپ کا وقت ختم ہو جائے گا تو میں دروازہ کھول کر کھڑا ہو جاؤں گا تو مہربانی کرکے آپ اٹھ جائیے گا ورنہ جب تک آپ بیٹھے رہیں گے وہ بھی آپ سے باتیں کرتے رہیں گے اور آپ کے بعد والوں کو موقع نہیں مل سکے گا۔ اس لئے کہ اس کے بعد نماز کا وقت ہو جائے گا اور وہ نماز پڑھیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ٹھیک ہے مجھے کوئی یادداشت نہیں پیش کرنی ہے اور نہ کوئی لمبی چوڑی گفتگو کرنی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کریں گے اور وقت ختم ہونے پر اٹھ آئیں گے۔ ہماری یہ گفتگو ملٹری سکریٹری سے ہو رہی تھی کہ استاذ بی، کے نہرو کے ساتھ جو اس وقت آسام کے گورنر تھے سامنے آئے اور ان سے جدا ہو کر ملاقات کے کمرے میں گئے اور گھنٹی بجائی۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی مجھے طلب کر لیا۔ میں اندر داخل ہوا اور سلام عرض کیا۔ وہ اٹھے بڑھ کر گلے لگایا۔ خیریت دریافت کی اور پوچھا کہ "آپ آسام کیسے آگئے؟" میں نے عرض کیا کہ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں نے جماعت اسلامی ہند بنائی ہے اور کچھ لوگوں نے اپنی زندگیاں جماعتی سرگرمیوں کے لئے وقف کردی ہیں۔ میں بھی اُن میں سے ایک ہوں۔ ۲۲ سالوں تک بہار، اڑیسہ، بنگال میں جماعت اسلامی ہند کی دعوت پیش کرتا رہا۔ اللہ کے فضل و کرم سے وہاں کچھ کارکن تیار ہو گئے تو اب جماعت نے مجھ کو آسام بھیجا ہے تاکہ یہاں بھی جماعت اسلامی کی دعوت پیش کروں۔ ساتھ ہی ساتھ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر بھی تیار کرانے کا کام میرے سپرد ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔" انھوں نے فرمایا "کہ آپ نے بڑے استقلال سے کام کیا۔" میں نے عرض کیا کہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور آپ لوگوں کی تعلیم و تربیت ہے کہ اس کام کی سعادت حاصل ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ "آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے تیار کرانے کا کام بھی بہت اہم ہے۔" انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر آسامی زبان میں اسلامی لٹریچر کے لئے دیا۔ میں نے قبول کرنے میں تامل کیا کہ آپ سفر کی حالت میں ہیں، فوری طور پر دینا کیا ضروری ہے۔ انھوں نے میری جیب میں نوٹ ڈال دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "پچھلے دنوں آپ نے "محسن انسانیت" بھیجی ہے۔ سیرت پر یہ کتاب مجھ کو بہت پسند آئی۔ سیرت پر میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا شبلیؒ کی "سیرت النبیؐ" بھی دیکھی ہے۔ مگر محسن انسانیت مجھ کو بہت پسند آئی۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ اس مختصر ملاقات میں زیادہ تر انھیں کے ارشادات سنوں گا اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں پوچھوں گا

ں جب وہ خاموش ہو گئے تو میں نے پہلی بات یہ عرض کی کہ آج جمعہ کا دن تھا اگر گوہاٹی کی کسی مسجد میں جمعہ کی
ز بھی آپ کے پروگرام میں شامل ہوتی تو اچھا ہوتا۔ یہاں کے مسلمانوں کو توقع تھی کہ مسلمان صدر جمہوریہ
ر یہاں کی کسی مسجد میں نماز ادا کریں گے تو قریب سے انھیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس سلسلہ میں گوہاٹی
مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوگی۔ انھوں نے فرمایا کہ "میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے اور فرش
نماز ادا کرنے میں تکلیف زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ میں چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر نماز پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی
بقرعید کے موقع پر دہلی کی عیدگاہ میں چلا جاتا ہوں تو بڑی تکلیف کے ساتھ نماز ادا کر پاتا ہوں۔"
ں نے عرض کیا کہ یہ عذر معقول ہے لیکن لوگوں کو اس کی خبر نہ ہوگی ـــــ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ
آپ کے جو بھی ہوم منسٹر ہوتے ہیں جماعت اسلامی کے خلاف غلط الزام لگایا کرتے ہیں اور ہم لوگ اُن
ں صفائی میں جو کچھ کہتے ہیں اُن کا وہ کوئی نوٹس نہیں لیتے۔ ایک طرح کے الزامات بار بار دہراتے رہتے
ہتے ہیں۔" انھوں نے فرمایا کہ "وہ اپنا کام کرتے ہیں، آپ اپنا کام کیجئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ آج کل
لوگوں کو اور سب جماعتوں کو خوش رکھنے کے لئے اور توازن برقرار رکھنے کے لئے سیاسی لوگ ایسی بات
یتے ہیں اور ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو حقیقت اور صداقت کے خلاف ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کہ خود چوہان
ی کی (جو اس وقت ہوم منسٹر تھے) جماعت کے بارے میں اپنی رائے کیا ہے۔ لیکن عام طور سے ایسا
ہوتا ہے کہ الکشن میں کامیابی کی خاطر لوگ ایسا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے الکشن کا موجودہ طریقہ غلط ہے۔"
اس موقع پر میں نے عرض کیا کہ "تب تو الکشن میں جماعت اسلامی کا حصہ نہ لینا حق بجانب ہے۔" اس کا
انھوں نے خاموش مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ بھارت میں فسادات کا سلسلہ
آخر کبھی ختم بھی ہوگا؟ میرے اس سوال پر وہ افسردہ سے ہو گئے اور کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا "ہم لوگ مسلمان
ہیں اور فسادات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں لہٰذا فسادات کو زیادہ محسوس کرتے ہیں، ورنہ حکومت کی کونسی کل سیدھی
ہے؟ دیکھئے تلنگانہ میں کیا ہو رہا ہے؟ (اس وقت آندھرا پردیش میں تلنگانہ کی پُرتشدد تحریک زوروں پر تھی)
اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری لیڈرشپ بہت کمزور ہے۔" یہ سنکر میں حیرت میں مبتلا ہو گیا کہ اپنی ہی حکومت کے سلسلے
میں صدر جمہوریہ کیا فرما رہے ہیں۔ ساعت یہاں تک پہنچی تھی کہ صدر کے ملٹری سکریٹری دروازہ کھول کر نمودار
ہوئے اور میں بھی ان کی ہدایت کے مطابق اٹھ کھڑا ہوا۔ استاد محترم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں الوداعی سلام
کرنے کے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی لپٹ کر ... کاندھوں پر شفقت سے ہاتھ رکھے ہوئے

دوازے تک یہ کہتے ہوئے آئے : " اللہ آپ لوگوں کو کامیاب کرے، آپ لوگوں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے ۔"
ن آخری ملاقات کے بعد جب میں باہر نکلا تو میں بہت خوش اور مسرور تھا کہ انھوں نے میری سرگرمیوں کی تائید
رمائی اور دعا دی ۔ ان کی حوصلہ افزائی اور دعائیں میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور اب تک گونج رہی ہیں ۔ مگر
سوس ہے کہ میری خوشی اور مسرت کے لمحات بہت عارضی ثابت ہوئے ۔

ایک ہفتہ بعد ۳ مئی کو میرے ایک دوست نے آکر خبر دی کہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین انتقال کر گئے ۔
نا للہ و انا الیہ راجعون ——— یہ خبر سُن کر میں اس درجہ متأثر ہوا کہ بستر پہ جاکر لیٹ گیا اور
ر تک روتا رہا ۔ جب کچھ سکون ملا تو وہاں سے اپنے ایک عزیز کے یہاں چلا گیا جن کے پاس ریڈیو سیٹ تھا ۔
تر پہ لیٹا لیٹا اس وقت تک ریڈیو سُنتا رہا جب تک ان کی تجہیز و تکفین نہ ہو گئی ۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے
ر اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ——— آمین

ہم کہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی ان دو حرفوں کی تفسیر تھی : " بادوستاں تلطف، بادشمناں مدارا "
اقبالؒ کے اس مصرع کے مصداق تھے : " مروّت حسن عالمگیر ہے مردانِ غازی کا " ——— یا
للہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق تھے : " تم میں سب سے اچھا انسان وہ ہے، جو
خلاق میں سب سے اچھا ہو ——— اور اللہ نے مجھ کو اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمایا ۔" اور ارشاد باری
ہے : " ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم " تم میں سب سے محترم و مکرم بندہ وہ ہے جو سب سے
یادہ اللہ سے ڈر کر زندگی گزارنے والا پرہیزگار ہو ۔ ●●

# ریاض الرحمٰن شیروانی

● جناب ریاض الرحمٰن شیروانی : پیدائش ۱۹۲۴ء بمقام حبیب گنج، ضلع علی گڈھ،
تعلیم : علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور، قاہرہ یونیورسٹی۔ چوتھی صدی ہجری کے عالم
ابوالفرج المعافٰی بن زکریا الجریری النہروانی کے مخطوطے "کتاب الجلیس والانیس" کی
پہلی پچیس مجلسیں ایڈیٹ کرکے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔
۱۹۵۳ء میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں ریڈر کے
عہدے پر ترقی ملی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں صدرِ شعبہ کے فرائض انجام دیئے۔ یکم مارچ ۱۹۸۳ء کو کشمیر
یونیورسٹی میں پروفیسر و صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

ہندوستان اور پاکستان کے اہم عربی، انگریزی اور اُردو کے مجلّات و جرائد میں ڈیڑھ سو
کے قریب مضامین، تراجم اور تبصرے شائع ہو چکے ہیں جو علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات سے تعلق رکھتے
ہیں۔ جن مجلّات و جرائد میں یہ تحریریں شائع ہوئی ہیں ان میں "المجمع العلمی الہندی" علی گڈھ، "اسلام
اینڈ ماڈرن ایج" نئی دہلی، "ویوز اینڈ ریویوز" نئی دہلی، "معارف" اعظم گڈھ، "اُردو ادب"
علی گڈھ "نگار" کراچی، "فکر و نظر" علی گڈھ، "صبا" حیدرآباد، "شاہکار" الہ آباد، "جامعہ"
نئی دہلی، "صبح" دہلی، "علیگڈھ میگزین" علی گڈھ، "بیگڈنڈی" امرتسر، "آجکل" نئی دہلی قابل ذکر ہیں۔
ہندی انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ بنارس ۱۹۶۰ء میں ابن سینا، پر مضمون اور عربی کے ایک درجن ادبا و شعراء
پر نوٹ شائع ہوئے تھے۔

دیگر مشاغل و مناصب : رکن مجلس منتظمہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ، سابق نائب
صدر انجمن ترقی اردو، اترپردیش سابق پرووسٹ آفتاب ہال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سابق رُکن
اکیڈمک کونسل علی گڈھ مسلم یونیورسٹی۔

●●

(۱)

ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام اور کام سے، کان ابتدا ہی سے آشنا تھے۔ دہلی علیگڑھ سے دُور نہیں ہے
ذاکر صاحب کا تعلق علی گڑھ سے اِتنا قریبی تھا کہ کسی علی گڑھ والے کے لئے ان سے نا آشنا رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔
ے زمانۂ طالب علمی میں مُسلم یونیورسٹی کا نظم ونسق جن لوگوں کے ہاتھوں میں تھا ان سے ذاکر صاحب کے اختلافات
۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلم یونیورسٹی کی مختلف علمی اور تعلیمی مجلسوں سے وابستہ تھے اور یونیورسٹی کے
ی اور ادبی حلقوں میں ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دَور ہمارے ملک کی تاریخ میں خاص
رسے بڑا پُر آشوب اور ہنگامہ خیز دور تھا اور اس سے مسلم یونیورسٹی بھی مُستثنیٰ نہیں تھی۔ جس طرح پورے ملک
ب اسی طرح یونیورسٹی میں بھی مسلمان اساتذہ اور طلبہ کی بھاری اکثریت تقسیم ملک کے حق میں تھی۔ میرا تعلق اس چھوٹی
ی اقلیت سے تھا جو اس تحریک سے متفق نہیں تھی اور ملک کے اتحاد اور سالمیت کی حامی تھی۔ ہم نے اپنی راہ
سوچ سمجھ کر متعین کی تھی اور اس لئے ہمیں یہ حق نہیں تھا کہ اپنے اقلیت میں ہونے کا شکوہ کرتے لیکن ہمیں یہ شکایت
ضرور تھی کہ اُس وقت یونیورسٹی کا ماحول ایسا تھا جس میں اکثریت کے نقطۂ نظر کے علاوہ کسی دوسرے نقطۂ نظر
کی شنوائی بالکل نہیں تھی، اس کا احترام کرنا تو علیٰحدہ رہا، اسے برداشت کرنے کے لئے بھی کوئی تیار نہیں تھا۔ اس
لئے اُس وقت ہم علی گڑھ کی فضا میں بڑی گھٹن اور اجنبیت محسوس کرتے تھے۔ یہاں کئی ایسے واقعات پیش آئے تھے
جنھوں نے ہمیں بہت تکلیف پہنچائی تھی اور ہماری اُداسی اور تنہائی میں اضافہ کر دیا تھا۔

اسی زمانے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جوبلی ہوئی اور ہم نے سُنا کہ وہاں ذاکر صاحب نے جامعہ کے اسٹیج پر
کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کو دوش بدوش جمع کر دیا اور ان کا یکساں احترام کیا تھا ۔۔۔ ذاکر صاحب کے اپنے
جو سیاسی خیالات تھے ان سے ہر شخص اچھی طرح واقف تھا، اس کے باوجود ان کی یہ فراخ دلی کہ انھوں نے موافقین
کے ساتھ مخالفین کی بھی پذیرائی فرمائی اور ان کے احترام میں بھی فرق نہیں آنے دیا، ہمارے لئے ایک بالکل نیا اور اس
سے یکسر متضاد تجربہ تھا جس سے ان دنوں خود ہمارا سابقہ تھا۔ ذاکر صاحب کی شرافت اور عظمت کا پہلا نقش میرے
دل پر اسی واقعے سے ثبت ہوا۔ پھر میں نے ان کا وہ خطبہ پڑھا جو اس موقع پر انھوں نے جامعہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

درجس میں ایک طرف ان کٹھنائیوں کا ذکر کیا تھا جن سے جامعہ کے کارکنوں کو گزرنا پڑا تھا اور دوسری طرف ملک کے رہنماؤں سے اپیل کی تھی کہ وہ ملک میں پھیلی ہوئی نفرت کو روکیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے شعلوں سے عمر بھر کی کمائی جل کر راکھ ہو جائے اور تعلیم کا کام — جو دراصل محبت کا کام ہے — اس ملک میں ممکن نہ رہے۔ ذاکر صاحب کا یہ خطبہ میرے نزدیک عزم اور خلوص دونوں کا شاہکار ہے اور اسے پڑھ کر آج بھی دل وہی گرمی اور دماغ وہی روشنی محسوس کرتا ہے جو اس نے اوّل روز محسوس کی تھی۔ ان ہی دنوں ذاکر صاحب پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی جسے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور ذاکر صاحب کی شخصیت کا نقش دل میں فروزاں تر ہو گیا۔ اس کتاب میں رشید صاحب نے (جہاں تک مجھے یاد آتا ہے) لکھا تھا کہ وہ اپنے اچھے طالب علموں کو ذاکر صاحب سے ملنے کا مشورہ دیتے تھے تاکہ وہ ان کی شخصیت سے کسب نور کر سکیں۔ یہ کتاب پڑھ کر میرے دل میں بھی ذاکر صاحب سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ کچھ ہی عرصے بعد معلوم ہوا کہ ذاکر صاحب علیگڑھ تشریف لائے ہیں اور حسب معمول رشید صاحب کے مکان پر مقیم ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے آخر یا ۱۹۴۷ء کے شروع میں ایک خوشگوار صبح کو ہم تین ساتھی ذاکر صاحب سے ملنے کی آرزو دل میں لئے آفتاب ہوسٹل سے رشید صاحب کے مکان پر پہنچے اور وہاں مکان کے چھوٹے سے لیکن خوبصورت باغیچے میں ذاکر صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم طے کر کے گئے تھے کہ ذاکر صاحب سے اپنا تعارف نہیں کرائیں گے (کیونکہ اتفاق سے ہم تینوں ہی کے بزرگوں سے ذاکر صاحب اچھی طرح واقف تھے) تاکہ ان سے ہماری گفتگو بالکل آزادانہ ماحول میں ہو سکے۔ لیکن ہمارے بیٹھتے ہی ذاکر صاحب نے سب سے پہلے ہمارے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں اور پھر گفتگو شروع ہوئی۔ ہم نے اس وقت کے علیگڑھ کے ماحول کا تذکرہ اور اس سے بیزاری کا اظہار کیا تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ ایم۔ اے کر کے جامعہ چلے آیئے، زیادہ تو نہیں لیکن سو روپے ماہوار جامعہ آپ کو پیش کرے گی۔ وہاں رہ کر علمی کام کیجئے اور اس کے نتائج سے طلبہ کو روشناس کرایئے۔ اس سے چند ہی روز قبل یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد کی دعوت پر ڈاکٹر سید حسین اور جناب عبدالرحمٰن صدیقی علیگڑھ آئے تھے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ یونین میں ان کی تقریر ہو، لیکن ڈاکٹر سید حسین کے سیاسی خیالات کی بنا پر یونین کے عہدیداروں نے ان کی تقریر کا اہتمام کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ان سے تقریر کرائی گئی تو طلبہ مزاحمت کریں گے۔ اس صورت میں جناب عبدالرحمٰن صدیقی بھی تقریر کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اور دونوں بغیر تقریر کئے ہوئے ہی علیگڑھ سے واپس چلے گئے تھے۔ اس واقعے کا ہم پر بہت اثر تھا۔ جب اس کا ذکر ہم نے ذاکر صاحب سے کیا تو وہ بھی بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ ڈاکٹر سید حسین ذہین آدمی ہیں، وہ کوئی ایسی بات ہرگز نہ کہتے جس سے

ایت پیدا ہوئی۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر یہی حالات رہے تو علیگڑھ والے اچھے لوگوں کی صورت دیکھنے اور ان کی
ن سننے کو ترس جائیں گے۔ دوران گفتگو ایک لطیفہ بھی پیش آیا۔ ذاکر صاحب نے ہم سے سوال کیا کہ تعلیم سے فارغ ہو کر
یا کرنے کا ارادہ ہے۔ ہم میں اس وقت نوجوانی کا جوش تھا چنانچہ میں نے اور میرے ایک ساتھی نے جواب دیا کہ ہم قوم کی
دمت کریں گے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ شروع میں سب یہی کہتے ہیں لیکن اگر نائب تحصیلداری بھی مل جاتی ہے تو قوم
ی خدمت بھول کر اس میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ یہ فرما کر وہ ہمارے تیسرے ساتھی کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے دریافت
یا کہ کیا آپ کا بھی قوم کی خدمت کرنے کا ارادہ ہے۔ وہ ذاکر صاحب کی گفتگو سے ایسے کھلا گئے تھے کہ انھوں نے سر ہلا کر
ہا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس پر ذاکر صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ اب قوم کی خدمت ایسی بری بات بھی نہیں ہے
س سے آپ اس طرح برات کا اظہار کریں۔ اس ملاقات کا مجھ پر بہت اثر ہوا اور ذاکر صاحب کی ذہانت، خلوص
ور سادگی سے طبیعت خاص طور سے متاثر ہوئی۔ اس کے بعد ذاکر صاحب ہمارے ہیرو ہو گئے اور ہمارا دل چاہنے لگا
کہ کاش وہ ہماری یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوتے۔ اگرچہ ہم جانتے تھے کہ اس وقت جو حالات تھے ان میں ہمارا یہ خواب
شرمندۂ تعبیر ہونا ممکن نہیں تھا اور نہ خود ذاکر صاحب ہی کا جامعہ کو چھوڑنا آسان تھا۔

اس وقت کون جانتا تھا کہ جلد ہی حالات میں ایسی خوش گوار تبدیلی ہو گی کہ ہمارا یہ خواب حقیقت بن
جائے گا۔ اور ذاکر صاحب واقعی وائس چانسلر ہو کر علیگڑھ تشریف لے آئیں گے۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں ان کا انتخاب اس
منصب پر ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کی عجیب کیفیت تھی۔ دس سالہ سیاسی جوش و خروش کے بعد اب مایوسی اور بددلی
کا دور دورہ تھا۔ نشہ اتر چکا تھا، خمار باقی تھا، سب لوگ اعصاب شکنی میں مبتلا تھے۔ ہر ایک کو ہر طرف اندھیرا ہی
اندھیرا نظر آتا تھا، خود اپنے مستقبل پر کسی کو اعتماد نہیں تھا۔ ہر شخص سہما اور ڈرا ہوا تھا کہ نہ معلوم کس وقت کیا
ہو جائے گا۔ دوسری طرف یونیورسٹی اغیار کی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ وہ افراد کی بے راہ روی کا انتقام ادارے
سے لینا چاہتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ یونیورسٹی کو بند کر دینا چاہیئے۔ کسی کی رائے تھی پاکستان کے فلاں تعلیمی ادارے سے اس کا تبادلہ
کر کے اسے ملک بدر کر دینا چاہیئے! اور کسی طرف سے آواز اٹھتی تھی کہ یونیورسٹی کا نظم و نسق حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔ غرض جتنے
منہ تھے اتنی ہی باتیں تھیں۔ اصل بات یہ تھی کہ تقسیم ملک کے بعد مسلم یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا آخری مرکز رہ
گئی تھی اور یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ اب اس ملک میں مسلمانوں کی بالادستی کا کوئی چھوٹا سا نشان بھی باقی رہے۔ ان حالات میں پنڈت جواہر
لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نگاہ دور بیں نے ذاکر صاحب کا وائس چانسلر کے منصب کے لئے انتخاب کر کے مسلم یونیورسٹی پر ایسا
احسان کیا جس کے بارے میں وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکے گی اور ذاکر صاحب نے بھی جامعہ کو چھوڑ کر ایسے ایثار کا ثبوت دیا جس کا احساس بہت کم لوگوں کو

## ۲

ڈاکٹر صاحب سے میری دوسری ملاقات ستمبر یا اکتوبر ۱۹۴۹ء میں اس وقت ہوئی جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ چکے تھے اور میں عربی میں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے رہا تھا۔ شعبۂ عربی کے صدر پروفیسر عبدالعزیز میمن کا ریٹائرمنٹ قریب تھا اور میں ان ہی کی زیرِ نگرانی کام کرنا چاہتا تھا۔ پروفیسر ہادی حسن فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین تھے۔ وہ شعبۂ عربی کی اندرونی کشمکش کے سبب میمن صاحب سے راضی نہ تھے۔ اس لئے انھیں اس میں تامل تھا کہ کوئی نیا طالبِ علم میمن صاحب کی زیرِ نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لے۔ اس وجہ سے میرے داخلے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ حال سے انھیں آگاہ کروں۔ (ان دنوں وائس چانسلر کا دفتر وکٹوریا گیٹ کے اوپر تھا۔ بعد میں ذاکر صاحب کو قلب کی تکلیف ہو جانے کی بنا پر نیچے آ گیا)۔ میں وائس چانسلر کے دفتر میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ دیکھا کہ ذاکر صاحب سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ نیچے آ کر میں نے اپنی حاضری کا مقصد گوش گزار کیا، تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ مجھے تو کسی ایسے اختلاف کا علم نہیں ہے۔ بہر حال آپ کا داخلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ داخلہ ہو گیا۔ ایک سال کے بعد میمن صاحب کا ریٹائرمنٹ ہونے لگا۔ آرزو صاحب (پروفیسر مختار الدین احمد) اور میں اس وقت ان کے زیرِ نگرانی پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں نے ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہمارا کام ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔ اگر میمن صاحب ریٹائر ہو گئے تو کام ادھورا رہ جائے گا اور کوئی ایسا استاد اس وقت شعبۂ عربی میں نہیں ہے جو اس کی تکمیل کرا سکے۔ ذاکر صاحب نے فرمایا کہ میمن صاحب ریٹائر ہونے کے بعد بھی علی گڑھ ہی میں رہیں گے آپ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ میمن صاحب کا مزاج یہ نہیں ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری رہنمائی فرمائیں۔ اس پر ذاکر صاحب کا جواب تھا کہ پھر تو ان کا ریٹائر ہو جانا ہی بہتر ہے۔

ذاکر صاحب ہی کے دورِ وائس چانسلری میں، میں نے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر (اس وقت یونین کا سب سے بڑا عہدہ یہی تھا، صدر خود وائس چانسلر ہوتا تھا) کا انتخاب لڑا۔ یہ بھی ۱۹۴۹ء

بات ہے۔ ملک کی تقسیم کو تھوڑی ہی مدت ہوئی تھی اور ابھی تک یونیورسٹی میں مسلم لیگی خیالات کے طلبہ
اکثریت تھی۔ یہ انتخاب خالص نظریاتی بنیادوں پر ہوا تھا۔ تین امیدوار تھے۔ ایک امیدوار (جو کامیاب
ے) مسلم لیگی تھے۔ دوسرے کمیونسٹ اور میں نیشنلسٹ خیالات کی نمائندگی کرتا تھا۔ اصل مقابلہ میرے اور
سلم لیگی امیدوار کے درمیان تھا۔ مسلم لیگی خیالات کے طلبہ کی جانب سے الیکشن میں زور زبردستی کا مظاہرہ
یا جا رہا تھا۔ بعض اساتذہ کی درپردہ حمایت بھی انھیں حاصل تھی۔ میرے بعض ساتھیوں نے ذاکر صاحب سے
کر انھیں اس طرف توجہ دلائی، تو انھوں نے فرمایا کہ آپ الیکشن کو پھولوں کی سیج کیوں سمجھتے ہیں، یہ تو
اٹوں بھرا راستہ ہے۔ جب اس راہ پر نکلے ہیں تو جوانمردی سے حالات کا مقابلہ کیجیے۔ الیکشن کے بعد ایک
وست نے، جو طالب مسلم نہیں تھے، ذاکر صاحب کو خط لکھ کر شکایت کی کہ اگر آپ کے دورِ وائس چانسلری
ں یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو پھر کس سے توقع کی جائے۔ ذاکر صاحب نے اس کا جواب دیا کہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا ممکن
ہیں ہے۔ آہستہ آہستہ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر ذاکر صاحب نے واقعی سب ٹھیک کر کے دکھا دیا۔

ذاکر صاحب کا انتظامی طریقۂ کار کیا تھا اس پر ایک واقعے سے بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔
حصول آزادی سے قبل مسلم یونیورسٹی میں محرم کی تعطیلات بہت طویل ہوتی تھیں، یعنی ۱۰، ۱۲ دن۔ پھر
یہ کم ہو کر سات دن رہ گئی تھیں۔ ذاکر صاحب ان میں مزید تخفیف کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گھٹا کر تین
دن کر دی گئیں (اب صرف ایک دن کی تعطیل ہوتی ہے) جب اس تخفیف کا اعلان ہوا تو طلبہ کی طرف
سے اس پر احتجاج کیا گیا اور اسٹوڈنٹس یونین کے اُس وقت کے صدر احمد سعید صاحب نے اپنی ایک
تقریر میں یہ پھبتی کسی کہ "ذاکر حسین، ذکرِ حسین سے روکنا چاہتے ہیں۔" معاملہ اور آگے بڑھا اور بعض طلبہ
"بھوک ہڑتال" پر بیٹھ گئے۔ ذاکر صاحب ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ جب تک تم کھانا نہیں
کھاؤ گے میں بھی نہیں کھاؤں گا لیکن تعطیل میں بہرحال اضافہ نہیں ہوگا۔ بالآخر ہڑتال اور احتجاج ختم ہو گیا
اور چھٹی جتنی کم کر دی گئی تھی، اتنی ہی رہی۔

ذاکر صاحب کے مزاج کا ایک پہلو یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان کی خدمت میں کوئی درخواست پیش
کرتا تو وہ اس پر اپنے تاثر کا آغاز منفی انداز میں فرماتے تھے۔ اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ وہ جاننا چاہتے
تھے کہ درخواست کرنے والا کتنے پانی میں ہے اور اس نے اپنے موقف پر کتنا غور کیا ہے۔ جب انھیں اس
کی استقامت کا احساس ہو جاتا تب اس کی بات مان لیتے۔ میمن صاحب کے ریٹائر ہو جانے کے بعد

میرا پی، ایچ، ڈی کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور اس وقت تک میرا ملازمت کرنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میں نے ذاکر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں کوئی علمی کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مشورہ دیں کہ کیا کام کروں۔ ذاکر صاحب اس سے واقف تھے کہ گاؤں میں میری زمینیں ہیں جہاں کاشت ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ علمی کام کے مقابلے میں تجارت زیادہ منافع بخش پیشہ ہے، آپ آڑھت کا کام کیوں نہیں کرتے؟ گاؤں سے غلّہ لاکر شہر کی منڈی میں فروخت کریں بہت نفع ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میرا رجحان اس طرف بالکل نہیں ہے ورنہ ایم۔اے کیوں کرتا اور پھر پی۔ایچ۔ڈی میں داخلہ کیوں لیتا۔ ذاکر صاحب نے اس طرح فرمایا گویا کوئی نئی بات ان کے علم میں آئی ہو۔ "ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" اور پھر مجھے مشورہ دیا کہ پہلے آپ کسی اچھی علمی کتاب کا انگریزی یا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیجیے اور دیر تک ترجمے کی اہمیت اور اس کے رموز پر روشنی ڈالتے رہے۔ ایک خاص بات یہ فرمائی کہ عام طور سے مسلمان ان یوروپین مصنفین سے خوش ہوتے ہیں جو ان کے مذہب اور اہلِ مذہب کی تعریف کر دیتے ہیں چاہے اس تعریف میں گہرائی ہو یا نہ ہو۔ آپ کسی ایسی کتاب کا انتخاب نہ کریں بلکہ واقعی کوئی علمی کتاب ترجمے کے لئے منتخب کریں۔ ایک دوست، جو علی گڑھ سے ایم۔ایس۔سی کر کے چلے گئے تھے اور گورکھپور میں لیکچرار ہو گئے تھے، واپس آئے کہ پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لیں۔ جب ذاکر صاحب سے ملے تو انھوں نے فرمایا کہ "آپ لگی ہوئی ملازمت کیوں چھوڑنا چاہتے ہیں"؟ انھوں نے کہا کہ وہاں ریسرچ کی سہولتیں نہیں ہیں۔ فرمایا یہ بتایئے کہ پہلے ریسرچ ہوئی یا پہلے سہولتیں وجود میں آئیں۔ اگر ریسرچ ہی نہ ہوتی تو سہولتیں کہاں سے وجود میں آجاتیں! بعض طلبہ تعلیم سے فارغ ہو کر ملازمت نہ ملنے کی شکایت لے کر ذاکر صاحب کے پاس جاتے تھے۔ ذاکر صاحب ان میں کسی سے کہتے کہ ملازمت نہ ملنے کی صورت میں آپ رکشا چلائے اور کسی سے فرماتے کہ گھاس چھیل کر فروخت کیجیے، کیونکہ تعلیم یافتہ آدمی جو کام بھی کرے گا غیر تعلیم یافتہ آدمی کے مقابلہ میں بہتر طور پر کرے گا۔ اس سے ان کا مقصد ان طلبہ کی ذہانت اور پامردی کا امتحان لینا ہوتا تھا۔ لیکن اکثر طلبہ ان کے اس طرزِ عمل سے ناراض ہو جاتے اور باہر آکر دوستوں سے ان کا شکوہ کرتے۔ ذاکر صاحب اشخاص کے کردار اور طرزِ عمل کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر نظر رکھتے اور ان سے بڑے بڑے نتائج اخذ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وی، سی، لاج کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں شیشوں میں سے بیرونی منظر صاف نظر آتا ہے۔ ایک صاحبزادے ان سے ملنے کی غرض سے آرہے تھے کہ بوندیں آگئیں۔ وہ بھاگ کر وی، سی لاج کے برآمدے میں پہنچے۔ جب ذاکر صاحب سے ملنے کے لئے کہلوایا تو انھوں نے فوراً اندر بُلا لیا۔ صاحبزادے

ہیں مقصد سے آئے تھے (جو غالبًا مالی مدد سے متعلق تھا) جب وہ گوش گذار کر چکے تو ذاکر صاحب نے فرمایا:
"میاں! جب تم چند بوندوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو زندگی کے مسائل اور مشکلات کا مقابلہ کیسے کروگے!" پھر
بھی سمجھایا کہ معمولی رفتار سے چل کر آنے اور بھاگ کر آنے میں تھوڑا ہی فرق پڑتا ہے۔ آدمی کو جتنا بھیگنا ہوتا
ہے بہرحال بھیگ جاتا ہے۔ اگر کسی پارٹی یا جلسے میں کسی ایک شعبے یا دفتر کے اراکین کو ایک جگہ بیٹھے ہوئے
دیکھتے تو فرماتے کہ اپنے شعبے یا دفتر کے لوگوں سے تو آپ روز ہی ملتے رہتے ہیں، ایسے جلسوں اور پارٹیوں
میں دوسرے شعبوں اور دفتروں کے اراکین کے ساتھ مل کر بیٹھنا چاہیئے تاکہ واقفیت بڑھے اور دوسروں
کے ساتھ تعلقات استوار ہوں۔ اگر کوئی طالب علم شیروانی کے بٹن کھولے ہوئے ہوتا تو اس سے بجائے یہ
کہنے کے کہ بٹن بند کرلو، خود اپنے ہاتھ سے اس کے بٹن بند کرنے لگ جاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ شرما کر
باقی بٹن خود بند کرلیتا۔ اس معاملے میں یہی طرز عمل مسلم یونیورسٹی کے ایک سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر
ابوبکر احمد حلیم (مرحوم) کا بھی تھا۔

پروفیسر عبدالعلیم (مرحوم) کی ترغیب پر میں نے ۱۹۵۳ء میں بطور لکچرار شعبۂ عربی میں کام کرنا شروع
کیا۔ ابتدا میں میرا تقرر عارضی تھا۔ جب ۱۹۵۴ء میں مستقل جگہ نکلی تو سلیکشن کمیٹی کے سامنے پیش ہونے کا
مرحلہ آیا۔ ایکسپرٹ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) اور ڈاکٹر وحید مرزا (مرحوم) تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ سلیکشن
کمیٹی کا ماحول خصوصًا ایک نوگرفتار کے لیے کتنا ہولناک ہوتا ہے۔ لیکن ذاکر صاحب اس ماحول کو اپنی خوش مزاجی
اور پُرلطف فقروں سے بڑی حد تک خوش گوار بنا دیتے تھے۔ مجھ سے پہلا سوال یہ ہوا کہ آپ کو عربی کی کس
صنف سے زیادہ دلچسپی ہے؟ میں نے عرض کیا "جدید نثر سے" ذاکر صاحب نے فورًا فرمایا: "بھئی یہ تو بڑی دلچسپ
بات ہے۔ آپ سے پہلے جتنے امیدوار آئے سب کی دلچسپی قدیم شاعری سے تھی۔ آپ نے شاعری کو نثر اور قدیم
کو جدید سے بدل دیا۔ جبران خلیل جبران کے بارے میں سوال ہوا کہ وہ کس قسم کی نثر لکھتا تھا۔ میں نے جواب دیا
انشائے لطیف سے ملتی جلتی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ یہ انشائے لطیف اس نے نیاز فتحپوری سے سیکھی ہے! ایک
دوسرے مصنف جن کا حال ہی انتقال ہوا تھا، کے بارے میں پوچھا گیا کہ ابھی زندہ ہیں یا وفات ہوگئی۔ میں نے
جواب دینے میں کچھ تامل کیا تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ یہ سوال مناسب نہیں ہے۔ جس مصنف کا مطالعہ کرلیا
تو وہ زندہ جاوید ہوگیا، اب اس کے مرنے کا کیا سوال ہے! صرف اتنا ہی نہیں، ذاکر صاحب انٹرویو میں پوری
دلچسپی لیتے تھے۔ معلوم ہوا تھا کہ جس مضمون کی کسی اسامی کے لئے سلیکشن کمیٹی ہونے والی ہوتی اس سے

متعلق کتابیں لائبریری سے منگواکر پڑھتے اور پھر امیدواروں سے ایسے سوالات کرتے کہ وہ حیران رہ جاتے۔ فرماتے تھے کہ میں تو اس مضمون میں بالکل جاہل ہوں، اس مسئلے کو اس طرح واضح کیجئے کہ مجھ جیسے LAYMAN کی سمجھ میں آ جائے۔

ذاکر صاحب کے مزاج میں خودداری اور تواضع کا بڑا لطیف امتزاج تھا۔ جب باہر سے کوئی مہمان یونیورسٹی میں آتا، چاہے اس کی حیثیت ذاکر صاحب سے کمتر ہی کیوں نہ ہوتی، اس کے ساتھ اتنے اعزاز واکرام کا برتاؤ کرتے کہ بعض اوقات دیکھنے والوں کو اچھا نہ معلوم ہوتا۔ تاہم کسی بڑے سے بڑے آدمی کا دباؤ ہرگز برداشت نہ فرماتے۔ میرے والد ماجد مولوی حاجی عبیدالرحمٰن خاں شیروانی صاحب (جو اس وقت یونیورسٹی کے آنریری ٹریژرر تھے) بیان فرماتے ہیں کہ یو۔جی۔سی کی طرف سے یہ مطالبہ تھا کہ طلبہ کی فیس میں اضافہ کیا جائے۔ ذاکر صاحب جانتے تھے کہ مسلم طلبہ کی عام اقتصادی حالت ایسی نہیں کہ وہ یہ بار برداشت کر سکیں۔ چنانچہ وہ اس کے مخالف تھے۔ جب ایک دفعہ فائنانس کمیٹی کی میٹنگ میں یو۔جی۔سی کے نمائندے نے اس پر زیادہ اصرار کیا، تو ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "بہت اچھا، فیس بڑھا دیجئے۔ طلبہ کی طرف سے احتجاج ہوگا تو پھر ان پر گولی چلوائیے گا۔" ذاکر صاحب کے تیور دیکھ کر اور ان کا لب و لہجہ محسوس کر کے یو۔جی۔سی کے نمائندے سناٹے میں آ گئے اور کہا "ذاکر صاحب، آپ تو ناراض ہو گئے۔ وہی ہوگا جو آپ فرمائیں گے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ فیس جوں کی توں رہی۔

بعض ایسے حضرات (نام لینا مناسب نہیں) جن کی قومی خدمات تھیں، لیکن حالات کی ناسازگاری نے جنھیں سنکی یا چڑچڑا بنا دیا تھا، ذاکر صاحب کے پاس آ کر قیام کرتے۔ ذاکر صاحب ان سے گھبراتے تھے لیکن بظاہر اور حتی الامکان ان کی خاطر تواضع اور رکھ رکھاؤ میں فرق نہیں آنے دیتے تھے۔ اگر کسی کام میں مصروف نہ ہوتے تو اکثر اوقات مجھ جیسے چھوٹوں کو بھی رخصت کرنے کے لئے کمرے سے باہر آ جاتے اور کبھی کبھی تو کوٹھی کے لان میں ٹہلتے ہوئے دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں نے ان کے صدر جمہوریہ منتخب ہونے پر انھیں خاصہ جذباتی تہنیت نامہ لکھا تھا۔ اس پر انھوں نے جو جواب عنایت فرمایا اس کا طرز تخاطب اور دستخط کا سابقہ اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ مکتوب الیہ کی شخصیت ان کے ذہن میں پوری طرح محفوظ ہے۔ نہ معلوم اس موقع پر ان کی خدمت میں کتنے تہنیت نامے آئے ہوں گے۔ نہ صرف ان سب کا جواب دینا بلکہ مکتوب الیہ کے منصب اور حیثیت کو پیش نظر رکھنا کتنی بڑی بات ہے۔

(۳)

ذاکر صاحب علی گڑھ آئے تو یہاں کی فضا آہستہ آہستہ بدلنے لگی۔ طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال ہونے لگا اور بیرونی حملوں کی شدت میں بھی کمی ہو گئی۔ لیکن ذاکر صاحب کا کام آسان نہیں تھا۔ انھیں ایک طرف یونیورسٹی کو بدلے ہوئے حالات اور نئے ماحول سے ہم آہنگ کرنا تھا اور دوسری طرف اس کی ان صالح اور جاندار روایات کو قائم بھی رکھنا تھا جن کی پیداوار خود ذاکر صاحب تھے اور پھر یہ کام اس طرح انجام دینا تھا کہ ہندوستان کے عوام اور حکومت دونوں کی نظر میں اس ادارے کا اعتبار اور وقار نہ صرف قائم رہے بلکہ روز افزوں ہو۔ یہ بڑا صبر آزما اور دیر طلب کام تھا، خود ذاکر صاحب کے بقول یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں تھا، بلکہ پتّا مارنے کا کام تھا اور اسے ذاکر صاحب نے جس طرح انجام دیا اس سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنھیں اُن دنوں ذاکر صاحب کی مسیحا نفسی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ذاکر صاحب نے جہاں اس ادارے کے سیکولر کردار پر زور دیا وہاں یہ بات بھی واضح کر دی کہ خود ملک اور حکومت کے سیکولرزم کی سب سے بڑی آزمائش گاہ یہی ادارہ ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ملک کا آئندہ جو نقشہ بنے گا اس کے رنگ و آہنگ کا بڑی حد تک اس بات پر دار و مدار ہوگا کہ اس ادارے کے ساتھ عوام اور حکومت کا کیا برتاؤ رہتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ابھی اپنے کام کا آغاز ہی کیا تھا کہ ۱۹۴۹ء کے آخر میں ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا اور وہ علیل ہو کر کچھ عرصے کے لئے علیگڑھ سے باہر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی ایسا محسوس ہوا گویا مخالفین اس موقع کی تاک میں تھے اور جیسے ہی ذاکر صاحب نے پیٹھ پھیری، یونیورسٹی ایک دفعہ پھر اغیار کے حملوں کی زد میں آ گئی۔ پریس اور پلیٹ فارم سے اس پر طرح طرح کے الزام لگائے جانے لگے اور اس کے اساتذہ اور طلبہ کی ملک کے ساتھ وفاداری پر شبہ کا اظہار ہونے لگا۔ ذاکر صاحب کی علیگڑھ واپسی کے کچھ ہی عرصے کے بعد اخبار یہ وتو پھاوے یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب نے انھیں مخاطب کر کے اور گواہ بنا کر جو تقریر فرمائی اس سے ان کی شخصیت کا ایک ایسا رُخ نظروں کے سامنے آیا جو اب تک کم سے کم علی گڑھ والوں کی نظر سے اوجھل تھا۔ اُس وقت تک انھوں نے ذاکر صاحب کی شخصیت کا صرف جمال دیکھا تھا۔ اس کے جلال سے آشنا نہیں تھے۔ اب پہلی دفعہ اس کا جلال اپنی پوری ہیبت اور گھمبیرتا کے ساتھ رونما ہوا۔ انھوں نے جن تیوروں کے ساتھ اور جن الفاظ میں مسلم یونیورسٹی کے ناقدین و معاندین کی خبر لی اور انھیں پھٹکارا وہ صرف ذاکر صاحب ہی کر سکتے تھے، کسی دوسرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ تقریر سُن کر اور بعد میں کے بعض حصے اخباروں میں پڑھ کر لوگوں نے محسوس کیا کہ ذاکر صاحب نے اپنے نام کے ساتھ "خان" لکھنا بھلے ہی

دیا ہو، لیکن ایک گاندھیائی کے جمال کے ساتھ ایک پٹھان کے جلال کی بھی ان میں کمی نہیں ہے اور موقع آنے پر وہ اس سے بھی پوری طرح کام لے سکتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے یونیورسٹی کے مخالفین پر اوس پڑ گئی یا انھیں سانپ سونگھ گیا۔ پھر جب تک ذاکر صاحب علیگڑھ رہے، یونیورسٹی کو اس طرح کے نازیبا حملوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا جب قدامت پسند مسلمانوں کی طرف سے بعض ایسے اصلاحات کی مخالفت ہوئی جن کا نفاذ بدلے ہوئے حالات میں ناگزیر اور یونیورسٹی کی ترقی کے لئے ضروری تھا۔ ذاکر صاحب نے ان مخالفتوں کو بڑے صبر و سکون سے انگیز فرمایا لیکن اس کا اثر اپنے کام پر نہیں پڑنے دیا بلکہ وہی کرتے رہے جو ان کے نزدیک یونیورسٹی کے لئے مناسب اور مفید تھا۔

ذاکر صاحب نے یونیورسٹی میں آزادیٔ خیال کی شمعیں فروزاں کیں۔ کسی تعلیمی ادارے میں فکر و نظر پر پابندی عائد کرنا یا پہرے بٹھانا ایسا معیوب فعل ہے جس سے ایک طرف اساتذہ کے ذہنوں میں زنگ لگ جاتا ہے اور دوسری طرف طلبہ کی شخصیت پوری طرح پنپنے اور ابھرنے نہیں پاتی ہے۔ ذاکر صاحب اس راز سے بخوبی واقف تھے اور ہر نقطۂ نظر کو تعلیمی اداروں میں فروغ پانے اور پھیلنے کا بھرپور موقع دینے کے حق میں تھے۔ جن لوگوں کی ذہنی تربیت ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ماحول میں ہوئی تھی ان میں سے اکثر کے لئے یہ طرزِ فکر بالکل نیا اور نامانوس تھا اس لئے انھوں نے ذاکر صاحب سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا کہ آپ کو خود اپنے اصول و نظریات پر بھروسہ نہیں معلوم ہوتا ہے، ورنہ آپ اس طرح کا احتجاج نہ کرتے۔ میں ہر شخص کو اپنے نقطۂ نظر کی تبلیغ کی آزادی دینا چاہتا ہوں بشرطیکہ اس کا اثر یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی اور نظم و نسق پر ناخوشگوار نہ ہو۔ جو نظریہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اور جاندار ہوگا وہ باقی رہے گا۔ دوسرے سب نظریات خود بخود فنا ہو جائیں گے۔ لہٰذا آپ اپنا کام کیجئے، اور دوسروں کو اپنا کام کرنے دیجئے۔ جو لوگ نظریاتی اعتبار سے ذاکر صاحب کے ہمخیال تھے ان کی خواہش تھی کہ ذاکر صاحب ان نظریات کی ترویج میں ان کی اعانت کریں۔ لیکن ذاکر صاحب نے اس سے ہمیشہ پہلو تہی فرمائی اور کہا کہ اس طرح کا کام پھولوں کا سیج نہیں ہے، کانٹوں بھرا راستہ ہے؛ جب آپ اس راہ پر چلے ہیں تو اس کے موانع کا خود اپنی ہمت سے مقابلہ کیجیے، دوسروں کا سہارا تلاش نہ کیجیے۔ شروع میں ان کے اس طرزِ عمل سے ایسے لوگوں کو کسی قدر شکایت پیدا ہوئی لیکن جب انھوں نے ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر سمجھ لیا تو نہ صرف ان کی شکایت رفع ہو گئی، بلکہ وہ اس کی خوبی کے قائل بھی ہو گئے۔

کافی عرصے سے یونیورسٹی میں علمی کام کی اہمیت اور وقعت بہت کم ہو گئی تھی۔ تقررات اور ترقیوں کا انحصار

ی علمی کام کے مقابلے میں بعض دوسری باتوں پر زیادہ تھا۔ ذاکر صاحب نے اس فضا کو بدلنے کی پوری کوشش کی۔ انھوں نے تحقیقی کام کی اہمیت پر زور دیا اور اساتذہ کو محسوس کرایا کہ ان کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ علمی میدان میں کچھ کرکے نہ دکھائیں۔ اس طرح عرصے کے بعد یونیورسٹی میں علمی کام کی طرف توجہ ہوئی۔ اگرچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ کام کم ہوتا تھا، اس کی نمائش زیادہ ہوتی تھی لیکن بہرحال لوگوں نے محسوس کیا کہ کچھ نہ کچھ کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ جو لوگ واقعی سنجیدہ علمی کام میں مصروف تھے ذاکر صاحب ان کی بہت عزت اور ہمت افزائی کرتے تھے۔ ان سے جب بھی ملاقات ہوتی ان کے کام کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور ان کی راہ میں جو دشواریاں ہوتی تھیں انھیں دور کرنے میں معاون ہوتے تھے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ایسے نوجوان اساتذہ کو جن سے آئندہ اچھی توقعات وابستہ تھیں کثیر تعداد میں مزید کسب علم کے لئے یورپ اور امریکہ کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں بھیجنے کا انتظام فرمایا۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری سے پہلے یونیورسٹی میں پروفیسروں کی تعداد بہت کم تھی۔ انھوں نے کوشش کی کہ یونیورسٹی کا کوئی شعبہ پروفیسر سے خالی نہ رہے اور اس کوشش میں انھیں پوری کامیابی ہوئی۔ مرکزی وزارت تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پر اُن کا اتنا اثر تھا کہ ان کی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج یونیورسٹی کے تقریباً ہر شعبہ میں پروفیسر موجود ہیں اور ان میں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اسی یونیورسٹی کے طالب علم رہے ہیں یا یہیں لکچرار کے عہدے سے ترقی کرکے اپنے موجودہ منصب تک پہنچے ہیں۔ بڑی بات یہ تھی کہ جب تک ذاکر صاحب علیگڈھ رہے ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ یونیورسٹی کا سربراہ ایک ایسا آدمی ہے جو خود بھی علمی ذوق رکھتا ہے اور دوسروں کے علمی کام کی قدر کرنا بھی جانتا ہے۔ یہ احساس بجائے خود علمی کام پر آمادہ کرنے میں بہت معاون ہوتا تھا۔ "سرسید ڈے" کی ایک تقریب میں، جس میں یونیورسٹی کے بعض سینئر اساتذہ موجود تھے، ذاکر صاحب نے انھیں مخاطب کرکے فرمایا کہ سرسید احمد خاں صرف علمی آدمی نہیں تھے وہ عملی انسان بھی تھے اور انھوں نے عمل کے میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا علمی کام اتنا زیادہ ہے جو کسی یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے بھی باعث رشک ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ جن کا کام صرف علم کی خدمت ہے انھیں سرسید احمد خاں کے اس پہلو سے سبق لینا چاہیئے اور سوچنا چاہیے کہ ان کا علمی سرمایہ سید احمد خاں کے مقابلہ میں کیا اہمیت رکھتا ہے۔

ذاکر صاحب کی یہ بھی قطعی رائے تھی کہ یونیورسٹی کے مسائل خود یونیورسٹی کے اندر طے ہونے چاہئیں۔ باہر سے کسی کو ان میں دخل نہیں دینا چاہیئے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، حکومت یا سیاسی جماعتیں یا اشخاص و افراد۔ وہ اپنے اس اصول پر بہت مضبوطی سے قائم رہے اور بیرونی اثرات انھوں نے بہت کم قبول کئے۔ اگرچہ اُن کے اس

از عمل سے بعض اوقات بعض حلقوں میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ وہ یونیورسٹی میں گروہ بندی کو سخت ناپسند
رتے تھے اور جن لوگوں کے بارے میں انھیں شبہ ہوجاتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کی انتظامی اور تعلیمی مجالس میں گروہ بندی
و فروغ دینا چاہتے ہیں ان سے حتی الامکان ان مجالس کو پاک کرکے رہتے تھے۔ انھوں نے ان مجالس میں اساتذہ
ی نمائندگی میں اضافہ کیا اور بیرونی ممبروں کی تعداد کم کی۔ اس کا مقصد جہاں یہ تھا کہ تعلیمی مسائل کے حل میں ان لوگوں
ی آواز فیصلہ کن ثابت ہو جنھیں ان مسائل کا عملی تجربہ ہے، وہاں یہ بھی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو یونیورسٹی کو گروہ بندی
سے نجات ملے۔ جن لوگوں کو ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے دور میں ان مجالس میں شرکت کا موقع ملا ان کا بیان
ہے کہ ذاکر صاحب ہر ممبر کو اپنی بات کہنے کی پوری آزادی دیتے تھے لیکن ان کے تدبر اور شخصیت کا کمال یہ تھا کہ ان کی
موجودگی میں مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹو کونسل اور اکیڈمک کونسل، غرض ہر مجلس میں ہر فیصلہ ہمیشہ اتفاق رائے
سے ہوا اور کبھی رائے شماری کی نوبت نہیں آئی۔ اگر کوئی ممبر ان کی کسی رائے سے اختلاف یا کسی فیصلے پر اعتراض کرتا تھا
تو وہ فرماتے تھے کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن صرف اعتراض کافی نہیں ہے بلکہ اس مسئلے کا حل تجویز کیجیے۔ اور پھر وہ
ممبر یا تو کوئی ایسا حل تجویز کرتا تھا جو ان کے اور دوسرے ممبروں کے لئے قابل قبول ہوتا تھا اور نہ خود ان کی رائے مان
لیتا تھا اور اکثر ان ہی کی رائے مانی جاتی تھی کیونکہ وہ سب سے وقیع ہوتی تھی۔

صحت مند دماغ کے لئے صرف صحت مند جسم ہی نہیں، صحت مند ماحول بھی انتہائی ضروری ہے۔ ایسے ماحول
ی علی گڑھ میں بڑی کمی تھی۔ یہاں ہر طرف خاک اڑتی تھی اور بالخصوص گرمیوں کے موسم میں یونیورسٹی میں گھروں یا کمروں سے
نکلنا ممکن نہیں تھا۔ سبزے، پھول، پودوں اور درختوں کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ بلکہ عام خیال یہ تھا
ہ یونیورسٹی کی زمین روئیدگی کے لئے سازگار نہیں ہے۔ ذاکر صاحب بہت باذوق آدمی تھے اور ان کی جمالیاتی
حس بہت قوی تھی۔ انھیں خاص طور سے پھولوں سے غیر معمولی شغف تھا۔ انھوں نے اپنے زمانۂ وائس چانسلری
یں جہاں اساتذہ اور طلبہ کی ذہنی بالیدگی کا انتظام فرمایا، وہاں ان کے لئے خوش گوار اور صحت مند ماحول مہیا
رنے میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ تھوڑی ہی مدت میں یونیورسٹی میں ہر طرف سبزہ لہلہانے لگا۔ پھول کھلنے لگے اور شاداب
ور بلند بالا درخت سایہ فگن ہو گئے۔ ان کی دلچسپی اور ہمت افزائی کا اثر دوسرے لوگوں پر بھی ہوا۔ یونیورسٹی کی
مارتوں اور میدانوں کے علاوہ ذاتی مکان بھی پھولوں سے مہک گئے۔ جن لوگوں نے ۲۰-۲۲ سال پہلے علیگڑھ
یکھا تھا وہ آج اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ ذاکر صاحب کے یہاں تشریف لانے کے بعد یونیورسٹی کی ظاہری شکل و صورت
ور اس کے ماحول میں کتنی زبردست اور خوشگوار تبدیلی ہوئی۔ اس کے علاوہ ذاکر صاحب نے طلبہ کی روحانی نشوونما

، کے خالی وقت کو بامصرف بنانے کی خاطر بعض ثقافتی مشاغل کی طرح ڈالی اور اس طرح طلبہ کا جو وقت بے کار گپ بازی
ںاموں میں گزرتا تھا اب ایسے کاموں میں صرف ہونے لگا جو ایک مہذب شخصیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اصل
یکہ ذاکر صاحب کسی تعلیمی ادارے میں طلبہ کی بنیادی اہمیت کے قائل تھے اور ایسی تمام تدابیر اختیار کرتے تھے
یں ملک کا مفید اور کار آمد شہری بنا سکیں۔ وہ ایسے ڈسپلن کے حامی تھے جو خود طلبہ کے اندر سے پیدا ہوتا ہے
اُن پر باہر سے مسلط کیا جاتا ہے۔ اُن کی وائس چانسلری کے دور میں یونیورسٹی میں ایسے کئی مواقع آئے جب اگر
یسے کام نہ لیا جاتا تو کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کے حُسنِ انتظام نے اس کی نوبت نہ آنے دی،
خود طلبہ کے تعاون سے سارے مسائل بحسن وخوبی حل ہو گئے۔ مذہب کی طرف بھی ذاکر صاحب کا یہی رویہ تھا۔ وہ
دی طور پر خالص مذہبی آدمی تھے۔ انکی سحر خیزی اور قرآن کے ساتھ گہری وابستگی عام طور پر معلوم ہے لیکن وہ
ےکے زور سے دوسروں پر مذہبی افکار و اعمال مسلط کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ طلبہ جرمانے
ڈر سے نماز پڑھیں، یا دوپہر کو کھانا نہ ملنے کے خوف سے روزہ رکھیں۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جب اس طرح کی
بندیاں عائد کی جاتی ہیں تو لوگ ان پابندیوں سے بچنے کے لئے چور دروازے بھی تلاش کر لیتے ہیں اور اس طرح
یں مذہبی افکار و اعمال کا احترام ہونے کے بجائے اُلٹی منافقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بخلاف وہ چاہتے،
ر نماز، روزہ اور دوسرے مذہبی اشغال کا داعیہ خود طلبہ کے اندر سے پیدا ہو اور وہ انھیں ذوق وشوق
ے انجام دیں۔

ذاکر صاحب جتنے باذوق تھے اتنے ہی عالی حوصلہ بھی تھے۔ چھوٹی بات اور چھوٹا خیال ان کے ذہن
کبھی نہیں آتا تھا اور انھیں ہمیشہ خوب سے خوب ترکی جستجو رہتی تھی۔ جو لوگ تقسیم ہند سے قبل یونیورسٹی میں برسرِ اقتدار
ان کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ سر سید کے مشن کے حامل اور ان کے پیرو تھے۔ اس کے بخلاف ذاکر
حب علی گڈھ تحریک سے بغاوت کر کے عدم تعاون کی تحریک میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی وائس
نسلری سے پہلے یونیورسٹی میں "سر سید ڈے" محض ایک رسم کے طور پر منایا جاتا تھا اور جسد بے روح بن کر رہ گیا
ا، انھوں نے اس میں روح پیدا کی اور اسے بانی درس گاہ کے شایان شان منانے کا اہتمام فرمایا۔ یونیورسٹی
بریری میں سر سید کی تصانیف اور ان سے متعلق لٹریچر کی نمائش کا خیال سب سے پہلے ذاکر صاحب ہی کے
ن میں آیا اور اس نے ان ہی کے اشارے پر عملی صورت اختیار کی۔ رات کو سر سید ہال کے لان پر یونیورسٹی
ے سب طلبہ، اساتذہ اور مہمانوں کا ساتھ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا، ایسا شاندار اور ولولہ انگیز منظر ہوتا ہے جس کی

ال کسی اور تعلیمی ادارے میں ملنا محال ہے۔ یہ روایت ذاکر صاحب ہی نے قائم کی ہے۔ اس کورٹ میں ملک کی بعض
تدر ہستیاں بھی شرکت کرتی رہی ہیں اور اس کے بارے میں انھوں نے ایسے ہی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ذاکر صاحب
وائس چانسلری کے دور میں ملک اور بیرون ملک کے متعدد معزز مہمان علیگڑھ تشریف لائے۔ جن میں شاہ سعود
رضا شاہ پہلوی بھی شامل تھے۔ ذاکر صاحب نے ان کی پذیرائی جس حوصلے اور فراخدلی سے فرمائی اور جیسی شاندار
ضیافت منعقد کیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔ ایسے موقعوں پر وہ روپے پیسے کا خیال بالکل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کی ساری
یونیورسٹی کی نیک نامی پر مرکوز رہتی تھی۔ مسز روزویلٹ جب ہندوستان کے دورے پر آئی تھیں تو علیگڑھ بھی تشریف
تھیں۔ یہاں سے واپس جاکر انھوں نے اپنے سفر کے تاثرات پر کتاب لکھی تو اس میں مسلم یونیورسٹی اور اس کے وائس چانسلر
اکر صاحب) کا ذکر خاص طور سے کیا۔

ذاکر صاحب کی ذاتی خوبیوں میں میرے نزدیک اولیت ان کے جذبۂ ایثار کو حاصل تھی۔ انھوں نے
جوانی جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمت میں بسر کردی وہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جو دوسرے سب کارناموں پر
اری ہے۔ جب وہ علی گڑھ تشریف لائے تو ان کی عمر ۵۰ سال سے متجاوز تھی اور ۲۲ سال تک بہت قلیل معاوضے
جامعہ کی سربراہی کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ یہاں آکر انھیں فراغت حاصل ہوئی اور آرام ملا، لیکن ان کی
دگی، جفاکشی اور اخلاق میں فرق نہیں آیا۔ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ نادار طلبہ کی اعانت میں صرف کردیتے تھے۔
طلبہ ان سے اپنی ذاتی ضرورتوں اور مشکلات کے سلسلے میں ملتے تھے، انھیں وہ پورا وقت دیتے تھے اور حتی الامکان
کی مشکلات حل کرنے کی کوشش فرماتے تھے اور اگر حل نہیں کرسکتے تھے تو کم سے کم انھیں مفید مشوروں سے ضرور
ازتے اور ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

ان کی بلند اخلاقی کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جب ان کے چھوٹے بھی ان سے ملنے کے لئے جاتے تھے،
وہ انھیں چھوڑنے کے لئے کمرے سے باہر تشریف لاتے تھے اور کبھی کبھی تو کافی دیر تک کوٹھی کے احاطے میں ٹہل
ل کر ان سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ انھیں حفظِ مراتب کا بھی بہت خیال تھا اور اپنے سے بڑوں کے ساتھ وہ جس
نکسار اور نرمی سے پیش آتے تھے موجودہ دور میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر آل
ڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر بھی ہوتا ہے۔ جب ذاکر صاحب وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ تشریف لائے تو اس حیثیت
ے ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے انھیں استقبالیہ دیا گیا۔ اس وقت نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم و مغفور کانفرنس
جنرل سکریٹری تھے۔ ذاکر صاحب اور نواب صاحب کی نشست تخت پر تھی۔ جلسے کے بعد نواب صاحب تخت سے

پلتے تھے اور ان کا یہ اعلان خلوص اس معاملے میں ان کا معاون ہوتا تھا۔ ان کی تقریر کی طرح ان کی تحریر بھی بڑی میٹھی اور دل نشین ہوتی تھی۔ بالخصوص ان کے خطبات میں ادب اور خطابت کا ایسا حسین اور دل آویز امتزاج ہوتا تھا جو کسی دوسرے کے یہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ اردو میں ڈاکٹر صاحب سے بہتر خطبات کسی اور نے نہیں لکھے ہیں۔

۱۹۵۷ء کے آخر میں ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے تشریف لے گئے۔ یہاں سے جا کر ملک میں مختلف ممتاز عہدوں پر سرفراز ہوئے۔ وہ جہاں گئے اور جس منصب پر بیٹھے، نہ صرف نیک نام اور سربلند رہے، بلکہ اپنی شخصیت اور لیاقت سے اس منصب کو چار چاند بھی لگائے۔ ان کے کردار کے جو روشن پہلو جامعہ ملیہ اور مسلم یونیورسٹی میں نمایاں ہوئے تھے، خدمت کا وسیع تر میدان ملنے پر ان کی تابناکی میں مزید اضافہ ہوا۔ پٹنہ کا راج بھون ہو یا پارلیمنٹ کا ایوان بالا یا نئی دہلی کا راشٹرپتی بھون، ہر جگہ ان کے کردار کا نور روشنی اور عظمت بلند رہا۔ جب ۱۹۶۷ء میں جمہوریہ ہند کی صدارت کے منصب جلیل پر ان کا انتخاب ہوا تو یہ ایک ایسی زندگی کا نقطۂ عروج تھا جو ہمیشہ اعلیٰ مقاصد کے لئے وقف رہی تھی۔ اس انتخاب کی اہمیت کو اس وقت کسی نے سمجھا تھا اور کسی نے نہیں سمجھا تھا کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانا چاہی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا جادو اور کردار کی عظمت یہ تھی کہ جب تقریباً دو سال کے بعد انہوں نے اس دنیا کو چھوڑا تو ہر ایک شخص اس بات کا معترف تھا کہ اس منصب کے لئے ہندوستان بھر میں ڈاکٹر صاحب سے بہتر کوئی دوسرا شخص نہیں مل سکتا تھا۔ ایک طرف مسز اندرا گاندھی نے، جو ان کے انتخاب کی سب سے زیادہ ذمہ دار تھیں، یہ کہہ کر بہت سی غلط فہمیاں رفع کر دیں کہ ڈاکٹر صاحب کا عہدۂ صدارت پر انتخاب اس لئے نہیں ہوا تھا کہ وہ مسلمان تھے بلکہ اس لئے ہوا کہ وہ اس کے سب سے زیادہ اہل تھے تو دوسری طرف شری راج گوپال اچاریہ نے بھی، جو ہر زمانہ اور ہر بات میں ایک منفرد نقطۂ نظر رکھتے تھے، اعتراف فرمایا کہ اس وقت ہندوستان میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے زیادہ لائق شخص کوئی اور نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا عہدۂ صدارت پر انتخاب بلاشبہ ان کی اہلیت و لیاقت کی بنا پر ہوا تھا لیکن اس سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں کسی شہری کا مذہب اس کی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ پچاس کروڑ انسانوں نے جتا دیا ہے کہ سیکولرازم کا دعویٰ پر خلوص ثبت کر دکھایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر عہدۂ صدارت میں اپنے نیک اطوار اور زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کئے اور ہر دو ملک ہندوستان کے فقدان ہر قدم میں ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہو کر بھی ان کے انکسار اور سادگی میں کمی

ہیں آئی بلکہ شاخ ثمردار کی مانند وہ جتنے اونچے ہوتے گئے اتنے ہی جھکتے گئے۔ جس شخص سے ان کا جو تعلق قائم ہو گیا وہ آخر وقت تک اسی طرح قائم رہا۔ جب وہ صدر جمہوریہ منتخب ہوئے تو قدرتی طور پر ملک کے گوشے گوشے سے ان کے نام ہزاروں تہنیت نامے آئے ہوں گے۔ جن لوگوں سے وہ تھوڑے سے بھی واقف تھے انھیں خود اپنے دستخط سے جواب مرحمت فرمایا اور اس میں مکتوب الیہ کے ساتھ اپنے تعلق کا پورا لحاظ رکھا۔ کہنے کو یہ معمولی بات ہے لیکن اس پر عمل جتنا دشوار ہے اس کا اندازہ ہر شخص بہ آسانی کر سکتا ہے۔ ذاکر صاحب کو جو مناصب و اعزازات حاصل ہوئے ہمیشہ بلا طلب حاصل ہوئے۔ وہ عہدوں کے پیچھے کبھی نہیں دوڑے، عہدوں نے انھیں تلاش کیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی ساکھ اور وقار میں آخر تک اضافہ ہی ہوتا رہا، کمی کبھی نہیں ہوئی ورنہ حصولِ اقتدار کی کشمکش میں ہم نے کتنی شہرتوں کو داغدار اور کتنی بلندیوں کو پستیوں میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے اور برابر دیکھتے رہتے ہیں۔

اب جب کہ ذاکر صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ان کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں اور اس نقصانِ عظیم کا اندازہ ہو رہا ہے جو ان کی وفات سے ہمیں پہنچا ہے۔ بلاشبہ یہ ملک کا بہت بڑا نقصان ہے لیکن بالخصوص مسلمانوں کی صف میں تو ایسا خلا ہو گیا ہے جو نہ معلوم اب کب پُر ہو گا اور کبھی پُر ہو گا بھی یا نہیں۔ انھیں راشٹرپتی بھون میں دیکھ کر خود اپنی ذات پر اعتماد و افتخار پیدا ہوتا تھا اور اس ملک میں مسلمانوں کے روشن مستقبل کے امکانات واضح ہوتے تھے۔ لیکن اب ان کے اٹھ جانے سے یہ کیفیت ہے کہ اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی۔ ایسا ہی سناٹا ۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کی وفات کے بعد بھی محسوس ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے مولاناؒ کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا ایک حد تک پُر کر دیا تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ قدرت ذاکر صاحب کی کمی کب اور کس طرح پوری کرتی ہے۔

● ●

اشتیاق محمّد خاں

آج تک یہ عادم بھی اس کا عادی ہے کہ ہوسٹل میں کہیں بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا انسظر آیا اور فوراً اس کو کوڑے دان کی نذر کر دیا۔

عملی تربیت کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ فرمایئے:

دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کا سال تھا۔ کیا غلہ کیا ترکاری ہر چیز مہنگی ہو چکی تھی۔ ڈائننگ ہال میں کھانا بھی ناپ تول کر ملتا تھا۔ بچت اور کفایت کی زبانی تلقین و نصیحت کے بجائے قرآن کی یہ آیت ترجمہ کے ساتھ ایک خوبصورت فریم میں جلی حروف میں لکھ کر ڈائننگ ہال کی ایک دیوار پر آویزاں کر دی گئی تھی: "کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا" کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو۔

ایک دوپہر کے کھانے کے وقت ذاکر صاحب ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ سب طلبا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ذاکر صاحب ہر ٹیبل پر جاتے اور سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے۔ ساتھ ساتھ کھانے کی کوالٹی کے متعلق بھی پوچھتے۔ اچانک دیکھا کہ ایک ٹیبل کے پاس ذاکر صاحب رک گئے اور ہڈی پلیٹ کو بغور دیکھنے لگے۔ ان کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، وہ ذرا جھکے اور ہڈی پلیٹ میں پڑے ہوئے ایک عدد آلو کو اُٹھا لیا۔ وہیں پانی سے دھویا اور کھڑے کھڑے کھانا شروع کر دیا۔ سب لڑکے حیرت سے ذاکر صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ ذاکر صاحب طلبا کے حیرت کے احساس کو بھانپ گئے۔ کہنے لگے "میاں! میرا منھ کیوں تک رہے ہو یہ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ دانہ دانہ پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں لاکھوں آدمیوں کو ایک وقت کی روٹی میسر نہیں" پھر مسکرا کر کہنے لگے "یہ ادھ کچا آلو آپ ہی میں سے کسی نے ہڈی پلیٹ میں پھینک دیا تھا، میں نے جب غور سے دیکھا تو اپنا نام لکھا پایا، اس لئے اٹھا کر کھا لیا"۔ تمام طلبا، کو جو اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے، ایسا محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان سب کے چہرے پر بھرپور تھپڑ مارا ہو۔ اس دن کے بعد سے کھانے کی ٹیبل پر روٹی کے ٹکڑے یا ادھ کچے آلو پھر کبھی ہڈی پلیٹ میں نہ دیکھے گئے۔

تو یہ تھا جناب ذاکر صاحب کا طرزِ تربیت۔ ان کی تربیت کا ایک ایک عمل ہزار وعظ و نصیحت پر بھاری تھا۔

جامعہ ملیہ کے دور کا ایک اور ناقابلِ فراموش واقعہ میرے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہے:

نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی سلور جبلی منائی گئی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک کا دور ہمارے ملک

کی تاریخ میں بڑا ہی ہنگامہ خیز دور تھا۔ مسلم لیگ اپنے شباب پر تھی۔ ہر طرف قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ پاکستان بنانے کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ کانگریس ملک کی تقسیم کے خلاف تھی۔ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے موقف کے لئے زیادہ سے زیادہ تائید اور حمایت حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھیں۔ یوں سمجھیے کہ دو زبردست پہلوانوں کے درمیان ٹکراؤ تھا۔ مصالحت کی تمام راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں جماعتوں کے قائدین کا کسی ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت کا کمال کہیے کہ اسی ہنگامہ خیز دور میں جامعہ کی سلور جبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے دونوں جماعتوں کے لیڈروں کو یکجا کر دیا۔

میں اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے ہے جب جامعہ کے "جشن سیمیں" کے موقع پر ایک ہی پنڈال میں ایک اسٹیج پر قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خاں تھے اور ان کے مقابل دوسری طرف صوفوں پر مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو رونق افروز تھے۔

اسی موقع پر ذاکر صاحب نے جامعہ کی ۲۵ سالہ روداد پیش کرتے ہوئے جو تاریخی خطبہ نذر سامعین کیا تھا وہ طلائی حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہے۔ اس خطبہ کا وہ حصہ جس میں سیاست و تعلیم کا موازنہ کیا گیا تھا، آج تک میری ڈائری میں محفوظ ہے:

"سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیرے دھیرے بہنے والا امیدانی دریا ہے، جو برسات ہی میں نہیں بہتا، گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے۔ سیاست ان کی تنظیم اور حفاظت کرتی ہے۔ اس لئے وہ مخدوم اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی ہے اور تعلیم تمدت۔ سیاست کے پروگرام آئے دن بدلتے رہتے ہیں تعلیم کا پہلا منصوبہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل پہنچنے کے لئے نہیں ہے، رہرو کا رخ متعین کرتی ہے۔"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ ۱۹۴۶ء کا دور بڑا ہی ہنگامہ و قیامت خیز تھا۔ ملک میں بالخصوص شمالی حصہ میں فسادات کا لاوا پھوٹ پڑا تھا۔ اسی خطبے میں آخر میں ذاکر صاحب نے بڑے بیباکانہ انداز میں قومی رہنماؤں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا: "آپ سب صاحبان آسمان سیاست کے تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں

آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں :

" آج ہمارے ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، آج ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ آج نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوارسکیں گے؟ بربریت کے اس دَور دورے میں تہذیب کو کیسے بچائیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی نرم ہو گے ہم جو اپنے کاموں کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی پوری طرح محفوظ نہیں۔

" شاعر مندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے۔

" خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اُسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجئے۔"

ذاکر صاحب کو شاید ہی کسی نے کبھی غصہ میں دیکھا ہو، بجز ایک موقع کے جب وہ علی گڑھ میں وائس چانسلر تھے۔ قصہ یوں ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں صاحب کے انتقال پر کچھ فرقہ پرست اخباروں نے یہ خبر اخبار میں اُڑا دی کہ لیاقت علی خاں کی موت پر یونیورسٹی میں شادیانے بجائے گئے اور فوراً یونیورسٹی کو بند رکھا گیا۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔ سارے ملک کے اخباروں میں چرچے ہونے لگے۔ طلبا جا کر ذاکر صاحب سے ملے اور اس جھوٹے پروپگنڈے کے خلاف اخبارات میں تردیدی بیان کی سفارش کی۔ لیکن ذاکر صاحب نے ہنس کر ٹال دیا کہ " کتے بھونکتے ہیں تو بھونکنے دو۔ ہم کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔" لیکن طلبا اور اساتذہ ذاکر صاحب کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے اور سمجھنے لگے کہ ذاکر صاحب تو حکومت کے آدمی ہیں حکومت سے ڈرتے ہیں اور فرقہ پرستوں سے بھی۔

بہر حال اتفاق سے اسی عرصہ میں علی گڑھ کے آس پاس فسادات ہو گئے۔ امن و امان قائم کرنے کے لئے ونوبا بھاوے جی کو علی گڑھ آنا پڑا۔ ذاکر صاحب نے بالخصوص ونوبا بھاوے جی کو یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ اسٹریچی ہال میں ونوبا بھاوے جی کا استقبال کیا گیا۔ اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جو تقریر سنائی وہ کو لتاڑا ہے بس نہ پوچھئے۔

انھوں نے کہا "... ونوبا بھاوے جی، تنگ نظر، گندہ ذہن اخبار والوں نے ہمارے خلاف کچھ عرصہ سے ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔" پھر غصہ سے بھرپور بلند آواز میں کہا:

"کون بھڑوا کہتا ہے کہ ہم ملک کے وفادار نہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری وفاداری کا ثبوت ہم سے مانگے۔"

غرض کہ اس تقریر سے طلبا کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ذاکر صاحب کی عزت ان میں زیادہ اضافہ ہو گیا۔

ذاکر صاحب کو دین سے بھی لگاؤ تھا۔ جامعہ کی زندگی میں جب کبھی وقت ملتا وہ نظام الدین ضرور جاتے اور مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے جلسوں میں شرکت کرتے۔ مذہبی ہونے کے باوجود ان میں کٹھ ملائیت کبھی نہیں آئی۔ ان کو فنون لطیفہ، بالخصوص پینٹنگ، شعر و شاعری اور موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ تعلیم کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ طلبا کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔

ذاکر صاحب سے پہلے مسلم یونیورسٹی میں کوئی کلچرل شام کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان ہی کے زمانہ میں طلبا نے یوتھ فیسٹول کے مقابلوں (دہلی) میں حصہ لینا شروع کیا۔ ڈرامے اور موسیقی کے مقابلوں میں طلبا نے انعامات بھی حاصل کئے۔

ہمارے ملک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہے جس کا اپنا ایک ترانہ ہے۔ یہ ترانہ مجازؔ کی نظم "نذرِ علی گڑھ" ہے جس کو مجازؔ نے اپنے زمانۂ طالب علمی ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔ ذاکر صاحب نہ ہوتے تو یہ نظم ترانہ نہ بن سکتی۔

یہ بات سنہ ۱۹۵۵ء کی ہے جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ یونین کا الیکشن ہو چکا تھا۔ مسند نشینی کی رسم باقی تھی۔ میں ذاکر صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ میں نے مجازؔ کی نظم (نذرِ علی گڑھ) کی دُھن تیار کی ہے اور اس کو یونین کے جلسۂ مسند نشینی کے موقع پر کورس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا "آپ یونین کے صدر کے پاس جائیے۔ اس لئے کہ جلسہ یونین کا ہے۔ یونیورسٹی کا نہیں۔

آدمیوں کے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے۔ آپ کی یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دُکھ کے ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں:

"آج ہمارے ملک میں باہمی نفرت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، آج ہمارا چمن بندی کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جھلسے دیتی ہے۔ آج نیک اور متوازن شخصیتوں کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے؟ حیوانوں سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی اخلاق کو کیسے سنوارئیں گے؟ بربریت کے اس دَور دورے میں تہذیب کو کیسے بچائیں گے؟ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم ہوتے ہیں لیکن ان حالات کے لئے جو روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے ہیں اس سے سخت لفظ بھی نرم ہوتے ہیں جو اپنے کاموں کے تقاضوں سے بچوں کا احترام کرنا سیکھتے ہیں آپ کو کیا بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے ہیں کہ بہیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی پوری طرح محفوظ نہیں۔

"شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے۔

"خدا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھئے اور آگ کو بجھائیے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی؟ کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اُسے بجھائیے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لئے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجئے۔"

ذاکر صاحب کو شاید ہی کسی نے کبھی غصہ میں دیکھا ہو، بجز ایک موقع کے جب وہ علی گڑھ میں وائس چانسلر تھے۔ قصہ یوں ہے کہ: پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے انتقال پر کچھ فرقہ پرست اخباروں نے یہ خبر اخبار میں اُڑا دی کہ لیاقت علی خاں کی موت پر یونیورسٹی میں شادیانے بجائے گئے اور دو دن یونیورسٹی کو بند رکھا گیا۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔ سارے ملک کے اخباروں میں چرچے ہونے لگے۔ طلبا جاکر ذاکر صاحب سے ملے اور اس جھوٹے پروپگنڈے کے خلاف اخبارات میں تردیدی بیان کی سفارش کی۔ لیکن ذاکر صاحب نے ہنس کر ٹال دیا کہ "کتے بھونکتے ہیں تو بھونکنے دو۔ ہم کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔" لیکن طلبا اور اساتذہ ذاکر صاحب کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے اور سمجھنے لگے کہ ذاکر صاحب تو حکومت کے آدمی ہیں حکومت ڈرتے ہیں اور فرقہ پرستوں سے بھی۔

بہرحال اتفاق سے اسی عرصہ میں علی گڑھ کے آس پاس فسادات ہو گئے۔ امن و امان قائم کرنے کے لئے ونوبا بھاوے جی کو علی گڑھ آنا پڑا۔ ذاکر صاحب نے بالخصوص ونوبا بھاوے جی کو یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ اسٹریچی ہال میں ونوبا بھاوے جی کا استقبال کیا گیا۔ اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جو تقریر سنائی کو نسا لڑا ہے بس نہ پوچھئے۔

انھوں نے کہا " .. ونوبا بھاوے جی، تنگ نظر، گندہ ذہن اخبار والوں نے ہمارے خلاف کچھ عرصہ سے ایک مہم شروع کر رکھی ———— ہے "۔ پھر غصہ سے بھرپور بلند آواز میں کہا:

" کون بھڑوا کہتا ہے کہ ہم ملک کے وفادار نہیں۔ کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری وفاداری کا ثبوت ہم سے مانگے "

غرض کہ اس تقریر سے طلبا کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ذاکر صاحب کی محبت میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔

ذاکر صاحب کو دین سے بھی لگاؤ تھا۔ جامعہ کی زندگی میں جب کبھی وقت ملتا وہ نظام الدین ضرور جاتے اور مولانا الیاس کی تبلیغی جماعت کے جلسوں میں شرکت کرتے۔ مذہبی ہونے کے باوجود ان میں کٹرملائیت کبھی نہیں آئی۔ ان کو فنون لطیفہ، بالخصوص پینٹنگ شعر و شاعری اور موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ تعلیم کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ طلبا کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔

ذاکر صاحب سے پہلے مسلم یونیورسٹی میں کوئی کلچرل شام کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان ہی کے زمانہ میں طلبا نے یوتھ فیسٹول کے مقابلوں (دہلی) میں حصہ لینا شروع کیا۔ ڈرامے اور موسیقی کے مقابلوں میں طلبا نے انعامات بھی حاصل کئے۔

ہمارے ملک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہے جس کا اپنا ایک ترانہ ہے۔ یہ ترانہ مجاز کی نظم " نذر علی گڑھ " ہے جس کو مجاز نے اپنے زمانۂ طالب علمی ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔ ذاکر صاحب نہ ہوتے تو یہ نظم ترانہ نہ بن سکتی۔

یہ بات ۱۹۵۴ء کی ہے جب میں بی۔ ایڈ کا طالب علم تھا۔ یونین کا الیکشن ہو چکا تھا۔ مسند نشینی کی رسم باقی تھی۔ میں ذاکر صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ میں نے مجاز کی نظم ( نذر علی گڑھ ) کی دُھن تیار کی ہے اور اس کو یونین کے جلسۂ مسند نشینی کے موقع پر کورس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا " آپ یونین کے صدر کے پاس جایئے۔ اس لئے کہ جلسہ یونین کا ہے۔ یونیورسٹی کا نہیں۔

میں یونین کے صدر کے پاس پہنچا۔ وہ حضرت اپنے کٹر سیاسی پن اور ملائیت کے لئے مشہور تھے۔ مجاز کا نام سنتے ہی چراغ پا ہو گئے۔ فرمانے لگے "مجاز ترقی پسند ہے اور دہریہ بھی۔ جب تک میں اس کرسی پر ہوں، کسی دہریہ کو یونین کے پلیٹ فارم پر نہیں آنے دیا جائے گا۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور دوبارہ ذاکر صاحب کے پاس آیا اور یونین کے صدر کے انکار سے آگاہ کیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا "خیر کوئی بات نہیں، یونین والے آپ کو وہاں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو آپ سنستیڈ ڈے میں پیش کیجیے۔ یہ یونیورسٹی کا فنکشن ہے۔"

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کا وہ "سنستیڈ ڈے" تاریخی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہے گا جب میں نے چار ساتھیوں کے ساتھ کورس کی شکل میں مجاز کی نظم "نذرِ علی گڑھ" کو پہلی مرتبہ علی گڑھ کا ترانہ کہہ کر اسٹریچی ہال میں پیش کیا، تو اس کی دھن اور موسیقی سے ہزاروں کی تعداد میں طلبا اور اساتذہ سب اتنے متاثر اور محظوظ ہوئے کہ "برسے گا، برسے گا، برسے گا" کے اختتام پر صدائے تحسین اور تالیوں سے دیر تک اسٹریچی ہال گونجتا رہا۔

ذاکر صاحب نے اٹھ کر میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا: "آپ نے ترانہ کی صورت میں مادرِ درسگاہ کو یہ بہت بڑا اور اچھا تحفہ دیا ہے، جو ناقابلِ فراموش ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ تندرست اور خوش و خرم رکھے"

●●

# امان اللہ خاں شیروانی

• **امان اللہ خاں شیروانی صاحب:** پیدائش ۱۵ اگست ۱۹۲۶ء، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور برمنگھم یونیورسٹی (برطانیہ) سے تعلیم یافتہ، معاشیات اور سیاسیات میں ایم اے اور بی۔ایڈ۔ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۹ء اسلامیہ کالج سہارنپور میں معاشیات کے لکچرر رہے۔ ۱۹۵۹ء سے اسلامیہ کالج اٹاوا کے پرنسپل ہیں۔ آپ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کی ایگزیکٹیو کاؤنسل کے ممبر بھی ہیں۔ اسلامیہ کالج میں ایک تعلیمی پروجکٹ کے لیے حکومت اتر پردیش کی طرف سے انعام یافتہ۔ اتر پردیش کے اقلیتی اداروں میں ایک بہترین پرنسپل کی حیثیت سے بھی۔ آپ بھارت سیوا ٹرسٹ دہلی کی طرف سے انعام یافتہ ہیں۔ اردو اور ہندی رسائل میں آپ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں "ہندوستان میں ملٹی پرپز اسکول" اور ہندی میں جنرل نالج پر ایک کتاب آپ کی قابل قدر تحریریں ہیں۔ پرائمری کلاسوں کے لیے بھی آپ نے انگریزی کی ایک کتاب ترتیب دی ہے۔

••

کہا کس نے مسلمانوں کا ملجا ہے نہ ماویٰ ہے
خدا رکھے ہمارا ابھی علی گڑھ ہے اٹاوا ہے (اکبر الہ آبادی)

اسلامیہ کالج اٹاوا، جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے شمالی ہندوستان کا ایک قدیم اور معروف ادارہ ہے۔ علیگڑھ ایم۔ او کالج کے ساتھ ہی اس کی بھی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس کے بانی خان بہادر ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم ومغفور، سر سید کے رفیق کاروں میں سے ایک تھے۔ مرحوم نے اٹاوا میں ان ہی مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کالج کی بنیاد رکھی تھی جو سر سید کے سامنے علیگڑھ ایم۔ او کالج کے لیے تھے۔ اسکول کی ترقی اور شہرت میں جس عظیم شخصیت کا سب سے بڑا ہاتھ تھا وہ تھے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم۔ اگر خان بہادر صاحب کو کالج کا جسم کہا جا سکتا ہے تو سید الطاف حسین اس جسم کی روح تھے۔ وہ پھول بن کے مہکے اور ادارہ کی شہرت ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا شمار اُن گنے چنے لوگوں میں ہے جن پر قدرت نے سیرت، دل اور دماغ، شرافت اور ذہانت، دوستی اور قیادت کی غیر صفات ارزاں فرمائی تھیں۔ یوں تو مرحوم ہزار ہا خوبیوں کے انسان تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا جذبۂ ایثار تھا۔ ۴۹ برس تک جس شخص نے ایک معمولی اور مقررہ تنخواہ پر کالج کی خدمت کی اور اس تنخواہ کا بھی زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے شاگردوں پر خرچ کیا، اس کے جذبۂ ایثار کا کیا کہنا۔ مرحوم نے یہی جذبۂ ایثار اپنے ہونہار شاگردوں کو بھی عطا کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم، ڈاکٹر سید محمود مرحوم اور ان کے بہت سے دوسرے شاگرد اس کی ایسی تابندہ مثالیں ہیں جو ہندستان کی قومی اور تعلیمی تحریکوں کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مجسم اخلاق تھے۔ شرافت کا معیار تھے۔ انہوں نے اپنا عیش و آرام اور اپنا کل اثاثہ دوسروں کی بھلائی اور مستحق لوگوں کی امداد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انھیں کالج اور طالب علموں سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ ان کی ذات ان دونوں میں گم ہو گئی تھی۔ انہوں نے اپنا سب کچھ، اپنی زندگی، اپنا روپیہ اسکول اور اس کے طالب علموں پر قربان کر دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ جب وہ ریٹائر ہوئے تو کچھ رقم جمع کر گئے ان کی خدمات عالیہ کے اعتراف

میں ایک تھیلی کی شکل میں ان کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اوّل تو انہوں نے لینے سے انکار کیا لیکن بعد میں اس شرط پر راضی ہوئے کہ یہ رقم کالج میں جمع کردی جائے۔ بڑی مشکل سے یہ رقم ان کے نام سے ڈاکخانہ میں جمع کی گئی اور چونکہ اس بات کا خدشہ تھا کہ وہ اس رقم کو دوسروں پر خرچ کردیں گے اس لیے پاس بک کالج کے ایک اولڈ بوائے شیخ نفیس الحسن صاحب مرحوم سابق اسپیکر یو پی اسمبلی اور سابق چیرمین یو پی پبلک سروس کمیشن کے پاس رکھ دی گئی اور یہ اسی وقت انھیں دکھائی گئی جب اس کا یقین ہوجاتا تھا کہ رقم ان کے ذاتی خرچ کے لیے نکلوائی جارہی ہے۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی ان کے جذبۂ ایثار، ان کی شرافت اور طلبا سے محبت اور ہمدردی کا بہت مشہور ہے۔ کالج میں کم خرچ ہاسٹل بھی تھا جس کے طالب علموں کو مفت کپڑا بھی ملتا تھا۔ یہ کپڑا اکثر ہاسٹل کے تمام طلبا کے لیے ایک ہی طرح کا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے ان طلبا میں احساس کمتری پیدا ہونا یقینی تھا۔ ایک مرتبہ نمائش میں طلبا کو ان کپڑوں میں جانے میں تامّل ہوا۔ جب ہیڈ ماسٹر کو اس کا علم ہوا تو مرحوم نے اسی کپڑے کی شیروانی بنوائی اور اسے پہن کر نمائش جانے لگے اور اس طرح طلبا کے سامنے انکسار، ایثار، محبت اور مساوات کا ایک نمونہ پیش کردیا۔

سید الطاف حسین صاحب مرحوم ایک دردمند شفیق استاد، دیدہ ور ماہر تعلیم اور صاحب علم شخصیت کے مالک تھے اور ہر موضوع پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ علمی مشاغل میں ان کو سب سے زیادہ پڑھنا، اس سے کم پڑھانا اور اس سے کم لکھنا مرغوب تھا۔ کتب بینی کا ان کو اتنا گہرا اور سچّا شوق تھا کہ انتہائی مصروفیت و پریشانی، یہاں تک علالت کی حالت میں بھی اس کا تھوڑا بہت سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ انھوں نے درس تدریس کو اپنا پیشہ بنایا لیکن ان کا مطالعہ اس کے علاوہ اور دنیا بھر کے موضوعات پر حاوی تھا۔ کتابیں جمع کرنے کا بھی بید شوق تھا۔ آج کالج لائبریری میں انگریزی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ ان ہی کے شوق کا نتیجہ ہے۔ بحیثیت استاد ان کو باقاعدہ درس سے زیادہ اس کی لگن تھی کہ طلبا کے دل میں عام مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔ شاعری سے بھی شوق فرماتے تھے۔ لیکن وہ اپنے اشعار چند مخصوص احباب کے علاوہ کسی کو نہیں سناتے تھے۔ البتہ ان کے احباب اور مخصوص شاگردوں کا کہنا تھا کہ وہ بہت اچھے شعر کہتے تھے اور موصوف اس طرف زیادہ توجہ فرماتے تو ان کا مقام بحیثیت شاعر بھی اردو ادب میں بہت بلند ہوتا۔ وہ انگریزی تحریر پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کی تحریر میں بیساختہ پن، جوش اور خلوص ہوتا تھا لیکن حال یہ ہے کہ انھوں نے کوئی مستقل تحریر نہیں چھوڑی۔ ان کی انگریزی لکھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ سننے میں آیا ہے، جب مسٹر [illegible] گورنر یو پی بدایوں تشریف لائے تو ان کو میونسپل بورڈ کی طرف سے جو ایڈریس پیش کیا گیا وہ ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے

ایک صاحب کو ڈکٹیٹ کیا تھا۔ اس ایڈریس کو سن کر گورنر موصوف نے فرمایا تھا کہ یہ ایڈریس انگریزی زبان و ادب کا ایک شاہکار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم نے کالج کی بنیاد رکھی اور اس کی عالی شان عمارت بنوائی لیکن اس کالج کو ملک میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ الطاف حسین مرحوم کی ذاتی کوششوں اور طریقۂ تعلیم اور تربیت کا نتیجہ تھی۔ مرحوم ایک جید عالم، بہترین منتظم اور عظیم استاد تو تھے ہی ان کے خلوص، ان کے ایثار اور بے لوث محبت نے ان کو منفرد بنا دیا تھا اور ان کی اس شخصیت میں ہی کالج کی شہرت اور مقبولیت کا راز پنہاں تھا۔ وہ ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بنا لیتے تھے۔ یہ طالب علم اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پر صرف کرتے تھے اور مرحوم مختلف سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ان طالب علموں کے ساتھ ایسے دلچسپ انداز میں گفتگو کرتے تھے کہ ان میں ان مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہو جاتی تھی اور ان کے علم و واقفیت میں کافی اضافہ ہوتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی ان مجلسوں اور بحثوں کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ بہت سے طلبا کی عام واقفیت ان مسائل کے متعلق اتنی وسیع ہو جاتی تھی کہ وہ مستقبل میں ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں نمایاں حیثیت حاصل کر لیتے تھے۔

مرحوم کس طرح اپنے شاگردوں پر نظر رکھتے تھے اور کس کس طرح ان کی مدد فرماتے تھے، اس سلسلے میں ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ میں ۱۹۵۹ء میں اس کالج کا پرنسپل ہو کر آیا تو کچھ ہی روز کے بعد ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے انھوں نے اپنا نام رمیش گپتا بتایا اور کہا کہ وہ آگرہ ضلع میں ایک غریب کسان کے بیٹے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں مڈل پاس کر کے اس کالج میں نویں کلاس میں داخل ہوئے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے خود ان کا ٹسٹ لے کر انھیں کم خرچ والے ہاسٹل میں داخلہ دیا تھا۔ ہائی اسکول کے دوران ہیڈ ماسٹر صاحب گشت کرتے ہوئے اس کمرہ میں آئے، جہاں وہ آرٹ کا امتحان دے رہے تھے۔ ایک نظر ان کی آرٹ کی کاپی پر ڈال کر مرحوم نے گپتا جی سے کہا کہ وہ امتحان کے بعد ان سے ملیں۔ گپتا صاحب بہت پریشان ہوئے، وہ سمجھے کہ ان سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ بہر حال ڈرتے ڈرتے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس پہنچے تو مرحوم نے ان سے دریافت کیا کہ وہ ہائی اسکول پاس کر کے کیا کریں گے۔ گپتا صاحب نے بتایا کہ آئندہ تعلیم جاری رکھنا تو ان کے لیے مشکل ہے، اس لیے وہ ملازمت کی کوشش کریں گے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے نتیجہ برآمد کرنے کے بعد انھیں پھر بلایا۔ گپتا صاحب نے ہائی اسکول میں فرسٹ ڈویژن اور آرٹ میں امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انھیں ایک خط دیا اور دس روپیہ بھی اپنے پاس سے دیے اور فرمایا کہ یہ خط لے کر وہ اس پر لکھے پتے پر دہلی چلے جائیں، ان کی تعلیم یا ملازمت کا انتظام ہو جائے گا۔ گپتا صاحب کا کہنا تھا کہ اس خط اور مرحوم کی سفارش کی وجہ سے انھیں فرانس جا کر وہاں کے آرٹ اسکول میں آرٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفہ مل گیا اور وہ

۱۹۳۷ء میں فرانس چلے گئے۔ وہاں جاکر انھوں نے بڑی ترقی کی اور فرانس میں ہی ملازمت کرلی، وہیں شادی بھی کرلی اور بس بھی گئے۔ اب ۲۰، ۲۲ سال بعد وہ ہندستان آئے تھے اور سیدھے ممبئی سے اٹاوہ آئے، تاکہ سب سے پہلے وہ اس عظیم ہستی کے چرن چھو سکیں جس کی وجہ سے انھوں نے سب کچھ حاصل کیا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا انتقال ہو چکا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ انھوں نے ہیڈ ماسٹر کی تصویر کا جو دفتر میں آویزاں ہے ایک فوٹو اتارا اپنے پرانے ہاسٹل میں جاکر اپنے پرانے کمرہ سے کچھ مٹی جمع کی اور اپنے گاؤں چلے گئے۔

اس واقعہ سے مجھے اندازہ ہوا کہ مرحوم اپنے شاگردوں کے کس کس طرح کام آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کا ہر طالب علم انھیں اپنا محسن اور اپنا باپ سمجھتا تھا اور بیحد احترام کرتا تھا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم پر ان کی شخصیت اور ان کی تعلیم و تربیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ ایک تقریب میں جب موصوف کو ایک کتاب "نذر ذاکر" پیش کی گئی تھی، انھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "مجھ پر سب سے بڑا احسان میری والدہ کا ہے اور اس کے بعد میرے استاد سید الطاف حسین صاحب کا۔ اگر ان دونوں کی تعلیم و تربیت مجھے حاصل نہ ہوتی تو نہ جانے میں کیا ہوتا" اسی وجہ سے وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب بھی ان کا ذکر آتا تھا آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سید الطاف حسین صاحب نے ذاکر صاحب کے پاس جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اپنے ایک قدیم طالب علم کو سفارشی خط لے کر بھیجا۔ جب وہ خط لے کر ذاکر صاحب کے دفتر میں پہنچے تو ذاکر صاحب نے استاد کے احترام میں دفتر سے نکل کر ان کا استقبال کیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کی سیرت و شخصیت کا ہی اثر تھا کہ خود ذاکر صاحب کی شخصیت اتنی عظیم بنی۔ یہ ضرور ہے کہ استاد کا میدان عمل محدود تھا اور شاگرد کا بہت وسیع، اس لیے استاد کی تعلیم و تربیت کو زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آنے کا موقع ملا۔ شاگرد نے استاد کا نام روشن کیا اور اپنی انفرادی صلاحیت سے اپنے کردار کو منفرد بنایا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کا کام اور اثر اسکول تک ہی محدود نہ تھا۔ اس کا دائرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ملک کے ادیب و شاعر، سیاسی رہنما، مذہبی علما ہر قسم کے لوگوں سے ان کے مراسم تھے۔ سب ہی ان کا احترام کرتے تھے۔ اس دور کے مشہور شعرا، ادیب اور رہنمایان قوم اکثر ان کے مہمان رہا کرتے تھے۔ حضرت جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، سیماب اکبرآبادی اور یگانہ چنگیزی تو ان کے جگری دوستوں میں سے تھے۔ ان کی نشست کا کمرہ ہمیشہ شاہانہ دربار بنا رہتا تھا۔ آدھی رات تک شہر کے معززین، اساتذہ اور کبھی کبھی مخصوص طلبا وہاں جمع رہتے تھے ہیڈ ماسٹر صاحب جان محفل ہوتے تھے۔ مختلف موضوعات پر بحثیں ہوتی تھیں، لطیفے ہوتے تھے۔ شعر و شاعری ہوتی تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی معلومات اور علمی مباحثوں سے سب مستفید ہوتے تھے۔ ان کے باغ و بہار جلسوں کا لطف اٹھاتے اور ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، ان کی ظرافت اور ان کے ہیرا تراش فقرے آج بھی ضرب المثل ہیں۔

یوں تو ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کا علم، ان کا خلوص اور ان کا ایثار وہ اعلیٰ صفات تھیں جنھوں نے نہ صرف طلبا بلکہ عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا لیکن ان کی سب سے بڑی صفت ان کی شرافت نفسی تھی۔ بحیثیت مرشد و معلم کے بھی ان کی توجہ کا مرکز انسان کی شرافت رہی۔ مرحوم اپنے ارشاد و ہدایات اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ طلبا کے اندر ان قدروں کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے، جو انھیں انسانیت کے بلند منصب کے سزاوار بنائیں اور اس طرح تعلیم و ہدایت سے ان کی روح کو بھی سنوارنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اچھے طلبا بناؤ، اچھا سماج پیدا ہوگا، اچھی قوم بنے گی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے اسلامیہ کالج اٹاوہ کی ۴۰ برس تک بے لوث خدمت کی اور ۱۹۴۴ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں سے ۱۹۵۶ء میں اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔ وفات سے ایک سال قبل چند شعر کہے تھے، جن کے آخری مصرعے سے تاریخ وفات کا مادہ نکلتا ہے:

خادم جملہ خاص و عام الطاف — تھا کبھی مرجع انام الطاف

ملک الموت کے پیام تجھے — ملتے رہتے ہیں صبح و شام الطاف

نزع کے وقت دوستوں نے کہا — بستر مرگ پر سلام الطاف

۱۳۷۶ھ

زندگی بھر انھیں ایک دھن رہی، کالج کی خدمت اور وہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ وہ ان سچے معلموں میں تھے جو بقول ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم اس راز سے واقف ہوتے ہیں:

درس ادب اگر بود زمزمۂ محبتش

جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

●●

## (۲)

ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کی بیشتر خوبیاں سید الطاف حسین صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر اسلامیہ اسکول اٹاوا کی رہین منت ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم کی تعلیم و تربیت نے ہی ذاکر صاحب کی شخصیت میں وہ رنگ بھرے جو انھوں نے بعد میں اپنی صلاحیت سے اتنے تابناک بنا ڈالے کہ ان کی شخصیت منفرد ہو گئی۔ ذاکر صاحب ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک اسلامیہ اسکول اٹاوا (آج کل حافظ محمد صدیق اسلامیہ کالج) کے طالب علم رہے تھے ان دنوں اسلامیہ اسکول اٹاوا شمالی ہندوستان کا ایک ایسا منفرد اسکول تھا، جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ مخصوص تربیت دی جاتی تھی اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب کا نام اس سلسلہ میں بہت ہی مشہور تھا۔

کالج کے ریکارڈ میں ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں موجود ہیں۔ مثلاً داخلہ فارم کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۸ر نومبر ۱۸۹۷ء ہے جو بعد میں انسپکٹر آف اسکولس کے دستخطوں سے ان کی عمر میں ۹ ماہ کا اضافہ کر کے ان کی تاریخ پیدائش ۸ر فروری ۱۸۹۷ء کر دی گئی ہے اور یہی عمر ان کے ہائی اسکول کے سرٹیفکٹ میں درج ہے۔ ریکارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی برسوں میں وہ بہت اچھے طالب علم نہیں تھے۔ ان کی حاضریاں بھی کم رہتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ نہ صرف اچھے بلکہ اسکول کے سب سے ہونہار طالب علم بن گئے۔ ان کے زمانہ کے کچھ اساتذہ جو ابھی دس بیس سال پہلے تک حیات تھے، ذاکر صاحب کی ذہانت، مطالعہ سے دلچسپی، خطابت، مضمون نگاری اور شائستگی کی تعریف کرتے تھے۔ مولوی فیاض خاں صاحب مرحوم (علی گڑھ) جو اتفاق سے میرے بھی استاد رہے ہیں، ذاکر صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں بتایا کرتے تھے۔ مولوی صاحب ہوسٹل وارڈن بھی تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ذاکر صاحب ہوسٹل کے نظم و ضبط کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں قائم گنج (ضلع فرخ آباد) کے بہت سے طالب علم ہوسٹل میں مقیم تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر

وہاں کے پٹھان زمینداروں کے لڑکے تھے، ہر وقت لڑتے تھے اور شرارتیں کرتے تھے۔ لیکن ذاکر صاحب جو خود بھی قائم گنج کے پٹھان تھے، ہمیشہ اس ٹولی سے الگ رہے۔ اس لیے اکثر وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ "ذاکر! تم پٹھان نہیں، طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے سید ہو۔"

ذاکر صاحب نہ صرف ایک ذہین اور ہونہار طالب علم تھے بلکہ وہ اپنے اساتذہ اور طالب علموں دونوں میں ہر دلعزیز بھی تھے۔ ان کی ہر دلعزیزی کا ایک واقعہ ان کے ساتھی طلبا اور اس زمانہ کے اساتذہ سے سننے میں آتا رہا ہے: ایک مرتبہ ہوسٹل کے کچھ لڑکوں نے یہ مطالبہ کیا کہ "پلیٹ بند کرنے کی سزا" موقوف کی جائے اور اس بات پر اسٹرائک بھی کر دی۔ ان دنوں ہوسٹل کے قواعد میں یہ بھی تھا کہ سزا کے طور پر کسی طالب علم کے کھانے سے ایک پلیٹ کم کر دی جاتی تھی۔ گویا اسے دوسروں کے مقابلہ میں ایک پلیٹ سالن کم ملتا تھا۔ اس اسٹرائک کی پشت پناہی ذاکر صاحب ہی کر رہے تھے۔ حالانکہ ظاہرا وہ اسٹرائک میں شریک نہیں تھے۔ جب یہ اسٹرائک باوجود کوشش ختم نہ ہوئی تو ہیڈ ماسٹر صاحب سے شکایت کی گئی اور اسٹرائک کرنے والے لڑکوں کو اسکول سے نکل جانے کا حکم دیدیا گیا۔ جب ذاکر صاحب کو علم ہوا تو انھوں نے وارڈن کے پاس جا کر اصرار کیا کہ یہ حکم ناجائز ہے اسے واپس لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علم کی سزا میں پلیٹ بند کرنے کا طریقہ نہ صرف ظلم ہے، بلکہ غیر اخلاقی بھی ہے۔ جب یہ لوگ کھانے کا پورا پیسہ دیتے ہیں تو ان کی پلیٹ کیوں بند کی جائے۔ آخر کار ان کی سفارش اور زور دینے پر وارڈن اور ہیڈ ماسٹر صاحب کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور پلیٹ بند کرنے کا طریقہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دینا پڑا۔

ذاکر صاحب میں جذبۂ ایثار اور قومی ہمدردی اسی زمانے سے پیدا ہو چکی تھی۔ ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دنوں میں انھوں نے اسلامیہ اسکول کے ہوسٹل میں یہ تحریک چلائی تھی کہ طلبا گوشت کھانا بند کریں اور اس طرح جو روپیہ بچے وہ ترکوں کی مدد کو بھجوایا جائے۔ یہی نہیں وہ جمعہ کے روز نماز کے بعد مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر مظلوم ترکوں کے لیے اپنی ترکی ٹوپی میں چندہ جمع کرتے تھے۔ اکثر مسجدوں میں اس کے لیے تقریریں کرتے تھے۔ خطابت انھوں نے اسی طرح سیکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی تقریروں میں گھن گرج کے بجائے نرمی اور شیرینی پائی جاتی تھی۔

انسانی ہمدردی اور شرافت بھی ان میں اسکول کے زمانے سے ہی بہت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ ہوسٹل سے اٹاوہ اسٹیشن جو قریب ایک کلومیٹر ہے، صرف اخبار خریدنے جایا کرتے تھے جب وہ اخبار لے کر واپس آتے تھے، تو بہت سے طالب علم ان کے چاروں طرف اکٹھا ہو جایا کرتے تھے اور وہ سب کو

اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور اکثر خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان باتوں سے بھی وہ اپنے ساتھیوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ان کے ساتھی ان کو "مرشد" کے نام سے پکارتے تھے۔ ان تمام خوبیوں کی بنا پر وہ ہیڈ ماسٹر سید الطاف حسین صاحب مرحوم کی توجہ کا مرکز بنے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب ذہین اور ہونہار طالب علموں کو اپنی ذاتی توجہ کا مرکز بناتے تھے۔ ایسے طالب علم اپنا کافی وقت ہیڈ ماسٹر صاحب کے مکان پر گزارتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب مختلف مسائل پر اُن سے گفتگو کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی مخصوص توجہ کا اثر ذاکر صاحب پر بڑا گہرا پڑا۔ ان میں اس زمانے کے قومی اور بین الاقوامی مسائل کے متعلق کافی بصیرت پیدا ہوئی۔ اسی بصیرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں ان معاملات کو سمجھنے کے لیے صحیح جذبات اور احساسات پیدا ہوئے اور ان کے اندر نہ صرف قومی ہمدردی بلکہ انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا۔

جب مرحوم ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ تشریف لائے اور ہوسٹل میں اپنا کمرہ دیکھنے گئے تو میں نے اسلامیہ اسکول کے ایک پرانے خادم "بندے حسن" سے جو بفضل خدا اب بھی حیات ہیں اور کالج سے ریٹائر ہو گئے ہیں، انھیں متعارف کرایا۔ بندے حسن صاحب ذاکر صاحب کے طالبعلمی کے زمانے میں ہوسٹل میں بیرا تھے۔ ذاکر صاحب نے بندے حسن کو گلے لگایا اور کئی منٹ تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ انسان دوستی کا یہی جذبہ انھیں جامعہ ملیہ میں باوجود حالات ناساز گار ہونے کے کام پر اکساتا رہا۔ یقیناً ایک انسان دوست شخص ہی ان حالات میں جامعہ ملیہ جیسے عظیم ادارے کو چلا سکتا ہے جب وسائل کا فقدان ہو، اپنوں کی مخالفت اور حکومت کے عتاب کا سامنا ہو۔ ایسا وہی کر سکتا ہے جسے انسانوں پر اور خود اپنی ذات پر پورا بھروسہ ہو اور جسے انسانوں سے محبت ہو۔

انسان دوستی کے ساتھ بلند اخلاق اور اعلیٰ شرافت بھی ذاکر صاحب کی عظمت کی خصوصیات میں سے تھیں۔ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی جس طرح ملتے تھے اس کی مثال بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب بھی ان کے چھوٹے ان سے ملنے جاتے تھے تو وہ انھیں رخصت کرنے کے لیے کمرہ سے باہر تشریف لاتے تھے۔ انھیں حفظ مراتب کا بڑا خیال تھا۔ ۱۹۶۰ء میں جب وہ پٹنہ میں گورنر تھے، میں نے ایک خط اسلامیہ کالج کے بارے میں انھیں لکھا تھا۔ اس کے جواب میں موصوف نے مجھے "مکرمی و معظمی جناب پرنسپل صاحب" لکھ کر خطاب کیا تھا اور لکھا تھا "آپ حیران نہ ہوں میں یہ خط عزیزی امان اللہ خاں شیروانی کو نہیں لکھ رہا ہوں۔ بلکہ بہ حیثیت سابق طالب علم اپنے اسکول کے پرنسپل کو لکھ رہا ہوں۔"

اس عظیم شخصیت کا ایک اور وصف انسانی زندگی کی قدروں کی صحیح پرکھ میں نمایاں ہوتا تھا۔ یہ وصف بھی مرحوم نے اپنی مادر درس گاہ اسلامیہ اسکول سے ہی حاصل کیا تھا۔ اسکول کے بانی ڈاکٹر مولوی بشیر الدین صاحب مرحوم میں بھی مردم شناسی کا یہ جوہر نمایاں تھا۔ انھوں نے اسکول میں قابل مستعد اور پُرخلوص اساتذہ کی ایک ایسی جماعت یکجا کرلی تھی جنھوں نے خلوص اور لگن سے اس اسکول میں بچّوں کو ایسی تعلیم و تربیت دی تھی کہ وہ آیندہ زندگی میں اندھیروں کو دُور کرنے کے لیے شمعیں فروزاں کرتے ہیں۔ اس اسکول نے ذاکر صاحب کے ساتھ ڈاکٹر سیّد محمود، ڈاکٹر محمد حسین، یٰسین نوری، عظیم بیگ چغتائی، پروفیسر حبیب الرحمٰن، الشیخ نفیس الحسن، کے۔ آصف۔ (فلم ساز) اور بہت سی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا کی ہیں، جنھوں نے سیاست، درس و تدریس، ادب اور آرٹ میں اپنی عظمت کا سکہ جما دیا۔ ذاکر صاحب میں بھی مردم شناسی کا وصف نمایاں تھا۔ وہ ہمیشہ کاموں اور مقاصد کی قدر و قیمت کا بہت صحیح اندازہ لگا لیتے تھے۔ اسی پرکھ کی بدولت انھوں نے جامعہ ملیہ میں ایسے ایسے یادگار زمانہ نادر جواہر اکٹھا کر لیے تھے جن کو نہ صرف ان کے مقاصد سے دلچسپی تھی، بلکہ ذاکر صاحب کی ذات سے بھی عقیدت تھی۔ جامعہ ملیہ میں ایک مدت تک ایسے معلّم کام کرتے رہے جن کو باہر بہترین مواقع مل سکتے تھے اور نجی زندگی میں اور زیادہ عیش و آرام میسّر آسکتا تھا، لیکن بقول شخصے "ان کے دل میں اعلیٰ قدروں کی لگن تھی اور اسی عشق کا چراغ روشن تھا، جو ذاکر صاحب کے سینہ میں فروزاں تھا"

ذاکر صاحب کو اپنی مادر درس گاہ اسلامیہ اسکول سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۴ء میں اسلامیہ کالج اٹاوہ کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر بحیثیت مہمان خصوصی کی تھی۔ سپاس نامہ میں ان کی توجہ ان کی مادر درس گاہ کی طرف دلائی گئی تھی اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا:

"میں اس اسکول کو کیسے بھول سکتا ہوں! مجھے وہ دن یاد ہیں جب میں یہاں چھٹے کلاس کا طالب علم تھا۔ میری والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، والد پہلے ہی رحلت فرما چکے تھے، جب والدہ محترمہ کی وفات کی خبر مجھے دی گئی تو یہاں کے اساتذہ اور ہیڈ ماسٹر صاحب مرحوم نے گلے لگا کر کہا تھا کہ تمھاری ایک ماں نہیں رہیں لیکن یہ اسکول دوسری ماں موجود ہے۔ اور پھر مجھے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں یتیم و یسیر ہوں"۔ یہ فرماتے ہوئے ان کی آنکھیں اشک بار ہوگئی تھیں۔ ان کی یہ تقریر اتنی مؤثر تھی کہ مجمع میں بہت سے لوگوں اور طلبا کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے تھے۔

●●

## ڈاکٹر سید عبدالمجید شمس

[ڈاکٹر عبدالمجید شمس عظیم آبادی : پیدائش ۱۸۹۰ء تقریباً علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے، لندن سے پی۔ایچ۔ڈی۔ شعبۂ جغرافیہ، پٹنہ کالج پٹنہ کے صدر شعبہ اور کالج آف کامرس پٹنہ کے پرنسپل رہے، اپالچین یونیورسٹی اور کنٹکی یونیورسٹی (امریکا) کے وزیٹنگ پروفیسر کے فرائض انجام دیے "مثنوی حیات و کائنات" مثنوی جلوۂ صد رنگ" اور "یادِ وطن" آپ کے کلام کے مجموعے ہیں۔ فروری ۱۹۸۲ء میں وفات پائی۔]

ان کے اصولوں کے سلسلے میں ایک بات جس نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا، اس کا تذکرہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک موقع پر میں نے کالج کے ایک ٹیچر کی کچھ ناروا باتوں کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اس سے مجھے کالج کے کاموں میں رکاوٹ ہونے کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ ایسے معاملات میں ان کا یہ اصول رہا ہے کہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ کسی نے کوئی غلط کام کیا ہے، اس کو اچھا آدمی سمجھنا چاہیے اور اس سے کام میں مدد لینے کو جاری رکھنا چاہیے؛ ایسا نہیں کرنے سے اس کی دشمنی جو ممکن ہے غلط فہمیوں پر مبنی ہو شاید زیادہ بڑھ جائے اور ادارے کی ترقی میں زیادہ دشواریاں پیدا ہو جائیں۔ میں اس کے بعد سے اسی اصول پر چلتا رہا اور اسے بہت مفید پایا۔

میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو ایک بڑا انسان، ایک عظیم علم پرور اور سچا قوم پرست مسلمان سمجھتا ہوں اور ان کے اخلاق اور خلوص سے، ان سے جب ملا، بہت متاثر ہوں۔ میں نے ایسی عظیم شخصیتیں اپنی زندگی میں کم ہی دیکھی ہیں۔ ●●

## سید بہار الدین احمد

[سید بہار الدین احمد : پیدائش ۱۹۱۱ء بمقام نیا نواں (گیا)، ۱۹۳۸ء میں حکومت بہار کے تحت منصف پھر ۱۹۷۰ء میں ڈسٹرکٹ و سیشن جج کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۶۶ء میں بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ ۱۹۷۱ء میں ریٹائر ہو گئے۔ تصانیف میں "گلستان ہزار رنگ" (جس پر ابو الکلام آزاد کا مقدمہ ہے)، گلستانِ حجاز، گلزارِ معارف اور گلستانِ تغزل (زیر طبع) قابل ذکر ہیں۔ موجِ نسیم اور صاعقہ کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔]

**ذاکر صاحب سے ملاقات :** اس ملاقات کے بعد تھوڑے عرصہ پر ذاکر صاحب کے دو خطوط میرے خطوں کے جواب میں آئے۔ دونوں ان کے اپنے قلم کے لکھے ہوئے تھے۔ پتہ بھی دونوں پر اپنے ہی ہاتھ سے تحریر فرمایا تھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک لفافے پر ۱۵ عدد ایک ایک پیسے کے ٹکٹ لگے ہیں۔ اس زمانے میں لفافے پر ۱۵ پیسے کے ٹکٹ لگتے تھے۔ ●●

# سعید انصاری

● **جناب سعید انصاری** : پیدائش، جولائی ۱۹۰۴ء۔ مقام پیدائش، اعظم گڈھ (اُتر پردیش)۔ ابتدائی تعلیم، مدرسۃ الاسلامیہ اعظم گڈھ۔ انگریزی تعلیم، ولسبلی ہائی اسکول اعظم گڈھ۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک ترک موالات و عدم تعاون میں شرکت۔ یونیورسٹی کی تعلیم ابتداءً کاشی ودیاپیٹھ بنارس۔ بعد میں ۱۹۲۱ء سے جامعہ ملّیہ اسلامیہ علی گڈھ۔ ذاکر صاحب سے ملاقات و رفاقت بحیثیت طالبعلم یہیں سے۔ ۱۹۲۶ء سے بحیثیت رفیق اُردو اکیڈیمی و استاد جامعہ ملّیہ اسلامیہ۔

مزید اعلیٰ تعلیم :۔ دوران قیام جامعہ ملّیہ اسلامیہ ایک سال کے لئے (۳۱-۱۹۳۰ء) وشوابھارتی شانتی نکیتن میں بحیثیت ریسرچ اسکالر۔ ۱۹۳۴ء میں ذاکر صاحب کی ہدایت پر تعلیمات کی تعلیم کے لئے کولمبیا یونیورسٹی نیویارک۔ ۱۹۳۸ء میں امریکا سے واپسی پر، بنیادی تعلیم کے استادوں کی تربیت کے لئے ایک ادارے کا قیام۔ موجودہ ٹیچرز کالج انہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

تالیف و تصنیف :۔ ۲۵ء میں اُردو کے عناصر اربعہ کے عنوان سے ایک انعامی مقابلہ میں شرکت۔ آپ کا مقالہ (۱) "مولانا شبلی بحیثیت انشا اردو" اوّل انعام کا مستحق قرار پایا۔ اگلے دو سال میں جامعہ کی اُردو اکیڈیمی میں بحیثیت رفیق جان اسٹوارٹ مِل کی کتاب "لبرٹی" کا اُردو ترجمہ "آزادی" کے نام سے۔ پہلا اڈیشن مکتبہ جامعہ سے ۱۹۲۸ء میں۔ دوسرا اڈیشن ترقی اردو بورڈ کی طرف سے ۵۸ء میں۔

تعلیم پر کتابیں : (۳) "ہندوستان کے تعلیمی مسائل"۔ ۴۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے۔ (۴) "تعلیم اور سماج" ۴۸ء میں اسی پبلشنگ ہاؤس سے (۵) "زندگی کا رخ" مکتبہ جامعہ سے (۶) "اکابر تعلیم" مکتبہ جامعہ سے (۷) "تعلیم ہندوستان کے اسلامی عہد میں" ترقی اردو بورڈ سے (۸) "عصری تعلیم" ترقی اردو بورڈ سے۔ (زیر اشاعت)۔

●●

یادیں کس کی آتی ہیں؟ ایک محبوب کی، ایک عزیز کی، اور پھر وہ یادیں جو ایسی لذیذ اور دل آویز
کہ ان کی مٹھاس اور شیرینی سے کام و دہن اب بھی محظوظ ہو رہے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم انہی چند محبوب اور ہر دلعزیز شخصیتوں میں سے تھے کہ جن کی ہر ایک بات
ہر عمر اور ہر حیثیت کے شخص کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔

اسی کے ساتھ ان کی وہ باتیں ان کے حسنِ ذوق، ذہانت طبع اور اعلیٰ کردار کا پتہ بھی دیتی ہیں۔

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم کی غرض سے
آیا۔ وہ مجھے سب سے پہلے علی گڈھ کی ایک مشہور عمارت "بنگالی کوٹھی" میں ملے۔ جو اس زمانہ میں جامعہ کا ایک دارالاقامہ تھا۔
پہلی رات کے بعد صبح ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے کمرے میں ایک گھنی، سیاہ ڈاڑھی والے ایک
بزرگ مع پانچ ساتھیوں کے مقیم ہیں۔ ساتھ ہی بازو کے کمرے میں تین ندویوں کے ساتھ مجھے بھی جگہ ملی تھی۔ جب
صبح میرا ان سے تعارف ہوا کہ یہ اعظم گڈھ سے تشریف لائے ہیں، تو پھر انھیں اعظم گڈھ کے دوست، احباب،
دارالمصنّفین کے رفقا اور مصنفین اور وہاں کی ہر چیز جو انھوں نے کبھی دیکھی یا سُنی تھی، ایک ایک کر کے یاد
آنے لگی اور پھر انھوں نے ہر ایک کی خیر و عافیت، حال چال اور ان سب چیزوں کے بارے میں پوچھنا شروع کیا کہ
آیا وہ اب بھی ملتی ہیں یا نہیں؟

سب سے پہلے انھوں نے سہیلؔ صاحب کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا کہ "وہ اب بھی پان منھ میں دبائے کچہری
جاتے ہوں گے۔" میں نے کہا، جی ہاں، اب بھی ان کا وہی حال ہے اور پھر وہ ان کی ذہانت، علمی قابلیت اور علی گڈھ
کے زمانہ میں ان کی شعر و شاعری کے قصّے سُنانے لگے۔

ان کی جزئیات سے دلچسپی کا حال یہ ہے کہ سہیلؔ صاحب کے سلسلے میں کہنے لگے کہ بھئی، ان کے ہاں ارہر
کی دال خوب پکتی ہے۔ کھانے تو انھوں نے ایک سے ایک لذیذ ان کے ہاں کھائے ہوں گے اس لئے کہ سہیلؔ صاحب

کا دسترخوان اور پھر ان کی بیگم صاحبہ کی خوش سلیقگی اور پکوان بہت کم گھروں کو یہ نعمت نصیب ہوتی ہے لیکن ان سب کھانوں میں ان کا اَرہر کی دال کا انتخاب اور وہ بھی ان کے حافظہ میں محفوظ رہنا یہ ان کے حسن ذوق، لطافتِ طبع اور اس صفائے ذہن پر موقوف ہے، جس کو ہر چیز میں حسن و جمال نظر آتا ہے۔

دارالمصنفین کا ذکر آیا، تو مولانا سید سلیمان ندوی، لیکن اس سے زیادہ مولانا مسعود علی ندوی جن سے وہ زیادہ بے تکلف تھے اور دوسرے رفقا کا حال دریافت کرنے لگے، اور یہ کہ ان میں سے ہر ایک کیا کام کرتا ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو صاحب ادارہ کا حال پوچھ کر ختم کر دیتا، لیکن ان کی تلاش قدر بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہیں جانتی تھی۔ بلکہ وہ ہر ایک میں اپنی اپنی حیثیت کی قدر و قیمت دیکھتی، اور سب کو یکساں برابر تسلیم کرتی۔

اعظم گڈھ کا ذکر آیا تو کہنے لگے کہ آپ کے یہاں ریشمی کپڑے بھی تو بنتے ہیں، اور طرح طرح کے، اور ان کے نام بھی عجیب عجیب قسم کے؛ لیکن ہر ایک کی اپنی اپنی خوبی الگ اور اسی اعتبار سے ان کے نام بھی ہیں۔ شلاً ایک کپڑا ہوتا ہے جسے 'غلط' کہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ اتنا چکنا ہوتا ہے کہ اس کو چھونے پر چٹکی پھسل جاتی ہے۔ پھر اسی طرح سنگی اور بوٹ کے تھان کا ذکر کرنے لگے۔ اس قدر تفصیل و تحقیق کے ساتھ علم تو شاید ان کپڑا بنانے والوں کو بھی نہ ہو۔

لیکن ایک کپڑے کے شوق اور اس کی تحقیق کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاتا، جو ان کے نہ صرف شوقِ جمال کی کی دلیل ہے، بلکہ ان کی حقیقت شناس طبیعت کی بھی مظہر ہے۔ کہنے لگے کہ 'اور وہ ایک 'مُشرو' بھی تو ہوتا ہے' میرا ذہن اس سے فوراً 'مشروُوالا' کی طرف دوڑا، جو گاندھی جی کے حلقہ میں ان کے بڑے معتقد اور اچھے لکھنے والے گذرے ہیں اور ان کے بعض رسائل اور پرچوں کے ایڈیٹر بھی تھے۔

بات 'مشرو' کی نکلی تھی، وہ فرمانے لگے کہ یہ لفظ 'مشرو' نہیں بلکہ 'مشروع' عین کے ساتھ ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ کپڑا جو شرعاً جائز ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ مردوں کے لیے ریشم پہننا شرعاً جائز نہیں لیکن اس کے بنانے والوں نے اس میں تانے کا تار سوت کا رکھا ہے جس سے اس کا پہننا جائز ہو گیا اور اس لئے اس کا نام 'مشروع' رکھا گیا۔

ان کا یہ شوق اور قدر دانی دیکھ کر جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر گیا تو ایک ایک تھان ہر ایک کا اپنے ساتھ لے آیا جو اس وقت اتنا گراں بھی نہ تھا، اور وہ اس سے بہت خوش ہوئے۔

ایک بار فرمانے لگے کہ آپ کے شہر سے قریب ایک اور شہر پڑتا ہے: مرزاپور۔ آپ جانتے ہیں کہ وہاں کی کیا چیز مشہور ہے؟ میں نے بہت سوچا، حافظ پر زور دیا لیکن کوئی چیز یاد نہ آئی۔ پھر خود ہی بولے' وہاں کی لاٹھیاں اور ڈنڈے مشہور ہیں۔ وہاں کے بانس خاص قسم کے ہوتے ہیں، بہت لمبے اور سبک' اور ان میں مناسب فاصلوں پر گرہیں ہوتی ہیں۔ لوگ انہی گرہوں پہ اگر بانس میں کچھ ٹیڑھا پن ہو تو' چراغ کی لَو سے گرم کر کے اسے سیدھا کر لیتے ہیں۔ جب وہ سیدھے ہو جاتے ہیں تو ان میں سے مناسب لمبائی کی لاٹھیاں اور ڈنڈے کاٹ لئے جاتے ہیں اور پھر وہ استعمال ہوتے ہیں۔

بہرحال میرے لئے مرزاپور جانا، ان بانسوں کا لے آنا اور ساتھ میں لے کر اتنی لمبی مسافت طے کرنا بہت دشوار تھا۔ ایک خاں صاحب جو اپنے بچّے کو جامعہ میں داخل کرنے کے لئے بہت بے چین تھے، میں نے ان سے ذاکر صاحب کے اس شوق کا ذکر کیا۔ ایک دن جولائی میں کیا دیکھتا ہوں کہ خاں صاحب بن ٹھن کر چھیلے اور سدھے بانسوں کا ایک بوجھ لے کر چلے آ رہے ہیں۔ میں نے انھیں اسی حالت میں ذاکر صاحب کے پاس بھیجا۔ وہ یہ نایاب تحفہ پاکر بیحد خوش ہوئے۔ پھر نہ جانے کس کس طرح سے ان سے لاٹھیاں اور ڈنڈے نکالے ہوں گے۔

اسی قسم کی ایک دو اور باتیں یاد آتی ہیں' جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذوقِ جمال اور تلاشِ حسن کسی ذاتی تشفی اور شخصی منفعت کے خیال سے نہ تھا، بلکہ یہ ان کے ذہن رسا کا ایک قدرتی فعل تھا' اور اس سے وہ نہ صرف ان چیزوں کو اپنے اردگرد دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ وہ ان کے ذریعہ اپنے گرد و پیش کے ماحول پر چھا جانا چاہتے تھے۔ بوگین ویلیا کا لفظ میں نے پہلی بار ان ہی کی زبان سے سُنا۔ ایکبار وہ چند پودے اس پھول کے لائے اور بولے کہ اسے مدرسے کے احاطہ میں چہار دیواری کے سہارے لگا دیجئے۔ میں نے کہا کہ انھیں لگائیں تو بکریاں کب چھوڑیں گی جو ہم ان کے پھولوں کی بہاریں دیکھ سکیں گے، انھوں نے پھر بہ اصرار فرمایا کہ آپ لگائیے تو، قدرت نے اس کا انتظام بھی کیا ہے؛ چنانچہ میں نے ان کے حکم کے مطابق لگوا دیئے اور کچھ ہی دنوں بعد جب وہ پودے بڑے ہوئے اور ان میں سرخ سرخ رنگ کے پھول آنے لگے تو میں نے کیا دیکھا کہ ان پھولوں کے ساتھ ٹہنیوں میں نہایت تیز نکیلے کانٹے بھی ہیں' کسی نے ٹھیک کہا ہے: 'ہر جا کہ گل است خار است'۔ ان بکریوں اور گایوں کی ان کے کھانے کی کیا ہمت پڑ سکتی تھی۔ پھر تو ساری جامعہ نگر کی بستی جہاں گرمی کے دنوں میں کوئی پیڑ پودے نظر نہ آتے تھے' ان پھولوں کی بدولت لالہ زار بن گئی۔

جناب صدر' یعنی اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی اگر اجازت دیں تو میں یہ عرض کرنے کی جرأت کروں

کہ ایک زمانہ میں اس "راج بھون" میں جہاں اس سے پہلے بھی رہ چکا ہوں جبکہ ذاکر صاحب یہاں کے گورنر تھے، اس وقت خواہ آپ یقین کریں یا نہ کریں، اس تمام حصہ میں خاک اڑتی تھی۔ لیکن آج کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تو اسی بیگم ولیکا کی بدولت اور پھر اس پر آپ کا بھی ذوق جمال، اس لئے کہ آپ نے بھی انھیں کے سایہ میں پرورش پائی ہے، دونوں نے مل کر اب اسے ایک چمن زار اور "گلستاں" بنا دیا ہے۔

ذاکر صاحب کی رفاقت کا فخر جامعہ ملیہ کی خدمت کے سلسلہ میں کم و بیش کوئی پچاس سال رہا۔ لیکن اس مدت میں انھوں نے کبھی مجھے کیا کسی اور کو بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ جامعہ کے "شیخ الجامعہ" ہیں اور دوسرے لوگ ان کے ماتحت کارکن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جامعہ کی خدمت میں سب آپس میں برابر تھے اور جامعہ کی ترقی میں سب کا یکساں حصہ تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنے عہدے کے اظہار میں کہا کرتے تھے کہ First among the equals ہوں اور اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں۔

ان کا ایک اور "فلسفۂ زندگی" بھی تھا۔ وہ اکثر فرماتے کہ ہر شخص کو اپنی ترقی جماعت کی ترقی میں تلاش کرنی چاہیئے۔ وہ جماعت ہی کی خدمت میں اپنی ذاتی ترقی کی نشو و نما پا سکتا ہے۔ فرد اور جماعت کا یہی تعلق تھا جس کی بنا پر یہاں مدرسہ کا افسر اعلیٰ "نگراں" کہا جاتا تھا۔ وہ ہیڈ ماسٹر، صدر مدرس یا پرنسپل کے لفظ سے نہیں یاد کیا جاتا تھا۔

جامعہ میں مساوات قائم رکھنے کا ایک دوسرا اصول انھوں نے یہ رائج کر رکھا تھا کہ ایک مدت کے بعد یہ عہدیدار اپنے عہدے سے بدل کر کسی دوسرے منصب یا عہدے پر چلا جاتا تھا جس کا وہ اہل ہوتا۔ اس طرح جامعہ میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت اور استعداد کے آزمانے اور اسے بروئے کار لانے کا موقع ملتا تھا اور کوئی کسی عہدے یا مرتبے کو اپنا پیدائشی حق نہ سمجھتا۔

ذاکر صاحب نہ صرف اصولاً اپنے رفقا میں سب کو یکساں اور اپنا ہم مرتبہ سمجھتے تھے، بلکہ عملاً روزمرہ کی زندگی میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔ ایک بار ایک چھوٹا سا واقعہ لیکن نہایت ناگوار صورت میں پیش آیا وہاں ذاکر صاحب نے اپنے اس اصول اور طریقہ میں ذرّہ برابر بھی فرق آنے نہ دیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری جو نہ صرف ایک بہت بڑے معالج اور ڈاکٹر تھے، بلکہ ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ کے چانسلر یا امیر جامعہ بھی تھے، ایکبار وہ ایک بچّہ کو جامعہ کے بورڈنگ میں دیکھنے کے لئے آئے، جو اتفاق سے ان کا عزیز بھی ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو دیکھا کہ بچّہ کی چارپائی کمرے میں اس طرح بچھی تھی کہ ایک دروازے سے دوسرے

دروازے میں ہوا کا رخ پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب یہ دیکھتے ہی اندر اندر بہت برہم ہوئے اور مریض کی تو کچھ ایسی فکر نہ کی، اس لئے کہ اس کا علاج ٹھیک ہو رہا تھا لیکن ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا اور اس میں شاید بورڈنگ کے اتالیقوں کی غفلت اور لاپروائی کی سخت شکایت کی جو ان کے استاد اور تیماردار بھی ہوتے تھے۔ ذاکر صاحب کا خط پانا تھا کہ وہ آگ بگولہ ہو گئے اور بولے کہ میرے ساتھیوں پر غفلت اور بے توجہی کا الزام! فوراً پیڈ منگایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے نام ایسا سخت خط لکھا کہ ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا بند رہا۔ میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن یہ ضرور دیکھا کہ مدت تک امیر جامعہ اور شیخ الجامعہ میں کھنچاؤ رہا اور وہ بھی آپس کی کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اپنے ایک اتالیق اور استاد پر غفلت اور بے توجہی کا الزام وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

ایک سال جامعہ کے کچھ پرانے ساتھیوں نے ایک ساتھ حج کے لئے جانے کا ارادہ کیا۔ یہ تعداد میاں بیوی کو ملا کر کوئی چھ کے قریب ہو جاتی تھی۔ ظاہر ہے، اتنے امیدواروں کا ایک ساتھ قرعہ میں نام آنا مشکل کیا ناممکن تھا۔ ہم سب نے مل کر آپ سے ذکر کیا۔ آپ اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ اپنے اختیارِ خاص سے آپ نے ہم چھوں کے نام اجازت نامے دلوا دیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں تک ختم نہ تھا۔ اس زمانہ میں حکومت سعودیہ کی طرف سے ڈاکٹری معائنہ کے لئے بڑی سختی تھی۔ آپ نے اپنے پی۔ اے سے کہا کہ بھئی ان چھوں آدمیوں کا ڈاکٹر صاحب سے کہہ کر معائنہ کرا دو، ورنہ یہ لوگ حج کو نہ جا سکیں گے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ہمارے معائنہ کی رپورٹ آگئی اور ہم لوگ حج کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے۔

لیکن روانگی حج سے پہلے خیال آیا کہ ایک دن چل کر شکریہ تو ادا کر دیا جائے۔ پی۔ اے سے وقت مقرر کر کے ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، فرمانے لگے کہیئے سب انتظامات ہو گئے۔ پھر بولے کہ اس ارضِ پاک میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں، جہاں اللہ تعالیٰ بندے کی ہر دُعا قبول کر لیتا ہے۔ آپ کے لئے ہم دعا میں کیا مانگیں گے؟ بولے کچھ نہیں، اس نے سب کچھ دے رکھا ہے، بس اگر دعا کیجئے گا تو یہ کہ "انجام بخیر" ہو۔ ہم میں سے ایک صاحب جو بظاہر دینی مزاج اور مذہبی صورت رکھتے تھے، ان سے خصوصیت کے ساتھ بولے کہ آپ کا تو اللہ میاں سے ناتا ہے، آپ خصوصیت سے میرے لئے یہ دعا کیجئے گا۔ یوں تو رسماً ہر ایک "انجام بخیر" کی دعا کرتا ہے، لیکن جب ذاکر صاحب کی پوری زندگی پر نظر جاتی ہے، تو خیال ہوتا ہے کہ "یہ بندۂ مومن" ان کا ایک مقبول اور نیک بندہ تھا اور اس نے کس کی اور کیا خدمت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دنیوی جاہ و حشمت کے ساتھ اپنے تقرب اور

عطائے الٰہی سے بھی نوازا اور اس سے زیادہ 'انجام بخیر' اور کیا ہوسکتا تھا !

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ یاد آتا ہے، جو ہے تو ذاتی اور معمولی حیثیت سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس سے ان کے کردار، ان کی انسان دوستی اور ان کی ذرّہ نوازی کا اندازہ ہوتا ہے :

حج میں جب تمام مناسک اور ارکان سے فراغت پائی تو ایک دن یہ خیال آیا کہ یہاں سے لوگ تبرکاً خاکِ شفا یا حرم پاک سے کنکریاں چن کر لے جاتے ہیں۔ میں اگر یہاں سے سنگ مرمر کا ایک ٹکڑا اٹھاکر اپنے ساتھ رکھ لوں اور اس پر مدینہ منورہ کے کسی اچھے کاتب سے اپنے مکان کا نام اور سنِ تعمیر لکھواکر لے جاؤں اور اسے اپنے زیرِ تعمیر مکان کے دروازے پر لگوا دوں، تو کیسا رہے گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جو ۱۲″ × ۸″ سے زیادہ کا نہیں ہوگا، لیا جو باہر حرم کی تعمیر میں آدھے روڑے کی شکل میں ٹوٹے پڑے رہتے ہیں، اور جب ہندوستان پہنچا تو اس پر وہی مدینہ منورہ کے کاتب کا لکھا ہوا نام اور سن تعمیر لکھواکر رکھ لیا اور ذاکر صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ میرا وہ مکان جس کا سنگ بنیاد آپ نے رکھا تھا، اب بن کر تیار ہوگیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی رسم اختتام بھی آپ ہی کے ہاتھوں انجام پائے۔ وہ بولے کہ اس رسم کی کیا شکل ہوگی۔ میں نے پھر انھیں وہ تمام تفصیل بتائی، فرمایا کہ اچھا، کسی دن آجاؤں گا۔

اتفاق سے وہ اپنی اور مصروفیتوں میں اسے بھول گئے۔ میں نے چند دن بعد انھیں پھر ٹیلیفون کیا اور ان کے پی اے سے کہا کہ بھئی صاحب نے چند دنوں بعد جواب دینے کے لئے فرمایا تھا لیکن اب تک کوئی پیغام نہیں ملا۔ ذاکر صاحب اپنی مصروفیتوں سے فارغ ہوئے تو انھوں نے یاد دلایا۔ بولے، ہاں بھئی یہ بات حافظہ سے نکل گئی تھی۔ اچھا ایک رقعہ لکھ رہا ہوں۔ یہ سعید انصاری صاحب کو آج ہی بھجوا دیجئے۔ رقعہ میں تاخیر کی معذرت کے بعد یہ لکھا تھا کہ پرسوں حاضر ہو رہا ہوں اور اس سلسلہ میں جو ارشاد ہوگا، بجالاؤں گا۔ اس جواب پر میں پانی پانی ہوگیا۔ اور اس عجلت میں دعوت نامہ وغیرہ چھپوانا تو درکنار، جامعہ نگر میں جو مل گیا اس سے زبانی تذکرہ کردیا۔ شام کے قریب تاریخ مقررہ پر کیا دیکھتا ہوں کہ صدر جمہوریہ کی ایک بڑی گاڑی آئی۔ بغیر کسی آداب وقیود کے، اور اترتے ہی پہلے مکان دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر اس کے بعد رسمِ اختتام کی وہ نوعیت میں نے بتائی۔ سنگ مرمر کے اس ٹکڑے کو دیکھ کر پہلے تو اسے بوسہ دیا اور پھر مدینہ منورہ کے اس خطاط کا خط دیکھ کر بہت تعریف کرنے لگے۔ بعد میں سارے مکان کا ایک چکر لگاکر اسے اپنی جگہ پر نصب کردیا اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر تھوڑے سے اکل و شرب کے بعد لوگوں سے باتیں کرنے لگے کہ اتنے میں ان کے اے۔ ڈی سی نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اب تو آپ کا کام ہوگیا؟ اتنے میں انھوں نے بات کرتے دیکھ لیا۔ بولے، ابھی تو میں اور بیٹھوں گا۔ ایک دن تو ذرا سکون اور اطمینان کا ملا۔ اور ان سرکاری پابندیوں سے وہ بھی نصیب نہیں !

●●

# حکیم عبدالاحد

• حکیم عبدالاحد صاحب، پیدائش ۱۹ فروری ۱۹۱۲ء
بمقام گھگول (پٹنہ)، ۱۹۳۳ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ
پٹنہ سے عالم، ۱۹۳۷ء میں طبیہ کالج دہلی سے فاضل طب
وجراحت کے سند یافتہ۔ گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے پرنسپل،
حکومت بہار کے شعبۂ صحت عامہ کی طبی شاخ کے سابق
ڈپٹی ڈائرکٹر۔ طب و صحت عامہ سے متعلق ہندوستان کی
متعدد کمیٹیوں اور انجمنوں کے ممبر یا صدر رہ چکے ہیں یا
ہیں۔ ان دنوں ملازمت سے ریٹائر ہو کر پرائیوٹ
پریکٹس کر رہے ہیں

●●

۱۹۳۳ء تک میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں زیر تعلیم رہا۔ اس کے بعد طب یونانی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے دلی قرول باغ پہنچا تو مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب شیخ الجامعہ کا اثر میرے دماغ پر تھا۔ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا ماہانہ آرگن رسالہ جامعہ پابندی سے پٹنہ میں پڑھا کرتا تھا، اس لیے جامعہ ملیہ کے ساتھ شیخ الجامعہ کا تصور مجھے یاد تھا۔ نہ معلوم کیوں دلی پہنچنے کے بعد ان سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا، آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج اور جامعہ ملیہ یہ دونوں ادارے ایک ہی محلہ قرول باغ میں واقع تھے۔ کوئی پانچ منٹ کا راستہ تھا، میں اکثر جامعہ کی لائبریری میں کتابیں، رسائل اور اخبارات پڑھنے جاتا، وہاں شیخ الجامعہ کا بورڈ ایک کمرہ پر آویزاں دیکھتا، تو شوق ملاقات میں نئی لہر پیدا ہوتی۔ کئی دنوں کے بعد ایک روز صبح تقریباً ۹ بجے جامعہ پہنچا تو دیکھا دروازہ پر پردہ لٹک رہا ہے اور چپراسی ٹوپی، شیروانی میں ملبوس باہر موجود ہے مجھے پتہ چلا کہ وہ تنہا ہیں۔ میں نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یہ لکھ کر بھیج دیا "طبی کالج کا ایک طالب صرف چند منٹ کے لیے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ عبدالاحد بہاری" چند منٹ بعد ہی چپراسی نے پردہ اٹھایا اور میں کمرہ میں داخل ہوا۔ فرش پر سفید کھدر کی ٹوپی، شیروانی، علیگڑھ کٹ پاجامہ پہنے خوبصورت گورا چٹا جوان، بھر کر سیاہ داڑھی کے ساتھ چاندنی پر بیٹھا ہے، سامنے ڈیسک پڑی ہے، جس پر لکھنے کا سامان ہے۔ سلام عرض کیا، مصافحہ کیا اور سامنے قریب بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے مزاج پرسی کی، تعارف کے سوالات کیے، میں جواب دیتا گیا۔ طب پڑھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ یہ ان کا ایک اہم سوال تھا، کیسے آئے؟ یہ دوسرا اہم سوال تھا۔ کوئی کام ہے؟ میں نے جوابات دیے۔ پھر انہوں نے شوق اور محنت سے پڑھنے کی تلقین کی ــــــ میں اٹھ کھڑا ہوا، اجازت چاہی، فرمایا پھر آیئے گا۔ محبت کا ایک گہرا نقش لے کر میں وہاں سے واپس اپنے کالج آیا۔ اُن کی باتیں بار بار یاد آتی رہیں اور میں سوچتا رہا۔ ۱۹۳۸ء تک ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا سلسلہ برابر دلی میں جاری رہا۔ ایک دن شام کے وقت میں چھوٹے بچوں کے جامعہ ہوسٹل چلا گیا۔ انچارج لیڈی مس فلپس بورن وہاں موجود تھیں۔ میں ہندوستان میں جرمنی سے ان کی آمد کا قصہ اور محبت کے ساتھ بچوں کی خدمت اور ان کی دیکھ بھال کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ مجھے انہیں آیا تھا

کے پیار سے لفظ سے پکار رہے تھے، وہ بچوں کی خدمت ہنسی خوشی کرنے میں مصروف تھیں، ماں سے زیادہ شفقت بچوں کے ساتھ برت رہی تھیں ــــ ایک روز میں وہاں موجود تھا کہ ذاکر صاحب ٹہلتے ہوئے شام کے وقت وہاں بچوں کے ہوسٹل تشریف لائے، بچے ان سے لپٹ گئے۔ آپا بھی بچوں کے ساتھ تھیں، مجھ سے صاحب سلامت ہوئی۔ بچوں کی دیکھ بھال پر نظر کی، ان کے حالات معلوم کیے۔ ایک بچہ بیمار تھا، اسے دیکھا، مزاج پرسی کی، دوا، علاج کے متعلق دریافت کیا اور واپس چلے گئے۔

● ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ میں اس وقت گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کا پرنسپل تھا، ڈاکٹر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جامعہ کے بعد مسلم یونیورسٹی ان کی تعلیمی دلچسپی کا مرکز تھا۔ یونیورسٹی کے متعلقہ کالجوں کی اصلاح اور ترقی کے منصوبے تیار کرنے میں وہ مصروف تھے۔ یونیورسٹی کے شعبوں سے متعلق ملک کے ماہرین کو اکٹھا کر کے مشورے اور اسکیم حاصل کر رہے تھے۔ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اصلاح اور ترقی کا مسئلہ جب سامنے آیا تو سب سے پہلے نصاب تعلیم پر غور کرنے کے لیے انھوں نے ایک پانچ رکنی کمیٹی ترتیب دی جس کے صدر خود رہے، ماہرین فن کی صف میں نہ معلوم کیوں انھوں نے مجھ کو بھی لا کھڑا کیا اور ممبر نامزد کیا۔ اس کی میٹنگ مسلسل تین دنوں علیگڑھ یونیورسٹی میں جاری رہی۔ پہلے دن کی بیٹھک میں انھوں نے کمیٹی بنانے کا مقصد اور ممبروں کو زحمت دینے کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ فن کی تعلیم و ترقی، طلبہ کی زندگی، مریضوں سے ان کا تعلق اور معاشیات کے مسائل وغیرہ سبھی کو وہ زیر بحث لائے ــــ روزانہ ۶، ۷ گھنٹے غور و فکر کے بعد نوٹ تیار کیا جاتا، ڈاکٹر صاحب اکثر اوقات میٹنگ میں شریک رہتے۔ کبھی کبھار یونیورسٹی کے کسی ضروری کام سے معذرت کے ساتھ تشریف لے جاتے اور پھر وقت پر لوٹ آتے، ممبران کام جاری رکھتے اور واپسی پر وہ کاموں کا محاسبہ کرتے ــــ ان تین دنوں میں نصاب کا کام تو ہوا ہی، دعوتیں بھی ہوئیں اور آزادانہ گفتگو کا موقع بھی خوب نصیب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے طب یونانی سے بہت دلچسپی لی اور انھوں نے شعبہ جراحت کی جدید ترقیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ آج بھی طب یونانی کی دھاک اپنی جگہ موجود ہے، البتہ مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ شعبۂ معالجات میں طب یونانی کے اثرات کو لوگوں کے لیے بہت مفید بتایا۔ اس سلسلہ میں گھریلو علاج و معالجہ کے واقعات بھی بہت شوق سے سنائے، جس میں بڑی بوڑھیوں کا ذکر بھی آیا جو عام طور پر گاؤں میں اپنے اپنے گھروں میں یونانی دواؤں کی پٹاری رکھتی تھیں اور گھریلو تجربے کی بنا پر روزانہ بیسیوں بچوں کا گھر پر ہی علاج کرتی تھیں۔ اس طرح بچوں کی مائیں علاج کے سلسلہ میں بہت سی پریشانیوں سے گھر بیٹھے نجات حاصل کر لیتی تھیں۔

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہوتا، وہاں کھانے پر بھی نصاب ہی زیر بحث ہوتا۔ علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب بھی اہم ممبر تھے، میں علامہ کے ساتھ شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی کے دولت خانہ پر مقیم تھا، صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا ہم لوگ وہیں کھاتے۔ ایک دن ڈاکٹر ذاکر صاحب ملنے ہم لوگوں کی قیامگاہ پر تشریف لے آئے، کچھ دیر ٹھہرے، باتیں کیں، آرام تکلیف کا حال پوچھا اور رخصت ہوئے۔

● یہ ۱۹۵۷ء ہے، گورنر کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب بہار تشریف لائے۔ ۶ جولائی ۱۹۵۷ء کو انھوں نے گورنر کے عہدہ کا حلف لیا۔ میں نے ان کو مسرت کے اظہار کے ساتھ مبارکباد کا خط لکھا۔ رانچی سے انھوں نے ۱۶ جولائی کو میرے خط کا جواب دیا۔

۳۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو میری ان سے بہار میں پہلی دفعہ گورنمنٹ ہاؤس میں تقریباً نصف گھنٹہ ملاقات رہی۔ بہار کے حالات پر مختلف حیثیت سے گفتگو ہوتی رہی، چائے کا دور بھی چلتا رہا اور باتیں بھی ہوتی رہیں ــــ یہ خاص طور پر نوٹ کرنے کی بات ہے کہ انھوں نے جو خطوط اپنے قلم سے خود مجھے لکھے ہیں، لفافہ پر پتہ بھی خود ہی لکھا ہے، ایسے لفافہ پر ذاتی ٹکٹ استعمال کیا ہے، سرکاری ٹکٹ استعمال نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا دوسرا خط مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۵۷ء ہے جو انھوں نے گورنمنٹ ہاؤس پٹنہ سے مجھے بھیجا۔ اس لفافہ پر بھی ذاتی ٹکٹ چسپاں ہے۔ اس طرح کے پانچ خطوط جو دستیاب ہیں، گورنر، نائب صدر اور صدر جمہوریہ ہندوستان کی حیثیت سے انھوں نے مجھے لکھے ہیں جن پر پرائیوٹ ٹکٹ لگے ہیں۔

۱۹۵۷ء کے ماہ اگست میں مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب ایڈیٹر صدق جدید، پٹنہ میں گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مہمان خصوصی تھے۔ ۲۸ تاریخ تھی، یکشنبہ کا دن تھا، ڈاکٹر صاحب نے نہایت محبت سے مجھ سے فرمایا کہ حکیم صاحب آج شب کے وقت آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ظاہر ہے انکار کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں مولانا عبدالماجد صاحب کے ساتھ ہی نالندہ، راجگیر اور بہار شریف کے سفر سے شب میں واپس آیا تھا۔ ملاقات کے چھوٹے کمرہ میں ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اصل بات اور چھیڑ چھاڑ تو مولانا سے ہو رہی تھی، میں تو صرف سننے کا فرض انجام دے رہا تھا۔ کھانا لگ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے مولانا کو اور مجھے کھانا کھانے کی طرف متوجہ کیا اور معذرت کی کہ مجھے افسوس ہے کہ میں کھانے میں آپ لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، آج میرے صرف پھلوں پر گذارہ کرنے کا دن ہے۔ پاس ہی صوفہ پر بیٹھ گئے۔ تقریباً دو گھنٹے گفتگو اور کھانے کی نذر ہو گئے۔ خدابخش خاں لائبریری، علیسنہ لائبریری کا ذکر بھی تفصیل سے آیا۔ دہلی کے ہنگامہ خیز فسادات،

انسانیت کا خونی ڈرامہ اور ریفوجیوں کی بے پناہیوں کا ذکر بھی آیا ــــ انسان پر انسان کا ظلم کس کس طریقے سے ہوا، اس کا بھی ذکر بہت افسوس کے ساتھ ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی پرانا قلعہ ریفوجی کیمپ میں تشریف لے گئے تھے، اس کا بھی ذکر حسرت و افسوس کے ساتھ انہوں نے کیا ــــ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانیت رو رو کر انسانوں سے پناہ مانگ رہی ہے۔

اسی زمانے میں کسی سرکاری جماعت نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے اسٹرائیک کر دی تھی۔ بات چھڑ گئی، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، "اسٹرائیک کے طریقے اور زبردستی کسی مطالبے کو منوانے کے لیے کسی جماعت کا سرکاری کاموں کو چھوڑ کر جدوجہد کرنا اپنی حکومت میں مناسب نہیں معلوم ہوتا ــــ دوسرے حکومت کو بھی چاہیے کہ ان کے مطالبات پر غور کرے، اگر صحیح اور جائز ہیں تو ان کے مانگنے سے قبل ان کو ملنا چاہیئے اور اگر ناقابلِ قبول ہیں تو کسی قیمت پر جھکنا نہیں چاہیے"۔

ڈاکٹر صاحب مخدوم شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ اور دوسرے بہار کے بزرگوں کے حالات جاننا چاہتے تھے۔ میں نے ان کو اس سلسلہ کی کئی کتابیں بھیجی تھیں۔ ان کا تذکرہ بھی ڈاکٹر صاحب کے ایک خط میں موجود ہے۔

۵ اگست ۱۹۵۷ء کو مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کا دسنہ لائبریری دیکھنے اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی قبر پر حاضری کا پروگرام تھا۔ مولانا کی خواہش کے مطابق سفری کے لیے میں صبح ۸ بجے گورنمنٹ ہاؤس پہنچ چکا تھا، مولانا تیار ہو کر روانگی کے لیے اوپر قیامگاہ سے نیچے آئے، ڈاکٹر صاحب بھی ساتھ ہی نیچے تشریف لائے، میں بھی ساتھ تھا، موٹر میں بڑا سا آوٹ دان رکھا گیا، گورنر صاحب نے فرمایا کہ یہ اتفاقیہ ضرورت کے لئے ہے۔ تاکہ وقت پر کام آئے۔ کوٹھی کی دہلیز تک تشریف لائے اور رکتے ہوئے خداحافظ کہا اور بولے "یہ میری آخری حد ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتا"۔ ڈاکٹر صاحب دہلیز پر کھڑے رہے اور ہم لوگ سلام بجالاتے ہوئے کار پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ یہ تھی ڈاکٹر صاحب کی عظمت ــــ اور مولانا کے ساتھ ان کا مخلصانہ برتاؤ ــــ اور ان کے دل میں مولانا کا وقار!

۲ فروری ۱۹۵۹ء کو حکیم اجمل خاں ڈے، گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے وسیع میدان میں انجمن اطباء صوبہ بہار کی جانب سے بہت ہی شاندار طریقہ پر منایا گیا۔ کئی وزراء، شاہ عزیز منعمی، بیرچند پٹیل، افسران، وکلاء، معززین شہر، اخبارات کے ایڈیٹر، نامہ نگار حضرات کے علاوہ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ عظیم پنڈال ناکافی۔ حکیم اجمل خاں کے علاوہ یہ اُن کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جلسہ کا افتتاح فرمایا۔ اس افتتاح

کے سلسلہ میں جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انھوں نے بخوشی رضامندی ظاہر کی اور فرمایا: "حکیم اجمل خاں غیر معمولی انسان تھے، ان کی یاد، ان کی شایان شان منانا چاہیے۔" بعد کی ملاقات میں انھوں نے جلسہ کی کامیابی پر بہت مسرت کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ایک گھنٹہ پُراثر تقریر کی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے احسانات، ان کے کارنامے، قومی خدمات، جامعہ ملیہ میں ان کا خصوصی تعاون، شریف منزل میں بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کے جلسے اور وقت کے ملکی مسائل کا حل، طب یونانی کے مسائل اور طبّی علاج کی کامیابی پر روشنی ڈالتے ہوئے گورنمنٹ طبّی کالج کی ضروریات پر بھی انھوں نے ایک نظر ڈالی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک موقعہ پر فرمایا کہ زندگی، وقت کی پابندی کے ساتھ جد و جہد کا دوسرا نام ہے۔ وہ بجا طور پر فرماتے تھے کہ گھڑی اگر وقت کی پابندی چھوڑ دے، تو آپ اسے چھوڑ دیتے ہیں یا نہیں! ــــ اگر آپ وقت کی پابندی نہیں کرسکتے ــــ تو وقت آپ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا، اس لیے پوری مستعدی کے ساتھ وقت کی پابندی کیجیے۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں تو بہت بار ہوئیں، مگر ایک اور ملاقات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ۱۹۶۴ء، فروری کی ۲۰ تاریخ ہے۔ وہ نائب صدر جمہوریہ ہیں، دلی میں مولانا آزاد روڈ پر سرکاری قیامگاہ میں مقیم ہیں، ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ۱۲½ بجے دن کے وقت حاضری ہوئی۔ فوراً ہی بُلایا، کھڑے تھے، گلے ملے، بولے میں انتظار کررہا تھا۔ ایک گھنٹہ اطمینان سے باتیں ہوتی رہیں، بہار کے خاص خاص لوگوں کی فرداً فرداً خیریت پوچھی، خدا بخش لائبریری کا حال پوچھا، طبّیہ کالج کی ترقیوں میں پیش رفت پر بھی گفتگو ہوئی۔ ناشتہ اور چائے بھی پینی پڑی، تب کہیں چھٹکارا ہوا۔ اور واپسی کی اجازت ملی، کھڑے ہوکر رخصت کیا۔ ●●

# اونل ڈے

• جناب اونل ڈے : پیدائش ۲۳ جولائی ۱۹۱۹ء بمقام پٹنہ۔ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ۔ ۱۹۵۵ تا ۱۹۶۰ء بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما کے اسوسیٹ سکریٹری رہے۔ آپ تعلیمی اور ثقافتی میدان کے سرگرم کارکن اور ریڈیکل ہیومنسٹ ہیں۔ ایم این رائے کے شیدائی اور عزیز چیلے ہیں اور جنگ آزادی کے مجاہد رہے ہیں۔ فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی اور تھیئٹر کے ماہر ہیں۔ ••

میرے فاضل دوست ڈاکٹر بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے بارے میں اپنی یادوں کو ریکارڈ کرانے کی فرمائش کی ہے۔ میں نے پہلو تہی کی کوشش کی۔ کیونکہ واحد متکلم کا بکثرت استعمال جو ایسی یادوں میں ناگزیر ہو جاتا ہے، میری نظر میں مناسب نہیں ہے اور اس لئے بھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور میرے درمیان کافی عرصہ پہلے جو بھی معاملات ہوئے اس کا نہ کوئی شاہد ہے نہ ثبوت۔ تاہم، چونکہ ڈاکٹر بیدار میری طرف سے منفی جواب سننے کے لئے آمادہ نہیں ہیں اس لئے ان کی دوستی کی قدر کرتے ہوئے انکار نہ کرسکا۔

۵۷ – ۱۹۶۱ء کا درمیانی عرصہ میری زندگی میں بہت ہی سبق آموز، معلوماتی اور پُرلطف گزرا ہے۔ اس دوران مجھے سابق گورنر بہار ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اسکالر اور انسان دوست سے قربت کا موقع ملا۔

اس موضوع کی وضاحت کے لئے میں اس پس منظر کو بیان کردوں جس میں مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین سے متعارف ہونے، ان کے قریب جانے اور ان کی شفقت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ادب، موسیقی، رقص، ڈراما اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدان میں ثقافتی سرگرمیوں میں، میں ۱۹۴۲ء سے ہی سرگرم رہا ہوں۔ "آرٹس اینڈ آرٹسٹ" نام کی ایک ثقافتی سوسائٹی ہم لوگوں نے قائم کی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں "بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما" صوبائی حکومت کی سرپرستی میں معرض وجود میں آئی اور اس کے اگزکیوٹیو بورڈ کی رکنیت کے لئے مجھے بھی منتخب کیا گیا۔ اس کے دستور کے مطابق گورنر بہار اس اکاڈمی کے صدر ہوئے۔ ۵۷ – ۱۹۵۶ء میں میری تقرری ایسوسی ایٹ سکریٹری کی حیثیت سے ہوئی۔ ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن بہار، سکریٹری تھے۔ اگزکیوٹیو بورڈ کے نائب صدر اور چیرمین پٹنہ ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس ایس۔ کے داس تھے۔ ۱۹۵۷ء میں سپریم کورٹ میں بحیثیت جج اپنی تقرری ہونے کی بنا پر جب انھوں نے استعفیٰ دیا تو سلطان احمد نے کرسئ صدارت کو زینت بخشی۔ اسوسیٹ سکریٹری ہونے کے ناتے معمول کے مطابق آفس کا نظام چلانے کے علاوہ تمام سرگرمیوں کی ذمہ داری جس میں منصوبہ بندی سے لے کر اس کی تعمیل کا کام بھی شامل تھا میرے ہی سپرد تھی۔ سارے مشوروں اور تجاویز کے ساتھ فائلوں کی تیاری مجھے ہی کرنی پڑتی تھی اور ان

فائلوں کو چیرمین سر سلطان احمد کے سامنے ان کی رائے کے لئے پیش کرنا پڑتا تھا۔ سر سلطان احمد نے بارہا ان فائلوں کو اپنی رائے کے ساتھ لے کر مجھے صدر کے پاس بھیجا تاکہ وضاحت طلب باتوں کی وضاحت اور صدر کے سوالوں کا جواب دے سکوں اور اس طرح ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ میرے تعلقات باضابطہ طور پر قائم ہوئے۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو کئی بار اس ڈرامے اور رقص کو دیکھنے کی دعوت دی جو میری ہدایت میں پیش کئے گئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے میرے بہت سے ڈراموں کو اسٹیج پر دیکھا، انہیں سراہا اور میری ہدایت کاری کی تعریف بھی کی۔

اگرچہ پہلی ملاقات سے ہی انھوں نے کوئی امتیاز نہیں برتا اور برابری کا ہی سلوک کیا، لیکن ایک دو ملاقات کے بعد تو مجھ سے کھُل کر ملنے لگے اور منصبی کام کے بعد بے تکلفانہ گفتگو کے لئے مجھے روک لیتے۔ ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی باتیں ایسی ہوئیں جو یاد رکھنے کے قابل تھیں اور ان کی روشن خیالی کا بیّن ثبوت بھی، جنھیں ٹیپ کرنے کی ضرورت تھی۔ بدقسمتی سے ذاکر حسین کی بہت سی عالمانہ گفتگوئیں میرے ذہن سے نکل گئی ہیں جو چند باتیں یاد رہ گئی ہیں، انھیں دہرا رہا ہوں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے متعلق قابل ذکر جو پہلی چیز ہے، وہ یہ ہے کہ ان پانچ برسوں کی طویل مدت کے دوران میں نے انھیں کبھی تاخیر سے آتے نہیں دیکھا، چاہے وہ راج بھون ہو یا راج بھون سے باہر کوئی جگہ۔ اسٹیج پر ڈراما پیش کرتے وقت ہم لوگوں کو ہر دم چوکس رہنا پڑتا تھا کہ کھیل وقت پر شروع ہو جائے اور راجیہ پال کو آڈیٹوریم میں انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب کبھی بھی انھیں کسی ڈرامے کے افتتاح کے لئے بلایا گیا تو وہ کبھی پانچ منٹ سے زیادہ نہیں بولے۔ جب میں نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کرنے کی جسارت کی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ناظرین یہاں فن کارانہ کھیل دیکھنے کی امید لے کر آتے ہیں، ہم جیسے بوڑھے آدمی کی بھونڈی تقریر سننے کے لئے نہیں۔ لیکن جب کبھی بھی ناظرین کے علم میں کوئی بات لانے کی ضرورت انھوں نے محسوس کی تو انھوں نے اس موضوع پر بصیرت افروز تقریر کی۔

ایک دفعہ جب میں ان سے ملنے راج بھون گیا تو انھیں بہت ہی افسردہ اور مغموم پایا۔ جیسا انھوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا تو کسی قدر پس و پیش کے بعد میں نے ان کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ جسمانی طور پر بہت ٹھیک ہوں لیکن ذہنی طور پر افسردہ ہوں۔ ہم دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے۔ کیونکہ مجھے یہ نہیں معلوم ہو رہا تھا کہ کیا کہنا یا کرنا چاہیے۔ تھوڑی دیر کے بعد گویا ہوئے اور کہا "جانتے ہو اکل، آج مجھے اپنی زندگی کا ایک عظیم صدمہ پہنچا ہے۔ میں ایک مقامی بنیادی ٹریننگ اسکول دیکھنے گیا۔ پرنسپل

مجھے سب جگہ لے گئے اور وہ تمام چیزیں دکھائیں، جو دیکھنے کے لائق تھیں۔ جب معائنہ ختم ہوا، تو میں گاڑی پر سوار ہونے لگا تو ایک شخص ٹوکری بھر تازہ سبزی لے کر آیا اور پرنسپل نے جو مجھے رخصت کرنے آئے تھے مسکراتے ہوئے ڈرائیور کو کار کا بوٹ کھولنے کو کہا۔ میں نے متحیر ہو کر پوچھا کہ سبزیاں کہاں سے آئی ہیں۔ پرنسپل نے بڑے فخریہ انداز میں کہا کہ یہ سبزیاں زراعت میں تربیت پانے والے طلبا کی محنت کا پھل ہیں اور میرے لئے ہیں۔ میں ششدر رہ گیا اور یقین مانو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں صرف اُن سے صرف اتنا کہہ سکا کہ سبزیوں کو واپس لے لیں اور فروخت کے لئے بازار بھیج دیں۔ یہ کہہ کر میں گاڑی میں بیٹھا اور سمجھو بھاگ کر واپس آگیا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے اور پھر کہا " مہاتما کے ایما پر میں نے اپنے بچوں کے لئے ملک کی عزت کے شایان شان ایسی تعلیم کا منصوبہ پیش کیا تھا جس کا بنیادی تصور ہی یہ تھا کہ تعلیمی اخراجات کا بوجھ ملک یا والدین کے بجائے خود طالب علموں کے شانے پر رہے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب طالب علموں کو اسکول میں ہی دستکاری، زراعت وغیرہ کے ذریعہ قابل فروخت اشیاء پیدا کرنے کی اور انھیں بازاروں میں فروخت کرنے کی تعلیم دی جائے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے ایسی تربیت طالب علموں کو نوکری کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور معاشی طور پر خود کفیل بننے میں مدد دے گی۔ یہ پیداوار اپنے سے اوپر والوں کو محض خوش کرنے کے لئے تحفتاً دینے کی نہیں تھیں۔ یہ حرکات بنیادی تعلیم کے تصور کی ہی ضد اور ہماری قدیم زمیندارانہ ذہنیت کی پرانی عادت ہیں۔ اور تو اور خود پرنسپل صاحب جو بنیادی ٹریننگ اسکول کے سربراہ ہیں اس سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں "

ایک دوسرے موقع پر جب ہماری گفتگو کا موضوع ملک کے فرقہ وارانہ تناؤ کی طرف مڑا تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے فرمایا کہ " اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں فرقوں کے مفسرین اپنے صحیفوں سے پوری طرح واقف نہیں اور انھوں نے خود اپنے مذہب کی اصل، اسباب اصل، ارتقا اور بنیادی اصولوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ دوسرے کے نظریے، خیالات اور عقاید کا احترام، پرستش کے طریقے، امن اور اتحاد صرف ہندو مذہب کے نہیں بلکہ اسلام کے بھی بنیادی اصول ہیں اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ بعید میں ہندو مذہب آریہ بھٹ، اور اسلام الغ بیگ جیسے لوگ پیدا کر سکا اور یہ سبق انھوں نے نام نہاد مذہبی رہنماؤں سے نہیں سیکھے تھے۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا وجہ ہے بہت دنوں سے " آرٹس اینڈ آرٹسٹ " نے کوئی ڈراما یا رقص نہیں پیش کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ چونکہ سبھی ایسے ادارے خسارے میں چلتے ہیں اس لئے آرٹس اینڈ آرٹسٹ مالی مشکلات سے دوچار ہے اور اس لئے خاموش رہنے پر مجبور ہے۔ ایک یا دو مہینوں کے بعد آرٹس

اینڈ آرٹسٹ' کو صوبائی حکومت کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے پانچ ہزار روپے ایڈہاک گرانٹ کی شکل میں ملے۔ حیرت سے ہم لوگوں نے محکمۂ تعلیم سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ راجیہ پال نے وزیر تعلیم سے اس بارے میں گفتگو کی تھی اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کو یہ رقم دی جائے۔

۱۹۶۱ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کی برسی کے موقع پر ٹیگور کا ڈانس ڈراما "چراکمار سبھا" ریاستی محکمۂ تعلیم کے ذریعہ پیش کردہ ٹیگور ڈراما' بھانو سنگر پداولی' میں شرکت کے علاوہ 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' نے میری ہدایت کاری میں خود پیش کیا، جو ہندوستان کی چند بہترین کامیڈیوں میں ہے۔ اس ڈرامے میں میں نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کو ڈرامے کے افتتاح کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر پہنچے، ایک جملے کے ساتھ افتتاح کیا اور ان کے بیٹھتے ہی ہم لوگوں نے ڈراما فوراً شروع کر دیا۔ ان کے ملٹری سکریٹری، شاید میجر چندراودکر نے (ان دنوں گورنر کا ملٹری سکریٹری ہوا کرتا تھا) علٰحدہ سے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق گورنر کو ہر روز ٹھیک ۸ بجے کھانا کھا لینا چاہیئے، اس لئے ہمیں ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ ٹھیک ۷ بجکر ۴۵ منٹ پر گورنر رخصت ہو سکیں۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور کہا کہ ٹھیک پونے آٹھ بجے پردہ گر جائے گا، چاہے اس وقت کسی سین کا درمیان ہی کیوں نہ ہو، اور ہال کی بتیاں روشن کر دی جائیں گی تاکہ گورنر ہال سے باہر نکل سکیں۔ ساڑھے سات بجے میں نے ایک اہم رکن کو ہال میں ملٹری سکریٹری کو یہ خبر دینے کے لئے بھیجا کہ ٹھیک پونے آٹھ بجے پردہ گرا دینے کے لئے ہم تیار ہیں لیکن مجھے یہ اطلاع دی گئی کہ ڈراما دیکھنے میں گورنر اس طرح مستغرق ہیں کہ کھیل کے آخر تک وہاں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں۔ گورنر وہاں مستقل موجود رہے اور اس وقت گئے جب کھیل ساڑھے نو بجے ختم ہوا۔

ہال میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ گزرا۔ ڈراما بنگالی زبان میں تھا۔ سامنے کی صف میں 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کے سابق صدر شری مہابیر پرشاد، ایڈووکیٹ جنرل آف بہار، گورنر کے ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے اور دوسری طرف حکومت بہار کے ایک بنگالی افسر اعلیٰ کی بیوی بیٹھ گئیں۔ جیسے ہی کھیل شروع ہوا۔ وہ خاتون موصوف خود سے مترجم بن بیٹھیں اور بنگالی مکالموں کا انگریزی ترجمہ سرگوشیوں میں کرتی گئیں۔ اس غیر ضروری مداخلت کو کچھ دیر برداشت کرنے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاتون کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے بہت نرمی کے ساتھ کہا کہ وہ یہ تکلیف نہ اٹھائیں کیونکہ وہ خود اس ڈرامے کو متعدد بار پڑھ چکے ہیں اور مکالموں کو سمجھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت محسوس نہیں کر رہے ہیں (یہ بات مجھے 'آرٹس اینڈ آرٹسٹ' کے صدر نے بتائی)۔

۱۹۶۱ء کے آخری نصف سے محکمۂ تعلیم میں صوبائی حکومت کے انتظامیہ کا رویہ 'بہار اکیڈمی آف میوزک'

ڈانس اینڈ ڈراما" کے تئیں کچھ عجیب سا ہو گیا۔ اگرچہ ایجوکیشن سکریٹری اور ڈی پی آئی دونوں اکزیکیوٹیو بورڈ کے رکن (بلحاظ عہدہ) تھے اور ڈی ۔ ڈی ۔ پی ۔ آئی سکریٹری (بہ لحاظ منصب) ہونے کے ناتے بورڈ کی ساری میٹنگیں بلا یا کرتا تھا۔ سکریٹری اور ڈی پی ۔ آئی نے میٹنگ میں شریک ہونا بند کر دیا۔ ساری اہم فائلیں جو محکمہ میں بھیجی جاتی تھیں وہیں روک لی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ چیرمین، سلطان احمد کے خطوط بھی بغیر جواب دیئے اور بغیر رسید کے رکھ لئے جاتے تھے۔

ایسے حالات میں میں نے ایک مرتبہ اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین کے سامنے اس معاملہ کو اٹھانے کی جرأت کی —— یہ کہتے ہوئے کہ جب انھوں نے اتنی مہربانی اپنی طرف سے کی کہ بغیر مانگے ہوئے وزیر تعلیم سے اکیڈمی کے بارے میں بات کی اور اسے ایک قابل قدر رقم بطور گرانٹ دلوائی تو کیا وہ وزیر تعلیم سے اکیڈمی کے معاملوں میں ذاتی طور پر زیادہ دلچسپی لینے کی سفارش نہیں کر سکتے اور خصوصاً سلطان کی طرف محکمہ تعلیم کے ناروا سلوک کو ختم نہیں کرا سکتے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بہت ہی رقت انگیز طور پر مسکراتے ہوئے کہا "کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔" اور پھر بولے "میں نے وزیر تعلیم کو اکیڈمی کی عمدہ اور مفید سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے اس معاملے میں ذاتی طور سے مداخلت کرنے کی گذارش کی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ایک بوڑھے آدمی خصوصاً جب وہ ریٹائر ہونے والا ہے، کے مشورے کے بہ نسبت انہیں اپنے محکمے کے افسروں کے مشوروں پر زیادہ اعتماد ہے" تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے مزید کہا "اگر میں اور زیادہ زور دیتا تو صوبہ میں سیاسی بحران پیدا کرنا پڑتا۔ کیا تمھاری نظر میں وہ انتہائی بدقسمتی نہ ہوتی؟" میں فوراً ان سے متفق ہو گیا۔

اگرچہ موضوع سے مناسبت نہیں ہے لیکن میں یہاں عرض کر دوں کہ کچھ ہی دنوں کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین کے منصب گورنری کے اختتام کے ساتھ ہی شائد صوبائی حکومت نے 'بہار اکیڈمی آف میوزک، ڈانس اینڈ ڈراما' جیسے معتبر ادارے کو بند کر دیا، جسے خود تو حکومت نے ۱۹۵۱ء میں قائم کیا تھا اور اس کی جگہ بورڈ آف کلچرل ایجوکیشن کو محکمہ تعلیم کا ایک شاخ کے طور پر ۱۹۶۱ء کے آخیر میں یا ۱۹۶۲ء کے شروع قائم کر دیا۔ یہ بورڈ اپنے چند سالہ وجود کے دوران صوبہ میں کوئی ایسا مفید کام نہ کر سکا اور بالآخر اپنی موت آپ مر گیا۔ اس سے جو سبق ہمیں ملتا ہے وہ یہ ہے کہ موسیقی، رقص، ڈراما اور دوسرے فنون لطیفہ کے میدان میں سرگرمیاں، ثقافت کو دوبارہ زندگی بخشنے میں صرف اسی وقت مفید ثابت ہو سکتی ہیں جب انھیں سرکاری افسروں کے ہاتھوں سے بچا کر رکھا جائے۔

●●

# حکیم ظلّ الرحمٰن

• حکیم ظلّ الرحمٰن صاحب: پیدائش یکم جولائی ۱۹۴۰ء بمقام بھوپال۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ۔ جامعہ طبیہ دہلی کے سابق لکچرر اور لٹریری طبی ریسرچ یونٹ علی گڑھ کے سابق ریسرچ آفیسر، جنوری ۱۹۷۳ء میں اجمل خاں طبیہ کالج علیگڑھ کے شعبۂ علم الادویہ میں بحیثیت ریڈر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۸ء سے صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہیں۔ مجلّہ 'الحکمت' دہلی کے سابق ایڈیٹر اور طبیہ کالج میگزین 'شیخ الرئیس نمبر ۱۹۵۸ء' کے مرتب ہیں۔ آپ کی تصنیفات میں 'دورِ جدید اور طب' "تاریخ علم تشریح'، 'علم الامراض' 'تجدید طب' 'رسالہ جودیہ' 'بیاض وحیدی' 'مکتب مرتعش' 'تذکرہ خاندانِ عزیزی' 'کتاب المرکبات' 'حیات کرم حسین' 'صفوی عہد میں علم تشریح کا مطالعہ (زیرِ طبع) اور قانون ابن سینا اور اس کے شارحین و مترجمین" (زیرِ طبع) قابل ذکر ہیں۔ مزید برآں ۴۵ سے اوپر تحقیقی مضامین ملک کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ••

شفاءالملک حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی جھوائی ٹولہ لکھنؤ (علیگڑھ طبیہ کالج کے پرنسپل) اپنے علم و فضل، باغ و بہار شخصیت اور حسن معالجہ کی وجہ سے جلد ہی یونیورسٹی کے حلقوں میں مقبول ہوگئے۔ علی گڑھ میں ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ ذاکر صاحب، سلیمان اشرف، رشید احمد صدیقی، عبدالمجید قریشی، حمید الدین خاں، حاذق صاحب، اکرام اللہ خاں، عمر الدین صاحب، حفیظ الرحمن صاحب ان کے مخصوص دوستوں میں تھے۔ ذاکر صاحب کے خطوط سے ان کے بے تکلفانہ تعلقات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں دل کی باتیں ہیں، سرگوشیاں ہیں اور شخصیت کے بعض وہ پہلو ہیں جو شاید دوسرے ذریعہ سے سامنے نہ آسکیں۔

جامعہ ملیہ کے کتب خانہ میں شیخ الرئیس کی کتاب الادویۃ القلبیہ کا ایک اہم نسخہ تھا۔ ذاکر صاحب نے حکیم صاحب سے اس کے ترجمہ و اشاعت کی خواہش کی۔ حکیم صاحب نے رام پور اور پٹنہ کے نسخوں کے علاوہ استنبول کے مطبوعہ نسخہ سے موازنہ و تصحیح کے بعد اس کے ترجمہ کا کام انجام دیا اور ایک بیش قدر مقدمہ تحریر کیا۔ یہ کتاب ایران سوسائٹی کلکتہ سے طبع ہوئی ہے۔

۱۹۶۳ء میں شملہ میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اجلاس میں ذاکر صاحب کی شرکت اور ان کے ہاتھوں کانفرنس کا افتتاح، حکیم صاحب سے ذاتی تعلق کے علاوہ طب یونانی سے ان کے شغف کا آئینہ دار ہے۔

ذاکر صاحب کے زمانہ صدارت میں تکمیل الطب کالج کے بارے میں بعض حلقوں کی طرف سے یہ تحریک شروع ہوئی کہ اسے حکومت اپنی تحویل میں لے لے۔ اس وقت یوپی میں گورنر راج تھا۔ حکیم صاحب، ذاکر صاحب سے ملنے گئے، تکمیل الطب کے سلسلہ میں ان سے کہنا چاہتے تھے، مگر آخر وقت تک نہیں کہہ سکے۔ جب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے تو حکیم صاحب نے روداد بیان کی اور کہا ذات کا نہیں ادارہ کا مسئلہ ہے اگر آپ کچھ کر سکیں تو شاید نتیجہ خیز ہو۔ ذاکر صاحب نے کاغذات مانگے، حکیم صاحب نے کہا وہ باہر موٹر میں ہیں۔ میں مذبذب میں رہا اس لئے یہاں نہیں لایا۔ ذاکر صاحب نے کہا اسحٰق آپ کو موٹر تک چھوڑنے جائے گا، اسے یہ کاغذات دے دیجئے اور پھر ذاکر صاحب کی کوشش سے اسوقت کالج کا یہ مسئلہ ختم ہوگیا۔

ذاکر صاحب نے شاہ سعود کی دعوت پر اگرچہ سعودی عرب کا دورہ کیا تھا اور انہیں عمرہ کی سعادت ملی تھی لیکن حج کا شوق دامنگیر تھا۔ حکیم صاحب نے قلبی دورہ کے بعد ایک روز ان سے کہا کہ سفر حج میں اب آپ کا ساتھ اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ عارضہ قلب کی وجہ سے جو احتیاطیں آپ اختیار کریں گے میں بھی ان میں شریک ہو سکوں گا۔

حکیم صاحب نے شخصیات پر نہیں لکھا ہے۔ وہ ذاکر صاحب پر بھی نہیں لکھتے۔ لیکن مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب صدق میں ان کے انتقال کے بعد بھی معترضانہ مضمون لکھا تو حکیم صاحب نے مدیر صدق کا حوالہ دیے بغیر ذاکر صاحب کی شخصیت اور ان کی خوبیوں پر اس انداز میں روشنی ڈالی کہ مولانا کے محاسبہ کا جواب اس میں آ گیا۔

- ذاکر صاحب مشرقی تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار کا بے مثل نمونہ تھے۔ شرافت، مروت، حسن اخلاق، ایفائے عہد اور استقامت ان کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ ذاکر صاحب کو حکیم اجمل خاں کی سرپرستی اور تربیت حاصل رہی۔ کہا کرتے تھے کہ میں نے انسانیت اجمل خاں سے سیکھی ہے۔ اجمل خاں انسانیت کی بلند ترین منزل پر فائز تھے۔

زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ سے ایک مرتبہ میں اپنے دوست ڈاکٹر احتشام احمد ندوی سے ملنے جامعہ ملیہ گیا۔ رات کو ۸ بجے کے قریب بھلوگ کا لج ہوسٹل سے ثانوی درس گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک کار قریب آ کر رکی۔ دیکھا تو ذاکر صاحب تھے۔ کہنے لگے اگر آپ علی گڑھ جا رہے ہوں تو بیٹھ جائیے۔ میں نے عرض کیا آج ہی علیگڑھ سے آیا ہوں۔ فرمایا کیا مولانا اسلم جیراج پوری کو دیکھنے جا رہے ہیں، وہاں نہ جائیے گا۔ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ اور پھر اسی شب مولانا جیراج پوری کی وفات کی اطلاع ملی۔

- علی گڑھ میں نئے طلبا کو خطاب کرتے ہوئے وہ کہا کرتے تھے کہ جتنی دوستیاں کرنی ہوں اب کر لیجیے یہی دوستیاں بڑھاپے تک باقی رہیں گی۔ اس وقت آپ جس سے ملتے ہیں بے غرض ملتے ہیں اور جو آپ کے پاس آتا ہے وہ محض دوستی کی خاطر آتا ہے۔ طالب علمی کے بعد آپ جس کے پاس جائیں گے کسی کام سے جائیں گے اور آپ کے پاس جو آئے گا وہ کسی مقصد سے آئے گا۔ آپ کو زحمت کا سبب اور اپنے لائق خدمت معلوم کرنی ہوگی اور اگر آپ دریافت نہیں کریں گے تو وہ محسوس کرے گا کہ میں گیا اور مجھ سے کام کا معلوم نہیں کیا۔ اگر وہ پہلی مرتبہ کام نہیں بتائے گا تو یہ آمد آئندہ کام کی تمہید ہوگی۔ لیکن اگر یہاں کسی کمرہ میں آنے والے ساتھی سے آمد کی وجہ اور اپنے لائق کوئی خدمت دریافت کرلی تو وہ خفا ہو جائے گا۔ یہ ہے بڑا بنیادی فرق جو اس وقت کے تعلقات اور بعد کے تعلقات میں ہوتا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ علی گڑھ میں مختلف علاقوں اور مختلف تہذیب و معاشرت کے طلبا کی موجودگی سے جہاں ہندوستان کے مختلف رسوم و رواج کو سمجھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے وہاں ان مختلف عادات، خصائل کے لوگوں کے درمیان زندگی گزارنے کا سلیقہ اور ان سے نباہ کا ڈھنگ بھی پیدا ہوتا ہے، اسی لیے ایک کمرہ میں ایک ہی جگہ کے طلبا کو نہیں رہنا چاہیئے۔

● مجھے ان کی خدمت میں نائب صدر کے زمانہ میں دو مرتبہ اور صدارت کے زمانہ میں ایک مرتبہ حاضری کا موقع ملا اور ہر مرتبہ ان کی کریم النفسی اور علو مرتبہ کا گہرا نقش لے کر واپس ہوا۔ حکیم صاحب کو اطلاع ملی کہ انھیں اس سال خطاب ملنے والا ہے۔ پدم شری کا خطاب وہ نہیں چاہتے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں انھیں حکومت برطانیہ کی طرف سے شفاء الملک کا جو خطاب ملا تھا وہ ان کے خیال میں اس سے زیادہ حیثیت کا تھا۔ پدم شری کا خطاب رشید صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کو مل چکا تھا اور اسی سال نرگس بھی اسی خطاب سے نوازی گئی تھیں حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ منع کرنے سے ذاکر صاحب کا ذہن رشید صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اس لئے بہت خوبصورت انداز میں انھیں لکھا کہ "نرگسی خطاب سے باز رکھا جاؤں" اور یہ خط انھوں نے مجھے دہلی بھجوایا کہ میں خود ذاکر صاحب تک پہنچاؤں۔ ذاکر صاحب ان دنوں نائب صدر تھے۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا، پہلے سے کوئی وقت مقرر کرائے بغیر! اسحٰق کے ذریعہ فوراً ملاقات ہو گئی۔ خط پڑھا، مسکرائے اور رکھ لیا۔ حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ رشید صاحب کو پدم شری کے خطاب کی وجہ سے ذاکر صاحب سے شکایت ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی، مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا تھا اور وہ صرف پدم شری ٹھہرائے گئے تھے۔ رشید صاحب کو اس سے قبل ایک قریب ترین عزیز کی سفارش کے سلسلے میں بھی شکایت ہو گئی تھی۔

● ذاکر صاحب علیگڑھ سے بہار کے گورنر ہو کر گئے۔ وہ علی گڑھ سے خوش نہیں گئے تھے۔ لیکن اس کے فوراً بعد یونین کی جبلی تقریبات منائی گئیں۔ ذاکر صاحب کو دعوت دی گئی۔ خوشدلی سے تشریف لائے اور پروگراموں میں شرکت کی۔ جگر صاحب بھی مشاعرہ میں آئے تھے۔ یونین کے سامنے کے دروازہ سے نکل کر جب کار کی طرف چلے تو اس وقت صدر یونین اور طلبا کے علاوہ وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی بھی تھے۔ لیکن جیسے ہی کار کے قریب پہنچے ذاکر صاحب نے جو اس وقت علی گڑھ میں خود بطور مہمان تھے، فوراً آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا اور جگر صاحب سے بیٹھنے کی درخواست کی۔ ہم لوگوں کے لئے یہ حیرت و استعجاب کا منظر تھا!

●●

# سیّد نقی احمد ارشاد

• سیّد نقی احمد ارشاد، والد کا نام سیّد حسین خلف شاد عظیم آبادی، والدہ کا نام حسن آرا بیگم بنت میر بہادر حسین نبیرۂ میر جان صاحب جن کے نام سے بھاگل پور میں میرجان ہاٹ ہے۔ سالِ پیدائش ۵ جولائی ۱۹۲۰ء۔ ۱۹۴۰ء میں بی۔ اے آنرس درجۂ اوّل کے بعد تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۸ء تک صوبائی سول سروس میں رہے۔ ۱۹۷۰ء میں اے۔ ڈی۔ ام اور ۱۹۷۷ء میں جوائنٹ سکریٹری ہوئے۔ ۱۹۷۹ء میں پنشن پائی۔ کئی کتابوں کے مصنّف، مؤلّف یا مترجم ہیں۔ کچھ مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ مطبوعات میں سے چند کے نام یہ ہیں: شاد عظیم آبادی: کلام اور شرحِ کلام، شاد عظیم آبادی کی مثنویاں، شاد کا عہد اور فن۔

••

۵۹-۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی مرحوم "شاد کی کہانی" مرتب کر رہے تھے۔ مرحوم کے اکثر خطوط موضع کاکو سے مدعو بنی میرے نام کے آتے تھے۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے وہ مل چکے ہیں اور ان کی کوشش سے یہ کتاب انجمن ترقی اُردو شائع کرے گی۔ بہار میں آنے کے پہلے مجھے معلوم تھا کہ ذاکر حسین صاحب مرحوم عرصہ دراز تک جامعہ ملیہ دہلی سے وابستہ تھے۔ شاید ایک یا دو مضامین ان کے قدیم پرچوں میں بھی میری نظر سے گذرے تھے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کچھ عرصہ تک پروفیسر محمد مسلم مرحوم جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، یہ ۲۲-۱۹۲۳ء کی بات ہے۔ شاید ان سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ذاتی ملاقات ہو۔

مسلم صاحب مرحوم نے اثبات میں جواب دیا کہ سید محمد مستی پوری جو ان دنوں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں لائبریرین تھے، ان سے مسلم صاحب کی ذاتی ملاقات تھی اور سید محمد صاحب سے ذاکر حسین صاحب کے کافی ارتباط تھے۔ چنانچہ سید محمد صاحب کی سعی سے ذاکر حسین صاحب نے مسلم صاحب کو جامعہ ملیہ میں بلوالیا تھا۔ پھر جب تعلقات بڑھے تو مسلم صاحب نے ذاکر حسین صاحب کی ہی مدد سے پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۲۲ء میں ام، اے اور ام، او کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اس خط سے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ذاتی خوبیوں سے واقف ہوا۔

میں ملازمت پیشہ شخص تھا، وہ بھی ڈپٹی کلکٹر جس کو ہمیشہ پا بہ رکاب رہنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں ذاکر صاحب سے ملنے کا ارادہ ہی کرتا رہا کہ میرا تبادلہ دربھنگا ضلع سنتھال پرگنہ کو ہو گیا۔ خوش قسمتی سے ضلع الکشن افسر ہونے کے علاوہ نظارت کا محکمہ بھی میرے ہی چارج میں تھا۔ دسمبر ۱۹۶۷ء کی بات ہے کہ عزت مآب گورنر بہار کی ضلع میں آمد کی اطلاع آئی۔ چنانچہ میں نے جی جان سے نظارت کے تمام انتظامات کو مکمل کرایا، ایسا کہ میرے ڈپٹی کمشنر جو اس زمانہ میں شری کارام دت پانڈے تھے، نہایت خوش ہوئے۔

میں نے ان سے استدعا کی کہ حضور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب میرے دادا کی کتاب شائع کرا رہے ہیں، مجھ سے ان سے کوئی ذاتی ملاقات نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ سربراہ آوردہ اور ضلع کے اعلیٰ حکام کو مدعو کیا جا

رہا ہے۔ آپ اس میں موجود رہیں گے۔ ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ ایسی ملاقاتیں تو وہ ہر ضلع میں کرتے رہتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر نے میرے دادا کا نام پوچھ کر اپنی ڈائری میں لکھ لیا اور کہا کہ جب آپ کا انٹرویو کراؤں گا تو آپ کے دادا کے حوالے سے۔

الغرض روز موعودہ اور وقت مقررہ پر حکام اور ضلع کے سر برآوردہ لوگوں کی قطار سرکٹ ہاؤس کے طویل اور کشادہ برآمدے میں کھڑی ہو گئی۔ اس قطار میں' میں بھی شامل تھا۔ دس بجے کا وقت تھا۔ چنانچہ جب میری ہاتھ ملانے کی باری آئی تو ڈپٹی کمشنر صاحب کے پاس اُن کی ذاتی ڈائری موجود تھی۔ گھرا کے اُنہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا " احمد صاحب! آپ کے دادا کا کیا نام تھا؟" سہارا مل کر ہاتھ ملاتے وقت میں نے خود عزت مآب گورنر صاحب سے کہا " حضور! میرے جد امجد کا نام علی محمد اور تخلص شاد تھا، جن کو اُردو داں 'شاد عظیم آبادی' کہتے ہیں۔" اُنھوں نے فرمایا " آج چار بجے کچھ پریس والوں کو بیان دینا ہے۔ آپ اس وقت ملیں تو کچھ اطمینان سے باتیں ہوں گی!"—— میں اس قطار کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

شام کو حاضر ہوا تو چند نامہ نگار اور اخبار نویس موجود تھے۔ انتظام میں حقیر ہی تھا۔ وہ خورد و نوش میں مصروف تھے اور میں ذاکر صاحب کے متعلق سوچ رہا تھا کہ کتنے حسین، دراز قد، سرخ و سفید بزرگ ہیں۔ گورنر ہونے پر بھی اخلاق قدیمانہ ہے۔ سلنے میں خود ذاکر صاحب اپنے کمرے سے برآمد ہوئے اور ہم لوگ اُٹھ کر ڈپٹی کمشنر کی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ ابتدا کچھ تفریح اور کچھ چٹکلوں سے ہوئی۔ پھر انٹرویو شروع ہوا۔ ایک نامہ نگار نہایت بیباک شخص تھے، انھوں نے ایک ایسا سوال کیا کہ سب چونک پڑے۔ وہ سوال تھا: "جناب آپ کا رنگ سرخ و سپید اور دراز قد تو یہ کہتا ہے کہ آپ کسی نواب فیملی سے ہیں۔" اس سوال پر ذاکر حسین صاحب مسکرائے اور بولے: "نہیں بھائی نہیں، میرے اجداد ڈاکو اور راہزن تھے۔" میں قدرے ذاکر صاحب کے پس منظر سے واقف تھا۔ میں نے ہمت کر کے سوال کیا " حضور! اس سلسلہ میں صرف ایک سوال کرنا چاہوں گا۔" وہ بولے "ضرور!" میرا سوال تھا: " حضور روہیلہ افغانوں میں نجیب الدولہ، ضابطہ خاں، حافظ رحمت اللہ خاں، دوندے خاں کو سبھی تاریخ داں جانتے ہیں، اس زمانے میں نواب رام پور کو کون نہیں جانتا!"۔ اُنھوں نے مسکرا کر دیکھا اور پوچھا " کیا آپ تاریخ کے طالب علم تھے؟" میں نے جواب دیا " جی حضور!" پھر انھوں نے دو چار جملے میرے دادا کی تعریف میں کہے اور فرمایا کہ افسوس اب تک ان کی کل کتابیں نہیں شائع ہوئیں۔ چنانچہ انھوں نے "شاد کی کہانی" کا بھی حوالہ دیا۔ پھر دوسرے دوسرے نامہ نگاروں کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔

میری عزت افزائی اس سے بڑھ کے اور کیا ہوتی کہ خود گورنر بہار نے حاضرین اور سامعین سے میرا تعارف کرایا۔ چنانچہ ان کے پریس کانفرنس کے بیانات بھی کچھ اخبارون میں شائع ہوئے تھے۔

یہ میری اور اُن مرحوم کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ وائس پریسیڈنٹ ہوکر دہلی چلے گئے مگر میں نے موقع کے ساتھ خط وکتابت جاری رکھی۔ چنانچہ دو کتابیں اُنکی خدمت میں دہلی بھیجیں، ایک تو یادگارِ شاد' دسمبر ۱۹۶۲ء، دوسرے زبورِ عرفاں' جو کچھ اس کے پہلے بھیجی گئی تھی وہ بڑے پابند وضع' سچے، منکسر، خلیق اور خوددار بزرگ تھے۔ خطوں کے جواب نہایت پابندی سے دیتے تھے۔ غالباً جتنے خطوط ملتے تھے' ایک ایک کا جواب لکھوا دیتے تھے اور ٹائپ کے بعد اپنا دستخط کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے تین چار خطوط ٹائپ میں ہیں، جن پر ان کے دستخط ہیں۔ جو وعدہ کرتے تھے پورا کرتے تھے، نہیں تو صاف انکار کر دیتے تھے۔ دو کتابوں کے بھیجنے کے بعد میں نے دو استدعا کی تھی' ایک یہ کہ کچھ اپنی رائے میری کتابوں کے متعلق فرما دیں اور دوسرے مقبرۂ شاد کی تعمیر کے سلسلے میں حکومت کو رجوع کریں۔

دونوں باتوں کا مختصر مگر صاف جواب دیا۔ کتابوں کے متعلق تو صاف تحریر فرمایا کہ پڑھ جاؤں گا مگر لکھنے کا وقت نہ نکال سکوں گا، اور مقبرۂ شاد کے متعلق تحریر فرمایا کہ آپ کے صوبہ کے وزیر اعلیٰ سے ضرور کہہ دوں گا" چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس زمانے میں دیوگھر کے رہنے والے بابو بنودھا نند جھا بہار کے وزیر اعلیٰ تھے۔ چنانچہ جب وہ دہلی تشریف لائے' تو کار بھیج کر انھوں نے مجھے سرکٹ ہاؤس میں بلوایا۔ کہنے لگے کہ ذاکر صاحب نے دلی میں مجھے آپکے دادا کے مقبروں کے بارے میں کہا ہے۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے تفصیل سے حال بیان کیا۔ بنودھا بابو نے مجھ سے درخواست طلب کی اور انڈین نیشن کے خصوصی نامہ نگار کو 'شاد منزل' میں بھیجا۔ جس نے تفصیل سے وہاں کے حالات انڈین نیشن مورخہ ۱۹۶۳ء میں شائع کئے۔ اس کا تراشا اب تک میرے پاس محفوظ ہے۔ میں ذاکر صاحب اور بنودھا بابو کے حق میں دعائیں کرہی رہا تھا کہ ؏ "من درچہ خیال و فلک درچہ خیال" کا مضمون پیدا ہو گیا۔ اِدھر بنودھا بابو کی وزارت جاتی رہی اور اُدھر ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

اس کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض وارثانِ شادؔ نے یہ سمجھ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو حکومت اس مکان کو لے لے اور وہ منہ دیکھتے رہ جائیں، مکان ہی کا وارا نیارا کر دیا۔

●●

# بیتاب صدیقی

• جناب عبدالحی بیتاب صدیقی : پیدائش ۱۹۲۷ء
موضع ڈمری، ضلع سیتامڑھی (یہ ضلع تحریک آزادی کے سلسلے
میں نامور ہے۔ بیتاب صاحب کے دادا عبداللطیف صاحب کو بھی
اسی پاداش میں ملک چھوڑ کر امریکا جانا پڑا اور وہیں وفات
پائی۔ بیتاب صاحب بھی جنگ آزادی کے رضا کار رہے ہیں)
فاضل (شمس الہدیٰ)، ۱۹۳۶ء سے پٹنہ میں رہا۔ پہلے جرنلسٹ
رہے۔ ۱۹۴۹ء سے رام موہن رائے سیمنری میں اردو فارسی
کے استاد ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں شاہ عمیر، شاہ مشتاق احمد،
ڈاکٹر محمود، ایڈووکیٹ محمد ایوب، غلام سرور، عزیزہ تقی امام،
اختر اورینوی، حافظ شمس الدین، سر سلطان احمد وغیرہ ۲۱
ممبروں کے ساتھ ریاستی انجمن ترقی اُردو کی بنا ڈالی۔
۱۹۵۴ء میں اس کے جنرل سکریٹری ہوئے۔

••

آزادی کے چند سال پہلے اور چند سال بعد کا دور بہت ہی پُر آشوب دور گزرا ہے۔ بہار میں جناب ایوب ایڈووکیٹ، جناب غلام سرور، جناب شاہ مشتاق احمد، ڈاکٹر اختر اُرینوی اور میں۔ ریاستی انجمن ترقی اُردو کے توسط سے اُردو کے تحفظ و بقا کی جد و جہد میں سرگرم تھا اور خصوصاً عزیزم غلام سرور، شاہ مشتاق احمد ایم-ال-اے اور میرا ہر وقت ساتھ رہتا تھا، یہ بات ہندوستان بھر کے اُردو دوست جانتے تھے جو بہار کی اُردو تحریک سے متاثر تھے۔ غلام سرور صاحب کی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے مراسلت بھی رہتی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں ہم تینوں انجمن کی ایک نشست میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ہم لوگ جس ٹرین سے لوٹ رہے تھے، ذاکر حسین صاحب اسی ٹرین سے گورنر بہار کی حیثیت سے بہار آرہے تھے۔ ٹرین میں کافی دلچسپی رہی۔ پھر اُردو کے کسی اہم مسئلے پر ہم تینوں آدمی ذاکر حسین سے ملنے راج بھون پہنچے۔ بڑے پُر خلوص ماحول میں ہم لوگوں سے کئی گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اُردو کے تحفظ و بقا کے مسئلے پر وہ بھی حساس ہیں۔ ان دنوں بہار کے ہر کس و ناکس مسلمانوں کی گورنر صاحب سے ملاقات کے لیے بھیڑ لگی رہتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ بہار میں پہلے مسلم گورنر تھے۔ اس لئے اس کسمپرسی کے دور میں ہر شخص راج بھون کا رخ کر لیتا تھا۔ دوران گفتگو میں جناب شاہ مشتاق صاحب نے کہا کہ ہم لوگ بہت پہلے ملنے آتے، مگر آپ کے یہاں تو ملنے والے لوگوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے، اس پر وہ ہنسے۔ اور پھر فرمایا کہ "فراست مومن" ہمارے یہاں ضرب المثل رہی ہے، لیکن بہار میں برعکس تجربہ ہو رہا ہے۔ جا و بیجا ضرورت مندوں اور حاشیہ برداری کرنے والوں کا جو ملنے کے لیے تانتا بندھا رہتا تھا، اسے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ بہار جب وہ آرہے تھے اور ہم لوگ بھی اسی ٹرین سے واپس ہو رہے تھے تو گیا کے پاس ٹرین کا واقعہ پیش آیا تھا، اُسے یاد دلانے پر خوب ہنسے۔

بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مختلف مسئلوں پر ہم لوگ جناب ایوب ایڈووکیٹ صدر انجمن کی قیادت میں اکثر ملتے رہے جس میں ہم لوگوں کے علاوہ سید جعفر امام مرحوم، کامریڈ علی اشرف، شری سنیل مکرجی، عزیزہ نقی امام صاحبہ، نثار احمد خاں ایڈووکیٹ وغیرہ ساتھ ہوتے ایک بار تند و ترش گفتگو بھی ہو گئی۔

کسی مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس گرتی ہوئی تہذیب کی دیوار پر کب تک پشتہ لگاتے رہیں گے۔ جناب ایوب صاحب مرحوم، جناب کا مرٹیڈ علی اشرف اور شری ستیل کرجی نے اس کا بُرا مانا اور مرحوم ایوب صاحب نے فرمایا کہ حکومت ہم لوگوں کو ایک فہرست دیدے، تاکہ ہم لوگ اسے ترک کردیں۔ مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب بڑے ہی متحمل اور بردبار، شریف النفس شخص تھے، صرف یہ کہکر گفتگو ختم کردی کہ آپ لوگ جذبات میں آگئے، میرا منشاء وہ نہ تھا جو آپ لوگوں نے سمجھا، بہرکیف اب تو میں چند ہی مہینے میں بہار سے لوٹ رہا ہوں کہ آپ کے مطالبات تو ابھی پورے ہوجائیں گے لیکن آیندہ کیا ہوگا وہ میں نہیں کہہ سکتا۔

حضرت مولانا آزاد علیہ الرحمہ کی یادگار بہار میں منانے کے منصوبے کے تحت، مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی کی تشکیل ہوئی جس کے سرگرم اور روح رواں لوگوں میں جناب شاہ مشتاق احمد، جناب عبدالاحد محمد نور، وزیر مملکت بہار، جناب عبدالقیوم انصاری، سید عقیل صاحب بہار شریف وغیرہ تھے، میں بھی اس کا ایک اساسی ممبر اور مجلس عاملہ کا ایک رکن تھا۔ چنانچہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر شری کرشن سنہا وزیراعلیٰ بہار نے صدارت فرمائی اور جناب ذاکر حسین نے افتتاح فرمایا۔ اپنے افتتاحیہ خطبے کے دوران آپ نے فرمایا کہ:

"زندہ قومیں اپنے مُردوں کو بھی زندہ رکھتی ہیں اور مُردہ قومیں اپنے زندوں کو بھی مُردہ کردیتی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ مقولہ مسلم معاشرہ پر پورے طور پر صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر صاحب کی گورنری کے دور میں بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے خلاف ایک سازشی حلقے نے حکومت بہار کا ایک نوٹیفکیشن شائع کرانے میں کامیابی حاصل کرلی جس میں بہار ریاستی انجمن ترقی اُردو اور اس کے ساتھ آٹھ، دس دیگر مسلم جماعتوں کو فرقہ وارانہ انجمن قرار دیا تھا اور اس کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس فہرست میں جمیعۃ العلماء بہار اور رانچی کی ایک مسلم پنچایت کا بھی نام تھا۔ اس کے خلاف جناب غلام سرور اور میں نے بڑے ہنگامے کئے اور غالباً لیڈی امام صاحبہ کی قیادت میں ہم لوگوں کا وفد گیا تھا جس میں رامانند سنگھ وغیرہ سبھی لوگ تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو جب میمورنڈم پیش کیا گیا، صورت حال بتائی گئی کہ ریاستی انجمن اس مرکزی انجمن کی شاخ ہے جس کے آپ حال تک صدر رہ چکے ہیں۔ حکومت کے اس اقدام سے وہ بیحد برافروختہ ہوئے اور چیف سکریٹری سے باز پرس کی۔ جناب ایوب صاحب کو مشورہ دیا کہ بہار یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے مل کر

معلوم کریں کہ شاید یونیورسٹی کا یہ اقدام ہو۔ مگر اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر دکھن رام نے بھی اس اقدام پر سخت افسوس کا اظہار کیا اور بتایا کہ یونیورسٹی کے پاس کوئی ایسی ایجنسی نہیں ہے کہ وہ معلوم کرے کہ کون فرزند اردو ہے اور کون نہیں ہے" اور پھر اس یونیورسٹی کو ضرورت بھی کیا ہے۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور چند ماہ کے بعد رانچی گورنر کیمپ سے ایک پوسٹ کارڈ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا جس میں تحریر تھا کہ

> "متعلقہ معاملے میں کافی تفتیش کی گئی۔ حکومت کا کوئی شعبہ اس سرکلر کے بھیجے جانے کا اقرار نہیں کرتا اور لاعلمی ظاہر کرتا ہے۔ اب آپ اسے نسیاً منسیا سمجھیں اور انجمن کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔"

اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انجمن سے وابستہ ۵۰ فیصد پروفیسر اس سرکلر کی اشاعت کے بعد انجمن سے الگ ہو گئے اور پھر جب ایمرجنسی زادی انجمن ترقی اردو بنی ہے تو وہ مذکورہ پروفیسر صاحبان سرکاری انجمن میں نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں سے بے حد خوش رہتے تھے۔ اُردو کے تحفظ و بقا کے مسئلے پر انجمن کی جدوجہد سے وہ بے حد متاثر تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ میں گورنر کیمپ رانچی سے جناب غلام ربانی تاباں کی معرفت ایک دستی خط میرے نام بھیجا تھا جس میں ریاستی انجمن ترقی اُردو کی خدمات کا اعتراف اور جناب تاباں صاحب کے ساتھ تعاون کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین شرافت نفسی اور تحمل و بردباری میں بے مثال شخصیت کے مالک تھے۔

۱۹۵۱ء میں مرکزی انجمن ترقی اُردو کے نمائندہ خصوصی جناب خبیر بھوروی بہار میں انجمن کی شاخ قائم کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ پرانے ملاقاتی کی حیثیت سے وہ میرے پاس آئے اور مطلب کی بات بیان کی میں انہیں پروفیسر اختر اُرینوی مرحوم کے پاس لے گیا۔ انھوں نے ایک دوسرے صاحب کے پاس بھیج دیا، جو ایک انجمن ترقی اُردو کے مالک تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے یومنی میں ساتھی یا ملاقاتی بھی رہ چکے تھے، ان کے پاس بھی لے گیا۔ انھوں نے خبیر بھدوی صاحب اور مجھے دوسرے دن عصرانہ پر طلب کیا اور پر تکلف عصرانہ کھلایا۔ کھلا پلا کر بابائے اُردو عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا آزاد، قاضی عبدالغفار مرحوم وغیرہ جملہ حضرات کو اتنی سنائیں کہ ہم لوگ سکتے میں رہ گئے اور پھر یہ کہکر خبیر صاحب کو چلتا کیا کہ میں اپنی انجمن کو ایسے لوگوں سے وابستہ انجمن کے ساتھ ملحق نہ کروں گا۔ آپ میں ہمت ہے تو دوسری انجمن بنا لیں۔ چنانچہ بہار ریاستی انجمن قائم ہوئی۔ جناب خبیر بھدوی صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنی رپورٹ دی مگر وہ کچھ نہ بولے۔

# سیّد محمد احمدؔ

• سیّد محمد احمد صاحب: پیدائش ۱۹۳۵ء بمقام پٹنہ۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، رانچی سے زراعت و کاشتکاری میں ڈگری اور ٹوکلائی (آسام) سے چائے کا اعلیٰ ڈپلوما لیا۔ محکمۂ زراعت حکومت بہار سے منسلک ہو جانے کے بعد قانون کا امتحان پاس کیا، ۱۹۷۸ء سے ملازمت سے مستعفی ہو کر پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

••

میں آئی۔ایس۔سی کا ایک طالب علم تھا اور وہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ مگر جب ہم نے ان کو دیکھا تو خوب دیکھا اور جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا، بلکہ بڑھ کر پایا۔

سبھی طالب علموں کی طرح میرے لیے بھی انہیں دیکھنے اور سننے کے موقعے، یونیورسٹی کی مختلف تقریبات میں ملتے تھے۔ میں نے ان کو یونیورسٹی یونین میں دیکھا، اسٹریچی ہال میں دیکھا، دنیا کے عظیم رہنماؤں کے ساتھ، جو علیگڑھ مہمان ہو کر آتے تھے، ان کے ساتھ دیکھا۔ پھر ہم نے انھیں طالب علموں کے درمیان میں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ ایک سے ہی نظر آئے۔

اونچا قد، قدرے بھاری جسم، بہت بڑا چہرہ اور اس پر سیاہ چشمہ، کھلتا ہوا گورا رنگ، کھری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا۔ چال آہستہ اور بھاری قدموں میں۔ لباس میں ٹخنوں سے نیچی شیروانی، پورے سر کی ٹوپی، ذرا اونچا پاجامہ اور عموماً پمپ شو جوتہ۔ بیٹھنے میں دونوں ہاتھ برابر سے گھٹنوں پر رکھتے تھے۔

اتفاق کہیے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ پر بھی خصوصی توجہ دی ــــ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہوا: کچھ ہی دن قبل عرب کے شاہ ابن سعود ہندوستان آئے تھے اور مسلم یونیورسٹی بھی دیکھ کر گئے۔ شاہ نے ڈاکٹر صاحب کو ایک زربفت عربی کپڑوں کا جوڑا تحفتہً دیا تھا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد وی۔ ایم ہال میں ایک فینسی ڈریس شو تھا۔ تقریباً سبھی لڑکے کچھ نہ کچھ لباس تبدیل کیے ہوئے تھے۔ شام کے وقت ڈاکٹر صاحب جوبلی ہوسٹل کے کامن روم کے سامنے اپنی کار سے آئے اور پورے عربی لباس میں اپنی کار سے نمودار ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب کا اس لباس میں جاہ وجلال ابھی تک میری نظروں میں ہے۔ میں نے اس فینسی ڈریس میں کوئی دلچسپی نہیں لی تھی اور عام لباس میں لوگوں سے کچھ دور پر کھڑا تھا۔ جیسے ہی ڈاکٹر صاحب اپنی گاڑی سے باہر نکلے، اساتذہ اور لڑکوں نے ان کو گھیر لیا۔ پھر فنکشن اور لباس پر گفتگو اور ہنسی کا ایک سلسلہ چل گیا۔ مشکل سے کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ میں نے دور کھڑے ہوئے ڈاکٹر صاحب کو بھیڑ میں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس وقت شبہ ہوا کہ یہ میرا شک ہے مگر پھر فوراً ہی ڈاکٹر صاحب لڑکوں کے

درمیان میں سے نکل کر میری طرف آ رہے تھے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا اور جب وہ بالکل قریب آ ہی گئے تو میں نے جلدی سے بڑھ کر السلام علیکم کہا۔ انھوں نے سلام کا جواب دے کر مجھ سے پوچھا "آپ نے کوئی لباس تبدیل نہیں کیا" میں نے کہا کہ جی ہاں۔ بس ایسے ہی، اس پر وہ بولے "کچھ لباس بھی تبدیل کیا ہوتا تو اچھا معلوم ہوتا" پھر وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر سبھوں میں واپس آئے اور مجھے بھی سبھوں میں شامل کر لیا۔

ذاکر صاحب کی یوں تو بے شمار تقریریں اور جملے یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ مگر اُن کی ایک نصیحت جو انھوں نے ہم طالب علموں کو کی تھی وہ یاد رہ گئی۔ انھوں نے کہا تھا کہ "لوگوں کی یہ عادت ہو جاتی ہے کہ دوسروں کی شکایتیں کریں یا ان کی کمزوریاں ظاہر کریں، تم یہ عادت بنا لو کہ دوسروں کی تعریف کیا کرو۔"

پھر ڈاکٹر صاحب کو پٹنہ میں دیکھا، جب وہ بہار کے گورنر ہو کر آئے۔ ہم علیگڑھ اسٹوڈنٹس نے ان کو بانکی پور کلب میں مدعو کیا تھا۔ گورنر کی حیثیت میں (اگرچہ ان کی کار سے گورنر کا جھنڈا اُترا ہوا تھا)، ان کو معزز اشخاص، جنھوں نے علیگڑھ میں تعلیم پائی تھی اور سرکاری افسران نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ ڈاکٹر صاحب بدقّت تمام اس حلقے سے نکلے اور ہم لوگوں تک جو ایک طرح سے الگ چھٹ گئے تھے، آئے اور ہم لوگوں کو ساتھ لے کر کلب کے ہال میں داخل ہوئے۔ ان کے WELCOME ADDRESS میں سبھی لوگ انگریزی میں بولے ہے۔ جب ڈاکٹر صاحب کھڑے ہوئے تو اُنھوں نے کہا کہ یہ ہمارے بچّے ہیں۔ ان سے میں ہمیشہ اُردو میں باتیں کرتا رہا ہوں۔ آج بھی اُردو ہی میں باتیں کروں گا اور اُردو ہی میں اپنی تقریر کی۔

●●

# شاہ سید ریاض الرحمن

[ شاہ سید ریاض الرحمن صاحب، کشمیری کوٹھی، پٹنہ ) پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء بمقام پٹنہ سیٹی۔ رام موہن رائے سیمنری اور بی۔ان کالج سے تعلیم یافتہ، ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۸ء پٹنہ میونسپل کارپوریشن اور پٹنہ واٹر بورڈ کے ممبر رہے۔ انجمن ترقی اُردو پٹنہ سیٹی کے اعزازی شریک معتمد بھی رہ چکے ہیں۔ یتیم خانہ انجمن خادم الاسلام پٹنہ سیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر ہیں ]

○

یہ ۲۲ اگست ۱۹۵۷ء کی بات ہے جب میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب گورنر بہار سے راج بھون پٹنہ میں ملا۔ میں ۱۰ بجے دن میں ڈاکٹر صاحب کے چیمبر میں لے جایا گیا۔ جاتے وقت فطری طور پر کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا لیکن جب چیمبر میں پہنچا اور ڈاکٹر صاحب سے سامنا ہوا تو سلام علیک کے بعد انھوں نے کھڑے ہو کر فرمایا، تشریف لائیں اور پھر بیٹھنے کو کہا۔ مزاج پرسی کے بعد انھوں نے گفتگو شروع کی۔ انداز گفتگو ایسا تھا جیسا کہ ہم ایک دوسرے سے بہت قریب رہے ہوں۔ چنانچہ میں چند منٹ ہی میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں گورنر سے نہیں، بلکہ ایک شفیق اور مخلص سے باتیں کر رہا ہوں۔ انھوں نے گفتگو کی ابتدا اس طور پر کیا کہ "آپ تو کارپوریشن کے ممبر ہیں اور یہ سمجھتے ہوں گے کہ یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں صفائی ستھرائی زیادہ ہے۔ اس لئے یہاں مچھر نہیں ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں بھی مچھروں کی کمی نہیں ہے۔" پٹنہ شہر کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شہر تو بس پچھم سے پورب تک چلا گیا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔" چند دن پہلے ۱۵ اگست کی تقریب ہوئی تھی اس کے متعلق فرمایا کہ "یہاں تو کوئی سجاوٹ دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں جب علی گڑھ میں تھا وہاں تو میں نے سجاوٹ کے لئے مستقل سامان مہیا کر رکھا تھا، جب بھی ضرورت پڑے، شہر کی سجاوٹ ہو سکے۔" ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے قیام جرمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "جرمنی بہت صاف ستھری اور خوب صورت جگہ ہے، وہاں تمام مکانوں میں پھولوں کے گملے کھڑکیوں میں لٹکے رہتے ہیں۔ سڑکوں پر روشنی کی قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں۔" آپ نے فرمایا کہ "جب میں سڑکوں پر سے گذرتا تھا اکثر اس وقت اسکولی بچے اور بچیاں بھی آتے جاتے نظر آتے تھے اور جب مجھ اجنبی پر ان لوگوں کی نظر پڑتی تو نہایت ادب سے سلام کرتے۔ اُن لوگوں کا سلام اس ملک کے بچوں اور نوجوانوں کی طرح تمسخرانہ نہیں ہوتے۔"

● ●

# انوار کریم

• انوار کریم صاحب: پیدائش ۵ اکتوبر ۱۹۱۶ء
علی گڑھ سے ۱۹۳۹ء میں ریاضی میں ایم۔ایس۔سی کیا
۱۹۴۱ء میں بہار میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۵۷ء
میں آئی۔ اے۔ ایس کے سینئر اسکیل پر ترقی پائی۔ فروری
۱۹۶۵ء میں جموں و کشمیر میں ڈویژنل کمشنر پھر ایڈیشنل
چیف سکریٹری کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ نومبر ۱۹۶۳ء میں
ریٹائر ہو کر بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔
اب گوشۂ عافیت میں ہیں۔ ••

○

آج سے تقریباً ۴۵ سال کی بات ہے کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو پہلے پہل دیکھا تھا۔ اس وقت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سال شاید ۱۹۳۷ء تھا یا ۱۹۳۸ء، مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے وہ یونیورسٹی یونین میں معاشیات کے کسی ادق پہلو پر تقریر کرنے آئے تھے۔ میں سائنس کا طالب علم ہوتے ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ موضوع تقریر سے میں بالکل نابلد ہوں، اپنے اور ساتھیوں کے ہمراہ یونین ہال گیا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس وقت کے علیگڑھ میں ڈاکٹر صاحب کے سیاسی اور معاشی نظریہ سے سبھی طالب علم متفق تھے، لڑکوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ذاکر صاحب کے خیالات کی سخت مخالف تھی۔ لیکن اُن کی شخصیت، علمی صلاحیت اور ان کے جذبۂ ایثار کے سبھی مداح تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی تقریر سُنی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب کے شباب کا عالم تھا۔ اُن کی جاذب نظر شخصیت اُبھر رہی تھی۔ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ڈاکٹر صاحب سے ملنے اور اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع پھر اس وقت ملا جب وہ صوبہ بہار کے گورنر مقرر کیے گئے۔ اس وقت میں سکریٹریٹ میں ایک محکمہ کے سربراہ (HEAD OF DEPTT) کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔

جب تک ڈاکٹر صاحب بہار کے گورنر رہے، ان کا معمول تھا کہ باری باری چند محکموں کے سکریٹریز اور سربراہوں کو راج بھون میں رات کے کھانے پر مدعو فرماتے۔ اس طرح ہر دو چار ماہ میں مجھے بھی ان دعوتوں میں شریک ہونا پڑتا۔ گو ذاتی طور پر مجھے اس طرح کی دعوتوں سے کچھ کوفت بھی ہوتی کیونکہ دعوت میں شرکت کے لیے سرکاری لباس میں ملبوس رہنا ضروری ہوتا تھا۔ تاہم ان دعوتوں میں، مَیں ضرور شریک ہوتا۔

گنے چنے لوگوں کو چھوڑ کر، ہم سرکاری ملازموں کی عمومی کمزوری یہ ہے کہ جس محکمہ سے ہم لگے ہوتے ہیں اس محکمہ کے مسائل کو ہی حکومت کے اہم ترین مسئلے تصور کرتے ہیں۔ ہماری دلچسپی اور ذہنی کدوکاوش عموماً اپنے محکموں تک ہی مرکوز و محدود رہتی ہے۔ اس لیے ہماری گفتگو کے موضوع بھی زیادہ تر یہی مسئلے رہا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر

صاحب شاید سرکاری افسروں کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ اس لیے جب کسی محکمہ کے سکریٹری یا سربراہ سے گفتگو کرتے تو پہلے کچھ اِدھر اُدھر کی عام دلچسپی کی باتوں سے سلسلہ شروع کرتے اور رفتہ رفتہ گفتگو کا رخ محکمہ کے امور کی طرف موڑ دیتے۔ محکمہ کے مسائل پر بات چیت کرتے ہوئے، ظاہر ہے کہ ہر افسر اپنے کو محفوظ سرزمین پر پاتا اور خود اعتمادی کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا۔ ڈاکٹر صاحب سُنتے زیادہ تھے اور بولتے کم تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب براہ راست حکومت کی کارکردگیوں و دیگر مسائل کے متعلق واقفیت حاصل کرتے تھے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ جب بھی وہ ہم جیسے افسروں سے بات کرتے تو ہماری ذہنی اور علمی سطح پر آکر ہی باتیں کرتے۔ ہمیں کبھی اپنی کم مائگی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ دائرۂ گفتگو زیادہ تر ہماری محدود دلچسپی کے موضوع تک ہی رکھتے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ہم میں سے جو بھی ان سے ملتا، ایک خوشگوار تاثر لے کر واپس لوٹتا۔

●●

# ڈاکٹر مسعود الحق

[ ڈاکٹر مسعود الحق صاحب: پیدائش نومبر ۱۹۰۱ء، ۱۹۲۸ء میں پٹنہ میڈیکل کالج سے گریجویشن۔ ۱۹۳۰ء میں پٹنہ میڈیکل کے شعبۂ اناٹومی میں بحیثیت لکچرر مقرر ہوا، اور بحیثیت صدر شعبہ ریٹائر ہوئے۔ ۱۹۶۰ء میں نالندہ میڈیکل کالج پٹنہ کی بنا ڈالی اور اناٹومی کے پروفیسر ایمریٹس کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ]

ڈاکٹر ذاکر حسین سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ آل انڈیا سائنس کانگریس میں شرکت کے لئے نمائندہ کی حیثیت سے پٹنہ تشریف لائے۔ یہ آزادی سے قبل کی بات ہے۔ وہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے ساتھ جو اس وقت بہار کے وزیر تعلیم تھے، قیام فرما تھے۔ انڈین سائنس کانگریس کے مندوبین میں سے ایک کا قیام میرے ساتھ تھا۔ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ اس دعوت میں آزاد ہند فوج کے کرنل محبوب، جو بعد میں کئی ممالک میں سفیر کے عہدے پر بھی فائز رہے، اور مسٹر قرنی (آئی سی ایس) جو ان دنوں حکومت بہار میں ملازم تھے، شریک تھے۔ کھانا ختم ہوتے ہی ذاکر صاحب نے مجھ سے یہ تصدیق چاہی کہ کیا ان کے ڈرائیور نے بھی کھانا کھا لیا؟ گرچہ میں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر دیا تھا لیکن اس بات سے مجھ پر ذاکر صاحب کے نظریہ اور غریبوں کے لئے ان کی محبت آشکارا ہوئی۔

# سیّد علی عبّاس

• سیّد علی عبّاس صاحب، پیدائش ۱۹۱۱ء،
بمقام کھجوا (سارن)۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۴ء میں گریجویشن
کے بعد جنوری ۱۹۳۶ء میں انڈین پولس سروس (آئی۔پی۔ایس)
میں داخل ہوئے جہاں سے ڈی۔آئی۔جی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔
۱۹۴۳ء میں انڈین پولس میڈل اور ۱۹۴۸ء میں کنگس پولس
میڈل حاصل کیا۔ ۱۹۵۰ء میں سینئر سی۔آئی۔ڈی ٹریننگ
کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ (انگلینڈ) گئے۔ ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔
آپ نے ۱۹۵۸ء میں پٹنہ میں 'کاروان کلب' اور
۱۹۶۶ء 'غالب کلب' کی بنا ڈالی تھی۔ 'بزم کاف' کے بانی بھی
آپ ہی ہیں جس نے ۱۹۷۴ء میں کلیم عاجز صاحب کی کتاب
"وہ جو شاعری کا سبب ہوا" شائع کی۔
آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے آپ کی متعدد تحریریں نشر ہو کر
مقبول عام ہو چکی ہیں۔ "نفیس اور انیس کی شاعری" آپ کی اہم
تصنیف ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پٹنہ میں مقیم ہیں۔

حیرت ہوئی کہ بیدآر صاحب نے مجھے کوئی سخت ہوم ٹاسک کرنے کو نہیں دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، ان کی عظمت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالنے کو نہیں کہا جو میرے بس کی بات نہ تھی۔ بیدآر صاحب نے صرف اپنے ذاتی تجربے، مشاہدے اور ذاکر صاحب سے ملاقات کے قصے سننے چاہے جو کام بڑی آسانی سے ہو سکتا تھا۔ بیدآر صاحب مجھے تو ذاکر صاحب کے عاشقوں میں سے لگے اور کسی عاشق کا دل رکھنا باعثِ ثواب ہو کہ نہ ہو، انسانی ہمدردی کا تقاضا یقیناً ہوتا ہے۔ اس مقالے کو میری بیداری کا ثبوت سمجھا گیا تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر ہو کر پٹنہ آئے تو اُن دنوں میں پٹنہ میں سینیئر سپرنٹنڈنٹ اوف پولیس ہوا کرتا تھا۔ اس حیثیت سے مرحوم کا اکثر ساتھ ہوا اور میں نے انھیں بہت قریب سے دیکھا۔ کیا خوب انسان تھے سبحان اللہ۔

۱۹۵۸ء میں سائنس کالج کے بزم سخن کے سالانہ جلسے میں ذاکر صاحب مہمان خصوصی ہو کر تشریف لائے۔ اُن دنوں اُردو کو سرکاری زبان منوانے کی تحریک زوروں پر چل رہی تھی۔ اپنے شکوے سنانے کے لیے اور داد ولا جانے کے لئے اُردو کے کچھ پاسبان اور حامیان ایسے مواقع کو کب ہاتھ سے جانے دیتے۔ چنانچہ اس بڑے جلسے میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ کسی نے گورنمنٹ کی بے رخی کا گلہ کیا، تو کسی نے ہندی کے پرستاروں کی رقابت کا ذکر کیا۔ ہمیشہ چندہ مانگنے والے اور امداد طلب کرنے والے کچھ مولویوں نے اُردو دانوں کی مفلسی اور بے بسی کا رونا رویا اور ہاتھ پھیلایا۔ آخر میں جناب وفاؔ ملکپوری نے اپنے خاص ترنم میں ذاکر صاحب کو خطاب کرتے ہوئے ایک "شکوہ" نما نظم سنائی۔ یہ تو نہیں کہا "رحمتیں تیری ہیں اغیار کے کاشانوں پر"... اور نہ یہ کہا "ہم وہی سوختہ ساماں ہیں، تجھے یاد نہیں"۔ پھر بھی بہت کچھ کہہ گئے اور اُردو کے لیے سرکار کی توجہ، امداد اور پشت پناہی کی ضرورت کا ذکر کر گئے۔ نظم ختم ہوئی اس مصرع پر "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا چاہیئے"۔ خوب تالیاں پڑیں، خوب واہ واہ ہوئی۔ اور ذاکر صاحب خاموش سر جھکائے سنتے رہے۔ آخر میں جب ذاکر صاحب نے تقریر اپنی شروع کی، تو وفاؔ صاحب کی نظم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :

"جو کوئی بیچ منجدھار ڈوبنے سے بچنے کے لیے تنکا تلاش کرنا شروع کرے اور کہیں تنکا دکھائی دیا

تو اسے سہارا سمجھ کر اس پر لپکے تو اس کا کیا حشر ہوگا، ظاہر ہے۔ ایسے کو ڈوبنے سے کون بچا سکتا ہے۔ ظالم موجوں اور طوفانوں سے لڑنے کے لیے مضبوط ہاتھ پیر چاہیے۔ تیرنا جاننا چاہیے، ہمت چاہیے، عزم چاہیے، خود اعتمادی چاہیے۔ ورنہ پار اُترنے کے خواب، خواب ہی رہیں گے۔ ایسے کمزور اور بے ہاتھ پیر والوں کے لیے بہتر ہے وہ ساحل کی آسودگی میں پڑے سسکتے رہیں اور غزلیں گنگناتے رہیں"
ذاکر صاحب نے فرمایا :

" اُردو نے جب جنم لیا تھا تو وہ عربی فارسی کا دَور تھا۔ اُس وقت کے سلاطین اور رؤسا جن کی دیوان خاص یا دیوان عام تک رسائی تھی، وہ اُردو میں کسی سے ہمکلام ہونے کو معیوب سمجھتے تھے اس لیے کہ اُردو تھی بازاری زبان۔ نیچے طبقے والوں کی زبان، سپاہیوں، بیوپاریوں کی زبان۔ شرفا کی زبان کچھ اور ہوتی تھی۔ وہ تو کچھ تو پیر و مرشد، کچھ فقیر و درویش، کچھ سنت سادھو، کچھ کبیر، تلسی داس۔ امیر خسرو، اور میر ایسے چٹائی پر بیٹھنے والے تھے، جنھوں نے اُردو کو وہ توانائی اور عوام پسندی بخشی کہ اُردو لال قلعہ میں اٹھلاتی، لچکتی، اکڑتی پہنچی اور ظفرشاہ کو تو دیوانہ بنا کر چھوڑا۔ پھر تو اُردو کی نورجہانی دلّی سے لے کر دکن تک اپنا لوہا منوا گئی۔ وہ غریبوں، فقیروں، محتاجوں اور پریشان حال لوگوں کی جد و جہد کا کرشمہ تھا کہ اُردو پروان چڑھی۔ نہ شاہی خزانوں سے کوئی امداد ملی نہ مغل سورماؤں نے پشت پناہی کی۔ بلکہ مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کو اردو ہی کا سہارا لینا پڑا۔ جس سے حاکم و محکوم میں رابطہ قائم ہوتا۔ اُردو کبھی حکمرانوں کی محتاج نہ ہوئی، بلکہ حکمرانوں نے اُردو کا سہارا لیا۔ تو تاریخ کے واقعوں سے سبق نہ لیا جائے تو پھر تو تاریخ اور الف لیلیٰ میں فرق ہی کیا ہوگا"؟

●●

# حسن احمد قادری

[ حسن احمد قادری صاحب: پیدائش ۱۶ر جنوری ۱۹۴۳ء بمقام چھوٹی پورنا (مونگیر) وطن پھلواری شریف۔ والد کا نام شاہ فضل احمد قادری صاحب جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے ناظم ہیں۔ ابتدائی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ اور شمس الہدیٰ پٹنہ۔ حکومت بہار کے شعبۂ صنعت و حرفت سے منسلک ہیں ]

## والد صاحب کے ساتھ راج بھون پٹنہ میں ملاقات کی روداد:

.... ڈاکٹر صاحب، والد صاحب سے مخاطب تھے اور فرما رہے تھے کہ شاہ سلیمان ندوی پھلواروی کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی عالمانہ تقریریں سنی ہے۔ سیرت پر جو انھوں نے کتابیں لکھی ہیں، اس کے مطالعہ کا موقع ملا ہے۔ فرما رہے تھے کہ بڑے اچھے مقرر، باصلاحیت انسان اور عظیم شخصیت تھی۔ ان کے جانشین کے متعلق دریافت حال کیا۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ آپ کے خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے کتب خانہ میں تو قدیم قیمتی نسخے ہوں گے؟

**والد صاحب:** جی ہاں۔

**ڈاکٹر صاحب:** تو آپ اسے خدابخش لائبریری میں دیدیں تاکہ عرصہ تک یہ سرمایہ محفوظ رہ سکے۔ میں اس لائبریری کی عمارت کو ایسا بنانا چاہتا ہوں جس سے کتابوں اور ان کے اوراق پر برسات کی نمی، گرمی کی تمازت وغیرہ کا اثر نہ ہو اور اس کے لئے ایک جامع اسکیم بنا کر میں نے حکومت ہند کو لکھ بھیجا ہے۔ میں کوشاں ہوں اور میری دلی خواہش ہے کہ ایشیا کی یہ تاریخی لائبریری مثالی رہے۔

**والد صاحب:** خانقاہ مجیبیہ کی لائبریری خلوت شریف سے منسلک ہے۔ صاحب سجادہ فرصت کے اوقات مطالعہ فرماتے ہیں۔

**ڈاکٹر صاحب:** میں ان کے لئے خدابخش لائبریری میں حجرہ بنوا دوں گا۔

**والد صاحب:** وہ بھی معمول کے خلاف ہوگا۔ چونکہ وہاں کے گدی نشین کے قواعد و ضوابط کے مطابق وہ حج بیت اللہ کے علاوہ اور کسی دوسرے کام سے بستی سے باہر نہیں جا سکتے۔

**ڈاکٹر صاحب:** تو پھر آپ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کی لائبریری کے لئے ایک عالیشان عمارت بنوائیے۔ میں یہاں ڈاکٹر سری کرشن سنہا، وزیر اعلیٰ بہار، جو کہ تعلیمی ذوق رکھتے ہیں، وہاں ایک اچھی عمارت بن جائے گی، تاکہ بزرگوں کا یہ بیش بہا سرمایہ محفوظ اور اچھی حالت میں رہ سکے۔

●●

# سیّد احمد علی آزاد

• سیّد احمد علی آزاد مرحوم: پیدائش، بنارس ۱۹۰۷ء۔ احباب نے آزاد منش ہونے پر انھیں آزاد کہنا شروع کیا جو ان کے نام کا جز ہو گیا۔ تحریک ترک موالات کے دوران خادمانِ جامعہ کی صف میں شامل ہوئے۔ جامعہ سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ پھر ۱۹۳۶ء میں ذاکر صاحب نے انھیں معلمی کی تعلیم و تربیت کے لیے ٹریننگ اسکول موگا (پنجاب) بھیجا، جہاں سے کامیابی کے بعد تعلیمی مرکز قرول باغ کے نگراں مقرر کر دیے گئے۔

آپ کا نام جامعہ کے جانثاروں میں سرِ فہرست ہے۔ ذاکر صاحب بھی آپ کی خدمات، جوش اور لگن کے مداح تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۷۶ء کو وفات پائی۔

••

جہاں وہ بڑوں کے ذاکر صاحب تھے وہاں بچوں کے ذاکر صاحب بھی تھے۔ وہ جامعہ سے جانے کے بعد اُونچے اُونچے عہدوں پر پہنچے لیکن بچوں سے ان کی دلچسپی اور لگاؤ کسی طرح کم نہیں ہوا تھا۔ رانچی سے لکھتے ہیں:

"نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ خوشی ہوئی کہ آپ چھٹی جماعت سے "ہمالہ کی جھیلیں" پروجیکٹ چلوا رہے ہیں۔ بہت دلچسپ موضوع ہے اور مجھے یقین ہے کہ بچے بڑے انہماک سے اس منصوبہ کو کر رہے ہوں گے۔ اور بہت کچھ سیکھیں گے۔ کیا عجب ہے کہ کسی دن آپ کا کوئی شاگرد کسی چوٹی کو فتح کرے۔ اُس وقت اس پروجیکٹ کو ضرور یاد کرے گا۔"

جب تک جامعہ میں رہے بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے۔ وہ بچوں کو نہ صرف تعلیم دیتے تھے بلکہ ان کے لئے اچھی اچھی کہانیاں اور اسباق بھی لکھتے تھے۔ مکتبہ جامعہ نے پہلی جماعت کے بچوں سے لے کر آٹھویں جماعت تک کے بچوں کے لئے جو ریڈریں شائع کی ہیں ان میں کتنے ہی اسباق ذاکر صاحب کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کے جستہ جستہ حصے تو سب ہی اسباق میں ہیں۔ وہ بچوں کے لئے لکھتے تو تھے لیکن کہا کرتے تھے کہ بچوں کے لئے لکھنا بڑا مشکل فن ہے۔ مغرب کے مصنفین اس پر اچھی قدرت رکھتے ہیں، ہندوستان میں یہ فن ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔

انھیں بچوں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ ان کی دلچسپی کے لئے جامعہ کے مدرسہ ابتدائی میں خرگوش خانہ، کبوتر خانہ، چڑیا خانہ، مرغی خانہ، باغبانی، بچوں کی دکان، بچوں کا بینک، بچوں کا خوانچہ قائم کرایا۔ بچے ان میں بڑے انہماک سے کام کرتے تھے۔ وہ LEARNING BY DOING کے قائل تھے۔ اس کی پوری جھلک بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم میں موجود ہے۔ وہ منصوبی تعلیم میں بڑے امکانات دیکھتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں پٹنہ سے لکھتے ہیں:

"مرغی خانہ کا ایک نسخہ ملا۔ خط اور نسخہ دونوں کے لئے شکریہ قبول فرمائیں۔ 'مرغی خانہ' کتاب بہت اچھی چھپی ہے۔ بس اتنا ہی دیکھ پایا تھا کہ سعیدہ کی لڑکی نیلوفر جس نے ابھی ایک مرغی بٹھائی تھی اور پرسوں ہی اس کے نو بچے نکلے ہیں 'کتاب' اڑا لے گئی۔ آپ نے دیکھا 'کام' اور 'کتاب' کا ربط۔ اب تک وہ کتاب انھیں کے تصرف میں ہے۔"

ذاکر صاحب بچی خطوط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ جب تک بہار کے گورنر رہے، خود اپنے قلم سے جواب

لکھتے تھے ۔ اس کے بعد بھی اپنے قلم سے ہی جواب لکھ کر سکریٹری کو دیدیتے تھے اور وہ ٹائپ کرا کر خط لکھنے والے صاحب کے پاس بھیج دیتے تھے۔ خط کا جواب سکریٹری کو املا کرا دینے میں اور خود اپنے قلم سے جواب لکھنے میں جو فرق ہے اسے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ خود اپنے قلم سے جواب لکھ کر وہ اپنے دلی تعلق کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی تحریر پاکر جواب پانے والے کو جو خوشی ہوتی تھی اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو ان کے خطوط ملے ہیں۔ ان کے خطوط میں کہیں کہیں بڑے پتے کی باتیں لکھ گئے ہیں اور کہیں کہیں اپنے دلی جذبات کو ظاہر کر گئے ہیں۔ بہر حال یہ خطوط ان کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ یہ خطوط جب شائع ہوں گے تو بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر سکیں گے۔

وہ پرانے فن اور پرانی چیزوں کی قدر کرتے تھے۔ ہاتھ کی بنی ہوئی ابری کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ فن مشین کی ابری کے مقابلے میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ابری بنانے کے طریقوں پر انھوں نے ایک کتاب مجھ سے لکھوائی تھی جس کا مسودہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں اس وقت جالندھر اسٹیشن پر اُن کے سامان کے ساتھ گم ہوگیا، جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وہ کشمیر جا رہے تھے۔ جامعہ میں عرصے تک اُن کی ہدایات کے مطابق ہاتھ کی ابری بنتی رہی اور گتے کے ماڈلز میں ان کا استعمال ہوتا رہا۔ وہ خوشخطی کے فن کی بھی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے کمرے میں ہاتھ کے لکھے ہوئے کتبے آویزاں رہتے تھے۔ آخری عہد کے موقع پر شفیع الدین نیّر صاحب کی کتاب "غالب کی کہانی" کا ذکر ہو رہا تھا، فرمایا کسی اچھے کاتب سے لکھوایئے گا، پھر خود ہی فرمایا۔ اب اچھے کاتب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ محترم علی احمد مرحوم بڑے اچھے خطاط تھے اور جامعہ کے بچّوں کو خوشخطی لکھنا سکھایا کرتے تھے۔ ذاکر صاحب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور اُن کے فن کی قدر کرتے تھے۔ وہ پرانے قلمی نسخوں کے بڑے قدردان تھے۔ غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے، ایک صاحب کچھ قلمی کتابیں میرے کمرے میں لائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ذاکر صاحب بھی تشریف لے آئے اور ہر کتاب کو بغور دیکھا۔ پھر اُن سب کو جامعہ لائبریری کے لئے خرید لیا۔ ●●

(رسالہ جامعہ سے شکریہ کے ساتھ)

# ڈاکٹر رشید الوحیدی

[• ڈاکٹر رشید الوحیدی : پیدائش ۱۳ دسمبر ۱۹۴۲ء بمقام دیوبند، ۱۹۵۹ء میں دیوبند سے فاضل، ۱۹۷۱ء میں دہلی یونیورسٹی سے عربی ادب میں ایم اے اور ۱۹۷۸ء میں پی-ایچ-ڈی-۱۹۷۳ء سے جامعہ میں لکچرر کے عہدہ پر فائز ہیں، تصانیف میں 'خلافت بنی امیہ'، اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور حسن البصری : حیات اور کارنامے' (زیر طبع) قابل ذکر ہیں۔]

○

جامعہ ملیہ کے ایک چپراسی کی بچی کی شادی ہے۔ ایک کچے سے مکان کے سامنے چارپائیاں بچھی ہیں۔ ایک جگمگاتی ہوئی کار آکر رکی۔ ایک عظیم الجثہ بھاری بھرکم شخصیت نے مجھ پر سایہ کر لیا۔ مڑ کر دیکھا، منھ سے نکلا ارے ذاکر صاحب۔ میری گھبراہٹ بھانپ گئے۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے "میاں صاحبزادے شادی کس جگہ؟ راستہ کدھر سے ہے، چلو میرے ساتھ۔ لڑکی کے باپ کے گھر پہنچے۔ یہ "باپ" جامعہ میں ان کا پرانا خادم تھا (جس کو ذاکر صاحب' میرے ساتھی کہا کرتے تھے) باپ سے بغلگیر ہوئے۔ وہ زنان خانے میں لے گیا" نائب صدر جمہوریہ بلا تکلف چلے گئے۔ بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے حِنّائی لگے ہاتھوں پر ایک گڈی نوٹ کی تھمائی۔ باپ سے اجازت لی اور کار واپس گئی۔ میں اس واقعہ پر حاضر تھا۔

ایک بڑے میاں جی' جامعہ کے پرانے سقہ کا انتقال ہوا۔ واللہ اعلم کس نے پریسیڈنٹ ہاؤس کو اطلاع کردی : "آپ کا ساتھی قرول باغ سے آپ کو کھلا میں آپ کے ساتھ کام کرنے والا فلاں آج اللہ کو پیارا ہوگیا"۔ شام کو ۶ بجے ہم سب جامعہ قبرستان میں بڑے میاں کو لٹا کر واپس آ رہے تھے۔ ایک جگہ سڑک پر میں جا رہا تھا۔ پھر گاڑی رکی۔ ذاکر صاحب۔ گھبرائے ہوئے جلدی میں۔ کیا فلاں صاحب کو دفن کردیا۔ جی ہاں وہیں سے آرہا ہوں۔ اچھا! ایک منٹ توقف کے بعد ڈرائیور سے بولے۔ چلو میاں واپس۔ •

# سدانند منڈل

○ جناب سدانند منڈل : پیدائش ۱۹۲۶ء
بمقام سبور ( بھاگل پور ) ، سبور اگریکلچر کالج ( بھاگل پور )
سے زراعت میں ڈگری ، سبور اور پوسا ( سمستی پور ) سے
منسلک رہے۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں راج بھون ، پٹنہ
میں شعبۂ باغبانی کے انچارج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور
اب تک اس منصب پر فائز ہیں ۔

●●

ذاکر صاحب ایک بہت بڑے پھولوں کے پریمی تھے۔ یوں تو انھیں ہر پھول اور پودے سے پریم تھا، پرنتو گلاب سے انھیں ادھک پیار تھا۔ میں انھیں کے سمے ۱۹۵۹ء کی گارڈن سپروائزری میں آج بھو میں آیا تھا۔ پرنتم ساکچھار[1] کے دن ہی مجھے ان کے آرام کچھ میں پہنچا یا گیا کیونکہ اس دن ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میرے پہنچنے پر وہ اٹھ کر بیٹھے اور مجھ سے بھی بیٹھنے کو کہا گیا۔ اس کے بعد وہ باغبانی سمبندھی[2] انیکوں[3] سوال پوچھے جو مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آرہے ہیں، جو یاد ہے وہ اس پرکار ہے۔ ابھی تک کتنے پرکار[4] کے گلاب نکالے گئے ہیں؟ اور کون کون؟ میں صرف ۱۴ قسموں کے نام اور رنگ ہی بتا پایا تھا۔ گلاب کے پودے کن کن طریقوں سے بنائے جاتے ہیں؟ اس پر میں نے کل ۱۱ طریقے بتائے اور یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سبھی طریقے کتابی ہیں اور کامیابی ہے بھی تو ودیشوں میں ہی ہوتی ہے (ٹھنڈی جگہوں میں) بہار میں نہیں۔ یہاں کے لئے تین، چار طریقے ہی کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس پر وہ ہنس پڑے اور بولے تم ٹھیک کہتے ہو، میں نے بھی آزما کر دیکھا ہے، تین چار طریقے ہی یہاں کے لئے اُپیکت[5] ہیں۔ اس سمے میری بحالی کا آدیش انھوں نے دیدیا۔ دوسرے دن مجھے پھر صبح آٹھ بجے بلایا گیا اور ایک ویران جنگل دکھایا گیا جو شیشم، سپریس، جامن اور کئی پرکار کی جھاڑیوں سے بھرا تھا۔ اسے دکھاتے ہوئے مجھے کہا گیا کہ اس جنگل کو منگل میں بدل دو، ایسے گارڈن میں بدلو کہ جو لوگ ادھر آنے سے ڈرتے ہیں، وہ یہاں آکر بیٹھیں اور ان کے سہیوگ سے ہوا بھی ایسا کہ وہ ویران جنگل 'ذاکر کیاری' کے نام سے پرسدھ[6] ہوا۔ اسی سمے کی بات ہے کہ اس واٹیکا[7] کے لئے کچھ وشیش[8] گوبر کھاد کی آوشیکتا[9] تھی جس کے لئے میں سکریٹری صاحب سے کئی بار بول چکا تھا۔ پر اپنے ویست کاریہ وش وہ بھولتے رہے۔ ایک دن ذاکر صاحب اوپر سے اترتے ہی پہلے وہیں پہنچے جہاں کھاد کی آوشیکتا تھی۔ پہنچتے ہی وہ کھاد کے بارے میں پوچھے، تو میں نے کہا نہیں صاحب ابھی تک وہ نہیں آیا ہے۔ سنتے ہی وہ گمبھیر ہو گئے اور چپراسی کو بلوائے اور بولے کہ آج میں آفس کا کام اسی

---

۱- انٹرویو ۲- متعلق ۳- متعدد ۴- طرح ۵- مستقل مناسب ۶- مشہور ۷- پھلواری

۸- خاص ۹- ضرورت ۱۰- [illegible]

گارڈن میں کردوں گا۔ اس لئے میرے بیٹھنے کا انتظام اسی گارڈن میں کر دیا جائے اور ہوا بھی ویسا ہی۔ جب سکریٹری صاحب کو معلوم ہوا تو وہ ان سے ملنے آئے، پر وہ ان سے ملنے سے انکار کر دیئے۔ اس دن سے وہ نیمہ[1] پرتی[2] دن صبح سات بجے وہ گارڈن میں آجاتے تھے اور پورے گارڈن نرسری وغیرہ ہوتے ہوئے جنگل کی بھی سیر کرتے تھے۔ اسی بیچ جتنے بھی پیڑ پودے دیکھتے تھے سبھوں کا نام ساتھ میں رہنے والے چپراسی اور اسپیشل گارڈ کے سپاہی سے بھی پیڑ پودے کا نام پوچھتے جاتے تھے اور برابر یہی کہتے جاتے تھے کہ ویکتی[3] کو ہر چیز کی جانکاری رکھنی چاہیئے چاہے وہ مالی ہو یا مزدور، یا سپاہی۔

ان کے باہر جانے یا آنے کے سمے انھیں ہمیشہ ایک گلاب کا بٹن دیا جاتا تھا۔ پھول لینے کے بعد وہ ہمیشہ شکریہ ادا کرتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنا اور پریوار کا خیریت وہ ادشیہ[4] ہی پوچھتے تھے، کیسے ہیں تمھارے بچّے، سب کیسے ہیں اتیادی[5]۔ ایسے تو کبھی کسی پر بگڑتے نہیں تھے۔ یدی[6] وہ کسی پر بگڑتے تھے تو سلامی دینے پر سلامی نہیں لیتے تھے تبھی ہم لوگ سمجھ جاتے تھے کہ ہم لوگوں سے کچھ غلطی ہوئی ہے جس سے کہ وہ ناراض ہیں۔ گھومتے گھومتے جب ان کا کرودھ[7] شانت ہو جاتا تھا تو وہ سمجھاتے تھے کہ تم سے اس پرکار کی غلطی ہوئی ہے جو بھوشیہ[8] میں نہیں ہونا چاہیئے۔

وہ ایک بہت بڑے ادھان[9] دشیشگیہ بھی تھے۔ وہ ہمیشہ ادھان کی بڑی بڑی پستکیں پڑھتے رہتے تھے، وہ اپنے بیڈ روم کے برآمدے میں گوبر، کھاد، مٹّی، بالو، آرگنیز کھاد اور سو پچاس گملے ہمیشہ رکھتے تھے اور فرصت پانے پر خود اپنے سے بیج بونا، پودہ لگانا، کٹنگ کاٹنا، کھاد اور پانی دینا اتیادی سب کیا کرتے تھے۔ ان گملوں میں کسی بھی مالی یا انیہ ویکتیوں کو پانی یا کوئی کرنے کی سخت مناہی تھی۔ وہ اپنے سبھی بچّوں کو بھی ۲۵-۲۵ گملے دیدیتے تھے جس کی دیکھ ریکھ بچّے خود ہی کرتے تھے اور تب وہ اپنے بچّوں کے اور گارڈن کے گملوں سے ملاتے تھے کہ کون سا پھول اچھا ہے اور کون سا پھول خراب ہے۔ انت میں خود کہتے تھے کہ پریکٹیکل اور تھیوری میں بہت ہی انتر ہے۔ اس کے بعد سارے گملے وہ ہم لوگوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ ●●

---

۱- پابندی ۲- ہر دن ۳- آدمی ۴- فرور ۵- وغیرہ- ۶- اگر ۷- غصّہ

۸- مستقبل ۹- باغبانی-

# حکیم محمد اشرف کریم

[• حکیم اشرف کریم : پیدائش مئی ۱۹۲۳ء۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے فاضل، ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ سے گریجویشن، ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ میں بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اور ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہوئے۔]

○

گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے مسائل کے حل کے لئے جناب ذاکر حسین صاحب سے طبی کالج کا ایک وفد ملا۔ جس میں جناب حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل جناب حکیم عبدالشکور صاحب مرحوم سینئر پروفیسر اور تیسرا یہ خادم بھی شامل تھا۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے گورنر ہاؤس بہار میں ۱۹۵۸ء میں میری پہلی ملاقات تھی۔ ذاکر صاحب مرحوم نے ہم لوگوں کی باتیں اور مطالبات بڑی توجہ سے سُنے اور مداخلت کر کے کسی حد تک پورے کئے۔

میری دوسری ملاقات ۱۹۵۹ء کے اوائل میں گورنر ہاؤس ہی میں ہوئی۔ اس مرتبہ بھی جناب حکیم عبدالاحد صاحب پرنسپل وفد کے قائد تھے۔ ہم لوگوں نے ۲ فروری ۱۹۵۹ء کو گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ میں "اجمل ڈے" منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس کے افتتاح کے لئے اُن سے گذارش کی گئی۔

" اجمل ڈے کے شاندار پنڈال میں مختلف مقررین کے علاوہ خود ذاکر صاحب کی بہت مؤثر افتتاحی تقریر ہوئی جس سے ذمہ داران حکومت خصوصاً اُس وقت کے وزیر صحت شری بیر چند پٹیل بہت متاثر ہوئے۔ اس جلسہ کے بعد ہی وزیر موصوف نے طبی کالج پٹنہ کو ایک دو منزلہ پختہ عمارت الاٹ کر دی جس میں الکٹرک، واٹر پائپ اور فون کی ساری سہولتیں حاصل ہیں۔

ان سے میری تیسری ملاقات شملہ میں ہوئی تھی، جبکہ انھوں نے نائب صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس دہلی کے سالانہ اجلاس منعقدہ شملہ کا افتتاح فرمایا تھا۔ ●●

# شاہد رام نگری

شاہد رام نگری صاحب پیدائش ۲۳ر اکتوبر ۱۹۲۷ء رام نگر، بنارس۔ تعلیم و تربیت والد مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری کے زیر سایہ مکمل ہوئی۔ ادب و صحافت کا ذوق ورثہ میں ملا۔ ۱۹۵۵ء میں پٹنہ آ گئے اور روزنامہ ساتھی کے ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ پھر اپنی صحافتی زندگی میں مختلف روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کی ادارت کی۔ ابوالکلام اکادمی کا القلم ان میں قابل ذکر ہے۔ آج کل امارت شرعیہ کے ترجمان "نقیب" کے مدیر اعلیٰ کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔

●●

○

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ملاقات یا بالمشافہ گفتگو کا موقع مجھے کبھی نہیں ملا۔ جب وہ بہار کے
نامزد ہوئے تو اس وقت میں روزنامہ 'ساتھی' کی ادارت سنبھال چکا تھا۔ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد بہا
عبدالقیوم انصاری، ابوالصد محمد نور اور سید محمد عقیل وغیرہ کی مشترکہ کوششوں سے ابوالکلام اکادمی کا قیام
میں آیا، تو گورنر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور وزیر اعلیٰ شری بابو سے اس کی سرپرستی قبول کرنے کی درخواست
گئی جو انھوں نے منظور کر لی۔ ابوالکلام اکادمی کی افتتاحی تقریب شاندار پیمانے پر منعقد ہوئی۔ اس میں شری با
اور ذاکر صاحب دونوں شریک ہوئے۔ ذاکر صاحب نے مختصر مگر بڑی مؤثر تقریر کی۔ ان کی تحریر اور تقریر دونو
میں یکساں یہ خصوصیت تھی کہ سادہ الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی باتیں کہہ جایا کرتے تھے۔ وہ قاری
سامع کے ذہن کو مرعوب کرنے کے لیے بھاری بھرکم الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ ابوالکلام اکادمی کی افتتا
تقریب میں ہی مجھے پہلی بار ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

ابوالکلام اکادمی نے مولانا آزاد کی یاد میں ہفت روزہ 'الکلام' جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ ا
کی ادارت بھی میرے ہی سپرد ہوئی۔ میں صحافت کے میدان کا نووارد تھا۔ بہرحال جتنی بھر صلاحیت تھی میں نے ب
محنت سے 'الکلام' کو مرتب کیا۔ دو شمارے منظرِ عام پر آنے کے بعد ایک دن انصاری صاحب اور نور صاحب دو
دفتر ساتھی میں آئے۔ انصاری صاحب نے ہنستے ہوئے مبارکباد دی اور کہا کہ آپ امتحان میں پاس ہو گئے۔ ان
میں سمجھ نہیں پایا، پوچھا کیسا امتحان؟ بولے کل شب ہیں سر سلطان کے یہاں ایک تقریب کے سلسلے میں ہم لو
کی دعوت تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب بھی آئے تھے۔ انھوں نے مجھے خاص طور پر بلا کر 'الکلام' کے اجرا
مبارک باد دی اور معیار کو سراہتے ہوئے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس وقت مجھے بھی بڑی خوشی ہوئی کہ مجھ جیسے ا
کی کوشش کو ذاکر صاحب جیسے باذوق اور صاحب نظر نے پسند کیا اور سراہا۔ اس کے بعد بات چیت کا س
آگے بڑھا تو انصاری صاحب نے بتایا کہ جب 'الکلام' کے اجرا کا پروگرام ہم لوگوں نے بنایا اور اس سے ذاکر صاحب
آگاہ کیا تو انھیں بڑا تامل ہوا۔ بولے کہ اخبار کے معاملے میں مولانا آزاد بڑے باذوق تھے اور ان کا معیار بہ

بلند تھا۔ اگر اخبار معیاری نہ ہوا تو اس سے مولانا کی روح کو تکلیف ہوگی۔ چونکہ یہ اخبار ان سے منسوب ہوگا اس لئے نکلے تو ہر لحاظ سے معیاری ہو، ورنہ بہتر ہے کہ نکالا ہی نہ جائے۔ انصاری صاحب نے کہا کہ اس انتباہ کے بعد ذاکر صاحب کا اظہار پسندیدگی کوئی معمولی بات نہیں۔ تب مجھے اور زیادہ خوشی ہوئی، ویسی ہی خوشی جیسی طالب علموں کو امتحان پاس کرنے پر ہوتی ہے اور واقعی اس وقت صحافت کے میدان میں میری حیثیت طالب علم ہی کی تھی۔ مولانا آزاد کے مداحوں میں غلام رسول مہر، شورش کاشمیری، حامد الانصاری غازی، مولانا فارقلیط اور عبد الرزاق ملیح آبادی جیسے صحافی موجود تھے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ ابوالکلام اکادمی کی معاونت میں پہلے نہ نکلنے کی اور "الکلام" کی ادارت کی سعادت میرے حصہ میں آئی۔

مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کے بارے میں میرا ایک عام تاثر یہ ہے کہ ان کے جاننے والے تو بہت ہیں مگر جاننے کم ہی لوگ ہیں۔ میں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے سمجھدار لوگوں کی زبان سے یہ بات سنی ہے کہ مولانا آزاد زندگی کے آخری دنوں میں مایوسی کا شکار ہو کر خیر بلب ہو گئے تھے اور ذاکر صاحب میدان عمل چھوڑ کر راشٹرپتی بھون کے گوشۂ عافیت میں جا بیٹھے تھے۔ اس کے برعکس میرا تاثر یہ ہے کہ اگر مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نہ ہوتے تو آج جیسا ہندوستان ہمارے سامنے ہے ویسا نہ ہوتا بلکہ ہم اس ہندوستان میں رہ رہے ہوتے جس کا خاکہ سردار پٹیل اور گرو گولوالکر کے ذہن میں تھا۔ جواہر لال نہرو، گاندھی جی کے دباؤ سے وزیر اعظم کی حیثیت سے قبول کر لئے گئے تھے، لیکن نہ تو پارٹی ان کے ہاتھ میں تھی اور نہ حکومت میں ان کی بات چلتی تھی۔ ہوتا وہی تھا جو سردار پٹیل چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عوام میں جو مقبولیت اور محبوبیت نہرو جی کو حاصل تھی اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور اسی لئے جب کبھی اپنی بات منوانے کے لئے نہرو جی اپنی شخصیت کو داؤں پر لگا دیتے تھے تو سردار پٹیل کو جھک جانا پڑتا تھا۔ سردار پٹیل کے ذہن میں ہندوستان کا جو نقشہ تھا اس کی عکاسی ہندو، ہندی، ہندوستان کے نعرے سے ہوتی ہے۔ اس نقشے میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلمان اپنا حصہ لے کر الگ ہو گئے" اب جو ہندوستان بچا ہے اس کو ویسا بنانا ہوگا جیسا ہندو چاہتے ہیں۔ جبل پور کے فساد کے بعد "نو بھارت ٹائمز" نے فسادات کی جڑ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تو مشہور صحافی وشنو لال پر بھاکر نے اپنے ایک مضمون میں بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ ان فسادات کے پیچھے کون سی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ پربھاکر جی نے لکھا تھا کہ بٹوارے کے بعد ہندوستان میں مسلم کشی کا جو طوفان آیا اس کی قیادت میدان میں

آر، ایس، ایس والے اور حکومت میں سردار پٹیل کررہے تھے۔ جب سارا شمالی ہندوستان مسلمانوں کے خون سے نہا گیا اور دنیا بھر میں رسوائی ہونے لگی تو سردار پٹیل نے آر، ایس، ایس کے لوگوں کو بلا کر کہا کہ اپنا ہاتھ روک لیں۔ یہ چار کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان کو یہیں رہنا ہے۔ نہ تو ان سب کو تہ تیغ کرنا ممکن ہے اور نہ ان سب کو لاد کر سرحد پار پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کرنا صرف یہ ہے کہ انھیں ہندوستان میں اس طرح دبا دیا جائے لیکن اس طرح جیسے زہر کا دانت نکالا ہوا سانپ رہتا ہے۔ یہ بھاگر جی کا خیال تھا کہ مسلم کش فسادات زہر کا دانت توڑنے کے عمل کا ہی ایک حصّہ ہے۔

اس بظاہر غیر متعلق تفصیل کا مقصد اس جملے کا پس منظر پیش کرنا ہے کہ اگر مولانا آزاد اور ذاکر صاحب نہ ہوتے تو آج جیسا ہندوستان ہمارے سامنے ہے، ویسا نہ ہوتا۔ یہ دونوں غیر معمولی صلاحیتوں کے انسان تھے۔ ان کی خدمات اور کارہائے نمایاں کی فہرست بڑی طویل ہے، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس بازی کو پلٹ دیا جو مسلمان پوری طرح ہار چکے تھے۔ بے سروسامانی کی حالت میں بھاگتے ہوئے مسلمانوں کو انھوں نے آواز دی "کھیل ختم نہیں ہوا ہے تم صرف ایک مہرہ ہارے ہو۔ تمھیں ہندوستان کی اور ہندوستان کو تمہاری ضرورت ہے۔ نئے ہندوستان کی تعمیر میں تمھیں اہم کردار ادا کرنا ہے۔" اس آواز پر اکھڑے ہوئے پاؤں پھر سے جم گئے۔ ۱۹۴۷ء میں چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں تھے۔ آج ۱۹۸۲ء میں دس کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اصل تعداد پندرہ کروڑ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں ڈیوڑھی یا دوگنی تعداد میں رہ رہے ہیں ان میں ہمت ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے۔ وہ شکست خوردہ ملت کی طرح نہیں، نبرد آزما گروہ کی طرح میدان میں ڈٹے ہوئے ہیں۔

کبھی کبھی چپ رہنا بولنے سے زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ ذاکر صاحب جیسے لوگوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر انتہائی ناموافق حالات میں جو کام کیا دراصل وہ خاموشی سے ہی کرنے کا کام تھا اگر وہ دادِ تحسین کے لئے اپنے کاموں کا پروپیگنڈہ کرتے ہوتے تو وہ نہ کر پاتے۔ مخالف زیادہ منظم اور طاقتور رہتے، اس لئے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے انھوں نے خاموشی سے کام کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی۔ انھیں نہ داد و تحسین کے پھولوں کی حاجت تھی، نہ تنقید و تنقیص کے نشتروں کا خوف۔ البتہ بعض اسباب کا قلق ضرور ہے کہ وہ کم نظر اور بے بصیرت لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے جو وقت اور حالات کے تقاضوں کو بھی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

●●

# اکمل یزدانی جامعی

جناب محبوب الرحمٰن اکمل یزدانی : (پ ۱۹۲۹ء)
(بوناسی ضلع پورنیہ جہاں آپ کے آباء واجداد ایران
سے آکر آباد ہوئے تھے) ۱۹۴۳ء میں میٹریکولیشن ،
۱۹۴۷ء میں (سی۔ ایم کالج دربھنگہ) آئی۔ اے اور
۱۹۴۸ء میں جامعہ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۵۰ء میں آگرہ
یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔ اے کیا۔ ۵۲ تا ۱۹۵۵ء
آئینہ، عمل، انسان اور ساحل مختلف اخبارات و
رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ۱۹۵۵ء سے
دیدار بخش ہائی اسکول بیرنگر، پورنیہ میں ہیڈ ماسٹر ہیں۔
(۱۹۵۸ء میں پٹنہ ٹریننگ کالج سے ڈپ۔ ان۔ ایڈ کیا)
آپ ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں
جن میں سے "پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت" بہار اردو اکادمی
کے مالی تعاون سے شائع ہو چکی ہے۔ باقی کتابیں غیر مطبوعہ
ہیں۔ انگریزی اور اردو میں آپ کے متعدد مقالات شائع
ہوئے ہیں۔

●●

بیرنگر ضلع پورنیہ (بہار) کے سب ڈویژن ارریہ کے قدیم تھانہ رانی گنج اور جدید تھانہ بھرگاما میں واقع ہے۔ ضلع پورنیہ کے صدر مقام سے اس کی دوری ۲۰ میل اور سب ڈویژن کے صدر مقام ارریہ سے بھی تقریباً اتنے ہی میل ہے۔ تقریباً دو سو سال تک دریائے کوسی کے غیض و غضب کا شکار یہ دور افتادہ علاقہ اس کے چنگل سے رہائی کے بعد عرصہ تک فیل قد اور گنجان گھاس اور گھنے جنگلات سے بھرا رہا اور شیر، چیتے، جنگلی ہرن اور دوسرے جنگلی جانوروں کی آماجگاہ بنا رہا اور شکاریوں کی فردوس کہلاتا رہا۔ البتہ مویشیوں کی چراگاہ ہونے کے سبب سے یہاں کا گھی مشہور تھا جو مویشی پالنے والوں کے معرفت میں برائے نام ہی آتا۔ رانی گنج سے کلکتہ وغیرہ کو برآمد کیا جاتا تھا۔ اسی لیے اکثر پرانے اور کچھ نئے جغرافیہ میں رانی گنج کا گھی مشہور ہونا لکھا گیا ہے ۔ دوسری چیز جس کے لیے اس طویل و عریض علاقہ رانی گنج خصوصاً علاقہ بیرنگر نے شہرت پائی تھی وہ اس کا ہر جہتی پچھڑا پن ہے۔ جس نے اب تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ۔ ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۹ء کی ۱۸ فروری کو اسی بیرنگر نامی مقام پر تشریف فرما ہوئے، وہ اس وقت بہار کے گورنر تھے۔

وائس چانسلر بنا کر وہ علیگڑھ بھیجے جانیوالے تھے اس لیے جامعہ میں، ان کی زیارت و ملاقات کا موقع ملا مگر جتنا بھی ملا ان کی ذات گرامی سے گہری عقیدت کی بنیاد پر ان کی ایک ایک بات میرے دل میں گھر کرتی اور ان کی ایک ایک ادا بھاتی رہی، وہ علیگڑھ چلے گئے جو میرے لیے ایک بڑا سانحہ تھا۔ جامعہ بے مزہ معلوم ہونے لگی، مگر یہ ناکارہ، جب بھی وہ جامعہ آتے اپنے متعلق ان سے مشورہ کرتا رہتا تھا۔ وہ علیگڑھ چلے گئے تو وہاں جا کر بھی اپنے متعلق مشورہ کرتا اور وہ بیحد شفقت و محبت سے مجھے اپنی گراں قدر آراء سے نوازتے رہتے۔ میں نے معاشیات میں ایم۔ اے انہی کے حکم سے کیا اور تعلیمی کام کو پیشہ بنایا۔

جامعہ میں انھوں نے یہ روایت قائم کر رکھی تھی کہ طلبا اساتذہ سے بے تکلف ہوں اور کھل کر باتیں کریں۔ کلاس میں بھی، سر راہ بھی، کھیل کے میدان میں بھی اور کوٹھی پر جا کر بھی۔ جامعہ کے اساتذہ کے دروازے ہر وقت طلبا کے لیے کھلے رہتے ایسے میں موقع محل کی قید کم تھی، بے موقع بھی وہ ان سے مل سکتے تھے۔ میرے ایک

رست ہیں مولوی زین العابدین صاحب ندوی جامعی پورنوی۔ میرا ان کا ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ پروفیسر کلاف صاحب
نسپل جامعہ کالج، عابد حسین صاحب، پروفیسر عاقل صاحب، مولانا اسلم جیراج پوری، خواجہ عبدالحی فاروقی
شیخ الجامعہ، پروفیسر مجیب صاحب، پروفیسر قیصر زیدی صاحب سب کے ہاں جانا ہوتا۔ ان کے ملنے میں وقت
بے وقت کی قید نہیں تھی۔ وہ حضرات اس قدر عالی ظرف تھے کہ ۱۲ بجے، ایک بجے گرمیوں کے دنوں میں بھی جبکہ
دنے کا وقت ہوتا تھا، طلبا ان کا دروازہ کھٹکھٹاتے مگر ان کے ابرو پر شکن نہ آتا۔ ہم اور زین العابدین صاحب
نا اساتذہ کے اِذن عام سے فائدہ اٹھا کر ان کو دق کرنے کے لیے کوٹھی پر جا دھمکتے، دستک دینے پر سب کے
ں سے ایک ہی قسم کی آواز آتی "بہت اچھا" اور دروازہ کھل جاتا، خود ہی السّلام علیکم کہکر دروازہ کھولتے
رڑی خندہ پیشانی اور بڑے تپاک سے ہم بدتمیزوں اور گستاخوں کا خیر مقدم ہوتا۔ بسکٹ، چائے، پھل
سے تواضع تو ہوتی ہی تھی۔ گھنٹوں متعلق، غیر متعلق، پبلک پرائیوٹ، مقامی غیر مقامی ہر طرح کی باتیں کرتے
ران کا مناسب اور تشفی بخش جواب ملتا۔ ان حضرات کو خواہ ہم کتنے ہی بے وقت پہنچے ہوں، یا باتوں
یں کتنی ہی دیر ہو رہی ہو، یہ فرماتے نہیں سُنا کہ اب تشریف لے جائیے۔ روایت یہ تھی کہ جامعہ کے خواہ
کتنے ہی بڑے عہدے والے یا استاد کے ہاں خواہ کسی درجہ کا طالب علم یا آدمی پہنچے، وہ حضرات سلام میں
سبقت کی کوشش فرماتے، بیٹھے ہوں تو سرو قد کھڑے ہو جاتے اور آنے والے کو بٹھا لینے کے بعد خود تشریف
رکھتے۔ جہاں تک اس ناکارہ کا گمان ہے اس روایت کے موجد ذاکر صاحب ہی تھے اور جیسا کہ دیکھنے کا
اتفاق ہوا، وہ ان کو برتنے میں سب سے آگے تھے۔ ان کو سلام کر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ ذاکر صاحب
نظریں نیچی کئے ہوئے چلے آ رہے ہیں آپ ابھی دور ہی ہیں اور سلام کرنے کی تیاری ہی کر رہے ہیں کہ ادھر
سے قرأت کے ساتھ اچانک السّلام علیکم کی آواز آ گئی اور آپ منہ دیکھتے ہی رہ گئے'۔

جامعہ کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ گاہے بگاہے طلبا اپنے اساتذہ کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جن
ن کی دعوت ہوتی وہ مقررہ وقت پر تشریف لاتے۔ حسبِ موسم ناشتہ، لسی، چائے وغیرہ سے ان کی تواضع
دی۔ طلبا کا کچھ تفریحی پروگرام ہوتا تھا۔ مثلاً گانے کا، کھیل کا۔ اساتذہ کھیل اور کھانے دونوں میں شریک ہوتے
ور مل جل کر کھیلتے کھاتے۔ گھنٹہ دو گھنٹے کا پروگرام ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ غفار منزل کے کالج کے طلبا نے جن میں میں
بھی شامل تھا اساتذہ کی دعوت کی۔ ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور دو ایک اساتذہ تشریف لائے۔ ہم لوگوں
نے مختلف پھلوں، شربت، لسی اور طرح طرح کی چیزوں سے ان کی تواضع کی۔ تاش، لوڈو، کیرم بورڈ وغیرہ کا کھیل بھی

ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ کسی جماعت میں مجیب صاحب شریک ہوئے، کسی میں اور اساتذہ۔ کچھ طلبا کے ساتھ ذاکر صاحب الگ بیٹھ گئے اور بنفس نفیس تاش کا کھیل دکھانے لگے۔ ان کو تاش کے بہت سے کھیل آتے تھے۔ گراموفون بھی بج رہا تھا، اس میں ایک گانا ایسا تھا جو فحش تو نہیں تھا، جامعہ کے لحاظ سے غیر معیاری ضرور تھا۔ ذاکر صاحب ہنسی خوشی کھیلتے کھاتے رہے۔ مطلق پتہ نہ چلنے دیا کہ ان کو ناگوار ہو رہا ہے۔ جب مجلس ختم ہوگئی اور ہم لوگ ان لوگوں کو پہنچانے کے لئے دور تک ساتھ ساتھ گئے" تو کانوں کان مجلس کے سکریٹری سے کہا گیا کہ سکریٹری کو ہر چیز کا خیال رکھنا چاہیئے۔ مجلس میں کوئی بھدی چیز پیش نہیں کرنی چاہیئے۔

ذاکر صاحب فطرتاً تعلیمی آدمی تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے "استاد کو طلبا کا ادب و احترام کرنا چاہیئے۔" اس کو وہ بنیادی اصول کہتے تھے۔ اپنی تعلیمی تقریروں میں بھی وہ اس بات پر بڑا زور دیتے تھے۔ ایک تقریر میں انہوں نے جہاں تک یاد ہے یہ فرمایا: "استادوں سے بھی میری یہی التجا ہے کہ آپ بھی اپنے شریف کام کا بنیادی اصول اسی ادب و احترام کو بنائیں۔ یہ اصول ذہن نشین ہوگیا تو تعلیم کے کام میں آپ کا سارا رویہ بدل جائے گا۔" یہ اصول غالباً انھوں نے ان حدیثوں سے لیا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ اولاد کا اکرام کیجیے۔ اَکرِمُوا اَولَادَکُم اور یہ کہ جو بڑوں کا ادب نہ کرے اور چھوٹوں پر شفقت نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ان کو اس اصول پر سختی سے اربند پایا۔ وہ سلام میں سبقت کرتے۔ طلبا کی عزت فرماتے۔ ملنے والا ان سے مل کر یہ سمجھتا تھا کہ میں بھی کوئی اہمیت رکھتا ہوں۔ جب کبھی ان سے ملنے کا شرف ہوا، خواہ تخلیہ میں، خواہ مجلس میں ایسا لگا جیسے وہ اس حقیر کو اپنے سے بڑا تصور کر رہے ہوں۔ معلمی کے دور میں بھی یہ بات دیکھی اور جب وہ سرکاری عہدے پر فائز ہوئے یہی بات نظر آئی۔ ملنے جایئے تو سلام کرنا اور کھڑا ہو جانا، بٹھا لینا پھر بیٹھنا۔ خاص طور پر طالب علموں اور تعلیم دینے والوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کو بہت اہمیت دیتے اور چاہتے تھے کہ دوسرے لوگ بھی ان کی قدر کریں، ان کو معزز و محترم سمجھیں۔

جب ذاکر صاحب بہار کے گورنر تھے، ایک بار گورنر ہاؤس پٹنہ میں ان سے ملنے گیا۔ دیر تک تعلیمی مسائل پر بات کرتے رہے۔ نصیحت فرماتے رہے۔ وقت مقررہ ختم ہوا تو ان کا اے۔ ڈی۔ سی آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ مجھ پر غالباً یہ ظاہر کرنا تھا کہ تمھارا وقت ختم ہو چکا۔ ذاکر صاحب کو اس ناچیز سے باتوں میں منہمک دیکھ کر چلا گیا۔ ذاکر صاحب نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت دیر کے بعد پھر اے۔ ڈی۔ سی مخل ہوا اور یہ کہا کہ سری بابو (شری کرشن سنہا، وزیر اعلیٰ بہار) آگئے ہیں، دیر سے منتظر ہیں۔ یہ انہیں کا

وقت تھا۔ ذاکر صاحب اور باتیں کرتے رہے۔ اب یہ احساس ہوا کہ ذاکر صاحب میرا دل توڑنا نہیں چاہتے مگر یہ وقت دوسرے کا ہے۔ میرا وقت بہت دیر پہلے ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا بول اٹھا کہ اب اجازت ہو۔ فرمایا بہت اچھا پھر کب ملے گا؟ اور میرے کاندھے پر ہاتھ ڈالتے ہوئے باہر نکل کر دو چار باتیں نصیحت اور رازداری کی کرتے رہے۔ باہر ان کے ملے۔ ڈی۔سی سکریٹری اور دوسرے لوگ مجھے گھورتے رہے کہ آخر یہ حقیر فقیر جیسا آدمی ہے کون جسکی اتنی پذیرائی ہو رہی ہے۔ میں سلام کرکے چلا آیا۔ بعد میں میں نے سوچا کہ انھوں نے ایسا یہ ظاہر کرنے کیلئے کیا کہ ان کی نظر میں مجھ جیسے نالائق اور حقیر شاگرد اور گھٹیا درجہ کے استاد کی بھی اہمیت کسی بڑے سیاسی آدمی یا حکومت کے کسی سربراہ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔

اسی طرح ۱۸ فروری ۵۹ء کو جب وہ بیرنگر سے پورنیہ لوٹ گئے، تو دوسرے دن یعنی ۱۹ فروری ۵۹ء کو ضلع بھر کے مختلف طبقہ اور پیشہ کے لوگوں کے وفود سے انھوں نے ملاقات کی۔ باری باری سے لوگ بلائے جاتے رہے اور ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ضلع بھر کے پرائمری، سکنڈری، کالج وغیرہ کے نمایندے بھی باری باری سے ان سے ملے۔ جب وکلاء کے نمایندوں کے گروپ سے وہ باتیں کر رہے تھے، اس بیچ میں پرائمری اسکول کے نمایندے بھی آگئے۔ قریب کی جگہ پر دیکھ کر دور جا کر بیٹھ گئے۔ جب ذاکر صاحب کو بتایا گیا کہ پرائمری کے اساتذہ کا گروپ آگیا ہے، تو انھوں نے ان اساتذہ کو اپنے قریب یہ کہکر بلایا کہ آپ حضرات اِدھر تشریف لائیے۔ آپ میری برادری کے آدمی ہیں۔ ذاکر صاحب مختلف اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے بھی اپنا شمار اساتذہ کے ساتھ کرانا پسند کرتے تھے اور ان کے اعزاز و اکرام کا لحاظ رکھتے تھے۔ انھیں سماج میں سب سے اونچی جگہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔

ذاکر صاحب بیرنگر تشریف فرما ہوئے تو ایک پبلک جلسہ بھی رکھا گیا تھا۔ ہزاروں کا مجمع تھا۔ سودھا سنوجی آنجہانی صدر جلسہ تھے۔ جب سپاسنامہ پڑھا جا چکا اور ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں تقریر شروع کی تو اس طرح شروع کی کہ "محبوب الرحمٰن صاحب، سبھا پتی جی، بزرگو اور دوستو!" میرے نام سے تخاطب کے آغاز کا مطلب غالباً یہ تھا کہ اس ناکارہ کی احساس کمتری دور ہو اور لوگ مجھے جان جائیں۔ پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ "محبوب الرحمٰن میرے عزیز شاگرد ہیں اور چونکہ اس پسماندہ علاقہ میں وہ تعلیمی کام کر رہے ہیں، میں ان کو اور ان کے تعلیمی کام کو دیکھنے کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔" انھوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ "ان کی ہمت افزائی کیجیے، ان کا دل بڑھائیے۔ ان کے کام میں ان کی مدد کیجیے تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور یہ پورے دلجمعی سے آپ کے پچھڑے ہوئے علاقہ میں کام کر سکیں۔ تعلیمی کام، وقت اور مدت چاہتا ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں ہے۔ اسکا نتیجہ دیر میں نکلے گا۔ لہٰذا صبر سے کام لیجیے۔ آپکو اس کا پھل ملے گا۔"

سپاسنامہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ ہمیں آپ کی یہاں تشریف آوری سے اچنبھا اور یہ شبہ بھی تھا :

"وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے : کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے فرمایا کہ "آپ کو میرے یہاں آنے پر حیرت ہوئی ہے شاید اس لیے کہ یہ پچھڑا علاقہ ہے اور ریاست بہار کا پسماندہ خطہ ہے۔ یہاں میں کیسے آ گیا۔ پسماندہ جگہوں میں اگر گورنر نہ جائیں، منسٹر اور چیف منسٹر نہ آئیں تو آخر پسماندہ علاقے کیسے اوپر اٹھیں گے۔" پھر اُنہوں نے فرمایا کہ "میں تو خاص کر ویسے ہی علاقوں میں جایا کرتا ہوں، جو پچھڑے ہوئے ہیں۔"

تعلیمی کام کرنے والے شاگردوں اور شاگرد استادوں کی ان کے دل میں کتنی قدر و منزلت تھی اور وہ ان کے کام کے لیے کس قدر فکرمند رہتے تھے؟ اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیجیے کہ ذاکر صاحب اپنی گورنری کے دوران میں تو اس ناکارہ اور اس کے منتخب کردہ علاقہ بیر نگر سے گہری دلچسپی رکھتے ہی رہے، اور جن جن سے مجھے واسطہ پڑ سکتا تھا اور میرا کام ہو سکتا تھا، ان سے میرے متعلق بڑھ چڑھا کر پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے، مگر جب وہ نائب صدر جمہوریہ اور صدر جمہوریہ کی کرسی پر دلی تشریف لے گئے، تو ان کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔ اس علاقے سے جو لوگ ان سے ملنے دلی جاتے ان سے پوچھتے رہتے اور ان کی توجہ میرے کام کی طرف مبذول کراتے رہتے۔ موجودہ ممبر پارلیامنٹ شری ڈومر لال بیٹھا ارانی گنج پورنیہ کا بیان ہے کہ جب وہ اور ان کے ساتھی راشٹرپتی بھون میں اُن سے ملتے تو اُن سے میرا اور میرے کام کا ذکر کرتے اور ان کا اس لئے اعزاز فرماتے کہ وہ اس پچھڑے علاقہ کے نمائندہ ہیں، جہاں ان کا ایک شاگرد تعلیمی کام میں مشغول ہے۔ یہ بات مجھ بیٹھا جی نے کہی، جب وہ بہار کے منسٹر تھے اور میرے کام میں مدد فرماتے رہے۔

ذاکر صاحب نے جو بھی گرامی نامے راقم الحروف اور نالائق شاگرد کو لکھے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو انہوں نے خود اپنے دستِ مبارک سے لکھا ہے اور ان پر پتے بھی اپنے ہی ہاتھوں سے درج فرمائے ہیں یہ دستور انھوں نے حکومت کے اعلیٰ عہدے پر جا کر اور مشاغل کے ہجوم میں بھی قائم رکھا، حالانکہ وہ کم از کم پتے تو ٹائپ کروا سکتے تھے۔ یہ ان کی اپنے ایک نالائق شاگرد پر گہری عنایت و محبت کی علامت تھی۔ دیدار بخش ہائی اسکول کے معائنہ کے سلسلے میں انہوں نے اسکول کے وزیٹرس بک میں جو معائنہ نوٹ دیا ہے، وہ بھی ان کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اس حقیر شاگرد، اس کے رفقائے کار اور ان کے تعلیمی کام کا تذکرہ بڑے تُلے ہوئے الفاظ میں فرمایا ہے :

"۱۸ فروری ۱۹۵۹ء کو دیدار بخش ہائی اسکول بیرنگر، آکر مجھے خوشی ہوئی، اسکول کے ہیڈ ماسٹر محبوب الرحمٰن میرے پرانے شاگرد ہیں۔ اس لیے خاص طور پر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ کتنی توجہ اور خلوص سے یہ اور ان کے رفقاءکار ریاست کے اس پس ماندہ علاقے میں ایک اچھے اسکول کی تعمیر کر رہے ہیں۔ اسکول میں مل جل کر کام کرنے کا بڑا اچھا ماحول ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ یہ ایک بہت اچھے اسکول کی شکل اختیار کرے گا اور تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔" (ترجمہ)

اسی طرح کے کئی واقعات ان کی پورنیہ اور بیرنگر تشریف آوری کے سلسلے میں پیش آئے۔ میں نے علاقہ بیرنگر میں تعلیمی کام شروع کیا تھا۔ جب وہ بہار کے گورنر ہوکر پٹنہ تشریف لائے تو ان سے بار بار ملنا ہوا۔ وہ میرے کام سے دلچسپی رکھتے تھے اور بار بار تاکید فرماتے رہتے تھے کہ جم کر تعلیمی کام کرتے رہو۔ وہ میرے ٹوٹے پھوٹے کام سے باخبر رہنا چاہتے تھے اور گفتگو اور خطوط کے ذریعہ ہمت افزائی بھی کرتے رہتے تھے۔ اپنی مشکلات کا حال لکھ کر بھیجتا تو بڑی شفقت اور محبت سے تسلی دیتے اور ہمت افزائی فرماتے رہتے۔ ایک بار ایک خط میں بہت ساری پریشانیوں کا ذکر کرکے ان سے دبے لفظوں میں درخواست کی کہ ایک تو یہ زمین شور ہے، دوسرے ہائی اسکول میں بڑی پابندیاں ہیں، آزادانہ تعلیمی کام کا موقع نہیں ہے، آپ مجھے کسی اور کام پر لگادیں۔ جواباً اور باتوں کے علاوہ ارقام فرمایا: ؏ "آزمایش ہے نشانِ بندگانِ محترم" میں خاموش ہوگیا۔ ایک بار ملنے پر فرمایا "آپ کام کرتے رہیے گھبرایئے نہیں۔ میں کبھی پورنیہ آیا تو آپ کے کام کو دیکھوں گا۔" میں نے اپنی حماقت سے یہ سمجھا کہ محض دلدہی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک"۔ بھلا بیرنگر بھی گورنر اور خصوصاً ذاکر صاحب کے جانے کی جگہ ہے! بات ذہن سے اُتر گئی۔

۱۹۵۹ء کی فروری میں جب ان کا پورنیہ آنے کا پروگرام بن گیا، مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ میں پٹنہ اسکول کے کام سے گیا، تو ان سے بھی ملنے گیا، میرا ان سے ملنے کا مقصد، ان کی ذات بابرکات سے استفادہ اور ان سے تعلیمی مشورے لینا اور نصیحت حاصل کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی قسم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ میں جب اندر جاتے ہی سلام و مصافحہ کے بعد انھوں نے فرمایا آپ سکریٹری صاحب سے ملتے گئے ہیں (گورنر کے سکریٹری غالباً ذاکر صاحب تھے)، میں نے عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا جاتے وقت مل لیجیے گا۔ پورنیہ کا پروگرام بن گیا ہے میرا

وہاں جا رہا ہوں کیا آپ وہاں ملیں گے؟" میں نے عرض کیا حضور حاضر ہوں گا۔ فرمایا "ہوائی اڈے پر آپ موجود رہیں گے؟" میں نے عرض کیا انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا اور یہ بھی فرمایا "میرا تو جی چاہتا ہے کہ میں آپکے کام کو دیکھنے کے لئے بیر نگر بھی جاؤں۔" میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بیر نگر جانے میں ذاکر صاحب کو کیا کیا زحمتیں اٹھانی پڑیں گی اور ضلع مجسٹریٹ صاحب پہ اور خود اس ناکارہ پر کیا بیتے گی کیونکہ جو حیثیت ذاکر صاحب اب گورنر بھی تو ہیں اور وہاں ہے ہی کیا آپکے شایان شان کیا کہ میں ان کو دکھاؤں گا۔ میں تھوڑی دیر خاموش ہو گیا۔ پھر عرض کیا کہ بیر نگر پورنیہ کے صدر مقام سے ۳۰ میل پر ہے، وہاں جانے کے لئے کوئی پکی سڑک نہیں ہے اور دس بارہ میل تک تو کچی سڑک کا بھی نام و نشان نہیں۔ ہم لوگ پیدل اور کبھی کبھی بیل گاڑی سے وہاں جاتے ہیں، دوسرے وہ جگہ آپکے تشریف لے جانے کی نہیں ہے، لے دیکر بس ایک چھوٹا موٹا سا اسکول ہے۔ ایک تو آپ کو وہاں جانے میں بیحد زحمت اٹھانی پڑے گی، دوسرے ضلع مجسٹریٹ کو بھی دقتیں ہوں گی۔ یہ کہنا تھا کہ خفا ہو گئے اور فرمایا "آپ مجھے تکلیفوں سے ڈراتے ہیں۔ میں تکلیفوں سے نہیں ڈرتا۔ میں تو کھوج کھوج کر پسماندہ علاقوں میں جاتا ہوں اور خصوصاً ایسی جگہوں پر تو ضرور جاتا ہوں، جہاں تعلیمی کام ہو رہا ہو، خاص کر جہاں میرا کوئی طالب علم تعلیمی کام کر رہا ہو۔ کچھ دنوں پہلے میں بھاگل پور ضلع کے مندار ہل (Mandar hill) گیا تھا، وہاں بالکل پسماندہ علاقے میں میرے ایک شاگرد "مادھون" تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ میں وہاں ان کے کام کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ پچھڑی ذات کے لوگوں میں بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔" میں چپکا سنتا رہا۔ پھر انھوں نے پوچھا "آپ مادھون جی کو تو جانتے ہوں گے؟" میں نے عرض کیا "جی نہیں، وہ کون ہیں؟" پھر انھوں نے ان کا ذکر کرنا شروع کیا کہ "مادھون نامی ایک بے خانماں بچہ دلی کے سڑکوں پر بھٹک رہا تھا، جامعہ انھیں اٹھا لائی، ان کی تعلیم و تربیت کی۔ وہ مدراس کے رہنے والے تھے۔ جامعہ سے فراغت کے بعد مدراس چلے گئے۔ پھر بالکل پتا نہ چلا کہ وہ کہاں ——— گئے اور کیا کرتے رہے۔ جب میں گورنر ہو کر پٹنہ پہنچا تو وہ ملنے آئے تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور آدی باسیوں میں بڑا اچھا تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ میں ان کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بڑی محنت اور سلیقہ سے کام کر رہے ہیں۔ آپ کو وہاں جانا چاہیئے۔ ان سے ملنا چاہیئے اور ان کے کام کو دیکھنا چاہیئے۔" میں نے عرض کیا انشاء اللہ جاؤں گا۔ ہاں تو مادھون جی اور ان کے کام کے متعلق بیان کرنے کے بعد انھوں نے پھر بیر نگر جانے کا ذکر کیا۔ اور فرمایا "تکلیف تو مجھے کچھ نہیں ہوگی، البتہ ضلع مجسٹریٹ کو ہوگی، اس لئے کہ میں ان کا مہمان

ہوں گا۔" پھر انھوں نے سنایا کہ "ایک دفعہ کوئی ضلع مجسٹریٹ انھیں کسی سیٹھ کی دعوت پر لے گیا۔ محکمہ سراغ رسانی والوں نے اوپر رپورٹ کردی کہ ضلع مجسٹریٹ گورنر کو چور بازاری کرانے والے کے ہاں لے گیا تھا۔ پھر بیچارے کی شامت آگئی اور نوکری کے لالے پڑنے لگے۔" میں نے سوچا کہ موقع غنیمت ہے کوئی بات ایسی ہی جائے کہ ذاکر صاحب وہاں نہ جائیں۔ میں نے کہا "اسی لئے تو عرض کر رہا ہوں کہ وہ ایسی جگہ ہے جہاں ضلع مجسٹریٹ آپ کو لے جانے کے لیے شاید تیار نہ ہوں گے۔ فرمایا "اچھا آپ اتنا تو کر سکتے ہیں کہ پورنیہ جاکر ان سے مل لیجئے اور ان پر ظاہر کیجئے کہ آپ سے میرے کیا تعلقات ہیں اور کہیے کہ میں بیرنگر جانا چاہتا ہوں آپ وہاں کا پروگرام بنائیں۔ اگر آپ کے کہنے پر وہ مجھے وہاں نہیں لے گئے تو میں جب پورنیہ جاؤں گا ان سے پوچھوں گا کہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں، آپ مجھے وہاں کیوں نہیں لے گئے؟" میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر خود ہی فرمایا "اچھا چھوڑ دیجیے ابھی میرا ٹرم باقی ہے، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔" میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اللہ نے بڑی مصیبت سے نجات دی۔ اسکول آگیا اور میں تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔ غالباً ۱۶، ۱۷ فروری ۱۹۵۹ء کو ان کا پورنیہ کا کلا بھون میں پروگرام تھا۔

غالباً ہفتہ عشرہ قبل اسکول کے پڑوس کے پورنیہ کے کانگریس کے ایک بااثر لیڈر اور جنگ آزادی کے سپاہی آنجہانی سری سرجو نرائن کنور (مسکونہ چکلا تھانہ بنمنکھی) اسکول تشریف لائے۔ وہ اسکول کے بہی خواہوں میں تھے اور میرے کام سے دلچسپی رکھتے تھے اور مجھ پر بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔ وہ چونکہ کبھی کبھار اسکول آتے رہتے تھے، مجھے مسرت ہوئی۔ آفس میں بیٹھا تھا، اطلاع ملی تو فوراً حاضر ہوا۔ آداب، پرنام خیر خبر کے بعد انھوں نے فرمایا "یزدانی صاحب معلوم ہے لاٹ صاحب آپ کے یہاں آرہے ہیں" وہ چونکہ بذلہ سنج آدمی تھے، میں نے سوچا کہ چونکہ لاٹ صاحب (گورنر ذاکر صاحب) کا یہ ناکارہ شاگرد ہے اور پورنیہ کا پروگرام بنا ہے، مذاق کر رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں معلوم ہوا ہے وہ پورنیہ تشریف لائیں گے۔ انھوں نے کہا "پورنیہ تو آ ہی رہے ہیں۔ ۱۸ فروری کو بیرنگر اور دیدار بخش ہائی اسکول بیرنگر آرہے ہیں۔" میں نے پھر بھی مذاق ہی سمجھا اس لئے کہ اس کا تو اب امکان ہی نہیں تھا۔

کہنے لگے "آپ غالباً مذاق سمجھ رہے ہیں، میں آپ سے واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ کلکٹر صاحب (جگدیش ودتی صاحب) سے میں کل ملا تھا کہ وہ آپ کے لئے پریشان ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا کیوں؟ فرمایا "یہاں گورنر آرہے ہیں ان کے انتظامات کے سلسلے میں آپ سے مشورہ کرنا ہے، ان کو پٹنہ سے گورنر کے سکریٹری نے فون کیا تھا کہ

گورنر کے وہاں کوئی شاگرد ہیں۔ کلکٹر صاحب نے ان کو بیر پور کے متعلق کہا۔ لیکن ادھر سے کہا گیا کہ گورنر آپ کے ضلع کے بیرنگر جانا چاہتے ہیں اور یہ بھی کہا کہ ان کے شاگرد کا نام یہ ہے۔ وہ ان کے اسکول جائیں گے انتظامات کیجئے اور یزدانی صاحب سے مل کر ان کو گورنر کے آنے کے وقت ہوائی اڈے پر ملنے کی اطلاع کر دیجیے۔ پھر تحریری حکم آیا جس میں آپ کا نام گورنر صاحب سے آپ کے تعلقات وغیرہ کا ذکر ہے۔ آپ کو چکرورتی صاحب بہت یاد کرتے ہیں، ان سے ضرور مل لیجئے۔" میں نے کہا اگر گورنر یہاں آنا چاہتے ہیں تو ان کو جو انتظام کرنا ہے، وہ کریں گے میں اپنے طور پر یہاں جو کچھ کر سکتا ہوں کر دوں گا۔ مگر کنور صاحب مُصر ہوئے، وہ میرے بزرگ تھے۔ میں ان کے کہنے پر چکرورتی صاحب سے ملا، بڑا تپاک سے ملے۔ اور فائل دکھایا کہ گورنر کے آفس سے ہی آپ کے یہاں کا پروگرام آیا ہے، آپ انتظامات میں میری مدد کریں۔ بیرنگر میں کیا پروگرام ہوگا یہ میرے ذمہ تھا۔ چنانچہ انتظامات مکمل کر لیے گئے۔ کاٹے چھیل کر کٹھوری سے بیرنگر تک ۷ میل سڑک بنائی گئی اور استاد محترم ۱۸ فروری ۵۹ء کو ہمارے اسکول تشریف لائے۔

دو گھنٹے کا پروگرام تھا۔ علاقہ بیرنگر کی پبلک نے بڑی فراخدلی سے استقبال کا سامان کیا تھا۔ پروگرام میں دیدار بخش ہائی اسکول کا معائنہ، بچّوں کے میلے کا معائنہ، بچّوں کے گھر کا افتتاح، مڈل اسکول اور مدرسہ امداد الغربا کا معائنہ شامل تھا۔ کھانے کا کوئی پروگرام ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہیں رکھا تھا، مگر پبلک نے ناشتہ چائے وغیرہ کا بھی نظم کر لیا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ گورنر کو یہاں کچھ کھانے پینے نہیں دیا جائے گا، تو مجھ پر برہم ہو گئے وہ بیچارے کیا جانیں کہ گورنر کو کھلانا پلانا کوئی اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ میں سخت الجھن میں پڑ گیا کہ پبلک کو کیسے سمجھاؤں اور کلکٹر صاحب کو کیسے آمادہ کروں۔

کار اسکول کے دکھنی گیٹ کے باہر لگی، تو علاقہ کے معزز لوگوں کا ان سے تعارف کرانے کے بعد ہم لوگ ان کو اندر لے آئے۔ کار پر ان کے ساتھ لے۔ ڈی۔ سی مسٹر اڈلجی اور کلکٹر صاحب تھے۔ پروگرام شروع ہونے سے قبل ان کو آفس کے بغل والے کمرے میں صوفہ سیٹ پر آرام کے لئے بٹھا دیا گیا۔ مسٹر اڈلجی اور چکرورتی صاحب کے علاوہ اس میں کوئی نہ تھا۔

مجھ پر بار بار عوام کا اصرار ہو رہا تھا کہ گورنر صاحب کو کچھ نہ کچھ کھلانے کی سبیل نکالی جائے۔ میں خاموش ہی رہا۔ اتنے میں آنجہانی سودھا نسو جی (ملک کے ہندی کے بلند پایہ نقاد اور بہار اسمبلی کے سابق اسپیکر) کا بلاوا آیا۔ وہ آفس میں بیٹھے تھے، حاضر ہوا تو فرمانے لگے کہ "یزدانی صاحب پروگرام میں کھانے کا ذکر نہیں ہے اور

پبلک کا سخت اصرار ہو رہا ہے" میرے پاس کچھ لوگ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ "یہ مسئلہ آپ ہی سے حل ہو سکتا ہے کسی طرح کلکٹر صاحب کو راضی کیجیے۔" انھوں نے کہا "پروگرام میں نہیں ہے تو وہ ہرگز راضی نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا "پھر لوگوں کو سمجھا دیجیے۔" انھوں نے فرمایا "دونوں ناممکن ہیں۔ اس کی بس ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ گورنر گرد او مآپ چلیے۔ وہ آپ کی وجہ سے یہاں آئے ہیں، آپ خود جا کر کہیے تو شاید بات بن جائے۔" میں گھبرا گیا کیوں کہ ذاکر صاحب کے موڈ سے میں واقف تھا۔ وہ بے اصولے پن اور بے ڈھنگے پن سے بے حد خفا ہوتے تھے۔ بہر نوع مرتا کیا نہ کرتا، ڈرتا ڈرتا کمرے میں گیا اور ان کے قریب پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ ان کی فراست مشہور تھی اس کا ایک تجربہ مجھے اور ہوا۔ جیسے ہی میں پیچھے کھڑا ہوا، انھوں نے انگریزی میں میرا تعارف مسٹر اڈلجی اور چکرورتی صاحب سے بڑے اونچے الفاظ میں کرانا شروع کیا "یہ چپاں ہیں، یہ چنیں ہیں۔ میرے ایسے چہیتے ہیں۔ ویسے ہیں۔ میں انھیں کی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔" اور یہ بھی فرمایا کہ "ان کا جو کچھ پروگرام ہو ان پر چھوڑ دیجیے اور یہ جیسا چاہیں کرنے دیجیے Let him do what he disires" چکرورتی صاحب اور اڈلجی سر جھکائے سنتے رہے۔ میں جلدی سے آفس آ گیا اور رسودھا لسوجی کو مژدہ سنایا۔ اب تو پبلک میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پروگرام کے بعد شریک ہوئے ناشتہ میں چائے میں بھی۔ ڈائننگ ہال میں کچھ ایسی باتیں ہوئیں جو آگے قلمبند کی جائیں گی۔

سب سے پہلے انھوں نے بچوں کے گھر کا افتتاح کیا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "بچوں کا گھر ہر اسکول میں ہونا چاہیے۔" میں نے ایک اسکیم بنائی تھی۔ ایکبار پٹنہ گیا تو اس کی ٹائپ شدہ کاپی لیتا گیا تھا۔ اس پر اوپر ہی موٹے حروف میں ٹائپ تھا Zakir Ideal Home for Children۔ پہلے انھوں نے اس کو شروع سے آخر تک دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور فرمایا کہ ضرور قائم کریں" لیکن یہ بھی فرمایا: "مگر یہ یاد رکھیے کسی زندہ آدمی کے نام پر کوئی ادارہ ہرگز قائم نہیں کرنا چاہیے۔ میرے نام پر قائم کرنے کی میں ہرگز اجازت نہیں دوں گا، کسی ایسے بڑے آدمی کے نام پر قائم کیجیے جو مر چکے ہوں" میں نے اصرار کیا، تو کچھ اس قسم کے جملے فرمائے: "کسے پتا کہ مرتے وقت کس کا کیا حال رہے گا" اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ضبط سے کام لیا، ورنہ وہ شاید رو پڑتے۔ مجھے بعد قلق ہوا کہ میں نے یہ کیا کیا۔ لیکن چونکہ میں نے انھیں کے نام پر قائم کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا وہ اجازت نہ دیتے تو میں ہرگز کسی دوسرے کے نام پر قائم کیا ہمت کر کے کہا کہ پھر مجھے اس ادارے سے کیا دلچسپی میں قائم نہیں کروں گا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی تو

میرا چہرہ دیکھ کر فرمانے لگے "اچھا بھئی! میں جب کبھی آپ کے ہاں آؤں گا تو آپ جو چاہیں گے کریں گے" پھر پوچھنے لگے "ابتدا کتنے بچوں سے کریں گے؟" میں نے کہا پانچ سے۔ "استاد کتنے ہوں گے؟" میں نے کہا: ایک استاد اور اتالیق، فرمایا "ٹھیک ہے۔ کام کو دھیرے دھیرے ہی آگے بڑھانا اچھا ہوتا ہے۔ مگر نگرانی پانچ اور ایک کا تناسب تو ٹھیک ہے۔ بعد میں اس پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔" میں سمجھ نہ سکا کہ ان کا کیا مطلب ہے، تاڑ گئے۔ سوال کیا "ایک ماں باپ پانچ بچوں کو سنبھال سکتا ہے؟ ان کی پوری نگرانی، پڑھائی لکھائی تربیت ان کو ساتھ لے کر دسترخوان پر کھانا؟" میں نے کہا نہیں۔ فرمایا "یقین کیجیے؟" میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی فرمایا "فطری یونٹ تو دو بچوں کا ہونا چاہیے جس طرح ایک باپ دو بچوں کو بسہولت سنبھال سکتا ہے، ایک اتالیق دو بچوں کی تعلیم و تربیت کا حق ادا کر سکتا ہے۔ یہ ہے مشکل اور خرچیلا، مگر مقصود تو یہی ہونا چاہیے!" پھر فرمانے لگے "میں نے جامعہ میں بارہ پر ایک اتالیق رکھا تھا، بعد میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ میں نے غلطی کی تھی یونٹ اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیے۔"

بچوں کے گھر ہی کے سلسلے میں فرمانے لگے "پڑھی لکھی بوڑھی اور بیوہ استانیاں اگر آپ کو مل جائیں تو ابتدائی درجات کے لئے مناسب رہیں گی، فی الحال جیسا ممکن ہو کر لیجیے۔ اچھا، بچوں کے گھر کا نقشہ کہاں بنوائیے گا؟" میں نے عرض کیا جیسا حضور فرمائیں گے۔ "مجھے تو کوئی معلومات نہیں۔ فرمایا "دلی میں مسٹر ہاشمی ہیں۔ ان سے رجوع کیجیے۔" میں نے عرض کیا جب خاکہ بناؤں گا تو آپ سے مل لوں گا۔ اور آپ جیسا فرمائیں گے اسی کے مطابق بنے گا۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بچوں کے گھر کا افتتاح بیرنگر کے پروگرام کا پہلا آئٹم تھا۔ افتتاح کے لئے تشریف لے جا رہے تھے کہ راستے میں دو یا تین چھوٹے چھوٹے بچے ایک میرا بڑا صاحبزادہ فاران شکوہ یزدانی جو ۷-۸ سال کا تھا اور ایک میرا سالا جاوید جو اس سے ایک سال بڑا تھا، اپنے اپنے ہاتھوں میں خوب صورت پھولوں کے بڑے بڑے ہار لئے ہوئے کھڑے تھے اور پہنانا چاہتے تھے۔ ذاکر صاحب کے گلے تک ان کا ہار تو پہنچ نہیں سکتا تھا۔ بچوں کو دیکھ کر خود زمین پر بیٹھ گئے اور ان بچوں کو ہار پہنانے کا موقع دیا۔ جب وہ پہنا چکے تو پھر انھیں اتار کر انہی کے گلے میں پہنا دیا اور ان کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگے۔ بعد میں بتایا گیا کہ وہ کون ہیں۔ ذاکر صاحب کے پیار کی چاشنی سے وہ بچے ان سے فوراً مانوس ہو گئے اور ذاکر صاحب جب اسٹیج پر بیٹھے تو وہ بھی وہاں پہنچ گئے اور ان کے بغل میں بیٹھ گئے

ذاکر صاحب کو جتنے ہار ملے ایک ایک کر کے سب ان بچوں کے گلے میں ڈال دیتے ہے۔ ذاکر صاحب جامعہ میں میلہ بھی لگواتے تھے؛ وہیں سے سیکھ کر میں نے بیرنگر میں بچوں کا میلہ شروع کیا تھا۔ ان کے ورود مسعود کی خبر پر یہ میلہ ذرا بڑے پیمانے پر لگایا گیا تھا۔ میلے میں بچوں کی دکانیں مختلف قسم کی اور بچوں کا سیلون' بچوں کا پوسٹ آفس، بچوں کا پولیس اسٹیشن وغیرہ تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک ایک دکان کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ بچوں سے ان کی دکانوں پر لاگت، آمدنی، اس کے حصے دار، حساب کتاب رکھنے کا طریقہ وغیرہ باتوں کے متعلق استفسار کرتے جاتے اور جو بچہ ضد کرنے لگتا؛ اس کی کاپی پر اپنی دلدہی کے لئے دستخط بھی کر دیتے۔ "بچوں کا سیلون" پر پہنچے تو کچھ بچے؛ کچھ جوان سال حجاموں کو بال کاٹتے دیکھا' پوچھا یہ کون ہیں؟ بتایا گیا کہ یہ اسکول کے طلبا ہیں' جو ذات کے حجام نہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ جہاں تک یاد آتا ہے فرمایا کہ پیشہ کوئی بُرا نہیں ہوتا۔"

میلہ کمپاؤنڈ میں بھرگاما بلاک کی طرف سے مقامی کاشت کی پیداوار اور مقامی گھریلو صنعتوں کی نمائش بھی لگائی گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے مقامی گھریلو صنعتوں میں خصوصاً بیرنگر کی گھاس اور بانس سے بنی ہوئی چیزوں کو پسند فرمایا۔ چنانچہ یہاں بانس کا بنا ہوا ایک صوفہ سیٹ ان کو پیش کیا گیا۔ مقامی پیداوار کی نمائش کی چیزوں کے متعلق بتانے کے لئے بلاک سے محکمہ کاشتکاری کے افسران آئے تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھا' اس علاقہ کی مٹی' یہاں کی بعض پیداوار' بعض چیزوں کے متعلق جب وہ حضرات نہ بتا سکے تو خود ہی بہت سی نئی باتیں بتائیں۔ انھوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ اس علاقہ میں سفید سیمل کا درخت ہوتا ہے۔" لوگوں نے کہا کہ یہاں تو صرف لال پھول والے سیمل کے درخت ہوتے ہیں۔ فرمایا کٹیہار کے علاقہ میں کچھ سفید سیمل کے درخت بھی ہیں۔" نوادرات سے ان کو بڑی دلچسپی تھی۔ جب یہاں آئے تو ان کو یہاں بھی ان کی تلاش رہی۔ اسکول میں کئی جگہ کمروں میں بھی اور جلسہ گاہ میں بھی اور پھولوں کے علاوہ طرح طرح کے کروٹن بھی گلدستوں میں رکھے گئے تھے۔ علاقہ بیرنگر میں ایک قسم کا کروٹن گھونگھر والے پتوں کا بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں بھی بچوں نے مختلف کمروں میں سجا رکھی تھیں اور جلسہ گاہ میں بھی اسٹیج پر رکھا گیا تھا۔ پھولوں اور کروٹنوں پر تو وہ سرسری نظر ڈالتے تھے مگر گھونگھر والے پتوں والے کروٹن کے پتوں کو وہ بہت غور و توجہ اور دلچسپی سے دیکھتے اور ان کی پتیوں میں انگلیاں ڈال کر

نہ جانے کیا پتا لگانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں ہر جگہ ساتھ ساتھ رہا اس لئے وہ مجھ سے بار بار پوچھ کر "یہ کروٹن آپ نے کہاں سے منگوائے، بڑے انوکھے ہیں۔ ایسے کروٹن میں نے کہیں نہیں دیکھے"
میں نے عرض کیا یہ اسی علاقہ میں کثرت سے ملتے ہیں، بہت خوش ہوئے ۔

بچوں کے میلے کے متعلق انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا: "محبوب الرحمٰن صاحب (راقم) نے یہاں بچوں کا میلہ لگوایا ہے۔ بچوں کے میلے جامعہ میں لگا کرتے ہیں۔ یہ انھوں نے جامعہ سے سیکھا ہے بچوں کے میلے سے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ یہ میلے تعلیمی ہوتے ہیں۔ ان سے بچوں میں خود اعتماد پیدا ہوتی ہے۔ کام کا منصوبہ بنانا، اس کا جائزہ لینا، حساب کتاب رکھنا آتا ہے۔ اساتذ اور بچے مل جل کر کام کرتے ہیں، جس سے طلبا اور اساتذہ کا ربط بڑھتا ہے اور اساتذہ کو بچوں کی صلاحیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے "

جب وہ بیرنگر سے لوٹ کر پورنیہ پہنچے اور میں ان سے سرکٹ ہاؤس میں ملنے گیا تو انھوں نے اور باتوں کے علاوہ پھر ان کروٹنوں کا ذکر چھیڑ دیا "آپ نے جو گلدستوں میں کروٹن رکھوائے تھے وہ بہت پسند آئے" میں نے عرض کیا وہ تو اس علاقے میں ہر جگہ بکثرت ہیں۔ انھیں تعجب ہوا میں نے عرض کیا انشاء اللہ میں اس کے پودے پٹنہ لیتا آؤں گا اور احاطے میں لگواؤں گا۔ فوراً بول اُٹھے "ارے بھئی میرا یہ مطلب تھوڑا ہی تھا، آپ ایسا نہ کریں۔ اس کے لے جانے میں آپ کو بہت دقت ہو میں نے عرض کیا مجھے بالکل دقت نہیں ہوگی، منع فرماتے رہے۔ مگر جب ایک بار گیا تو آٹھ دس مختلف قسم کے کروٹن کے پودے لیتا گیا جن میں گھونگھریالے کروٹن کے پودے زیادہ تھے۔ بہت خوش ہوئے اور بڑے مالی کو بلوا کر ان کو گورنر ہاؤس کے احاطے میں لگوانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ لگ گئے تو مجھ سے فرمایا "آپ کے کروٹن لگ گئے۔ آپ کا بیحد شکریہ"

ذاکر صاحب کا مشاہدہ اور ان کی یادداشت عجیب و غریب تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی نہیں بھولتے تھے۔ بیرنگر کے سلسلے کے چند واقعات اور سن لیجیے:

ہمارے اسکول میں ایک نوجوان استاد تھے، چودھری منصور عالم ان کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے غائبانہ عقیدت و محبت تھی، وہ چاہتے تھے کوئی موقع ملے تو میں ان کو ذاکر صاحب سے ملادوں۔ مختصر وقت، مختلف پروگرام اور بے پناہ ہجوم کی وجہ سے موقع نہ مل سکا جب میں نے ذاکر

حب کو پورنیہ کے لئے رخصت کرنے کے لئے کار کا دروازہ کھولا تو چودھری صاحب میرے بالکل قریب
ہ، جلدی میں بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اور غالباً دعا کی درخواست کی۔ کار روانہ ہو گئی۔ تعارف
نے کا موقع نہ ملا۔

پھر جب ہیں بٹ۔۔۔۔۔ پہنچا تو انھوں نے اور باتوں کے علاوہ چودھری
ور عالم کے متعلق بھی پوچھا کہ "وہ نوجوان مجھ سے کیوں ملا تھا؟" میں نے عرض کیا وہ حضور سے عقیدت و
ت رکھتے ہیں اور آپ سے اپنے متعلق مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ چودھری صاحب نے کچھ عرصہ کے بعد ذاکر
حب کو خط لکھا اور ان سے ملنے کی درخواست کی، بلائے گئے اور مشورہ دیا۔

لحیم شحیم، لمبے تڑنگے، سرسید جیسی داڑھی والے بیرنگر کے ایک معمر آدمی تھے حاجی جمال الدین
احب مرحوم۔ اسکول کے پڑوس میں ان کا مکان تھا اور ہے۔ مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ مقطع داڑھی،
بات میں "ہو مولا، مولا ہو" ان کا سخن تکیہ تھا۔ لوگوں نے ان کا نام "مولا جمال" رکھ دیا تھا۔ اپنی مقامی
تعلی آمیز زبان میں سب سے بات کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے متعلق اونچا خیال رکھتے تھے۔ محبت اندھی ہوتی
ہے۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں ان کو ذاکر صاحب سے ملا دوں۔ مگر مجبوری تھی۔ سمجھانے بجھانے پر بھی اٹے
ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ذاکر صاحب ہائی اسکول کے پروگرام کے بعد مڈل اسکول کے معائنہ کے
ے تشریف لے گئے۔ ہزاروں کا مجمع بے پناہ بھیڑ میں ذاکر صاحب کو لئے ہوئے میں ان کے آگے آگے اور ان کے
، ڈی۔ سی پیچھے پیچھے مڈل اسکول کے احاطے سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے ہائی اسکول کی طرف آ رہے تھے کہ
ولا جمال نے پوری عربی قراءت کے ساتھ السلام علیکم کہا اور راستہ روک کر ذاکر صاحب کے سر پر شفقت
محبت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتے رہے۔ ذاکر صاحب بالکل سر جھکائے کھڑے رہے اور جب وہ دعائیں
ے چکے تو آگے بڑھے۔ ذاکر صاحب نے انھیں یاد رکھا اور جب وہ صدر جمہوریہ ہو گئے، تو بھی ایک خط
ں ان کا ذکر فرمایا، ان کو سلام لکھوایا اور ان کی خیر خیریت پوچھی۔

دیدار بخش ہائی اسکول سے متصل ایک مدرسہ تھا۔ "امداد الغربا۔" یہ مدرسہ اب وہاں سے منتقل
و گاؤں میں چلا گیا ہے۔ میں نے اس کا بھی معائنہ پروگرام میں رکھوا دیا تھا۔ مدرسہ کے احاطہ میں پھوس کے
بند مکانات تھے۔ ایک مکان بہت جلدی میں ذاکر صاحب کی آمد کی خبر سُن کر بنوایا گیا تھا۔ مدرسہ والے
شغول تھے۔ مکان میں کھڑکیاں وغیرہ نہیں تھیں صرف اگلی طرف میں ایک بہت ہی چھوٹی سی کھڑکی مر[illegible]

نے لگا دی تھی۔ ذاکر صاحب مدرسہ کے آفس وغیرہ کا معائنہ کرنے کے بعد اس مکان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور مجھ سے پوچھ بیٹھے "کیا یہ پوسٹ آفس ہے؟" ذاکر صاحب سمجھ گئے تھے کہ یہ مدرسہ کا مکان ہے مگر اس میں کھڑکیاں نہ ہونے کی وجہ سے اس کو پوسٹ آفس کہکر یہ سبق دینا چاہتے تھے کہ مدرسہ تعلیم کی جگہ ہے۔ تعلیمی و تدریسی کمروں میں روشنی اور ہوا کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ میں بہت شرمندہ ہوا اور مدرسہ والے بھی بہت جھینپے اور ان کے انوکھے اندازِ تربیت سے لطف لیتے رہے۔

ذاکر صاحب کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی مشہور تھی۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ سن لیجیے جو بیر نگر میں پیش آیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ان کے ساتھ شریک دسترخوان ہونے والوں کے لئے مختلف قسم کے ناشتے پھل، مٹھائیاں وغیرہ رکھی گئی تھیں اور چیزوں کے علاوہ بیر نگر کا کھاجا بھی پیش کیا گیا تھا۔ بیر نگر کا کھاجا مشہور ہے۔ یہاں کے حلوائی سے بڑے اہتمام سے بنوایا گیا تھا۔ بہت ہی مختصر سائز کا تہہ دار اور سبک کھاجا اپنی شکل و شباہت کے لحاظ سے کیلا جیسا لگتا تھا۔ ذاکر صاحب نے میٹھی چیزوں کو تو ہاتھ نہیں لگایا، غالباً ان کو میٹھے سے پرہیز تھا۔ لہٰذا بیچارہ کھاجا بھی ایک کونے میں پڑا رہا۔ چونکہ یہ کھاجا ذاکر صاحب ہی کے اعزاز میں یہاں کی پبلک نے بنوایا تھا اور وہ اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھ رہے تھے، ایک صاحب کی نظر پڑ گئی جو مقامی لیڈر تھے اور ذاکر صاحب سے قریب بیٹھے تھے، درخواست کی کہ حضور یہ بیر نگر کا کھاجا ہے۔ یہاں کا کھاجا مشہور ہے بحضور والا ہی کے لئے بنوایا گیا ہے۔ ذاکر صاحب نے تعجب کے انداز میں برجستہ فرمایا "اوہو یہ کھاجا ہے! میں نے تو کیلا سمجھا تھا" پھر دلدہی کے لئے ذرا سا توڑ کر چکھ لیا۔

ذاکر صاحب دیدار بخش ہائی اسکول تشریف فرما ہوئے تھے۔ اس اسکول کے بانی حاجی دیدار بخش صاحب مرحوم تھے، انھوں نے اس اسکول کے قیام و بقا کے لئے بڑی قربانیوں سے کام لیا تھا۔ ذاکر صاحب علاقہ بیر نگر کی تعلیمی پسماندگی اور حاجی دیدار بخش صاحب کے جذبہ خدمت و ایثار سے بہت متاثر ہوئے۔ چونکہ حاجی صاحب ورودِ مسعود سے قبل ہی وفات پا چکے تھے لہٰذا انھوں نے ڈائننگ ہال ہی میں ان کے دونوں لڑکوں تیسیر الدین صاحب اور محی الدین صاحب (مرحوم) کو بلوایا اور نصیحت کی اور ایا آپ لوگ دل جمعی کے ساتھ اسکول کو چلاتے رہیں، جو کام حاجی صاحب مرحوم کر گئے ہیں وہ اب آپ کے کرنے کا ہے۔ تیسیر الدین صاحب نے ان سے درخواست کی کہ حضور ہم لوگوں سے جو کچھ بن پڑتا ہے کر رہے ہیں مگر اسکول کو منظوری نہیں ملی ہے۔ جس سے نقصان ہو رہا ہے۔ اس پر ذاکر صاحب نے فرمایا "میں یہاں

اس لئے نہیں آیا کہ اسکول کو منظوری مل جائے۔ میں تو جہاں جاتا ہوں بے غرض جاتا ہوں۔ اس کام کے لئے آپ کے بہاں نیز یہ موجود ہیں۔ یہ سودھا لسنوجی کی طرف اشارہ تھا جو پاس ہی بیٹھے تھے۔ سودھا لسنوجی متوجہ ہوئے اور وعدہ فرمایا کہ میں اس سلسلے میں کوشش کروں گا۔ چنانچہ انھوں نے اس معاملے میں دلچسپی لی۔

ذاکر صاحب تعلیمی اداروں اور تعلیمی کام کرنے والوں کو آزاد رہ کر تعلیم کا کام کرنے کے قائل تھے۔ وہ ان کو سرکاری روک ٹوک سے بری دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے کئی بار تحریری اور تقریری دونوں صورتوں میں ان سے عرض کیا کہ اسکول کو منظوری نہیں ملی ہے، اس لئے لڑکے کم آتے ہیں اور جو بھی آتے ہیں چند سال رہ کر چل دیتے ہیں۔ اس پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں مجھے فرمایا کہ "آپ تعلیمی کام کرتے رہیے، اچھی تعلیم دیتے دلاتے رہیے، منظوری کی زیادہ فکر نہ کیجیے۔ اگر آپ کی جگہ میں ہوتا، تو منظوری کی ہرگز کوشش نہ کرتا۔" اس سلسلے میں جب میں پریشانی کے عالم میں لکھتا تو جواباً فرماتے "آپ مجھے لکھتے رہیے، حالات سے باخبر کرتے رہیے۔ میں آپ کے لئے کچھ کر نہیں سکتا مگر دعا تو کر سکتا ہوں۔"

میرے اسکول اور تعلیمی کام کے متعلق برابر اپنے گراں قدر مشوروں اور نصیحتوں سے نوازتے رہے۔ ایکبار فرمایا "اس کا خیال رکھیے کہ اسکول کا کوئی گوشہ اجاڑ اور سنسان نہ رہے۔ اسے پھولوں اور پودوں سے سجائیے۔ اگر قیمتی پھول نہ لگا سکیں تو 'دگن ویلیا' کی بیلیں ہی سلیقہ سے لگوا دیجیے۔" اسی سلسلے میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ "میں جب علی گڑھ میں وائس چانسلر ہو کر گیا تو یونیورسٹی کے احاطے کے کچھ حصے پھولوں اور باغوں سے خالی اور جھاڑ جھنکار سے پُر تھے، مجھے اچھے نہیں لگے اور ان میں چمن بندی کرائی"

ایک بار میں نے عرض کیا کہ اسکول تو منظور ہو گیا مگر حضور والا کے بقول اس میں سلیبس اور کوڈ کی 'لال کتاب' کی پابندی ہے۔ ان پابندیوں میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں نہیں ہو سکتا، فرمایا "اسکول کو ہر طرح سے مکمل کیجیے، سائنس، کامرس وغیرہ کے شعبے بڑھائیے، ڈرائنگ کے اچھے استاد رکھیے۔ ڈرائنگ خوشخطی کا پہلا اسٹیج ہے۔ آج کل اسکول کالج کے طلبا اکثر بدخط ہوتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ڈرائنگ پر توجہ نہیں دی جاتی۔"

یہ بھی فرمایا کہ "آپ کے ضلع میں جو تاریخی اور نادر چیزیں ہوں اپنے اسکول میں ایک میوزیم بنا کر ان کو جمع کیجیے۔ ان سے تعلیمی فائدہ ہوگا۔" اور فرمایا کہ "اسکول کے ریزلٹ کی طرف خاص توجہ دیجیے۔"

ایک بار فرمایا کہ "اچھے اسکول کے لئے اچھے اساتذہ کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کے انتخاب میں خوب جانچ پرکھ سے کام لیجئے، جلدی نہ کیجیے کہ جو اساتذہ بحال کئے جائیں وہ آپ کے ڈھب کے ہوں۔ اگر اس میں چوک ہو گئی اور ایک بھی غلط استاد بحال ہو گیا تو ایک مچھلی سارے پانی کو گندہ کر دے گی۔"

علاقہ بیرنگر کے عوام نے اپنے سپاسنامے میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس علاقہ میں سڑک نہیں ہے۔ سڑک نہ ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ پسماندہ ہے اور تعلیم کے کام میں بھی دقّت پیش آتی ہے۔ جواباً فرمایا: "آپ اچھی تعلیم کا انتظام کریں، سڑک بنوانے کی فکر نہ کریں، جہاں اچھی تعلیم ہو گی سڑک خود بخود بن جائے گی۔"

ایک بار یہ نصیحت فرمائی "کام سب کیجئے گا، جھگڑا کسی سے نہ کیجئے گا۔ جو جھگڑا کرتا ہے، جھگڑے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ جھگڑا ایک مستقل کام بن جاتا ہے۔"

بیرنگر میں جو 'ذاکر آئیڈیل ہوم' کا افتتاح ذاکر صاحب سے کرایا گیا تھا، اس کے بعض مسائل کا حل میں اُن سے بذریعہ خط بھی پوچھتا رہتا تھا۔ ایکبار کئی مسئلے لکھ بھیجے۔ جواباً تحریر فرمایا "بچّوں کو اپنا بچہ سمجھ کر رکھیئے، سب کچھ ٹھیک رہے گا۔"

ایک بار بچوں نے میلہ لگایا اور مصر ہوئے کہ میں ذاکر صاحب کو اس کی خبر کر دوں، تفصیلی رپورٹ بھی بھیج دوں اور ان سے پیام منگاؤں۔ چونکہ بیرنگر کے میلے کا موجد میں تھا، میرے دل میں بھی خود ستائی کا چور بیٹھا تھا۔ میں نے پہلے رسمی طور پر بچّوں کو روکا، مگر بعد میں تیار ہو گیا اور میلے کی کارگزاری کی ایک تفصیلی رپورٹ مرتّب کر کے اپنی چوری کو چھپانے کے لئے یوں لکھا کہ بچّوں کا مجھ پر شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ آپ سے اس سلسلے میں چند منٹ ہمت افزائی کے کلمات لکھنے کی درخواست کروں۔ جواباً ذاکر صاحب نے ارقام فرمایا کہ "بچّوں کے میلے کے متعلق پڑھ کر جامعہ یاد آ گئی۔ بڑی خوشی ہوئی۔" مگر ساتھ ہی ساتھ میری چوری پکڑی اور سخت ڈانٹ بتائی۔ لکھا کہ "بچّوں میں پیام طلبی کی عادت نہ ڈالیے" اور غالباً یہ بھی لکھا کہ "ان کا کام ہی ان کا انعام ہے۔" اس دن سے میں نے کان پکڑ لئے۔ یہ تھا ان کے تربیت کا انداز۔ افسوس، اب ایسا مُربّی کہاں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منوّر فرمائے اور ان کے درجات میں ترقی عطا فرمائے۔ ان کے نقش قدم پر اس نالائق اور بدنام کنندہ کو تعلیمی میدان میں چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

●●

# سیّد شاہ منظر حسین

[جناب سیّد شاہ منظر حسین : (پ ۱۹۲۴ء تقریباً) علیگڑھ کے بی ایس سی-
خلیفہ باغ بھاگل پور کے گرامی قدر خاندان کے نمبر ۲، شرف عالم صاحب
نمبر ۱، خانقاہ کے موجودہ سجّادہ نشیں ہیں۔ عنایت آفتاب (عنایت حسین شاہ)
نمبر ۳ آئی۔ اے۔ ایس ہیں]

○

جولائی ۱۹۳۸ء میں ہمارے والد مرحوم جناب سیّد شاہ فخر عالم صاحب سجادہ نشیں آستانہ پیر دمڑیا بابا خلیفہ باغ۔ بھاگل پور نے مجھے تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی روانہ کیا۔ میرا داخلہ درجہ پنجم میں کرایا گیا۔ جاڑے کے دن تھے۔ میں کھانا کھاکر ہوسٹل کے سامنے دھوپ میں سرخ بجری پر ٹہل رہا تھا کہ اسی بیچ ملازم نے والد صاحب کا خط لاکر دیا۔ خط نکال کر لفافے کے پرزوں کو جونہی تتلیوں کی طرح ہوا میں آزاد کیا اور یہ ٹکڑے سرخ بجری پر کچھ اس طرح بکھر گئے جیسے کسی بدتمیز نے کتھے کی کٹھیا میں چونے کی چھینٹ چھڑک دی ہو۔ اسی لمحہ ایک محبت بھری آواز کانوں سے ٹکرائی جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرکے ارشاد فرمایا ― "ان کاغذ کے ٹکڑوں کے لئے وہ سامنے ہر الٹین رکھا ہے، انھیں چن کر اس میں ڈال دیں۔ کیا آپ کو اس سرخ بجری پر یہ سفید پرزے گراں نہیں گزر رہے ہیں!"

میں اپنے سامنے ذاکر صاحب کی سیاہ داڑھی اور پُر رونق چہرہ کو دیکھ کر بے چون وچرا خاموشی سے کاغذ کے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کرکے ہرے ٹین میں ڈال آیا۔ یہ آج سے ۴۴ سال پہلے کی بات ہے، اور وہ نقشہ میری نظروں کے سامنے ہمیشہ قائم رہا ہے۔

● شیخ الجامعہ کی چھوٹی سی کالی گاڑی تھی اپنے ڈرائیور کے سڑک پر نیم کے درخت کے نیچے قیلولہ کر رہی تھی۔ ہم ریڈیو (۱۵ / ۲۲ [illegible]) میں ظہیر احمد انوار نے کار کے قریب جاکر ڈرائیور کو اس طرح مخاطب کیا: "ارے! آپ تو

سو رہے ہیں۔ ذرا مہربانی کرکے ہم لوگوں کو نہر تک چھوڑ دیجئے۔ ڈرائیور نے جواب دیا کیا خوب!! پاس ہی تو نہر ہے، دو فرلانگ پیدل نہیں جا سکتے۔ یہ کہکر وہ دوبارہ خراٹے لینے لگا۔ ظہیر کی نظر اچانک نیم کے درخت پر شہد کی بڑی مکھی کے ایک چھتہ پر پڑی جو تقریباً تین فٹ لمبا اور ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور ہم لوگوں کے ذہن میں ایک ساتھ ایک ہی شرارت سوجھی۔ ہم لوگوں نے انوار کو اپنے سینئر ہاؤس والے کمرے میں اوپر بھیج دیا جہاں سے وہ بہ آسانی ہماری شرارتوں کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔ جب اس نے کمرہ میں پہنچکر شیشے کے دروازہ سے ہاتھ کا اشارہ کیا تو ہم لوگوں نے شہد کے چھتے میں ڈھیلا مارنا شروع کیا۔ میرا ایک ڈھیلا ٹھیک اس جگہ پڑا جہاں شاید ملکہ تھی۔ اچانک لاکھوں مکھیوں نے اُتر کر کار کو گھیر لیا۔ ہم لوگ بھی بھاگے۔ دو چار نے سر میں کاٹا بھی۔ لیکن کسی طرح تیز سانسوں سے اپنے کمرہ میں پہنچ گئے۔ انوار بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ سڑک پر نظر ڈالی تو کار غائب تھی۔ انوار نے کہا جونہی مکھیاں کار پر حملہ آور ہوئیں ڈرائیور نے اپنے چہرے پر پہلے ایک دو بار، پھر لگاتار ہاتھ مارنے شروع کیے اور کسی طرح اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا دہلی کی طرف چل دیا۔ مکھیوں نے پیچھا کیا اور وہ راستہ میں بازار میں پھیل گئیں اور اس طرح تھوڑی ہی دیر میں ہر حرکت کرنے والی چیز یا تو ساکت ہوگئی یا روپوش ہوگئی۔ دو گھنٹہ تک جامعہ میں کرفیو لگا رہا۔ غروب آفتاب کے بعد ایک آدمی کار کی تلاش میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد کار آئی لیکن ڈرائیور کی آنکھ، کان اور ناک کا کنٹور لال پارہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جلدی سے اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ ہم لوگ بھی پوری جامعہ کی بھیڑ کے ساتھ اسپتال پہنچے۔ ڈاکٹر اور کمپونڈر مکھیوں کے ڈنک نکال رہا تھا۔ اسی درمیان ذاکر صاحب بھی آگئے اور جب انھیں پوری حالی معلوم ہوئی، تو وہ ڈرائیور سے بولے "وہ بچے تم میں زندگی دیکھنا چاہتے تھے۔ تم دن میں بھی سو رہے تھے۔ یاد رکھو حرکت میں ہی زندگی ہے، کہ سکون تو موت سے بدتر ہے"۔

ڈرائیور نے جھنجھلا کر بہت ہی ترش روئی سے جواب دیا — "واہ صاحب ایک تو آپ کے لڑکوں نے میرا حلیہ بگاڑ دیا اور اُلٹا آپ مجھ ہی کو ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں"۔ ذاکر صاحب کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ برہم ہوکر بولے "یہ تمہاری غفلت کا ہی نتیجہ ہے جس کی سزا تمھیں ملی ہے"۔

● ۱۳ جولائی ۱۹۴۵ء کو میں ہائی اسکول پاس کرکے مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے علی گڑھ پہنچا اور ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی میں شرکت کرنے کے لیے دہلی گیا۔ ہمارے پرانے ساتھیوں میں سید منیر الدین احمد آبادی جو بمبئی کے ۱۸ گیہنگٹ سید افتخار مظفر قادری کے بڑے بھائی ہیں اور ان دنوں لندن یونیورسٹی

، مع اپنی بیگم کے میڈیکل ڈاکٹر ہیں؛ فوٹوگرافی سے لیس پُرتپاک طریقہ پر مجھ سے ملے۔ ہم لوگوں کے ذمہ
اکرصاحب نے جوبلی اسٹال کی سجاوٹ کا کام سپرد کیا۔ ایک دن منیرالدین قادری نے مجھے مہمانوں کے کارڈ لاکر
یے کر انھیں صوفوں پر پن اَپ کردو۔ میں نے بیچ والے صوفہ پر داہنے مولانا ابوالکلام آزاد اور بائیں طرف
سٹر محمد علی جناح کے کارڈ ایک ہی صوفہ پر پن اَپ کردیئے اور اس کے بعد جناح کے پہلو والے صوفہ پر مسٹر لیاقت
علی خاں، عبدالرب نشتر وغیرہ کے کارڈ لگائے۔ مولانا آزاد کے پہلو میں مسٹر آصف علی اور دیگر کانگریسی مسلمانوں
کے کارڈ لگائے۔ ایک گھنٹہ بعد جونہی ذاکرصاحب اسٹیج پر آئے اور ان کی نظر ایک ہی صوفہ پر مولانا آزاد
اور مسٹر جناح کے ناموں پر پڑی تو پوچھنے لگے:

"یہ کن صاحب نے کارڈ لگائے ہیں"

میں جلدی سے آگے بڑھا۔ "جی! یہ کارڈ میں نے لگائے ہیں"۔

"انھیں الگ کیجیے۔ کیا آپ جامعہ ملیہ کو کھولو اور حمیدہ کا اکھاڑا بنانا چاہتے ہیں۔ جلدی کیجیے
..... جلدی" یہ کبھی ایک جگہ نہیں رہ سکتے، انھیں الگ الگ کردیجیے"۔

میں نے گھبراکر پن نکالنے شروع کیے۔

"سنو میاں منظر۔ یہاں صوفوں کی تین قطاریں ہیں۔ ایک طرف لیگ کے ممبروں کی چٹ لگاؤ،
تو دوسری طرف کانگریس والوں کی اور ان دونوں کے درمیان بیچ والی صف میں والیانِ ریاست و دیگر
معزز مہمانوں کے کارڈ چسپاں کردو۔ اور دیکھو اگلی میز پہ بیچ والی صدر کی کرسی چھوڑ کر ایک طرف میرا اور دوسری طرف
خواجہ عبدالمجید صاحب کا کارڈ لگا دینا"۔

● ایک دن میں نے ذاکرصاحب کو کھانے پر مدعو کیا اور انھوں نے بکمال شفقت دعوت
منظور کرلی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کمرہ کی سجاوٹ سے کافی مسرور ہوئے اور بولے "عموماً لوگوں کے کمرے سفیدی
(چونا) سے پُتے ہوئے ہوتے ہیں۔ ارے بھائی سفید قلعی تو اسپتالوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم تو ہلکے
رنگ کا ہو، کھانے کا کمرہ گلابی، اور سونے کا کمرہ ہرا ہونا چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمھارا یہ کمرہ بسکٹ رنگ کا
اور باہر کا حصہ ہرا، جہاں شاید تم لوگ بیٹھتے اور پڑھتے ہو۔ اور میں نے عموماً یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ اپنے کمرہ میں
خود اپنی ہی تصویر لگاتے ہیں۔ لیکن تمھارے کمرہ میں سینیریاں ہیں اور تمھارے ہاتھ کی بنائی فریم ہیں جو

سے تمھارے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن ایک چیز کی کمی ضرور میں نے محسوس کی ہے کہ تم نے اتنا لذیذ کھانا کھلایا لیکن کلوروفل (chlorophyll) قسم کی کوئی چیز کھانے میں نہیں تھی۔"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا اور بولا "ڈاکٹر صاحب میں نے آپ کو مغل ڈش کھلائی ہے۔ اس لیے سلاد نہیں رکھا، سلاد تو انگریزی کھانوں کی ڈش ہے، ہمارے ملک میں پانوں کا رواج اسی لئے ہے کہ ہم کلوروفل کی کمی پوری کرکے مرغن غذا کو ہضم کرسکیں۔ یہ کہکر پان کی ٹرے ان کی طرف بڑھا دی ذاکر صاحب نے کہا "میں نے زندگی میں کبھی پان نہیں کھایا لیکن تمھارے کہنے سے آج کھاتا ہوں۔ یہ کہکر انھوں نے چھ سات پان یکے بعد دیگرے کھا لیے۔ پھر بولے: "اپنے باورچی کو بلاؤ، یہ کہاں کا رہنے والا ہے۔" میں نے کہا، "ہمارے بدایوں والے خالو کا پروردہ ہے اور خالہ نے یہاں بھیج دیا ہے، ہم لوگ ڈائننگ ہال سے آج کل کھانا نہیں منگواتے؛ بلکہ یہی باورچی ہم چھ بھائیوں کا کھانا بناتا ہے۔ یہ کہہ کر میں نے حمید بیرا کو آواز دی کہ باورچی کو بھیج دے۔ باورچی ادب سے آکر کھڑا ہوگیا۔ ذاکر صاحب نے اس سے کہا کہ بھائی اگر میں کبھی تم کو اپنے یہاں کھانا بنانے کے لیے بلاؤں تو کیا تم آؤگے۔ اس نے جواب دیا خوشی خوشی آؤں گا۔" پھر ذاکر صاحب نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے انعام میں دیا، جو اس نے سر جھکا کر قبول کیا اور سلام کرکے چلا گیا۔ ساڑھے نو بجے رات میں ذاکر صاحب خوش خوش واپس ہوئے۔

● میرے امتحان کا نتیجہ نکلا اور میں فیل تھا۔ جب میں علی گڑھ پہنچا تو اپنے نجی اثر و رسوخ سے اپنے نمبر کا پتہ چلایا۔ معلوم ہوا کہ کیمسٹری کے ایک پرچہ میں زیرو (zero) ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ مقصود بھائی سے ملا اور انھوں نے جب کاپی نکلوائی تو پتا چلا کہ جوابات کے آگے تو نمبر درج ہیں جن کی مجموعی تعداد ستر ہے لیکن اسے کاٹ کر صرف سرورق پر ڈاکٹر عزیز کے دستخط سے کردیا گیا ہے ان کے مشورہ پر پہلے میں رجسٹرار مسٹر اے، ای زبیری سے ملا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ نتیجہ میں کافی تاخیر ہوگئی ہے۔ اس لیے اب صرف ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اپنے اختیار سے آپ کی کاپی کے جانچنے کا دوبارہ حکم دے سکتے ہیں۔ اس لیے ہم اور عنایت آفتاب ان سے ملنے وائس چانسلر لاج گئے۔ اور ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل موضوع پر آ گئے۔

"ڈاکٹر صاحب! میں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں کہ ہم لوگ جب گھر کی تعطیل کے بعد یہاں آئے تو معلوم ہوا کہ میں فیل ہوگیا ہوں اور کیمسٹری کے ایک پرچہ میں زیرو ہیں، باقی تمام نمبر بہت اچھے ہیں، چونکہ نتیجہ نکلے ایک ماہ سے اوپر ہوگیا ہے اس لیے زبیری صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ اس تاخیر پر وائس چانسلر ہی دوبارہ کاپی جانچ کرانے کا آرڈر دے سکتے ہیں۔"

جواب دیا کہ یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔ زبیری صاحب نے کیوں تم لوگوں کو میرے پاس بھیجا۔ یہ کام تو امتحانات کے رجسٹرار کا ہے، یا پھر خود ان کا شعبہ اسے درست کر سکتا ہے۔

منظر: چونکہ تاخیر کافی ہوگئی ہے اس لئے انھوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن اب میں کیا کر سکتا ہوں۔

منظر: آپ یونیورسٹی کے مختار کُل ہیں، آپ کو اگر مجاز نہ ہوتا تو زبیری صاحب ہم لوگوں کو آپ کے پاس کیوں بھیجتے۔

ذاکر صاحب: کیا تمھیں پتا ہے، میری لڑکی بھی دینیات (Theology) میں فیل ہے۔

منظر: یہ ممکن ہے کہ میں اس پرچہ میں فیل ہوں۔ لیکن صفر آنے کے معنی ہیں کہ میں نے سادی کاپی داخل کی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن یہ بتاؤ آخر صفر ملنے کی وجہ کیا ہے؟

منظر: میں بتانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن آپ جب پوچھ رہے ہیں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ شاید یہ علی گڑھ کی ہال پولیٹکس کا نتیجہ کہیں نہ ہو۔ کیونکہ یہ کاپی ڈاکٹر عزیز احمد کے پاس تھی۔ وہ ڈائننگ ہال کے صدر ہیں اور ایس ایس ویسٹ کے وارڈن ہیں، ہال میں کچھ لوگ مجھے عنایت آفتاب اور ہمارے دوستوں کی بڑھتی ہوئی پوزیشن کو حسد سے دیکھتے ہیں کیونکہ ہمارا گروپ کسی نہ کسی کمیٹی، کلب، یا ادارہ کا سکریٹری یا صدر ہے۔

ذاکر صاحب: لیکن ڈاکٹر عزیز صاحب کو تم سے کیا شکایت ہوسکتی ہے۔

منظر: میں چند ماہ پہلے جب فوڈ مانیٹر بنایا گیا تھا تو میں نے مطبخ کی کچھ بدعنوانیوں کی روک تھام کی تھی جس پر سینیئر فوڈ مانیٹر نے میرے کمرے میں مرغ اور پلاؤ کی اسپیشل ڈش بھیجی تھی جسے میں نے ٹھکرا دیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن ہی مجھے 'مانیٹر شپ' سے ہٹا دیا گیا۔

ذاکر صاحب: مگر اس سے ڈاکٹر عزیز صاحب کا کیا تعلق ہے؟

منظر: ان بدعنوانیوں کی سرپرستی میں ان کی بھی اشیرباد تھی۔

ذاکر صاحب: تم اپنے ایک استاد پر الزام لگا رہے ہو۔

منظر: یہ الزام نہیں ہے، حقیقت ہے۔

ذاکر صاحب: اس کا تمھارے پاس کوئی ثبوت؟

منظر: افسوس تو یہی ہے کہ میں اس لمحہ اس کا ثبوت آپ کو نہیں دے سکتا۔

ذاکر صاحب: (ترش رو ہو کر) میں ایسی جہل باتوں کو پسند نہیں کرتا۔

**منظر** : میرا اس وقت یہاں آکر ڈاکٹر عزیز کی بدعنوانیوں کی شکایت کرنے کا خیال تک نہ تھا، ورنہ میں تمام ثبوت کے ساتھ آپ کے پاس آتا۔ میں تو اپنی کاپی کی دوبارہ جانچ کے لئے آپ کا حکم طلب کرنے آیا تھا۔ اگر آپ اس کی اجازت دے دیں تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ (دراصل میں ذاکر صاحب سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں خود اپنی نظر سے کاپی دیکھ کر آ رہا ہوں۔ کیونکہ اگر یہ کہتا تو جتنے بھی Dealing clerk تھے ان کی نوکری پر بن آتی)

**ذاکر صاحب** : میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ اب تم صبر کرو۔ برداشت کرنے کے باوجود میں غصہ سے کھڑا ہو گیا۔

**ذاکر صاحب** : کیا تم خفا ہو گئے؟

**منظر** : میں آپ سے غلط کام کو کہنے نہیں آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آپ اجازت دیدیں لیکن آپ مجھے صبر کی تلقین کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے میں صبر ہی کروں گا۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

**ذاکر صاحب** : کیا تمھیں اس پر یقین ہے۔

**منظر** : بحمداللہ میں مسلمان ہوں اور ایک مسلمان کو اللہ پر بھروسا ہوتا ہے اور ہر پریشانی میں وہ صبر و رضا کا قائل ہوتا ہے۔ انشاءاللہ یہ میرے حق میں بہتر ہی ہوگا۔

ذاکر صاحب ایک دم سے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے ہاتھ پیچھے کر لیے اور دو چار قدم چل کر پلٹے، منیر صاحب کو بلانے کے لیے انھوں نے گھنٹی بجائی۔ ڈاکٹر عزیز صاحب نہ صرف سر سید ہال کے مطبخ اور فوڈ منسٹری کی صدارت سے ہٹائے گئے بلکہ ان پر کچھ ایسی بن آئی کہ وہ خود ہی مسلم یونیورسٹی سے استعفیٰ دے کر دہلی ہمدرد دواخانہ میں ملازمت کے لئے چلے گئے۔ لڑکوں کا کھانا جو کمروں میں جاتا تھا وہ بند کر دیا گیا اور ڈائننگ ہال سسٹم پھر سے شروع ہوا۔

●●

# تحائف موصولہ

• **بے نام** : سرشار صدیقی (پ ۱۹۲۶ء) کا مجموعۂ کلام (غزلیں اور نظمیں) ۱۹۸۳ء-۱۴۴ص
——— ۱۹۵۵ء تک وطن کانپور، پھر "نیا مدینہ" کراچی : نہ میں ملی نہ زماں ملی ٭ جو اماں ملی تو کہاں ملی!
——— سرورق کا شعر : رنگ ہوں، بو ہوں، حرف و نوا ہوں، محسوس و معلوم ہوں میں
یاس و یگانہ کا لہجہ ہوں، غالب کا مفہوم ہوں میں
——— ایک اور شعر : اسی کاوش میں عمر ہو گئی صرف ٭ لکھ سکوں اپنی سوچ حرف بحرف

• **ادعیۃ القرآن** : مؤلفہ ڈپٹی نذیر احمد۔ ڈاکٹر محمد اسلم فرخی کی تصحیح اور مفید مقدمہ کے ساتھ۔
ڈپٹی نذیر احمد تعلیمی ٹرسٹ کراچی ۱۹۸۲ء- ۱۴ + ۱۰۰ص-

• **آتش فشاں پر کھلے گلاب** : آصف فرخی کے افسانوں کا مجموعہ۔ ایک دل آویز، خیال انگیز اور خوش اسلوب پس گفتار کے ساتھ۔ ۱۴، بی، الہلال سوسائٹی۔ کراچی - ۱۹۸۲ء - ۲۵۵ص
——— مظفر علی سید نے آصف کو خطرناک حد تک تازہ کار، خطرناک حد تک پڑھا ہوا جن، خطرناک حد تک واقعیت شناس اور بصیرت مند قرار دیتے ہوئے لکھا ہے "نہ تو اس کو اپنے دور میں مدغم ہونا گوارا ہے اور نہ اس سے دائمی گریز۔ ابو طالب کلیم کے الفاظ میں :
درمیان من و تو الفتِ محکم است و کنار ٭ روز و شب با من و ہر لحظہ گریزاں از من"

• **قاموس الاقبال** (فہرست کتب اقبالیات) : ۲ جلد۔ عبدالجبار شاکر، بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سکنڈری ایجوکیشن، لاہور، ۱۹۸۱ء۔ ص ص ۵۹ + ۱۷، ۳۹ + ۴۰

• **تھری ڈی اسٹوریز** : (3D STOREES)، اسد القادری، ۱۲ ایچیسن گنیت وڈ لاہور۔ ۱۹۸۳ء- ۱۹۲ص-
——— تاریخ اسلام پر مبنی دلچسپ افسانے۔

• **تفسیر سورۂ فاتحہ** : (انگریزی و اردو)، اسد القادری۔ ۱۹۸۲ء: ص ص ۴۸ + ۵۲،

• **نقش اعجاز** : اعجاز حسن صادق پوری کی نظمیں اور غزلیں مع اسلام حروف مصنف کے والد سید احمد حسن صاحب کے اہتمام سے۔ ۱/۲۳، ۷ شریف آباد، کراچی (۱۹)، ۱۹۸۱ء - ۱۰۴ص -

● **مجمع البحرین** : شیعہ اور سُنّی متفق علیہ احادیث ۔ مؤلفہ محمد جعفر شاہ پھلواروی مرحوم۔ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور۔ ۱۹۶۹ء ۔ ص ص ۳۲ + ۲۳۳۔

—— لکھنؤ اور اس کے بعد کراچی کے شیعہ سُنّی لڑکوں کے لیے توجہ طلب ۔

● **اقبال اور بزم اقبال** (حیدرآباد دکن) : از عبدالرؤف عروج، کراچی، ۱۹۷۸ء ص ۱۶۴۔

—— چند ابواب (۱) حیدرآباد سے اقبال کا پہلا تعلق (۲) کچھ حسن یار جنگ کے بارے میں (۳) بزم اقبال قیام (۴) اقبال حلقۂ امرا میں (۵) مصوروں سے اپیل (۶) اقبال، بیرون حیدرآباد (۷) عطیہ بیگم اور بزم بال (۸) حیدرآباد ظلم کے نرغے میں ۔ وغیرہ

**تخلیقی ادب** : (غیر مطبوعہ ادبی تخلیقات کا مجموعہ) دو جلد، مرتبہ پاشا رحمان مشفق خواجہ، منہ مشفق؛ عصری مطبوعات، ناریحۂ ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ص ۳۲۰ + ۵۲۸

**جلد اوّل کے مقالات** : محمد حسن عسکری : انسان یا آدمی (سلیم احمد)، کلچر اور فنون لطیفہ محمد ہادی حسین)، پاکستان میں اردو افسانہ (وزیر آغا)، مغرب میں رومانی تحریک کے منفی پہلو (ریاض الحسن) ہر جدید کی فصیلوں میں نقب (شمیم احمد)، لینے گیتوں کا تصور: روایت اور عصر جدید (جمال پانی پتی)، لفظ گیان اور نیا افسانہ (احمد جاوید)، سارتر کا فکری سرچشمہ (پاشا رحمان)، **عالمی ادب** : بودلیئر ۳۰ نظمیں (ترجمہ محمد ہادی حسین)، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ۲ نظمیں، (ترجمہ رفیق خاور)، **انشائیے**، ورد نوشت، **ڈرامے** : ہجرت (وزیر آغا)، فٹ نوٹ (انور سدید)، سنہری شاخ (جمیل آذر)، تی کا دریا (میرزا ادیب)، جتنے دور اتنے پاس (انور عنایت اللہ)، **شاعری** : محمد ہادی حسین، سن علی خاں آحسن، غالب احمد، صدیق کلیم، توصیف تبسم، جہاب ظفر، سیدہ شاہین حنیف، نور غالب، انور شعور، راشد مفتی، پاشا رحمان اور مشفق خواجہ کی غزلیں اور نظمیں ۔ **افسانے** : غلام بیاس، ممتاز مفتی، میرزا ادیب، سید انور، حمید کاشمیری، ہادی حسین، رضیہ فصیح احمد، رشید امجد، لیم اختر، صلاح الدین عادل، مرزا حامد بیگ، اختر جمال، رحمٰن شاہ عزیز، انوار احمد، قیوم راہی، شہزاد منظر، ظفر خاں نیازی، طاہرہ بلوچ۔ **شخصی خاکے** : کنہیا لال کپور، ڈاکٹر تاثیر، محمد حسن عسکری، سید جعفر طاہر، ابراہیم جلیس ۔

**جلد دوم** : اردو ادب کے دس سال (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۹ء) : مقالات از محمد علی صدیقی،

شمیم احمد، شہزاد منظر، عتیق احمد، میرزا ادیب، انور سدید، جمیل آذر، غلام حسین اظہر، معین الدین عقیل، احمد ہمدانی، نظیر صدیقی، تحسین فراقی، فروغ احمد، **میرزا یگانہ ــــ شخصیت اور فن :** مقالات از خاصہ خاصانِ ادب (غیر مطبوعہ تحریر) یگانہ، ممتاز حسین، سلیم احمد، سید قدرت نقوی، ملن، اقبال بیگم (بنت یگانہ) تابش دہلوی، شیخ انصار حسین، دوارکا داس شعلہ۔ غیر مطبوعہ غزلیات، منظومات، اشعار، رباعیات اور یگانہ کے غیر مطبوعہ خطوط بنام دوارکا داس شعلہ۔

نظیر صدیقی (اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد) کی کتابیں :-

- **نقش ہائے رنگ رنگ** (رشید احمد صدیقی کی مختلف النوع تحریروں کا مجموعہ) ۱۹۷۷ء، ص ۳۰۱- ــــ گزارشِ احوالِ واقعی، از نظیر صدیقی، معروضات از لطیف الزماں خاں **تنقیدی مضامین** (سرسید اور علیگڑھ، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا، اکبر پر ایک نظر، اقبال، کچھ حسرت کے بارے میں، جدید غزل، ترقی پسند ادب، غالب کی شرح بیانی، اردو طنز و ظرافت کا سرسری جائزہ، مکتوبات نیاز، پنجاب کی پروردہ اردو شاعری، ادب میں (انبار) اور چودہ **انشائیے**۔
- **شہرت کی خاطر** (انشائیے اور طنزیہ خاکے) ۱۹۷۹ء، ص ۱۸۳-
- **حسرتِ اظہار** (مجموعۂ کلام) : ۱۹۷۷ء، ص ۸۸ -
- **جان پہچان** (شخصی خاکوں کا مجموعہ) کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۴۱

ــــ **خاکے :** وحشت کلکتوی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ممتاز شیریں، لیڈر لے بخاری، آغا محمد طاہر، ارشد کاکوی، صادق القادری، شکیل ملک، سوز حیدر آبادی، شورش کاشمیری، سید وقار عظیم، کرشن چندر سے دو ملاقاتیں، ابن انشا ــــ سرسری جن سے ملاقات ٹھی لگا ہے، ڈاکٹر احسن فاروقی، جوش ملیح آبادی، اے، کے بروہی۔

- **شیرازۂ خیال** (مجموعۂ مضامین رشید احمد صدیقی) : مرتبہ نظیر صدیقی۔ کاروان ادب، ملتان صدر، ۱۹۸۲ء، ص ۲۶۳-

ــــ **خطبات اور صدارتی تقاریر :** خطبہ جلسہ تقسیم اسناد، صدارتی تقریر دکل بہار ریاستی اردو کانفرنس مئی ۱۹۵۱ء)، عرضِ حال، علیگڑھ ــــ ماضی و حال، خطبۂ افتتاحیہ (مشاعرہ جشن جمہوریت، دہلی۔ ۲۴ جنوری ۱۹۶۴ء)، اردو شعر و ادب، نیا شعر و ادب، اردو رسم الخط، **شخصی خاکے :** ڈاکٹر ضیاء الدین احمد،

محمد فاروق دیوانہ 'صدیق مرحوم' مقدمے، دیباچے وغیرہ : مقدمہ دیوان فانی (اُردو شاعری پر ایک نظر)' کلام فانی پر ایک نظر' پیش لفظ (حالی ایک محب وطن کی حیثیت سے' از ڈاکٹر ذاکر حسین) مقدمہ (نقوش اقبال، از مولانا ابوالحسن علی ندوی)' جگر میری نظر میں (آتش گل' کا مقدمہ)' مقدمہ (دُنیائے تبسم' از شوکت تھانوی)' مقدمہ (شام ہوتی ہے۔ ڈراما از جلال الدین احمد)' پیش لفظ (بہار کے نو چراغ' از پروفیسر سید محمد حسنین عظیم آبادی)' اماعبد (ناشاد کے مجموعہ کلام کا دیباچہ)' تعارف (ادیب سہارن پوری' کا مجموعہ کلام)' پیش لفظ ('عمل' مرتبہ موجد بدایونی)' تقریظ (ارمغان از شکیل بدایونی)' تعارف (ادب کا مطالعہ' از اطہر پرویز)' تعارف (قصاید مومن' از ظہیر احمد صدیقی) پیش لفظ (زاویہ نگاہ' از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)' تقریظ (گل بانگ حرم)' تعارف (کلیات میر جلد اوّل' از ظل عباس عباسی)' تنقیدی مضمون: ترقی پسند ادب۔

- **جستجو** (مضامین) تحسین فراقی۔ استاد شعبۂ اُردو' ایم اے' او کالج لاہور' ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۲۱۔

——— مشتملات: (۱) اُردو ادب میں اسلامی اقدار کی پیشکش کا مسئلہ (۲) اُردو تنقید کے دس سال، (۳) بھٹائی اور اس کی شاعری (۴) اقبال اور شاستے خواجہ (۵) اقبال اور ابوالعلاء المعری ——— چند مماثل پہلو (۶) اکبر الہ آبادی (۷) محمد حسن عسکری اور جدیدیت (۸) بشنو از نے چون حکایت میکند۔

- **شخصیات و مباحث** از ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی' پروفیسر گورنمنٹ پریمیئر سائنس کالج کراچی' ۱۹۸۳ء ص ۲۲۴۔

——— مشتملات:۔ آغا شاعر دہلوی' سرفراز حسین تسنیم' ابن انشاء' اقبال عظیم' ڈاکٹر اکبر حیدری' دوست علی خلیل' سید احد حسن جمیل بلدہ لوی' میر جان اثر شاہ اوّل' زبان کے مسائل' اُردوئے معلّٰی' عود ہندی' صدر الاخبار آگرہ' ڈاکٹر عبدالحق اور معرکہ مذہب' اقبال اور پیغام انسانیت' ستار وارثی' آصف برخیا کا فن شعر گوئی' مشکور حسین یاد' سعید زبیری سہسوانی۔

**ڈاکٹر معین الدین عقیل**، ۳۸۳/۵۱ کورنگی' کراچی (پاکستان) کی کتابیں:

- تحریک آزادی میں اُردو کا حصہ' انجمن ترقی اُردو پاکستان' ۱۹۷۶ء ص ۱۰۴۔
- اشاریہ کلام فیض' ادارہ یادگار غالب' کراچی' ۱۹۷۷ء ص ۱۳۶۔
- تحریک پاکستان اور مولانا مودودی' خیال نو' کراچی' ۱۹۷۱ء ص ۱۰۴۔

●●

# خدا بخش لائبریری کی مطبوعات

● خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی تحقیقی مجلہ) ۱۹۷۷ء سے جاری: اب تک ۲۳ شمارے چھپ چکے ہیں۔ فی شمارہ ۱۵ روپے۔
● ڈسکرپٹو کیٹلاگ (خدابخش کے عربی، فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست (انگریزی میں) شعر فارسی، تاریخ ہند، فقہ اسلامی، قرآنیات، حدیث، تذکرہ = ۱۲ جلدیں۔ فی جلد ۳۵ روپے۔
● خدابخش مخطوطات کی مجمل فہرستیں (فارسی ۳ حصے؛ عربی ۳ حصے، اردو ۱ حصہ) مجموعی قیمت: ۷۵ روپے
● شمس البیان فی مصطلحات الہندستان (شاہ عالم کے عہد میں مرزا جان طپش دہلوی کی لکھی ہوئی محاورات اردو کی لغت: ۶۰ روپے
● تصویر محبت (شمس الدین فقیر کی فارسی مثنوی، جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ بنی) ۱۰ روپے
● بارھویں صدی کے شعرائے فارسی کے معاصر تذکرے: ▪ خان آرزو کا مجمع النفائس؛ ▪ نقش علی کا باغ معانی ▪ علی ابراہیم خلیل کا صحف ابراہیم ہر ایک ۱۰ روپے۔
● خدابخش خطبات: فارسی اور ہندوستان (نذیر احمد) ● میری تنقید ــ ایک بازدید (کلیم الدین احمد) ہر ایک ۱۰ روپے ● افکار رومی (عبدالسلام خاں مکتبۂ جامعہ) ۴۰ روپے۔
● خدابخش خطبات (انگریزی میں): عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو (ہاشم امیر علی) ● صوفی لٹریچر عہد سلطنت میں (بروس لارنس) ● صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ۔ (سید حسن عسکری) ہر ایک ۱۰ روپے ● فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ؛ جدید تحقیقات کی روشنی میں (امیر حسن عابدی) ● افکار اسلامی: بدلتی دنیا میں (پروفیسر سید وحید الدین) ۱۰ روپے ● اسلام کی چودہ صدیاں پوری ہونے پر چند خیالات: ہندو مسلم مسئلہ اور اسلام و عصر جدید کے بارے میں (بدرالدین طیب جی) ہر ایک ۱۰ روپے ● خدابخش: صلاح الدین بخش: سچدانند سنہا اور جادو ناتھ سرکار کے قلم سے ۱۰ روپے ● خدابخش لائبریری، ایک تعارف (اسکاٹ اوکونر کے قلم سے) ۱۰ روپے ● تاریخہائے پیدائش و وفات: (شمس العلماء محمد سعید حسرت عظیم آبادی۔ م ۱۳۰۴ھ کے قلم سے) ۱۰ روپے ● کنز تواریخ (شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی کے قلم سے)؛ بیرھویں صدی کی تاریخیں۔ ۱۰ روپے ● یوپی کانگریس کے پہلے اجلاس کا خطبۂ صدارت (موتی لال نہرو) ۱۰ روپے ● فرہنگ آصفیہ: ایک جائزہ (قاضی عبدالودود) ۱۰ روپے
● رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت: پہلی جلد 'ادیب' (الہ آباد)؛ دوسری جلد 'العصر'؛ تیسری جلد 'صبح امید'؛ چوتھی جلد 'معیار' ہر ایک ۴۵ روپے
● تدوین متن کے مسائل (خدابخش سمینار) ۱۵ روپے۔

## بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
## مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸

۱ - مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔
۲ - وقفہ اشاعت : سہ ماہی۔
۳ - ۴ - پرنٹر و پبلشر کا نام : محبوب حسین۔
قومیت : ہندوستانی۔
پتا : رمنہ روڈ، پٹنہ ۴۔
۵ - ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار۔
قومیت : ہندوستانی۔
پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴۔
۶ - ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : محبوب حسین
۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء

many mundane matters, considered from Sufic view point. Sometimes the clarity of expression found in the Makhdum's own letters (e.g. Maktubāt-i-Ṣadi) is lacking in the reports on various questions and answers related in Malfuzāt such as Khwan-i-Pur Ni'mat.

----

union or the uuion of the body with body being a genuine union In the view of 'Ainul Quḍat and others Ma'iyyat, of God meant Ihātat or encompassment. The encompassing of a thing by other depends on subtleties and refinement; what is most absolutely refined (Latif): encompasses it completely. In such encirclement there is no union of body with body and substance with substance.

Replying to a question of Zain Badr about the meaning and scope of what was called the essense and attributes of the Divine Being, Dhāt-o-ṣifāt, the Shaikh said : To know the essense of the One True Being it should be realised that he is not a substance or matter (Jauhar). nor does He come in these terms of body. He has no width or breadth; is inconc ivable by all thoughts and imaginations; and is other than what you see around and all before yourself comprising the universe of which he is the maker or creater. His essense is external, powerful, perfect, and so are the attributes of the One Real Being. In chapter 5th the dialogue between him and his Shaikh brought out some very interesting matter regarding the latter. We learn that the Makhdūm was virtually always ritually pure i.e. with ablutions intact and, after the performance of two genuflections of prayer, used to renew the ablution. When asked as to whether he observed the fast of the days of Bīz i.e. 13, 14 & 15 of every month), he replied in the negative

On 12th Shawwal 780 the ceremony of shaving the head of the infants within 7, 14 or 21 days of birth, giving gold and silver weighed against the hair and slaughtering of one or two goats or sheep in case of a female or male child, which was called 'Aqiqah, came up for discussion. Zain asked if the barber also had to be given something from other source. The talk switched on to the ever-increasing gathering of men and women and the elaborate arrangements made for treating the guests and the celebration with guests not only on this but also on the occasions of 'Taṭhir' (circumcision) and betrothal and wedding (Tazwij). There were many other such customs or activities which were miscalled Sunnat implying that they were in accord with traditions.

Thus Zain Badr 'Arabi set down on paper the teaching discourses of his spiritual master on a variety of subjects which were not confined to Law (Shari'at) and the Path (Ṣufi way or Ṭariqat) but what embraced

Questioned as to whether a student, who has got no source of his own, should ask for paper, pen and some thing for his sustenance, the Sheikh said that he should not make a request, for it was possible that he could earn something by doing some part-jobs and devoting the rest of his time to his studies. In case the seeker of knowledge could not help being busy throughout day and night with his books, it was the duty of others to meet his necessary wants. Begging becomes Mubah (allowable) but at the last extremity, after all avenuse of earning had been blocked and exhausted.

In chapter III of M.M, we get that Zain Badr during the course of lesson imparted in the Khānqah on the text of 'Aqāid-un-Nasafi, recited a verse from the Quran, "Every one would get his necessary sustenance from God, whether lawful or unlawful". The Sheikh said that this had become a subject of controversy between the Sunnites and the Mutazilites. And he himself explained, at some length. the view of the orthodox Muslims about it. Zain put in another Quranic verse in the discussion, "There is none of the crawling being on earth for whose sustenance God is not responsible" He asked whether this did not indicate an element of obligation to which the Shaikh replied that there was no obligation but a promise of benefaction towards the weak and the infirm. Questions were followed by supplementaries. The saint was asked on topics of scholastic, theological and mystical, social and on tradition and law (Fiqh), and Zain used to be a participant.

On the question of (Ma'iyyat), derived from the Quranic verse, "Wa Huwa Ma'akum Ayr ma Kuntum" (He is with you wherever you be), which was interpretated by Ibn 'Arabi, the exponent of unityism or identity of God, women and man, and was questioned later by the 17th century Mujaddid, Sarhindi, Zain Badr said that it had been found recorded in some books of Masters of Mystical knowledge, particularly 'Ainul Qudat and others like him, indicating that they affirm their belief in the oneness of God with all the existing beings of the universe in essence and in knowledge and they disciplined the minds of beginners and the average men in that directions The Shaikh said that one should hesitate in either affirming or denying such notions. He referred to the case of Mansur-al-Hallaj and the attitude of men of ecstatic contemplation. It was said further that there was no question of corporal

ing blamable qualities, but that could not be said to be the case with the virtuous attributes. The saint said that viewing without approval or contemplation of praiseworthy virtues constituted a veil. concealing the reality (of Ujb or conceit). He quoted a few Arabic expressions implying that self conciousness of learning piety or worship, acted as a veil for the 'Alim, Zāhid and 'Ārif.

Raising the question of bestowal and returning of gift (Hibah) between husband and wife, Zain asked the saint whether it was permissible to take back what had been given. He said that (Rujū') (getting back) is not sound and proper in seven cases. A prohibitory verse in Arabic was quoted, and the words and letters analysed so as to throw light on the significance of Dama'-i-Khazaqa (tears in the eye socket) occuring in the verse. Some of the prohibitive occasions arose when *there was an increase in the transfer of the property*, the donee died, and the question of compensation arose etc (K.P.N. 32).

Participating in a discussion in Majlis 44 on the lawfulness or otherwise of asking, begging, and the advisability of uttering falsehood or truth and the types of food and drink. Zain Badr referred to the saying of 'Ainul Quḍat that on occassions things lawful became unlawful and vice versa. The saint was requested to specify such occasions. Among other things he said that lying was doubtlessly prohibited; but occasions might arise for speaking falsehood lo save some one or oneself from the oppression of a tyrant. There was a further dialogue between Zāin Badr and his Shaikh concerning 'Suwāl' (beggary) which was prohibited in principle, but certain conditions and circumstances rendered it lawful Emphasis was laid on earning or vocation, "Kasb", which was healthy practice, giving up the old ascetic ideal of renunciation; on ostentatious display of charitable deeds which was a bad and a deplorable practice; on much too exaggeration of wants as one's needs, and insistence on their fulfilment; all these were forbidden. As such an attitude implied a sense of dissatisfaction with God, it lowered the dignity of man and led to laziness. As the plethora of able-bodied aggressive type of beggar in Muslim society has no parallel in other communities of Bihar, one should pay special attention to what Zain quotes from the Makhdum on 'Kasb'.

consider only a few, taken at randum, from different places, and not on any selective basis. On Saturday R.I., 760, Hāji 'Arifi asked the Shaikh as to whether the compilers of the Malfuzāt wrote the actual words of their spiritual guides or made some changes; and he was told that in case he did not remember the words as exactly uttered, but was concious of their meaning and spirit, he might put the sense in an apt form. The talks led to the ways of the traditionists, and Zain Badr said that in Mashariq ul-Anwār some of the traditions, covering 2, 3 or even 4 pages were found. Now, could so many words uttered continuously be all retained in memory ? The saint said that much at that time was spoken orally rather than written and men were possessed of purer ears and mind. "Waḥy" (divine revelation) should not be confused with Ilhām and Riwait which were of feeble authority, (GLY). Once in Shawwāl 759, seeing that his holiness the Khwajah (M. Sharafu'ddin) was in a happy mood, Zain, (the poor helpless dog of the threshold) having placed his head on the ground made bold to submit that he was involved in debts. He invoked the blessings of the Shaikh for his firm resolve not to leave the world till he had paid off his debts personally or through his friends. The saint said "Be it so: if God the most high so wills". Then he asked him to sit down and advised him to repeat a thousand times the expression, "there is no power nor strength except in God, the most high and exalted". This should be done in days and nights, preferably at night, so long as the debts were not wiped out (TG).

On fourth Ramaḍān 760 Zain Badr asked the saint about the authority of the four doctors for the justification of some of the practices to which people had become accustomed such as bowing the head, and doing obeisance on hearing the names of Sultans, Maliks and nobles, and offering thanks-givings to God on sneezing and after taking water. The saint replied that there was no such authority for such things; but if the people of any religion had become accustomed to do somethings that had no sanction from the Qurān and Hadith, but there was a possibility of meeting with harm by abandoning them, the same might be allowed. But one should not become habituated to that; one should not become an idol-worshipper by being addicated to anything (GLY).

Talking about purity in the 11th Majlis, the saint observed that a disciple should purify himself as much of bad habits as of laudable qualities. Zain Badr said that pur fication could be attained by abondon-

His holiness the Makhdum, directed as he was by the light which was ever illuminating, brought this on his blessed tongue "Oh Badr I have accepted you, your house, and your illustrious family (Khail Khānah) which has been closely attached to me. Be at rest. If my honour and esteem remain, I am not one who would abandon anyone". I, the helpless one, submitted. "Even the slaves of the Makhdum have enough honour and esteem'. He added "There are hopes for that".

The Urdu biogarphies have added, in the Wafātnāmah that the Makhdum said that Zain Badr 'Arabi used to help him in putting on his clothes and this responsibility would devolve on his discendants. They don't say who was to be dressed? Another apocryphal matter is the display of the Chishti saint, Ashraf Jahāngir Simnāni on the scene, just after the death of the Makhdum. It had been predicted that such and such person with such and such qualifications would come and take the lead in offering the funeral prayer. It is also interesting to know in this connection the introduction of a couplet of the Persian poet, 'Urfi, of the 16th–17 century, in the printed copy of Ma'din ul-Ma'ani. In chapter 25 p. 222 we get this 'Ashiq ham as Islām Kharāb ast-o-ham az Kufr; Parwānah chirāgh-i-ḥaram-o-dair nadārad (The lover is made miserable by both Islam and infidelity—The moth does not distinguish between the sanctuary of Mecca and the temple of the magi). The two mss. in Khudabux Library, two of Bihar Sharif, and three of Phulwari Khānqah Library, consulted by the writer; are all free from these spurious insertions.

Before we end, it is worthwhile to say something about the numerous searching questions which Zain Badr himself posed to his revered Pir. In some Majlises (e g. 7th and 8th, 26th in Khwān-i-Pur-Ni'mat) he monopolised the attention of the Shaikh. The catechetical or the conversational part of the oral teachings, involving questions and answers between Zain, the desciple. and the saint his spiritual guide, include a variety of subjects such as 'Dhāt-o-Ṣifāt' (essence and attributes of God), 'Hiba' between husband and wife), which was deed of gifts, 'Ma'īyat', (coexistence or communion) 'Kasb' (acquisition by labour), Khuzu' (concentration, veneration, humility or submission) Zuhd (abstinence) La'nat-e Yazid (imprecations on) if justified or otherwise etc., Mashiyat (will of God), Irādat (purpose or will) Sahw (Sobriety—recovering from impiety), Sukr (drunkenness), Ru'yat (vision of God) etc. We can

As for himself we get very little from him. As stated above it is in the Wasaya, the last of the Malfuzāt, recording the affairs of the 16 hours before the death of the Makhdum, which he compiled at the instance of his friends, that he had to refer, among others, to himself also. The printed text ( Mufid 'Aam. Agra 1921 ) is named. Wafāt Nāmah. Before considering what is real and apocryphal, it is worth while to offer to the readers what the credulous author of Mānaqib-ul-Aṣfiya puts in the mouth of Zain. "What has been heard from Shaikh Zain Badr 'Arabi is this : "In my days of adolescence I approached my mother in a state of drunkeness and asked her for something in cash. She said, "Oh my son ask me for something which you might have given to me". Feeling ashamed he came out entered the Khānqah, and saw the Makhdum sitting on the prayer carpet with his face towards the west. He turned towards me and told me to get near him. He lifted up a corner of the prayer carpet and allowed me to take but not more than two handfulls. I saw stream of wealth flowing beneath the prayer carpet. I extended my hands and grasped what filled my two fists. With that I went to my mother who shouted out, "Oh my son, the enemy of God you have put your request to such a (spiritual) sovereign". Then I came to myself and thought that I had blackened my face and was determined that I would sin no more".

The above has been copied verbatim in two Urdu biographies of the Makhdum, Sirat-us-Sharaf[1] and Tarikh-i-Silsilah-i-Firdausiya, and they have introduced things, which we don't find in the manuscripts. The copy of Wasaya, a Phulwarisharif manuscript, has this : "After this I, the poor wretched one, with head bent towards the ground, weaping and trembling, was presumptuous enough to take hold of the august hands of the sovereign of the knowers with a view to soliciting the renewal of homage and reiteration of penitence, "I kissed the hands aud placed them on head and on the pupils of my eyes Enquiry was made "who is there?" I submitted "It is the wretched scabby dog of the exalted threshold of the sovereign of the knowers who seeks permission to pay homage again and express his remorse or penitence".

---

1. The respective author of the two were Maulana Zamir'uddin and Moin'uddin Dardai of Bihar.

their heads like Hindu women, but he would not like the Muslims to participate in the colourful festival of Holi Saturnalia.

Much more important than these things are the biographical notes in Khwān-i-Pur-Ni'mat and in Ma'din-ul-Ma'ani and also reference to the lessons and lectures imparted in the Khānqah. The Makhdum spoke about his revered teacher and namesake whom he called Maulana Kākā, and his sweat-voiced brother, Zainu'ddin, who was the Ḥāfiz or the memorizer of the Qurān but was also an expert in the art of music and was preferred as Imām in prayer by Ṣultān Shamsu'ddin[1] Firoz of Bengal (701-722) and Shahzadah Qatlgah Khān, his son (who was killed by his brother Bahadur); significant and fairly detailed information is furnished about Maulana 'Alau'ddin Jeuri[2] of Delhi who imparted lesson on different branches of high knowledge to a set of persons, and about Shaikh Ruknu'ddin[3] who did much for the popularisation of the Firadausi order of Sufism, and was the first to introduce the practice of celebrating 'Urs or death anniversary of saints along with Samā' in Delhi. The Khānqah of Bihar was a seat of learning. Many of the books specially on mysticism, law traditions, and commentary etc., on which lesson were imparted in the Khānqah have been mentioned, Primary education was also not neglected Boys and girls were brought for the initiation of the Bismillah[4] or the Maktab ceremony, and the description given in the account of several Majlis (assembly) shows that what Makhdum did or thought on occasions has still its echo in present times. In short, for the variety of information, some new and interesting. and the glimpses of the remote past that we get from the Malfuzāt, we are all indebted to Zain Badr 'Arabi.

---

1. There are many references to this good and religious-minded king. the 3rd of the Bengal Branch of the house of Balban, in the various malfuzāt, and these are of historical and cultural interest.
2. The printed text of K. P. N. mis spells jeuri as Jonpuri. None of the three - four manuscripts in Khudabux Library is free from such mistakes. In one copy of K. P. N, there is much of Malfuz-us-Safar; such hodge is found in many mss.
3. K. P. N., Majlis 47.
4. Ma'din-ul-Ma'ani.

and foibles which persist till the present times. Then as now, there was the calling of Adhān in the ears of the new born child; 'Aqiqah (shaving the infant's hairs of head); Tathir (circumcision), Siyum (ceremony of the third day), reading of the Qurān on the tomb; throwing dust of clay in the tomb. Talqīn (funeral services), placing flower on tombs and offering Fatiḥah (prayer offered to the soul of the dead); the use of Haft[1] Dānah (called Satnaja or the seven cereals) on Āshur or 10th Muḥarram; and also of the appliation of coligrium to the eyes on that day; Rozah-i-Maryam; demand of 40,000[2] Tankas (rupee) as dower money for bride. People believed, then as now, that the sitting near the door frame, burning[3] the crusts of garlic and onions in houses, making use of common or broken combs and of common towels caused poverty and separation. We get frequent references to Sehr (Sorcery) Fāl (omen or augury) and Ta'bīr (interpretation of dreams). The Makhdum was asked about the miracles of the saint of Bahrāich, Syed Sālār Mas'ud Ghāzi ((called Ghāzi Miyān), the reputed nephew of Maḥmūd of Ghazni, and he said how such men[4] became mythical figures. A festive fair is still held in commemoration of his tragic death in the beginning of May in Maner and elsewhere.

The testing of the Kaftār (Kutni) or despoiler of the dead by drowning her, and the thief-catching process by causing a 'Badhni-i-āb'[5] (small water pot) with grains on its cover to revolve by the recital of some Qurānic verses, were considered by the Makhdum as Satanic. He was liberal enough to justify the action of Muslim employees of Hindu lords and master addressing them as Thakkar or Khudāwand, and Muslim women applying Shangarf[6] or vermillion on

1. Mukhkhul Ma'ani.
2. Bahrul Ma'ani or Tuḥfa-e-Ghaibi = (TG).
3; Ma'din ul-Ma'ani and also K.P.N, See also Aḥsān-ul-Akhlāq, an 18th Century work by Mīr Mazhar 'Ali Rajgiri poetically named Ṣāfi.
4. Muniṣ-ul-Muridin, See also Rasail-ul-Ijaz of Amīr Khusrau where Masood. Ghāzi and Behraich, his burial place, have been mentioned and the myth around him has been referred to
5. Ganj-i-La Yafna = (GLY); Bahr-ul Ma'ani
6. Mūniṣ-ul Muridin.

ho were addicted to drudgery and toil, earned their bread by the sweat f their brow, or who were poor and distressed. He would recommend[1] thers but would have nothing for himself from kings and rulers. He denounced the 'dignity-seekers' and 'sellers of faith', the hypocrites who posed as Shaikhs and Sajjādahnashin and put on patched garments, nd those who took recourse to clever devices to escape from payment of Zakāt, and ignored the dictates of Shar'. He had no sympathy with clean-shaven Qalandars; nor did the Hindus who resorted satanic Subterfuge escape his attention.

In the first Malfūz we read that a certain cheat who had anaged to occupy at the trunk of a huge tree, had become for e blindly credulous an apparition and an object of worship Foolish eople assembled in large numbers to offer their homage to the invisible deity who appeared to speak from within the tree. They ainted the trunk with vermillion; and it was strewn with flowers. ne, reputed to be an ascetic, had discovered the game of the trickster; ut allowed his mouth to be sealed with money. The Makhdum ould admire, even if he did not approve of, the intensity of love hich made Hindu men and woman sacrifice themselves for the object f their worship. A man on Rajgir[2] hills has been seen standing ight and day, gazing constantly on a stone idol in his left hand for many years that his elongated nails could be folded up round the and. When the idol fell down the man destroyed himself. We get ferences also to self-immolation of widowed[3] woman on Rajgir hills; to cells with idols in front of which the love-stricken women ood with folded hands and head bent down, refusing the offer of od and drink, becoming more skeleton, and ultimately dying after tting fire to the scanty clothes. There were Siddhas and Jogis also ho claimed to bring down rains, fly in the air, float or walk on the ater. They practised what they called 'Kāchak' or 'Kapāri' ( a votary Shiva who carries a skull in his hand and a chain of these round is neck). Even in these days one gets echoes of such things in Bihar.

We naturally get much more about the Muslims, their manners nd customs from birth to death, their beliefs and practices, fault

---

1. Many instances of recommendatory letters written by the Makhdum with his own hands occur in the Malfuzāt,
2. Khwan-e Pur Ni'mat = (KPN); Ma'din-ul Ma'ani = (MM).
3. Ma'din Ma'ani.

the wayward Tughlaq Sulṭān Muḥammad, ( probably in 739 i.e. 15 years before 754) who had also sent, for Makhdum, a Jāgir in Rajgir and a Bulgarian prayer carpet. The Jāgir which the Makhdum had to keep reluctantly at the entreaty of the governor, was returned 15 years[1] later, to Sulṭān Firoz Shah when he visited the Makhdum in Bihar, while he was on his first expedition to Bengal against Ḥāji Ilyas in 754. This suggests the date of the bestowal of the royal gift, and order in 739. There was a few years later, something like a formal installation of the Makhdum whose remarks preserved both in Ma'din and Manāqib about the seat being the site of a 'But-Kadah' is significant,

The Khānqāh was thronged by men from far and near, Indian and outsiders, high and low, rulers,[2] high officials and functionaries, scholars, seekers, of knowledge, Zain tells us at different places in the Maltuzāt which he compiled and we also get something in Sharḥ-i-Adab-ul-Muriοīn, about the Kām Karan who worked as daily labourer, the Kanizagān or the slave girls, who aplashed[3] their feet in mud and water on the edge of walls and tanks walked bare-footed in the mosque, and offered their prayers; the Kushāwarzān who made use of their "Hulla" a plough to produce grains and various classes of artisans. and also minstrels and instrumentalists like Chhaju Gawāi and Ḥāji Rabābi, The Makhdum of Bihar was not out of touch with the reality of life and did not neglect those

---

1. Maktubāt-e-Mu'iz Shams Balkhi (Let. 98) says "would my spiritual guide" may his secrets be sanctfied accept (keep) this village from the King for 15 years, if in this respect there might have been any fault or harm. Perhaps he had no reliance on himself or was afraid on account of God's creatures; and he abandoned it when that fear was gone, after the death of the donor. "Magar tawakkul ān dasht wa ya az khauf khalq kard: chun khauf raft, ān gāh tark āward"
2. Among the persons who came to pay their respects to the Makhdum of Bihar some worth mentioning included two men sent by Khan-e-Zīshan, Prime Minister of Firuzeshah Tughlaq; the wife of Sulṭān Ikhtiyāru'ddin Ghāzi; the deceased of Bengal, Sarkhail Mukhlis, Naib of Daud Khān; Maulana 'Alau'ddīn Mi'bri, ( of Madurai ); Maulana Jalalu'ddīn Multani, Maulana 'Ali Khurāsani, Shamsu'ddīn Damishqi, Shaikhāzda Chishti.
3. Khwān-i-Pur Nemat, see also Sharḥ-i Adabul Muridīn.

and read them himself, word for word, and corrected and amended the lapses. He sometimes added illustrative ancedotes and verses, couplets, quatrains, quite apt and appropriate to the occasion. Arguments and objections (Īrādāt) which had been raised were also incorporated, along with the replies given and the collection was named Ma'din-ul-Ma'ni.

Some of the smaller treatises such as Maghz-al-Ma'ni and Mukh-ul-Ma'ni were 'Malfuzāt-i-Istikhrāj Karda', that is based on extracts from other works. They had also their contents checked up and were brought before the Shaikh who read them from beginning to end and made amendments and corrections in several places. In Tuḥfa-ṭ-Ghaibi Zain Badr 'Arabi writes that he had listened to the discourses on several occasions and had striven to treasure them up in his memory. Having correctly written out the whole things, he submitted the collection to the great Shaikh who, with a view to making it more beneficial, wrote something with his own blessed hands on the margins. He is much more brief in another collection (Ganj Lā-Yafnā). Many life-nourishing discourses which had fallen to his ears from the pearlscattering lips of the venerable Shaikh, the sense and meanings whereof had been grasped and understood thoroughly by him, were packed up and put together in this store house of permanence, "and yet this polluted dog of the exalted doorsteps" and this "ragwearing beggar" hoped that the collection (would come under the persual) of the spiritual master so as to be embellished, and have its value enhanced so as to prove to be cherishing to those who were mad after love ( Divānagān-i-Muḥabbat ).

As already noted, the earliest biggest and the most important of the series is a compendium not only of religious thoughts and teachings from Sufic standpoint but also of diverse matters of general interest The wealth of information in Ma'din - al - Ma'ni has been arranged not chronologically but systematically under definite headings, all largely, of course, of mystic import. But there is much in it, and also in other Malfuzāt compiled by Zain Badr of narrative, descriptive; biographical nature and of historical and cultural interest. Here are a few points culled from the Malfuzāt literature. The Ma'din, as well as Manāqib say that the Khānqah of Biharsharif was built by the then military Governor, Zainu'ddin Majdul Mulk, Maqta-i-Bihar,[1] at the orders of

1. The other Maqtas or Governors of Bihar mentioned in verious Malfuzāt were Malik Nathu, Malik 'Alau'ddin, Malik Mu'izu'ddin Ghori, deceased. The high functionaries referred to here and there were Sepah-Salar, Mutaṣarrif, Qāzi, Ḥakim, Kotwal, Katib etc.

The fullest idea of the method and techniques adopted was provided by the compiler himself in Ma'din - al - Ma'ni. The essentials have been detailed as follows:– Every one of the sincere seeker and devoted disciple, present in the assembly and other places, could, according to his capacity and worth, put questions, cite passages or precedents from works and would like proof for what might be to the contrary. Many of these were interested in principles and doctrines of the path, law, knowledge and Reality. The Makhdum gave adequate and convincing replies and his observations, full of matchless hints and allusions, pregnant with meaning, were couched in clear and intelligbile language. The compiler while sitting[1] there, exercised the best of his efforts and capacity to preserve in his memory the dialogues and discussions which he put together in the collection. As far as it was possible he left out nothing, word or expression: If per chance, due to his faults or failure of mental power he forgot the things as they had been actually uttered, and the talk did not remain with verbal exactitude in his memory, and yet he was quite concious of the sense, he put the main drift in an appropriate language, as it was the sense which really mattered. He was, however, also careful that there should not be the slightest change and deviation from the original sense and meaning, If he thought that he had missed the main purport of some talks, he was careful enough to leave some pages blank, and submitting that on some other occasion to the Shaikh, filled up the gaps After having had the approval of the members of the assembly, he put the whole thing into black and white. Feeling that there might still be some loopholes, mistakes, or variations somewhere, he submitted some portion of the compendium (Majmuah) to the venerable Shaikh and solicited his permission to read out the things to him The Shaikh was gracious enough to take

---

1. He was himself one of the most prominent of qusestioners. His object in posing questions was to shake off some of his doubts and difficulties and get himself enlightened on matters of doctrines beliefs, and ritualistic practices. Whenever we get the word "Bechara" in the Malfuzāt compiled by him, we can take it that he means himself. Some of the questions and their supplementaries put by him appear to have been very pertinent and arose from subject matters of talks or the lessons delivered on books of mysticism, law and traditions.

his sins be forgiven ). Ganj-i-Lā Yafnā[1] ( imperishable treasure ) contains the discourses from Rabi 1st Sunday 2 to Ṣafar I Wednesday 7 751 A. H. Malfūz-us-Ṣafar,[2] probably the 7th compiled by Zain, was the collection of Ṣafar and succeeding months upto Jamadi II of 762 A.H. Tuḥfa-i-Ghaibi (heavenly gift) also called Bahrul-Ma'ni commences from 12 Shabān Friday 759 to 770 A H.; and though it goes down to seventy seven, Bahrul-Ma'ni has been described as the fourth Malfūz "Charumin Bahr ast az Bahr-i-baqa-i-lafz-i-Pīr", that it is the fourth of the Sea for the permanency of the words of discourses of the Pīr ( spiritual leader ). Tuḥfa-i-Ghaibi also came in from the hands of Zain who has described in it briefly "meaner than the dust in this path"; strangely enough, however, in two places, Zain Badr, the compiler refers to the "first" and the "fourth"[3] Malfūz ( 19 & 11 Zilḥijja 759 A. H. ). In Malfuz-u -Safar, dated Saturday 12 Jamadi 1, 762, Zain refers to amore exhaustive treatment of the relevant topic in Vol. IV of the Malfūzat. Again, under the date, Saturday of the Rabi 1, 762 he refers to the 5th and 6th Malfūz for more detailed information on the subject. None of the Malfūz except those which were printed are completely free from disarrangement. Parts of one are found incorporated in others. Thus there are variations and discrepancies, here and there. There are smaller tracts[4] , Irshad-us-Salikīn, Irshad-us-Ṭalibīn, Kanzul-Ma'ni, Maghz-ul-Ma'ni etc., the names of whose compilers have not been specifically mentioned. Ashraf Rukn Balkhi compiled the small treatise; Aswila-wa-Ajwiba, and he also collaborated with Zain in compiling in 769 what is wrongly called Maktubāt-i-Do or Seh Ṣadi

---

1. Azīn Ganje ke Lā-yafnā ast Yārab; ba bakhshaish bar ahl-e-Ishq kun bakhsh - Ṭufail - i - ān hama Sherān-e-shahbāz : Sag-e-dar Zain rā yak Ḥubba - i bakhsh.
2. The rare copy of Futuḥa Khanqah manuscript is defective, incomplete and overlapping and portions are rewritten in different hands.
3. The names of the 3rd to the 6th Malfūzat referred to here have not been mentioned. There are references in Malfūz-us-safar to third, fourth, fifth and sixth Malfūz compiled by Zain but they remain un-named.
4. The Futuḥa Khānquah - Library is very rich in the Malfuzāt, Maktubāt and other works of Ḥazrat Sharafu'ddīn. There are works of other saintly personages of various orders of Ṣufis.

such as Fawāid-e-Rukni[1] with its eleven or twelve profitable notes or significant observations of spiritual value provided for or written at the instance of Hāji Ruknu'ddin, were also compiled by Zain Badr 'Arabi, and may be taken, along with others, as his legacy to posterity.

The first, and by far the most detailed Malfūz, compiled by Zain Badr 'Arabi, Mā'din-ul-Maāni (Mines of meaning) of which the printed text consists of 500 pages, is divided into 65 chapters, called Bābs, covers the period of the forties upto Shābān, 746 A. H. The copy is marred by certain interpolation. The letters in the collection known as Maktubāt-i-Ṣadi start from 747. Khwān-i-Pur Ni'mat[2] (spacious tray full of delicacies), divided into 47 Majlises, is the second and supplementary volume. It is of small size and contains the discourses of the Makhdum from 15 Shābān 749 to the end of Shawwāl of 751. Mukh-ul-Ma'ni ( the marrow of meaning is undated and has been wrongly ascribed by the author of Sirat-us-Sharaf to Shihābuddin Imād Halifi. He does not mention his source, and nowhere in its 53 Majlises we get any trace of the compiler. But the brief prefatory note, specially the expression, "Sam'-i-Qāṣir" and "fahm-i-Nāqiṣ" and "Dar Taiy-i-Kitābat Āwurd" remind us what Zain has dealt with at greater length about the format and technique adopted in compiling his Malfuzāts. There is a reference in it to the vagaries, eccentricities and cruel bloodshed, alternated by liberal gifts and lavish grants. made by Muḥammad Tughlaq ( d. 751 ) who has been described as dead ( Ghufira Lahu : may

---

1. This small work gives in a nutshell the spiritual thoughts of the great saint of Bihar and much of it reminds us of the contents of Maktubāt-a-i-Ṣadi and Shaiḥ-i-Adab-ul-Muridin. Very similar to the Fawaid is the Ajwiba containing the replies given by the venerable Shaikh to his disciple, Zahid, son of Nizām, and the other saints and desciples and they deal with the fundamental principles of Taṣawwuf and essentials of ethics and morals. Some spurious or apocriphal matters have crept in a small work named Irshād-us-Salikīn noted with amazement by Shaikh Aḥmad Sarhindi known as Mujaddid-i-Alf-i-Sani.

2. Go Jahane bar khurad zeen khwan - i - pur Ni'mat madām Zain-i-miskeen rā bas ast gar reza-i-bakhsh and azān.

The faithful ones remembered and recorded the Dialogues and Discourses in their own way and language, considering that this would lead to their salvation. Sometimes one feels puzzled to account for the apparently vague, confusing, conflicting, explanation and interpretation, coming as a sequence of a sprinkling of scriptural quotations, and it becomes difficult to accept that these actually emanated from the great Shaikh The scribes who transcribed the collections often made a mess of things. There is no questions of misunderstanding or misquotation on the part of the compiler.

Though the majority of the Malfuzāt were collections preserved by Zain Badr 'Arabi, and only a few, such as the small but highly informative Muniṣ-ul-Muridīn[1] of Ṣalāḥ Mukhlis Daud Khani, compiled in 775, are from others; yet the range of topics covered, the style and language adopted, simple, clear and intelligible do not appear to be the same and similar in all such works. Ṣalaḥ Mukhliṣ was not only a devoted disciple but also a builder and engineer for he raised a Qubbah (dome) on the tomb of Makhdum's Mother, and his name occurs on a big stone plaque which was originally fixed on the gate of a fort built by Sulṭān Firoz Shah Tughlaq in Saran (Bihar) and is now attached to a shrine in Tajpur[2] Basahi of the same diṣtrict and is dated 774 A. H. Asdul Ḥaq Waddin, Dāud Khān, father of Ṣalāḥu'ddīn Mukhlis figures also in Chirāghdān inscription of Amber (in Bihar) which is dated Rabi, 765 and he was perhaps the son and Successor of Malik[3] Bayyu and a Governor of Bihar during the reigns of Muḥammed Shāh and Firoz Shāh Tughlaq. Besides Maktubāt and Malfuzāt, some smaller tracts

---

1. A corpus of Inscription in Bihar by Dr. Q. Aḥmad.

2. See a separate paper on this warrior saint of Pīr Pahari mausoleum in Bihar and also an English Translation of Maktubāt-i-Ṣadi, by Fr. Paul Jackson and published by Pauline Press, New York (recently published.)

before him. The conservative companions came down upon the higl minded chief for resorting to what they considered to be a highl irreligious act, and the quarrel becoming hot and prolonged sent tl saint into a state of ecstasy which lasted for more than a day. Tl Manāqib also gives a hint to this episode.

We cannot expect to have a picture of anything in all its ful ness or a connected account of life and conditions, socio-religious a pects of monastic life in Khānqah, its educative value, the books learne referred to and lectured upon.[1] But we can catch the pervasive a mosphere of the time and place of study and penance, enter into tl spirit of the life, works, and thoughts, and have a fairly correct ide of the Ṣufi way, their mode of living, method of training, disciplin ideology, views and practices from essentially spiritual standpoin There may be, in these, many points also of general interest which researcher may utilise for a socio-historical and cultural survey of tl time, place, incidents, events and conditions. Considering the settin in which Sufism of the Firdausi order flourished in Bihar and also th magnetic and towering personality of its chief exponent, h utterances and sermons which stirred the audience and made the de votees, present or absent, well-directed so as to be in the world an also outside it, we can not but take the Malfuzāt to be of inestim able value.

Of course, they have their limitations. There is much which i repetitive and overlapping in them. Different persons, at different time entered into dialogues, put questions and had answers on practicall the same topics, and the Makhdum obliged them by saying what ha been previously said with or without additions. There was recurrenc of oral talks and exchange of views on certain controversial question such as the relation between 'Ali and Mu'āwiah and Ḥusain and Yazeed

---

1. Ma'din-ul-Ma'ni: Some of these are Sharḥ-i-Tajarrud of Kalabadi 'Awarif-ul-Ma'arif, Qut-ul-Qulub, Wasilat-ul-Qulub, Sharḥ-i Maṣābiḥ, Rauzatul 'Ulamā. Hidāyah, Kashshāf. Buzdavi, Quduri Mufassal, Tafsīr-i-Zāhidi, Bustān-i Abul Lais, 'Aqāid-i-Nasafi Tamhidāt-i-Abu-Sha ur Sālumi, Tamhidāt wa Maktubāt and Zubdat of 'Ain-ul-Quḍāt, Kanz-ul-Maṣabiḥ, Mashariq-ul-Anwār of Saghani Lahori etc.

:cial for him; and that other contemporary rulers and[1] Sulṭāns who re not so obliged. But the people of Bengal and Bihar failed in their y to preserve these valuable heritages of religious literature.

Unlike the Maktubāt, the Malfuz literature may be studied pri-rily as a source of knowledge, often with fair accuracy[2] of dates l names of persons and places. Such species of things are not to found elsewhere. There is a general bias against hagiological liter-re, lives mixed with legends, of medieval saints and Sufis. We can-expect from these any scientific methods and rational outlook accor-g to modern standards. The votaries suffered from, and may have ome victims of, some amount of hallucination and self-delusion, and y went too far in glorifying their spiritual preceptors. Strange as night appear to many, even in his lifetime the Makhdum of Bihar l become the subject of myths. The author of Manāqib-ul-Aṣfiyā s us that a Qāḍi, a close associate of the Makhdum, asked him ether it was true that for thirty years he ate no food and there no excretion or motion? The reply given showed that there was question of getting cereal or cooked food, and he was forced most the time, to subsist upon what he could get in and from the jungle, l at times even some grass of nutritive value sufficed for him. In Malfuzāt we get how the Makhdum was subject to the infirmities a human being. Once in his desire to clean himself so as to offer morning prayer he threw himself in the hot spring at Rajgir during old night and had to suffer from that for many days. From Ganj-ishidi we learn that once, in deep winter, with scanty clothes, on his y, he had to descend from the hills and hide himself in a heap of w on the edge of a village. In Muniṣ-ul-Qulub we get how the gs of hunger drove him once on the hill to a place where apparently ich Hindu had his food served before him. He fixed his gaze on menues, hastened in accepting the invitation, and fell on the food

---

[1] But there are two letters, one written to Sulṭān Muḥammad Tughlaq in reply to the request made by him for something special, and another addressed to his cousin, Firoz Tughlaq, recommending a Zafarabadi: Maktubāt-i-Sad-o-Panjāh-o-do.

[2] Ma'din-ul-Ma'ani and Manāqib ul-Aṣfiya are arranged not chronologically but in sections of short or long duration.

The poetical effusions of *Zain* are much too scarce to give him the epithet of a major or a perfect poet. The few verses we have from him do not appear to be of higher order as those in the Diwāns, big or small, of the first four Balkhi saintly disciples, scholars and poets of Bihar. Even Ahmad bin 'Isa Balkhi who called himself Ashraf Rukn and compiled, in collaboration with Zain the Maktubāt wrongly called Do-Sadi or Sih-Sadi ( in 769 ) and also a small tract, known as Aswilah wa Ajwibah (dialogue between the preceptor and the disciple), and at whose instance and entreaty the Makhdum wrote out his well known compendium, Sharḥ-i-Ādāb ul Muridīn, showed himself more prone towards versification.[1] Both he and Zain describe themselves as 'the dust of the feet' (Khāk-i-pā) of the Makhdum and, to both, the posterity should feel greatly indebted for rescuing the letters and the discourses of the great Firdausi saint and scholar of Bihar from negligence and obscurity.

The full list of the works, so rich and unique in mystic literature, produced by the Makhdum and compiled by Zain has not come down to us. The themes and the thought-contents of the letters which flowed from the pen of the Makhdum with the names of the addresses and with characteristic headings, could be easily put together and copied out, of course, after getting the permission, so as to be offered to a wider circle of people, present and future. The Maktubāt contained admirable exposition of matters philosophical, doctrinal, spiritual and mystical with their manifest and hidden meanings, with attempts made to establish an accord between the orthodox faith and reason. But have all such things reached us. ? We have got definite evidence that some of the valuable letters of the Makhdum were lost. But for a reference in one of the letters[2] of H. Muzaffar Shams Balkhi (d. 803 A H) to Ghiyāsu'ddīn A'zam Shāh we could not know that the Makhdum of Bihar had a soft corner in his heart for A'zam's father, Ṣulṭān Sikandar, the second king of the Ilyās Shāhi dynasty of Bengal; that he willingly wrote letters to him in reply to his queries and request for something

---

1. His verses in the prefatory portion of the so-called Maktubāt-i-do-Sadi and Siḥ-Sadi.
2. See "Maktūb and Malfūz Literature" published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library.

There are in Malfuzāt, Ganj-i-lā-Yafnā and others, references to men in the Khanqāh of Bihar who served the great Makhdum in some capacity or other. Once when he was being conveyed in a 'Dola' ( Sedan chair ) to Hauz-i-Rāni,[1] Zain Badr 'Arabi walked, along the conveyance with the pair of the shoes of his spiritual leader in his both hands, and Maulana Āmun, Khwaja Zahiru'ddin Gharīb, 'Khādim-i-Shaikh,' and others followed it on foot. There are references also to 'Shaikh Sikandar' or 'Amīr Sikandar Khādim-i-Khās' (attendant in-Chief) of the Makhdum. The latter was once bold enough to ask the Makhdum as to why when the Samā' was at its height he had suddenly ordered its stoppage and the dispersal of the audition[2] assembly, and was told that the Qawwāl had abruptly switched on from Persian to the Hindi Jigari ( Dhikri or Chakri ) which was usually sung by women, as some young men had managed to creep in the assembly.

One would naturally like to know the comparative position, status and functions of the various people designated as 'Khādim, 'Khwaja' and 'Amīr' which should not necessarily be stretched too much to mean that they compared favourably with Zain Badr 'Arabi who was virtually a Secretary and scribe, the 'Mīr Munshi' of the Makhdum, to use a modern parlance There is nothing on record that others were possessed of any special and superior qualification.

On the other hand, Zain-ul'Abidīn or Badr 'Arabi was a gifted person, and a man of learning and also a poet, as is evident from the few verses, couplets and Qiṭ'ahs which we find under the poetical pen name of Zain in the prefatory portions or colophons of the Malfuzāt like 'Tuḥfa-i-Ghaibi', Baḥr-ul-Ma'āni, 'Ganj-i-Lā-Yafnā' and Khwān-ipur Nī'mat.

---

1. Ganj-i-lā-Yafnā, under the date of 28 Ziq'ad 760. There is no trace of any s uch thing in Biharsharif.
2. There are many references to ecstatic songs but not to rotative dances performed by Darveshes both in the Maktubāt and Malfuzāt; and constructive suggestions and restrictive instructions were laid down. Mu'izz Balkhi gives a very graphic account of Sama' showing the attitude of the saints of Firdausi order in his Malfuz called Ganj-i-la-Yakhfa.

the Makhdum said "let alone ( Hallā ), go at this time to your house, and he did that" Obviously this does not refer to the first Lakhnauti expedition of Fīroze Shāh Tughlaq against Ḥāji Ilyās in 754 A.D. According to Sirat-i-Firoze Shāhi the Tughlaq Sulṭān, perhaps, on the second expedition to Lakhnauti, passed through the proximity of Bihar. He may have, however, met Ḥazrat Chirmposh on the occasion of the earlier expedition. According to Tārīkh e-Mubārak Shāhi Fīroze Shāh set out for Jaynagar (Orissa) via Bihar in Ziqa'd 761 or October 1360 and returned to Delhi in Rajab 762.

There is another reference, in this very Malfuz, under the date Thursday, 27 Safar; 762, to an interesting dialogue on the question of IMSĀK (abstinence) between the disciple, Zain Badr, a Sayyid, and his Pir who and his teacher, Maulāna Tawāma, appear to have evinced the impact of the views of Maulanā Taqiu'ddin better known as Ibn-i-Taimya ( died 720 A, H. ) The first topic of the day was 'Sirrhā-i-Qazā wa Qadr' ( the secrets of fate & pre-destination ) which were too subtle and time-taking, difficult but not impossible to explain away. Then the talk switched on to the question of imprecation on Yazeed, Son of Mu'āwiah. The Makhdum said that one should not curse Yazeed or any campanion of the Prophet but follow the practice of sermonisers who cursorily, or in substance ( Mujmalan ), referred to those who deserved praise or blame Zain appears to have had his own views about the relation between Ali and Mu'awiah and Ḥusain and Yazeed and as regards the latter the sayyid in him burst out, Why should one not condemn the acts and curse the blameworthy one ? What could be worse than the killing of the darling ( Jigar-Gosha or probe of the liver), of the Chief of the prophets with swords and arrows and making his family-members prisoners in the desert land of Karbala ? To pacify him the Makhdum said that 'Ali had come to terms with Mu'awiah and that there was no occasion for cursing or condemnation when the former had made peace with the latter. As for Yazeed there was a good deal of difference of opinion among the theologians; some held that there was no justification for condemnation of one who had been the Imām of the Musalmāns for many years. Then again the matter was controversial; it was better to avoid imprecations. Moreover, he may have repented his actions "Shāyed ki Azān Taubah Kardah Bāshad".

that the latter was a 'Hasani-Husaini Sayyid', he said that he ha heard something like that from some elderly people.

There is mention in this ms. of only four[1] generations and als of the word 'Mīr' for Zain Badr, and these raise doubts and difficulties More reliable are incidental references in Ganj-i-lā-Yafnā and Tuhfa i-Ghaibi. In the latter under the dates 22 Dhilhijja, 760 A.H , we get tha on Friday after morning prayer, Zain came to his Pīr with a tray con taining betel leaves and some sweetmeats, placed his head on the ground and reported that a son had been born to him; and he requested th saint to give the child a name and surname. As had been the cas with the earlier offsprings, when asked about them, he said that th eldest, Badru'ddīn Muhammad, and the middling, Ishāqu'ddīn Ahmad had been so styled by the Shaikh. He was told to call the newly born Qamaru'ddīn with Mahmud as his Surname.

Without any concious effort to thrust his own personality, Zain Badr does furnish us with some personal references. In what is named as Malfuz us Safar, under the date, Saturday, 6th of Rabi. 1762, while mentioning the view of Imām Shāfi'ī of Sayyid descent - which was not the case as that of the other three eminent jurists of the orthodox school - about the justification of the use of Inshā'allah (if God willeth ), he writes that when he was in Pandua ( Bengal), he met the Qutb there who made his own observations on this very topic. The same Malfuz under the date, Sunday 23rd of Safar 762, tells as that when he returned from Lower region ( Farodast i. e. Bengal ), after a stay there for 6 months and 16 days, he came to pay his obeisance to his spiritual master and had the honour of kissing the ground at his threshold, between the two evening prayers. The saint asked him about the alarm and disquititude of the creatures of God in the Farodast ( Bengal ) region on account of the assemblage of the huge and powerful army of Sultān Fīroze Shāh. After hearing him

---

1. "Asadullah, son of Sayyid Shāh Muhammad who was the son of Sayyid Mahmud, the son of Qāzi Murtaza, one of the sons of the exemplar of knowers, the cream of those who had realised God, viz. Mīr Sayyid Badr 'Arabi who was a Hasani wa Husaini, and a Khalifah (?) of Makhdum Jahān"

Fettered by traditional views and usages, and generally unco cerned with mundane matters, which we prize so much, the mystic Su kept themselves in the background and were incommunicative abo themselves and others also; and whenever they had to refer to themselve they assumed very humble terms and expressions. Described as 'Das girafta' ( protege, helper or assistant ), of the Makhdum, Zain Bad 'Arabi called himself 'Bichārah-i-miskīn'. ( Poor helpless one ), 'Sag-dargāh' (dog of the threshold), 'Gadā i-Zhandah posh (beggerly, clothe in rags), 'Khādim-i-Makhdum-i-Jahān.' There is nothing to be surprise at this, for greater men like Maulana Muzaffar Shams Balkhi alwa used self-humiliating and self-effacing appellations such as Maṭbakhi-Khām ( raw cook ) and 'contaminated dog' etc. for himself; and eve the great Shaikh himself, in reply to the letter of Dāwar Malik,[1] th sister's son and son-in-law of Sulṭān Muḥammad Tughlaq, called hims as 'Mudbir' ( luckless wretch ), Makhzul ( forsaken ), 'Sag-i-ru-siyāh ( black-faced dog ), Sag-i girgin-i-āstān-i 'ulamā (the scabby dog of th threshold of the learned ones).

It is a pity that posterity has forgotten many great celebriti of the past, and at this great distance of time it is no easy task t penetrate into obscure corners, to know the truth end clothe an animate the dry bones of vaguely-remembered individuals. Even th present representatives of Zain Badr know little or nothing authentic o reliable about him. There is a small colony of people on the north-eastern corner of the campus of the Dargāh which contains the final resting place of the Makhdum, his mother and also of others, who claim direct descent from Zain Badr 'Arabi and feel proud of, and are still glorying in, being called 'Khuddāmān' (servants) I asked the most learned of them an ex-principal of an Arabic college, whether he knew anything about the early life, geneology, education, activities, of his ancestor: but I failed to bring out anything from him. When I told him that the scribe of an old manuscript of Maṭlub-ul-Mubārak, the Malfuz of Maulāna Āmun, in Pulwarisharif Khānqah Library, had claimed, in the colophon, his descent from Zain Badr 'Arabi, and written

---

1, See Maktub-i sad-o-panjah-o-do. Dāwar Malik was the son of Khudāwandzāda, the sister of Muḥammad Tughlaq. This shows that the Sulṭān had a daughter who was married to his sister's son.

It is a pity that antecedents, character, personality, position and contributions of one who did so much to preserve for poster- ty the records of teaching, learning and the ways of the Ṣufi celebrities f Bihar of byegone times and circumstances, who enlightened and nabled us to know what was said and written, and how and what ople, who assembled in religious houses, hospices or Khānquahs, ought and acted, are shrouded in obscurity. Zain Badr 'Arabi con- buted much to the survival of the genres known as Maktubāt and a'fuzāt which had been cultivated greatly in the 14th century, perhaps ich more in Bihar than elsewhere in India. Except the meagre ormation supplied by the credulous author of Manāqib-ul Aṣfiyā, ne of the contemporary producers of religous and mystic literature ed to review or survey the learned utterances and teachings of the neer of the Firdausi order of Ṣufiism in Bihar, Shaikh Sharafu'ddin mad Maneri, and none has left behind anything worth knowing out him despite the very close association with him of countless mbers of ardent devotees and disciples. The little that is found even ater[1] works is not free from what may be taken as unwarranted and ocrypha, as we shall see hereafter.

Why has no one cast his glance and set his mind on Zain? Is it because he was too insignificant to be noticed? But do we know much about such a personage as Shamsu'ddin more than that he was the Qāzi or Hākim of Chausa; that he was the recipient of 98 out of 100 letters in Maktubāt-i Sadi; that he was one of the many querists whenever he happened to be present in the Majlis or the assembly; that he was addressed in and after 747 as 'brother'; that when he came near the death-bed of his great spiritual guide in 782, he was lovingly addressed as 'Farzand' (son); and that he was the first to be embraced? Even for these meagre information we are indebted to Zain Badr.

---

1 Sirat-us-Sharaf by Maulvi Zamīru'ddīn of Bihar.
The story given in Manāqib-ul-Aṣfiyā, that Zain was a drunkard, and being chided by his mother and favoured by the Makhdum, became a changed man, though not wholly improbable, reminds us of the way how saints were made.

*This article*

*for the first time*

*sheds light on the*

*selfless person*

*who*

*did so much*

*to preserve for posterity*

*the works*

*of*

*the Makhdum of Bihar.*

# ZAIN BADR 'ARABI

*( A Short Sketch )*

*by*
Prof. S. H. ASKARI

رام و لچھمن و کارست سوگند  به سیتا و هنومانست سوگند
به بشن و کرشن و اقبال جگنات  به جاه سومنات و رتبه لات
بتان از هر طرف برهم دویدند  بیکدیگر چو برگ گل رسیدند
گریبانها ز مستی چاك کردند  حساب رنگبازی باز کردند
چه حاصل نکهت از طول کلامست  تمام است و تمام است و تمام است

There is a reference to several important places all over the country, such as Patna, Akbarabad Hyderabad, Bengal and Rajputana, where this festival is celebrated with extreme gaiety and mirth :

تماشا بین ز نزدیکان و از دور  ز پتنه تا جهان آباد و لاهور
ز سرهند و حصار و اکبرآباد  ز برهانپور و ملك حیدرآباد
ز بنگاله و ملتان و بنارس  ز گجرات و سروج و از کلارس
ز صورت و ز اجین و شهر اجمیر  ز ملك راجپوتان تا برانبیر
ز بیجاپور و شولاپور و راچور  ز میلاپور و سالاپور و ایلور
ز کشمیر و حلال آباد و کابل  بچندین رنگ دل صبر و تحمل

Muṣḥāfi writes "sometimes back I came across a couple of Mathnawīs composed by this poet in the metre known as Ḥazzāj One of these Mathnawīs describes the charms of spring and the other portrays the festival of Holi. A study of these Mathnawīs shows how much pain the poet has taken in composing them[1] Khushgo says, ' He was gifted with wonderful memory, and whatever he composed preserved n the book of his bosom. That is the rsaaon why, after his death, his poetical output had been lost to us.[2]

*******

1. 'Iqd-i-Surayya ( Jami'a Barqi Press, Delhi 1934 ), P. 58,
2. Safina-i-Khushgo ( Patna 1959 ), P. 210.

رفیق ما پسر گجراتیان اند ٭ که مطوعند و مقبول جهانند

He also mentions Khattris, Brahmins, the people of Banaras and others who participated in this festival :

بهار عیش کهترزادگان است ٭ رفیق ما فلان است و فلان است

برهمن زادگان را در حواشی ٭ ز بعد رام رام و رنگ پاشی

بنارس‌زادگان شوخند بسیار ٭ بهم گستاخ و چشمك باز عیار

The mathnawī makes an interesting reading and is characterised with fluency and use of Hindi words, as is evident from the following lines :

شود چون نغمه ها مایل بسارنگ ٭ ز روی گل دوپهری می برد رنگ

پکهاوج طرفه ساز بی نظیر است ٭ بلند آوازه و عشرت خمیر است

بیا ساقی که جام باده نوشیم ٭ بهم چون صاف و درد می بجوشیم

که امشب تا سحر در صحن گلشن ٭ چراغان راگ دیپك کرده روشن

ز شوخ نو بهار رنگ بازی ٭ به بزم رقص و تال دف نوازی

گلال و زعفران و ابرك و رنگ ٭ نوای مطرب و قانون و آهنگ

نی و طنبور و بین و چنگ و مندل ٭ گلاب و عطر و مشك و عود و صندل

می و رقاص و جام و تال و مردنگ ٭ اصول و شوخی و آواز مهو چنگ

برنگ سجهٔ صد دانه گشتند ٭ بشیخ و برهمن همخانه گشتند

دو چندان بیرهٔ . . . و طلائی ٭ مرصع پاندان پان طلائی

در و لعل و زمرد نه عیانست ٭ مگر کان جواهر برگ پان است

دوچندان زان سپاری هم بسازند ٭ که برهمن زادگان لبریز نازند

بیا بنگر که خوبان درچه کار اند ٭ بهم یارند و عزم جنگ دارند

Ţughra had travelled throughout India and had seen all its important cultural centres, and was very much impressed by our various festivals. The author of the Şuḥuf i-Ibrahīm writes that he used to accompany Holi processions and throw colour on them. In the following qāşīda he describes Holi and uses a number of Hindi words :

گردیده مینا راگ خوان رنگ صدا گشته عیان
و ز نغمهٔ آب روان در جوی تکرار آمده
شد وقت هولی باختن با رنگ و بو پرداختن
خود را چو گلبن ساختن باغ ارم خوار آمده
آن شوخ کنترائی اقب چون رخ کشاید نیم شب
پیدا شود صبح طرب خورشید رخسار آمده
رجپوتنی دل می‌برد جان نیز غافل می برد
ایمان ز کامل می برد از بسکه طرار آمده
گردن بگردن ماله‌ها یك مه فگنده ماله‌ها
نی نی که هر سو ژاله‌ها با شاخ گل بار آمده

Besides this qaşīda, there is a rare and colourful Holi Nama[1] by Muhammad Yusuf Nighat Burhanpuri, entitled Sukhanwar Khān, who has praised 'Alamgīr in these couplets :

گل اورنگ زیب نو بهار است ٭ که هم تخت آفرین هم تاجدار است
بدور شاه عالمگیر غازی ٭ که دارد یك جهان عالم نوازی

The poet went to Karnataka, where he watched with amusement the festival of Holi in the company of Gujarati youths :

مرا شور تماشا در سر افتاد ٭ که از من ره بچندین کشور افتاد
و لیکن چون بکرناٹك رسیدم ٭ تماشائی که می بایست دیدم

---

1. MS. No. 175, Govt. Oriental MSS. Library, Madras.

su, chambeli, kewra, Jubi, bandali, nagkesar, pyari suhagan, kela, arhal, kamrakh haryarewri, mor Munir accompanied Saif Khān to engal and travelled from Patna in a boat, which is praised in these nes :

کانش گفتم و الحق صانست          سیه ملاح او زاغ کان است
شبیه او همه از چنگ جویند          و لیکن اهل هندش نای گویند

Mulla Ṭughra Mas͟hhadi (d. 1689), the secretary of Murād akhsh and one of the great masters in the art of ornate prose writing, peculiarly interesting Although an Iranian, he deliberately used numerable Hindi words like paisa, rupaya, Hali, dakchowki, dewhara ilbadal, katahra, dagla, tel, hal, bans, palki, dupatta, jogi, kara and ala throughout his writings to adorn his Munsha'at and give them an idian environment. Ṭughra wants to see Hindi penetrate into Persian add to its beauty and richness. The field of simile, metaphor and wale aif is also widened with the help of indigenous Hindi language. Besides, words like saheli, mahavat, hathnalchi, kalawant, tal, jharoka, supari and jhalar have been integ ated with Izafat-i-tās͟hbihī Moreover, compound epithets, compound participles and compound nouns have been introduced by combining Hindi and Persian or Arabic words.

Ṭughra leads us away from the conventional and foreign surroundings to an increased appreciation of the more familiar indigenous environments. Instead of calling us to appreciate the beauty of Caucasus, Khallukh, Naus͟had and K͟hata, he finds tremendous beauty in the various corners of India like Gujarat, Somnath, Agra, Jaunpur, Bengal and Ambala.

Ṭughra was not only a great prose-writer, but also a notable poet One of his qaṣidas is in praise of Maharaja Jaswant Singh of Jodhpur, in which Hindi words like naulakha mantar, sendoor and barchha occur In one of his Tarji'bands, the line 'na lena na dena na khana na pina' is repeated at the end of every strophe In addition in the Saqi Nama, he has used Hindi words like pan, tika, tel, tal, sanyasi, hathphul phuljhari, hathi palki ghoryal, ghari, pakhavaj, juti, pichkari, chhit, chuni, rag, har, pankha, kathal, kela, chuna, supari, bar, sahu, mahajan, jogi, chhatta, malmal, sur, kahar and chanbeli

Nazuk-Khayalāt, the Persian translation of Shankracharya's Atam Vilasa. which was published by the Anand Press, Lahore, with n introduction by Munshi Mohan Lal, an employee of Maharaja Ranjit Singh, has been mistakenly ascribed to Chandra Bhan Brahman. The letters of Nazuk-Khayalāt give the year of the translation as 1708 - 9 which means that the book was translated forty-seven years after the death of Chandra Bhan Brahman. Another proof of this mistake is that the translator of this treatise is the author of the Chahār Gulshan, Mirātul-Tawḥīd 'urf Gita and Mirātul 'Arifīn, and we know definitely that Chandra Bhan Brahman was not the author of any of these books. There was another Chandra Bhan (Kaesth, Saxena), who wrote the Chahār Gulshan, the MS, copy of which exists in the 'Abdus-Salām collection, Aligarh Muslim University. The name Chandra Bhan appears to be the translator of the Nazuk Khayalāt also.

The reign of Shah Jahān is distinctly noteworthy in regard to indigenous elements. It is in this period that Indo-Persian literature is truly Indianized and absorbs the spirit of the land, which is signalized by the assimilation of Hindi words even by Iranian writers. Abu Ṭalib Kalīm Kashani, (d. 1651) the Poet Laureate of Shah Jahān, coming from Iran, is so charmed by the Indian environment that he feels tremendous pleasure in using Hindi words, even if they are not indispensable. In his Mathnawīs including Shah Jahān Namā and a mathnawi in praise of Agra and Bagh-i-Jahān Ara, the words of Mahajan, hira, Dhobi, Rajput, Pathani, Champa, nim, mulsari, Kanwal, Keorah, Kathal, chhappan, rupayah, lakh, lut, Tal, Barsat, torah, ghari, hat, darshan, sagar, barut, hun, jag, Raj, have been frequently used.

Zafar Khān Aḥsān (d 1662/63) the governor of Kashmir, used many Hindi words in his mathnawī in praise of Kashmir, like bansuri, haryal, falsa, ber, jaman, kela, pan, and kanwal. Yaḥya Kashi (d. 1654), the librarian of Shah Jahān, has used a number of Hindi words in his Kulliyāt, like bahla, damri, pan, paisa, banya, chawal, dal. khana, kapur, madari, talwar and katari. Fani Kashmiri (d. 1670-71) has got a qaṣida in praise of Shah Jahān. in which these Hindi words occur: pan, rag, basant, kalyan, champa, har, chanbeli, bel.

Abul-Barakat Munir Lahori (1610-1645) composed a mathnawī in praise of Bengal, in which these Hindi words have occurred:

Panchkrohi, Kashi Mahatmaya, Bhagvata Purana, Tarjuma-i-Dil Khulasa-i-Dharmashastra, Karmavipaka, Vishnu Purana, Puranarth Prakasha, Harivansha Purana, Mahatmaya Ekadshi, Bahrun Najat, Kashi Khand, (Bahrul-Hayat) Gya Mabatmaya ( Khayalı Falal ), Chitra Rekha ( Kashful - Anwār ) Atma Sambiti ( Nazuk Khayalāt ), Vilasa, Sudama Cahritra. Ganesha Purana.

Another eminent literary personality of this period is that o Munshi Chandra Bhan, pen-named Brahman ( 1662-63 ). He is one o the greatest Hindu scholars in indo-Persian literature. Shah Jahān gave him the rank of thousand, and used to cali him "Hindu-e-Farsi Dān' ( The Persian knowing Hindu )

The importance of Brahman lies not so much in poetry as in prose, because he had a unique simplicity of his own. Among the most important of his prose works is the Chahār Chaman ( Four Orchards ), in which the first Chaman describes the various events and festivals at the court of Shah Jahān The second Chaman describes the various cities and provinces of the Mughal Empire; the third Chaman deals with the life of Brahman and some of his letters; in the fourth Chaman Brahman has expounded moral and religious thoughts.

This is well-known Chahār Chaman, many manuscripts of which are found in various libraries. But I have reeently come across another Chahār Chaman by the same author, the only manuscript copy of which — a specimen of the fine calligraphy — exists in the Tonk collection of the National Museum, New Delhi [1] Unfortunately a few folios towards the end are missing.

In this Chahar Chaman, the first Chaman deals with the life of Shah Jahān and the events of his royal court. The second Chaman consists of letters sent by Brahman to his mother, brothers and the dignitories of the period. The third and fourth Chamans consist of letters sent to his brother and son, Uday Bhan and Tej Bhan respectively.

---

1. No. 3340.

and Ramachandra in his dream. In that dream Vasishtha toid Rama-chandra to embrace the prince. Besides, he handed him sweets to feed him with his own hands. After waking, Dara Shukoh became keener and keener to get the book translated afresh.

Here, it may be mentioned that this book had aiready been translated. But Dura Shukoh did not fully approve of the earlier translations. One of the valuable translations was rendered by Nizam-mu'ddīn Pānipati, during the reign of Akbar, at the instance of his son, Prince Salim, who later ascended the throne with the title of Jahangir. Mīr Abu'l Qasim Findaraski (d. 1640 – 41), a great Iranian philosopher has written marginal notes on Nizammu'ddīn's translation, and has prepared a glossary named Kashful Lughāt-e-Kulliyât-e-Jog Bashist.[1] Besides, he has composed, verses praising the book. He says : –

همچو آب است این سخن بجهان ٭ پاك و دانش فزای چون قرآن
چون ز قرآن گذشتی و اخبار ٭ نیست کس را بدین نمط گفتار
جاهلی چون شنید این سخنان ٭ یا بدید این لطیف سر و بیان
جز بصورت بدین نه پیوندد ٭ زانکه بر ریش خویش می خندد[2]

( Clear like water is this speech,
Sacred and illuminating like the Holy Quran.
Except the word of God and the Traditions.
No utterance is as subtle as this
When a fool hears these words
Or sees the superb expression conveying this subtle mystery,
His mind touches but its surface,
And he laughs at his own stupidity. )

A large number of Sanskrit works have been translated into Persian during this period. Among these are Bhagvad Gita, Harivansha, Rajatarangini, Gulzar i-Ḥal, the Persian translation of Prabodha-Chandrodaya, Shrimad Bhagavad, Devlok Hajati, Brahmaiyana,

---

1. MS. No. 246/256, Tehran University Library.
2. Kashful-Lughāt-i-Kulliyāt Jog Bashishta.

"Inasmuch as Banaras, which is the seat of their learning, has been these days my habitat, I brought together ( at this central place ) the leading Pandits ( learned men ) and Saniyasis ( ascetics ) and the renowned scholars of the Vedas and Upanishads. In their midst I translated in 1067 A. H. ( 1656-7 A. D. ) this abstract of Divine Unity ( Tauḥīd ) namely the Upanishads or hidden secrets, the acme of the subject-matter of all the sayings of the saints of God. All those difficult and lofty thoughts, which I had been seeking and had not attained as yet, I discovered in this resume of ancient revelation, which is the first of all heavenly books and which is also the rock of all research and the ocean of Divine Unity ( Tauḥīd ) and, to crown all, is in consistency with the great Quran and commentaries. It is crystal clear that this Quranic verse is about this book :"

'Verily this illustrious Quran is in that hidden book ;
It is not to be touched except by pure ( and holy ) persons.
It is a revelation from the sustainer of the worlds '

Evidently this verse pertains neither to the Psalms of David ( Zubūr ) nor to the Books of Moses ( Taurait ) nor even to the Gospel ( Injīl ). The word 'tanzil' suggests that the said verse does not refer to the Preserved Tablet ( Lauḥ-i-Maḥfuz ) either. Inasmuch as the Unpanishad, which literally means hidden secret, is the origin of this revelation and because the Quranic verses find in it their exact essence, I hereby verily that the "Hidden Book" is this ancient book. From this ( revealed ) book I — this meek fellow — was able to understand the un-understandables and to grasp the un-graspables ( of all kinds ) ...

"May all those who, renouncing the desires of wretched self and spurred under lucky stars, by genuine wish to please God, happen to read and understand this translation entitled Sirr-i-Akbar considering it a version of the word of God and abandoning all prejudices, attain eternal salvation as well as freedom from apprehensiveness and worry of this mundane earth."

But since he could not do the whole job alone, he wanted the scholars to take up this task. One of the valuable Sanskrit works named Yogavasishtha was translated into Persian under his guidance According to the introduction, Dara Shukoh once saw Vashishtha

was short and ambiguous ( or cryptic ) ... I wondered as to how in India, the manifester of Divine Unity, there has been much talk about the Unity of God and what was the cause ( or causes ) behind the fact that neither the materialistic nor the divine doctors ( pandits ) of ancient India ever refused to acknowledge the unity of Godhood ( waḥdat ), nor did any of them dispute this with the monotheists ( believers in Tauḥid ), rather they considered Divine Unity as a settled fact. Reverse is the attitude of the ignoramuses of this age who style themselves as 'ulama (religious authority), and entering into pretentious arguments with the godly persons and monotheists, torment them, declaring them as infidel. Furthermore, they rescind the entire wording of the praiseworthy Quran and the authentic sayings (ḥadīth) of the Prophet regarding the unity of God setting themselves thus as brigands in the way of God."

"After the investigation of these facts it became clear that four heavenly books namely Rigveda, Yajurveda Samaveda and Atharvaveda were revealed to the prophets of that time before every other revelation The greatest of these prophets was Brahma who was (no other than ) Adam Safiullah ( the Pure or chosen one of God ). The Vedas were comprehensive revelations containing all the commandments "

"It is evident from the Great Quran that no nation could remain without a heavenly book and prophet. It says, we do not punish ( the sinners ) unless and until we have sent a prophet ( to admonish them ) ... It follows that there has never been a community or people without a prophet established amidst them ..."

"These four books, which contain all the secrets of Divine unity, are abridged in the Upanishads . ."

"Since I am essentially the seeker of the element of monotheism, and no linguister dabbling in the ( philology of ) Arabic, Syriac Hebrew and Sanskrit languages, I desired that I should translate ... these Upanishads, which are the treasure of Divine Unity ... into Persian and understand why these people ( monotheists ) of the Upanishads are segregated from the Muslims and what is the mystery behind this?"

Besides Diwān, Dara Shukoh is the author of Safinatul-Awliya Sakinatul-Awliya, Risala-e-Makātib, Ṭariqatul—Ḥaqiqat, Bayaz-e-Dara Shukoh and Goshti Baba Lal Dayal. One of the treatises, which has been recently discovered by me, is named Suwal-u-Jawab-i-Dara Shukoh and Fatḥ 'Ali Qalandar (Questions and Answers of Dara Shukoh and Fatḥ 'Ali Qalandar). The only manuscript of this treatise exists in the Zamin Ali Library, Shahganj, Agra,. Answering one of the questions of Dara Shukoh, Ḥazrat Shah Fatḥ Qalandar quotes a Hindi line from Kabir :

کبیرا بلی جائیے وہ پرش کے جومن ھی مسجد جاے

(O Kabir I am willing to die for the sake of the man who worships in the temple of his own heart.)

Dara Shukoh wanted Sanskrit works to be translated into Persian, so that Persian-knowing people, especially Muslims, may utilize them. He himself translated fifty Upanishads within six months with the name of Sirr-e-Akbar or Sirrul-Asrar. The introduction of this Persian translation is also significant, as it brings out the inner feelings of Prince Dara Shukoh. He says: [1]

"Since I had the splendid opportunity of meeting gnostics from all sects and inasmuch as I had heard from them high arguments about the unity of God. and also because I had read good many books on Taṣawwuf (mysticism) and produced some treatises on this topic and because my thirst for the limitless ocean of divine unity (Tauḥīd continued to enhance every moment, it dawned on me that the ultimate solution of the problem of Divine Unity (Tauḥīd) would not be possible without basing my studies on the word of God as well as on evidence and proof of the existence of that Endless Being. Further, since (the majority of the verses in) the glorious Quran ... are ambiguous (or mysterious) ... I desired to make a survey of all the heavenly books; for ... if the points at issue be cryptic and reticent in any one of these, an elucidation might be seen in another ... Accordingly, I studied the Books of Moses (Taurāit), the Gospel (Injil), the Psalms of David (Zubūr) and other revelations But, inasmuch as the statement about Divine Unity (Tauḥīd) in all of them

1. Sirr-i Akbar (Chap-i Tehran, 1961) Pp. three – six.

poetry. He used to compose verses in Hindi, while in Persian he is the author of a Diwan, named Iksīr-e-A'zam. Some of his verses and quatrians may be cited here :

بهشت آنجا که ملای نباشد      ز ملاّ شور و غوغای نباشد
جهان خالی شود از شور ملاّ      ز فتواهاش پروای نباشد
درآن شهری که ملاّ خانه دارد      در آنجا هیچ دانای نباشد

Paradise is there where no Mulla resides
Where there is no argument and tumult with him.
May the world become free from the noise of the Mulla.
May no one pay heed to his Fatwas
In the city where a Mulla resides,
No wise man is ever found

کافر گفتی تو از پی آزارم      این حرف ترا راست همی پندارم
پستی و بلندی همه شد هموارم      من مذهب هفتاد و دوملت دارم.

To revile me thou has termed me an infidel;
I, too, consider thy talk as true.
Disgrace and glory have become alike to me —
My religion is that of the two and seventy sects.

زابلیس به بوالبشر چه انکار رسید      حق گفت حسین برسر دار رسید
از شومی شرّ ملاّیان است      با هر نبی و ولی که آزار رسید

What disavowals did Satan hurl at Adam ?
Said Ḥusain Manūsr Hallaj 'I am the truth' and got the gallows,
Every prophet and saint, who suffered affliction and torment was due to the vicious and ignomiuous conduct of the Mullas.[1]

---

1. (Dara Shukoh) Dr. B. Hasrat, Vishvabharati, (1953). pp. 139, 146, 155.

fate so ordained that I had to leave the service of His Majesty, and was attached ... to the court of Prince Daniyal ... with the help of the souls ... of the masters of this art ... such as Sūlṭan Aḥmed Siwi and of the illustrious ... ancestors and forefathers of this nonentity and particularly ... Saiyid Shamsuddin Muḥammed Najafi ... this work has received the impress of completion."

Such literary activities were carried on with remarkable earnestness during the golden periods of Jahangīr and Shah Jahān, two of the greatest royal patrons of arts and letters. Innumerable poets and writers, like Ṭalib-i-Amuli and the authors of Shah Jahān Nama and Amal-i-Saleḥ, flourished during this period, Kami Shīrazi, 'Uvais Beg Fiṭraṭ, Sa'i, Aṣlāḥi and Hadi, the important poets of this period, have not been mentioned by biographers, while their diwans have been recently discovered and introduced by scholars. A distinct and welcome feature of this period is its increasing absorption of indigeneous elements.

Culturally and academically the period of Shah Jahān ( 1628–658 ) may be called the period of Dara Shukoh, ( d. 1659 ) one of whose achivements was to produce unity between Hinduism and Islam, hrough the intermingling of Sufism and Vedantism. He had been one of the great thinkers of the world, as he wished not only to bring hrough pantheism the two great religions of India, Hinduism and slam, nearer each other, but also wanted to produce a spirit which nay be more and more in keeping with the Indian enviroment. ufism and Vedantism seek to synthesise the diverse faiths, while Dara Shukoh may be regarded as the highest symbol of this synthesis. He tried to bring about spiritual and national integration through iherent unity of the diverse religions. If, on the one hand, he used ) like the company of Mulla Shah Badakhshāni ( d. 1661/62 ) and armad ( d. 1660 ), on the other hand, he enjoyed the company of 'ell-known Hindu mystics, especially Baba Lal Dayal; if he tudied Hinduism and Islam, he never neglected Christianity and udaism.

Dara Shukoh was well-versed in Arabic, Persian, Sanskrit id Hindi and has left a number of valuable works in both prose and

ـه جای شکار ... از غایت رغبت شکار و نهایت رحم دلی ... برجمیع
ـات جاندار شکار ... باهو اختیار فرموده که هم صیدی باین حسن
زیبائی بدام آید و هم قصوری و فتوری در زندگی حیوانی راه نیابد
.. بمقتضیات صغر سن و عهد شباب بحضرت شاهزادهای برخوردار ...
ـور فرموده ... این غریب را ... معرفتی ... درین وادی بود . .
ر اواخر ایام ... حسب الحکم جهان مطاع ... در ملازمت ... سلطان
.. در خدمت جانورهای آن سرور منسوب بوده ... بحسب تقدیر از
ـدمت ملازمت آن سرور جدا شده در بندگی شاهزاده دانیال ... طریق
خدمت معهود ... قرار دارد ... باستعانت ارواح ... استادان این فن
.. خواجه سلطان احمد سیوی و بزرگان ... سلسله آباواجداد کمترین
تخصیص ... سید شمس الدین محمد نجفی ... سمت اتمام پذیرفت .

"This humble writer ... Saiyid Arab Najafi . travelled from his native place ... situated — in the vicinity ... of Balkh to the great Indian sub-continent and was blessed with the good fortune of joining ... the service of His Majesty ... Jalālu'ddīn Muhammad Akbar the crusader ... At this time His Majesty, who is between forty and fifty ... does not feel inclined to shed the blood of an animal; no, he would not inflict the least injury even on an ant, what to say of hunting ... Due to his extreme fondness for hunting, which he combines with a remarkable compassion towards all animals life, ... he chooses to track only the deer, so that he could catch in his snare such a graceful and charming game without causing any injury or disability to the animal life. This be suggested ... to the young princes who were in the prime of their youth ... As I was ... familiar with that valley ( Care of animals ) ... I was ... subsequently assigned the duty of ... looking after the animals — by His Majesty's decree ... which was obeyed by the whole world ... The

Mulla 'Abdul Qadir Badāyūni, the transl itor of the Ramayana
tes :

"The emperor commanded me to make a translation of the
mayana, which is a superior composition to the Mahabbarata ...
nine hundred and ninty - seven ... I finished the translation
which had taken me four years. ... when I wrote at the end of it
couplet :

We have written a story, who will bring it to the Emperor?
We have burnt our soul, who will bring it to the Emperor?
was much admired ... He commanded me to write a preface to
.. But since it was no such great recovery from my former falling
of favour ... I dissimulated" [1]

There are a number of such important introductions in non-
orical sources, which should be studied in depth to have a com-
iensive idea of the inner mind and vision of men like Akbar. For
nple, there is an introduction to the Baz Name[2] written by Saiyid
b Najafi, who served Akbar, Iahangīr and Prince Daniyal ( 1572-
4 A. D. ) and was perhaps incharge of the royal stable. In the intro-
tion the author writes about himself and presents a picture of the
ler-heartedness of the emperor. He says :

« فقیر ... سید عرب نجفی ... از وطن مالوف ... که
حوالی ... بلخ ... واقع است بسواد اعظم هندوستان عبور نموده بسعد
خدمت و ملازمت حضرت خلیفه ... جلال الدین محمد اکبر غازی
فایض گشت ... درین ولا که سنین عمر گرامی او در اواسط اربعین
خمسین است ... بخونریزی حیوانی حتّی مورچه آزار موری اقدام نفرما

---

Muntakhab ut-Tawarīkh, Vol. II, P, P 346-8, translated by G.S,A, Ranking. Baptist Mission Press, Calcutta.
MS. No 1958, Central Public Library, Patiala.

## PART III

The Persian Literature produced in India reached its zenit in the Mughal period. Babur himself wrote pros and poetry in Turkish and Persian, while Humayūn has to his credi a complete Diwān. The Persian and Turkish Diwans of Bairan Khā have been edited by Sir Denison Ross. But I have traced a manus cript of his Persian Diwān,[1] which contains a large number o verses not included in the published Diwān. Besides, there are som quatrains which could be found neither in the manuscript nor in th published Diwān.

The reign of Akbar is the most glorious chapter in the his-tory of Indo-Persian literature, and has been enriched by Abdur-Rahīm Khān Khānān, Abul-Faḍl and a host of other poets, writers and patrons of arts and letters. With the stabilization of the empire, Akbar earnestly tried to introduce Sanskrit traditions into Persian language. The two great epics, Mahabharata and Ramayana, were first translated into Persian under his royal orders and guidance There are more than twenty versions of the Ramayana in Persian literature. In 1587 Abul Faḍl wrote an important introduction to the Razm Nama, the Persian translation of the Mahabharata, in which he says.

"Having observed the fanatical hatred prevailing between Hindus and Muslims and convinced that it arose only from their mutual ignorance, that enlightend monarch wished to dispel the same by rendering the books of the former accessible to the latter. He selected in the first instance the Mahabharata as the most compre-hensive, and that which enjoyed the highest authority, and ordered it to be translated by competent impartial men of both (communities). By this means he wished also to show to the Hindus that some of their errors and superstitions had no foundation in their ancient books, and further to convince the Muslims of their folly in alligning to the past existence of the world so short a span of time as seven thousand years."[2]

---

1. Ms. No. 885 State Archives, Srinagar.
2. Catalogue of the Persian Manuscripts in the British Museum, Vol. I. p. 57.

The Lodi period has been generally considered barren from the point of literary and artistic activity. Contrary to this popula notion, however, we find that a monumental book on Indian musi was produced in this period. It is entitled Lahjat-i-Sikandar Shahi The author of this book is Ibn-i-'Umar Kabuli. In addition to thi valuable work, I have been able to trace a manuscript[1] of unknowr treatise on music, written under the guidance of Qasim Kahi, ( d 1580 ). The author opens the introduction with the following observations :—

« اما بعد . . . عرضه می دارد که بجهت گردش . . . دوران
ز مکان اصلی انتقال کرده در کشور دلکشای هند اکثر اوقات شباب
بمباحثهٔ علم موسیقی . . . صرف می کرد . . . در ملازمت فضلای کرام
. . خصوصاً حضرت ارشاد پناهی میان قاسم کاهی . . . دلایل نکات
ی شنید . . . تا اندك بهره . . . ازین علم شریف . . . یافته و خلاصه
آنچه درین شیوه بکمینه رسیده مختصری تالیف کردی » -

"And now — I submit that the vicissitudes of life brought me from my native place to the delightful land of Hindustan. Here in my youth I used to spend hours at the feet of learned men ... discussing problems of music .. and I specially benefitted from the discourses of the great master Maulana Qasim Kahi ... who dealt with many subtle points ... of this branch of knowledge, so that I could acquire some degree of proficiency ... in this sublime art. And in this book I have briefly concluded all that I know about music "

Apart from these works, we come across a number of othe books original as well as translated dealing with music. For example there is the Ghunyat ul-Munya. Among the translations, mention may be made of Prijataka and Rāg Darpan. Tānsen has been creditec with the authorship of a book on music entitled Budh Parkash, which is in Hindi. While the original work has been apparently lost to us its Persian translation is fortunately extant

1. MS. No. 2655, Jāme Kabīr Collection, Public Library, Bursa (Turkey)

ـ رخت را در صفت مه می توان گفت ـ ۷ ـ دوش ز عکس
رضت قرص قمر بتاب شد ـ ۸ ـ ای داغ کش دل جوانان م
ـ سجده که می کنند سوی بارگاه شاه ـ ۱۰ ـ از ما چه دیده ای که
ین زود می روی ـ ۱۱ ـ نخاست از صدف حسن گوهری چو توئی ـ
ـ از شمع رخت یك شب گر پرده براندازی ـ ۱۳ ـ بیا که برهمه
بان شهر شاه توئی ـ ۱٤ ـ ای سرو نو رسیده خه از کجا رسیدی ـ
ـ کجائی ای مراد زندگانی ـ

## FRAGMENTS

ـ جماعتی بضرب باده نوش می کردند ـ ۲ ـ خواجه برخیز بکدم از سرچاه ـ

## QUATRAINS

ـ شاهی که مه آسمان اوگیرد ـ ۲ ـ ای دل در حق زایله نتوان کردن ـ
ـ شاهنشه عشق چون که درکار آید ـ ٤ ـ ای رسم کفت جو بحر
هر بخشد ـ ٥ ـ خواهم ز خدایت ای شه بنده نواز ـ ٦ ـ چون شاه
ند لشکر اقلیم کشای ـ ۷ ـ درسایهٔ هر درخت کان عالی خاست ـ ۸ ـ از
ل تو ای شهنشه دین پرور ـ ۹ ـ شاها کف تو ابرشده تیغ چو برق ـ

The value of the Bhopal MS, is further enhanced by the fa
that it is the first to record in complete form the following quatrai
which has appeared incomplete in the published Diwān :—

ب تو که کار بنده نگشاید[1] ازو ٭ چون دیده و دل مرا همی باید ازو
ن می دهدم هم ببهای اوّل ٭ بفروش[2] که بوی مشك می آید ازو

---

1. Published Diwān : بگشاید
2. Published Diwān. : نفروش

Next to Amīr Khusrau comes Khwaja Amīr Nizam'uddīn Ḥasan Sijzi known as the Sa'di of India. The published Diwān of Ḥasan Sijzi is based upon a number of valuable manuscripts. Besides, there are quite a few other precious manuscripts of his Diwān. One, of Majlis-i-Shura-i-Milli, Tehran was transcribed by Maulana Jafar Tabrizi Bayasanghari, ( d. between 1456—58 ) the pupil of Mīr 'Ali Tabrizi d 1446—47). The other valuable manuscript which is richly illuminated and illustrated, belongs to the Topkapi Sarayi Museum.[1]

I came across the most interesting but defective manuscript of his Diwān in the Maulana Azad Central Library, Bhopal.[2] At the end of the qasidas, with which the manuscript begins, there is a note saying that it was transcribed by Mirza Maqṣūd Hirati on the 9th Rajab. 700 A. H. (1301) This note does not appear to be in the handwritting of the scribe.

Ḥasan Sijzi died in 1337—8 It, therefore, follows that this manuscript was transcribed thirty eight years before the poet's death. But Mahdi Bayani, the author of the Aḥwal-u-Athar-i-Khushnawisan, on the authority of Aīn-i- Akbari, has referred to Maqṣūd -Harawi as a courtier of Emperor Humayūn. Thus, the date of the transcription of the above mentioned manuscript seems to be in the first half of the 16th century A. D.

However, the following ghazals, fragments and quatrains in the Bhopal manuscript are missing from the published Diwān,[3] :—

GHAZALS

١ - ای خم زلف تو سرتا سربلا - ٢ - این بتم یارب که خوش دریا
مقصود را - ٣ - ای که قدش طعنه زده سرو چمن را - ٤ - زهی روی
ماه و شکل مرغوب - ٥ - قرب و لقا که مشرب اهل سعادت است

---

MS. No. R. 961,

No. 59 Farsi Adab.

Diwān-i-Hasan Sijzi Dehlavi, Maktaba-i-Ibrahimia Mashin Press, Hyderabad, Deccan, 1933/34,

composed by Ḥayati Gilāni. Ḥayati Kashi was in no way connected with the Mughal court, nor was he a contemporary of Akbar and Jahangīr, while Ḥayati Gilāni was intimately attached to the Mughal Court. This conclusively proves that Ḥayati Gilani was the author of the supplement. Most of the biographers have also confirmed it.

From the following prose lines of the Allahabad manuscript it appears that the incomplete Tughlaqnama had ended with the four couplets, which are not found in the printed text.

«گذارش گفتار در تهمت نمودن سخن سازان بدگمان ... که
رگشتن ملك تغلق غازی از بار غیم و منزل چند واپس نشستن نبوده
مگر در ساختن با دشمن و یا سراسیمگی و دل بباد دادگی، چنانچه
ز مضمون این سه چهار بیت تغلق نامه امیر خسرو مفهوم میگردد که
خرین داستان نا تمام این کتاب است :—

چو بر غازی ملك شد روشن این حال
بحیله رای شان را کرد پامال

بتدبیر سره در قلب کوشید
اگرچه قلب لشکر زان بجوشید

دو منزل باز گشت از رفتن پیش
همه کس بد خیال او نیکی اندیش

گمان این شد بدلهای پریشان
که یا ترسید و یا شد یار ایشان»

I was also fortunate to have discovered the oldest manuscript of Diwān-i-Amīr Khusrau dated 1419 A. D. in the Public Library of Bursa, Turkey.

Loyaki. But the greatest Persian poet of India, who flourished during this period and adorned the courts of seven Kings, is Ḥazrat Amīr Khusrau entitled Ṭuṭiy-i-Hind ( d. 1325 ). His works enjoyed wide popularity during the later Timurid period. A number of illustrated manuscripts of his mathnawis found in the great libraries and museums of the world belong to the Hirat School and were undoubtedly transcribed and illustrated by the best calligraphists and painters of the age including Ṣulṭān 'Ali Mashhadi ( d. 1514 ) and Behzād ( d. 1537 ).

Tughlaqnama is the last poetical work and one of the historical mathnawis of Amīr Khusrau. It was found incomplete and defective and was later supplemented by Ḥayati during the Mughal period. But as there were two Ḥayatis, Ḥayati Gilāni and Ḥayati Kashi, the biographers and writers have confused one with the other in regard to the real authorship of this supplement.

Tughlaqnama was composed at the instance of Ṣulṭān Ghayath'uddīn Tughlaq ( 1320—25 ). It consisted of about 3000 couplets and dealt with the murder of Quṭb'uddīn Mubarakshah [ 1316–20 ), a few months of Khusrau Khan's rule ( 1320 ) and the accession of Ghayath'uddīn Tughlaq. During the reign of Emperor Akbar the royal library contained a manuscript of the Tughlaqnama which was defective and incomplete from both sides, while the complete manuscript was available with Raja 'Ali Khan Farūqi, the ruler of Khandesh. It seems that the Mughal court could not get a complete copy of this mathnavi. So Emperor Jahangīr ordered his court poets to apply their poetic talent to complete the mathnavi. Ḥayati's composition won so much admiration of the emperor that he got him weighed against gold and silver.

The Majlis-i-Makhṭuṭat-i-Farsi, Hyderabad, published the original but incomplete Tughlaqnama along with Ḥayati's supplement in 1933. But recently I have come across a manuscript of Diwān-i-Ḥayati which is to be found in the Allahabad Museum.[1] It contains the supplement also, which is very different from the printed one. Moreover, S. Hashmi Faridabadi, who edited the published mathnavi has ascribed the supplement to Ḥayati Kashi, whereas according to my assessment it was

1. MS. No. 168.

بسیم خواستن و یافتن چه فخر کنی
تفاخر آنرا .. کو را مکارم است وسخاست
تو هرچه یافته ای من ندانم ار دانم
که نظم و نثر تو یکسر معلّل است و خطاست

Amīr Muizzi ( d. about 1126 ) has praised Mas'ūd Sa'd Salmān in the following fragment : —

شریف خاطر مسعود سلمان را

While the latter has paid back the compliment with these hitherto unknown lines : —

اگر ندیدی بنظم بدیع مرجان را ٭ که آن غذا شده مرطبع را و مرجان را
بشعر امیر معزّی وحید اهل سخن ٭ نگه کن و بتر از وی سخن بسنج آنرا
عجیب نظمش نشناخت نظم لولو را ٭ غریب و زنش ننهاد وزن مرجان را
بماند خیره در وطبع مرجان و در غم و رنج ٭ بماند طبع غمی را و جان رنجان را
مزاج خاطر بادش قوی که خاطر او ٭ ضعیف کرد بقوت قوی مرا جان را

From among his published qaṣidas, the following qaṣīda has been specially selected for its artistic beauty. For while reciting its lines our lips do not touch each other : —

ای آذر تو یافته از غالیه چادر

In the printed copy of the Dīwān بافته has been substituted for یافته which does not seem correct. Besides, it shows that the editor and the scribes have not discovered the rhetoric device employed in this qaṣīda,

Other Indian poets, whose compositions have been included in this bayāz are Sirāj'uddin Sistāni or Khurasāni and Amīn'addin

صفات مشك مگوی و ز زلف یاد مکن
اگر توانی بدانم که این قصیده تراست
جز آن قصیده که از روزگار برنایی
که کار پیر نه چون کار مردم برناست
و گر بخواسته آراسته نشد تن تو
رواست کایزد جان مرا بعلم آراست
بدان که بیخردی را درم فزون باشد
بفضل ... کی آخر برابر داناست
بهیچ حال ابو جهل چون محمد نیست
و گرچه هر دو بنسبت ز آدم و حواست
مرا ز دانشی رنج تن است و راحت جان
شناخته مثل است این که خار با خرماست
مرا به بیدرم و بحکا چه طعنه زنی
بدان قدر که پسندست حال من بنواست
بهیچ دقتی آزار تو نه بجستم من
توبی که سوی منت سال و ماه قصد جفاست
بطبع دشمن آنی که دانشی دارد
شگفت نیست که ظلمت همیشه ضدّ ضیاست
بتمرت ار چه عطای بزرگ داد ملك
هنر نه از تست آن بارش بزرگ عطاست

مرا بسوی شما آب نیست و مرتبه نیست
سوی شما همه جاه و بزرگ آنکس راست

که شعرهاش چو تعویذ های کالبدیست
درست و راست نماینده نه درست و نه راست

بشعرهای لبیبی شما نگاه کنید
که شعرهای لبیبی چه بابت عقلاست

همیشه رغبت اهل هنر بشعر من است
بسوی اوست شمارا همیشه میل و رواست

بدستهای ریاحین کس التفات کند
ستور سر زده جائی که دستهای گیاست

مرا بگوی که یك شعر نابایسته
کز و مثل زد شاید ز گفتهاش کجاست

نه هر چه نظمی‌ای دارد ز گفته ها نیك است
ز هرچه رنگنی باشد ز جامه ها دیباست

ز مشك و زلف در آن کار بسته معینها
چه خوشی وچه شگفتی وزان چه خواهد خاست

بنظم و نثر سخن را نهایتی باید
کزو مثل زد شاید کزین چه‌گفت و چه خواست

برین طریق بگویش که یك دو بیت بگوی
برین قیاس که من گفته ام گرش یاراست

From among the first rate Indo-Persian poets, only Masūd Sa'd
in has found the pride of place in this anthology. From among
herto unknown poems in a qaṣīda after the model of Labibi :-

سخن که نظم دهند آن درست باید و راست
طریق نظم درست اندرین زمانه چراست
سخن که من بنگارم بنظم اگر دگری
به نثر خوب گذارد چسار گذارد راست
ز حسن خاکی دارم ز لفظ ناقص پاك
درست و راست زبان بسته نه فزون و نه کاست
مرا سخن به بلندی سماست و معینها
از و درخشان بگوئی که آفتاب سماست
بصنعت و بمعانی و نازکی و خوشی
یکی قصیدهٔ من هم ز مایهٔ شعر است
و گر گواهی ای خواهد یکی برین دعوی
همین قصیده بدین گفت من بسنده گواست
مرا چه باید گفت این سخن که نیك افتاد
چو آفتاب درخشان ز آسمان پیداست
بصنعت سه روان شعر من چو جان درین
بلی و آن دگر کس بسان باد رواست
ایا گروهی کین شعرها همین خوانیت
بحلق و خنجر و گوئی که زیر باد دوتاست

ز بهر فتنه چو سا من جهان بکین پیوست
فرود حادثه تا خورد خون من غمخور

ز جور چون کری بست بر میان بکشد
بسوی من ز جفاهای بیکران لشکر

چنین قصیده که من در ثنات گفتم نیست
ز گفتهٔ شعرا در قصیده ها بنگر

دروز بیت و دو بحر آفریده ام ابیات
چنانك رسم موشح بود غریب و غرر

نبوده کس بیقین جز تو لایق این مدح
که تو کریم ترین خالقی و ... پرور

همی نتایج لفظت چو صیت جود تو هست
ز عزّ و جاه و حلالت سحر به بحر و ببر

مطهّرست چو نامت دلت ز غم که سزاست
سپهر هست غلامت که پیش نیست کدر

همیشه تا که بود روزگار عمر تو باد
بهر چه رای ترا کردگار داده ظفر

زبانت باد سرایندهٔ ثنای خدای
بقات باد فزایندهٔ بقای پدر

ز بهر شکر تو بادا جهان کشاده زبان
به پیش امر تو بادا زمانه بسته کمر

کف تو فرش سخن در نوشت بی دهشت
محل تو ز فلك برگذشت بی رهبر
بقای تو بجهان بر نثار کرد سعود
عدوی تو ز سعادت نیافت هیچ ثمر
چو بر جهان ز اپادی نیافتی با خود
بفضل حق همه شادی بیافتی همبر
تو آفتابی و از چرخ کی شگفت ار هست
شگفته دایمی در مهر تو چو نیلوفر
بهر زمان چو همی بگذری برین گردون
چرا برحم همی ننگری یکی بقمر
مگر که ماه بهمت که اندرو بندی
کند بدست ز چشمت کال با محشر
چو رفت چرخ برای تو گشت با رفعت
چو گشت ناصحت اقبال یافت زینت و فر
ایا که بخت ترا رام شد و زین حسرت
بغصه خصم تو ناکام شد بسوی سقر
تو ساز در غم دهر حرون مرا درمان
تو باش در ستم چرخ دون مرا یاور
ز جورم آن یبلا می در افگند هردم
ز قهرم این بجگر برهمی زند خنجر

برون برد بزمانی کدورت از دلها
ز لفظ چون بزمین بر کند نثار درر
ز جود او دل خلقی شود بهر ساعت
شگفته چون گل سوری ز قطرهای مطر
صبا اگر بکف آرد نسیم خلقش را
ز نار برون بدماند برون گل احمر
مهابت کرمش ریخت خون آز و نیاز
بر اختران قدمش شد مقدم و مهتر
ایا رسیده ز لطفت بهر مراد رجا
بعمر خوف نباشد ترا ز هیچ خطر
نگفته عقل که یك دل رسد بدانش تو
ندیده چشم کست یار در جهان بهتر
بدیدن تو ز جان خرمی شود پیدا
همیشه در دل تو مردمی بود مضمر
مراد تو ز فلك راست شد که گوهر تو
ز بس شرف بجهان شد مثل چو اسکندر
ز سروری بهنر کام تو شدست درست
بمهتری ز کرم نام تو شدست سمر
زروی دست تو چون شد کشاده چشمهٔ جود
رسید پایه قدرت بگنبد اخضر

دلم کجا بطرب بی لبت کشاید چشم
ایا همیشه بلب رشك چشمهٔ کوثر
ترا رسد که دهی جان صد چو من برباد
مرا رسد که ز خاك درت کنم افسر
بدولت تو ز ایام آن رسید بمن
که روح در تنم از کار او نمود حذر
غمت ز پای در افکند خلق عالم را
رخت دمار برآورد از بت و بتگر
رضا دهند بغمهای تو زمان و زمین
مدد کنند ستمهای تو بفتنه و شر
ستمگری تو و ما را چه بیم از ستم است
کنون که باشد ما را چو تاج دین یاور
جهان حشمت و بحر کرم خداوندی
که بر اکابر سر دفتر اوست در کشور
کریم طبعی کزو بس شرف نظیرش نیست
همیشه هست بر اهل هنر کرم گستر
ز فخر بخت ببوسد همی کف پایش
که هست افسرش تاج سر قضا و قدر
ز روی مرتبه پایش فلك همی ساید
از آنك هست ز آل علك یگانه چو خور

ز مهر من چه گریزی چو کبك از شاهین
بماندهم ز چه سوزی چو مشك بر آذر
تن مرا بجفا هجر تو گداخت چنان
که شد جدا تنم از کام و باز شد مضطر
بکین من ز چه نازی چو اشك من سوی خاك
در آتشم چه گدازی چو اندراب شکر
ایا همیشه جهان را بجور بوده نظیر
بگو چه باشد اگر یابم از لب تو نظر
بود همی بجفا میلت و شوی واله
چو من دمی بوفا گر کند دل تو گذر
بتیر غمزه گدازی هزار دل مجروح
بعکس چهره برآری سمن ز روی حجر
تراست دل بجفا بر سوار چون شاهان
مراست دل ز وفا چون عروس در زیور
همی چه دست زنی هر زمان ببیدادی
ز من چه پای کشی و ز چه در نیاری سر
چنین بدم چه نمانی چو نیك خواه تو ام
بزین غمم چه فزایی چو کاست جان و جگر
نه در قران تو دل را دهد سعادت بار
نه بی وصال تو جان یابد از سلامت بر

ز چشم تیره گریان من شود روشن
که از هوای تو در جان من چهاست اثر
چو تیغ هجر بر آرد زمان زمان خشمت
ز ترس و بیم بر آید امان امان ز بشر
کدام تن که ز جورت نماند عاجز و خوار
کدام دل که ز هجرت نگشت زیر و زبر
مرا ز عشق جمالت چو غم رسد خواهم
هم از تو داد نباشد جز این سخن درخور
اگرچه از تو برویم رسد هزار بلا
بجان تو که نگویم بجز ترا دلبر
ز دیده خواب چو شادی بشد ز سینهٔ من
شدم اگرچه نه بودم عدیل با اختر
شبی فراز دلم کرد ناگهان پرواز
بسوخت باز طرب را بجملگی شهپر
بسا شبی که به ماندم در آتش غم تو
ز بهر بوی تو گشتم ندیم باد سحر
چو درد و اندوه و غم بی تو سرکند ز دلم
نه صبر و جان و روان ماندم نه عقل و بصر
ایا دست ز وفا بر کرانه بی تو غمی است
میانهٔ جگرم در برون ز حسد و زمر

"Muḥammad Jamālu'ddīn Samarqandi says _ that when God, exalted be His might, bestowed upon me a plentiful knowledge of prosody, I thought I might have a memento thereof. To that end, I composed a qaṣida in the metre of mujtas makhbun muwashshah, so_that it may cover all the twenty two metres, fifteen those framed by the Arabs and seven those evolved by the Persians. Each verse was composed in one of these metres. It is an extremely rare piece of poetry, the like of which has never been written before nor will ever be. Since the exalted court of my benefactor, Taju'ddīn Muṭahhar bin Ṭahir . has very graciously bestowed upon me innumerable favours and gifts, I decided to adorn this qaṣīda with his name (to dedicate this qaṣīda to him.") The qaṣīda begins with this line :—

ایا بہار سمن بر نگار حور صبور

شراب ہجر چشیدم بسی بعشق تو در

دل و تنم چو ترا از برم جہان بربود

شدم به توتهٔ حسرت درون هبا و هدر

ز گلستان رخت تا شدم جدا زان پس

ز خار ہجر کشیدم بسی عنا و ضرر

از آن زمان که جدا شد ز تیر قامت تو

به پیش تیغ بلا جان من شدست سپر

چو در هوای تو یکتا رود همی دل من

مکن چو زلف دوتا هر زمانش تافته تر

رخم ز دیده به خونابه زینتی دارد

چو درد عشق تو آتش زند مرا در بر

از آن زمان که شد این دیدهٔ من از تو جدا

بخون کنار من ار ہجر تو شدست شمر

A special feature of this edition is that in it the second fragment reads as follows :—

ای بزرگی که از تو دلشادم ٭ شاد گشتم که کردهٔ یادم

نامـــهٔ تو رسول تو آورد ٭ غـــم گیتی بباد بر دادم

چون خط بی خطای تو دیدم ٭ سر خود بر خط تو بنهادم

حالی از لطف تحفهٔ قلمت ٭ گره از طبع خویش بگشادم

شب تاریك هم بدست رسول ٭ بادهٔ روشنت فــرستادم

تا توآن دوسه را نخواهی داد ٭ من بنـقد این رسول را دادم

From among the figurative qasidas, the compiler has selected a qaṣīdā of Jamālu'ddīn Aruzi Samarqandi, dedicated to Tāju'ddīn Muṭahhar bin Ṭahir which can be recited in twenty two metres and in which the figure of speech known as Tauwshiḥ has been very skilfully employed. Indeed, he claims that no other poet has composed a poem employing this art.

He even quotes the poet himself :—

« چنین گوید محمد ... جمال الدین سمــرقندی که چون ایزد جلت قدرته ... مرا از علم عروض نصیبی وافر بارزانی داشت، خواستم که ازین یادگاری بماند ـ قصیده ای گفتم ار بحر مجتث مخبون موشح چنانك بیست و دو بحر از وی بیرون آید، پانزده وضع تازیان و هفت وضع پارسیان، از هر بحر یك بیت در وی بیاوردم ... و این نوع نیك غریب است و کس نگفته است و چنین کس نخواهدگفت ... و چون مجلس عالی ولی النعم تاج الدین مطهر بن طاهر ... درحق بنده اکرامی و انعامی از روی لطف بی‌حد و اندازه می فرماید ، .. خواستم که این قصیده بنام وی آراسته ترگردد» (ص ۷۸) ـ

آن مردهٔ روان بشکم گرد این جهان

گه زم و نرم و بباز گهی تندو بر جهان

هستند زنده در شکمش بچگان بسی

خود زنده نی و زنده بدویند زندگان

زنده است بچه در شکم مرده و چو زاد

بی هیچ زخم و رنج بمیرد هم آن زمان

The fragments quoted above are fine specimens of riddles and enigmas in Persian literature

From among the selected fragments is the following request for wine, sent by Anwari ( d. about 588/1192 ) to Shahab Muayyad :—

قاصد خویش را فرستادم ٭ بتو مهتر پیامکی دادم

سه حریفند میهمان رهی ٭ که بدیدار هر سه دلشادم

گر فرستی صراحی باده ٭ بیقین دان که هر سه را کاوم

The latter complying with his wishes acknowledged his letter in these lines : —

ای کریمی که از تو دلشادم ٭ شاد گشتم که کرده ای یادم

تا رسول تو خط تو آورد ٭ جان و دل بر خط تو بنهادم

شب تا یلك هم بدست رسول ٭ بادهٔ روشنت فرستادم

تا تو آن هر سه را بخواهی کاو ٭ من بنقد این رسول را کاوم

In the published Kulliyāt-i-Nazm-i Anwari[1] both the fragments have been attributed to Anwari, under the title "Mutafarriqāt-i-Anwari".

1. Maṭba Nawalkishore, Kanpur, 1891.

Moreover, it contains the following hitherto unknown riddles and ..igmas of Daqīqi, 'Asjudi ( d. 1040/41 ), 'Unṣuri ( 961–1039/40 ) and ..rrukhi (1134/35) : —

### DAQIQI

بگویی تا چه چیز است ای برادر ٭ بسی دیده تموز و تیر و آ..
ز باب و ما درست اصلش و لیکن ٭ نزاید بچه او چون باب و ما..
گهی چون مرد باشد گاه چون زن ٭ گهی دستار دارد گاه چا..
اگر در آب و آتش جاش سازی ٭ نه آبش بشکنند نی سوزد آذر
بجز در آب و آتش هر کجا هست ٭ بهر شکلی برآید تیز بنگر

### ASJUDI

دمنده اژدهایی چه بود آن ٭ خر و شان و بی آرام و زمین در
شکم مالان بهامون برهی شد ٭ شده هامون بزیر او مقعر
گرفته دامن خاور بدنبال ٭ نهاده برکران باختر سر
بباران بهاری گشته فربه ٭ بگرمای خزیران گشته لاغر
ازو زادست هرچه اندر جهانست ٭ ز هرچه اندر جهانست او جوان تر
فراوان جانور دیدم ز هرجنس ٭ ازو زاده و مانده در مجاور
ستان مانده رو بر زنده پیلی ٭ بپرواز اندر از معبر بمعبر
به پیش بحر و بر برد و لیکن ٭ همه اندر شکم او ... زند پر

### UNṢURI

از صفات حرام لفظی را ٭ باز گردان و بس مصحف کن
چون بدانی که آن مصحف چیست ٭ ضد او گیر و نقش بر کف کن
بودنی دال پیش او بنگار ٭ عرب اندر عجم مؤلف کن

ای ذات منزه تو از عیب بری ٭ بیرون ز هزار پرده در پرده دری
در پرده هزار معصیت هست ترا ٭ این شده ام ز فضلت از پرده دری

---

The following quatrain is also quite rare :—

ای بار عنا شخص ترا فرسوده ٭ چندین چه خوری غم جهان بیهوده
آسائش خود ز رنج بسیار مجوی ٭ کز رنج تو دیگری شود آسوده

Swami Govinda Tiratha,[1] in the Index of known quatrains with reference to a manuscript has given only its first line, and that also reads differently in this way —

ای یار عنا شخص ترا فرسوده

Besides, it contains the following ghazal of Nizami (1140–1203), which could not be traced in his published works :—

تا کی دل مسکینم از هجر حزین باشد ٭ زارم ز غمان گشتی معشوق چنین باشد
که ذره زنان آیم که جامه دران باشم ٭ از ناز همی گوئی عاشق به ازین باشد
جان رفت مرا از غم تن نیز کنم قربان ٭ باشد که همه رایت ای دوست چنین باشد
تو قدر وصال ما دایم که نمی دانی ٭ لیکن تو طلب می کن کار تو همین باشد
بر من دل ملکیت ای دوست نمی سوزد ٭ شاید من مسکین را این روز پسین باشد
من وصل نمی جویم آورده بزهد خود ٭ گوید که بدین خوبی کی خلد برین باشد
دادی تو مرا وعده گفتی که هلا فردا ٭ گفتم که ترا وعده بسیار چنین باشد
بر گفت مرا در گوش من زان تو ام خاموش ٭ پنداشت که عاشق را آرام درین باشد
برداشت نقاب از رخ گفتار چو می داری ٭ گفتم تو چوبی هرگز بر روی زمین باشد

---

1. The Nectar of Grace 1941 p. 333

Amidu'ddīn Loyaki, Naṣiru'ddīn Adīb, Ziau'ddīn Abdur-Rafi bin Abu'l Fath Harawi, Latīfu'ddīn Zaki Maraghai, Naṣru'llah Ghaznavi, Nizāmu'ddīn Kātib.

The special feature of this anthology is that its compiler has mentioned the following poets whose names could not be traced in any of the tazkiras :—

Abu Said Bakharzi, Aḥmad Manshūri Israngāni, At laha Amīr Saifu'ddīn, Awhad Ṭaliqani, Burhān Samarqandi, Taju'ddīn Khatīb Sajurmi, Jalālu'ddīn Fayūni, Jamālu'ddīn Shaniqi, Jamālu'ddīn 'Aruzi Samarqandī, Hubabi, Ḥusāmu'ddīn Nabirah, Ḥāmid Simkash, Khwaja Abdulh Hakīm Khiyali, Rashid Kātib Zainu'ddīn Qudbi, Sā'di Razi, Ustād Sa'd Kani. Saidu'ddin al-Muṭayyab Samarqandi, Said Yabî, Saīd Bukharushi, Said 'Usmâni, Shahgar Samarqandi, Sharafu'ddīn Khatāli, Shahābu'ddīn Adīb, Shahāb Nasafi, Said Masūd, Sadrush - Shariat, Alāu'ddīn Zargar, 'Alvi Nasafi 'Ala Ziyarkari, 'Ali Shah, Saiyid Imādu'ddīn, Ghawwās Gunbadi, Fakhr Alami Kamālu'ddīn Qarshi, Muḥammad Samak, Muḥyi Dehqāni, Manṣūr Sarmimi, Naṣru'llah Ghaznavi, Nizāmu'ddīn Darmandi, Nizāmu'ddīn Kātib, Nizāmu'ddīn Jundi, Wartiji.

The compiler has divided his selections form-wise into qasidas, ghazals, quatrains and fragments. He has further sub-divided them according to their contents. The most significant feature of the bayāz is that it contains innumerable poetic compositions and verses, which would otherwise have been lost to us, It contains the qasidas, ghazals, quatrains and fragments of some of the most renowned Persian poets including Masūd Sa'd Salmān. These compositions could not be traced in any of the published works. For example, it contains the following hitherto unknown moral and didactic quatrains of 'Umar Khayyām :—

بشنو سخنی که جز سرانجام تو نیست ٭ مرغیست مراد دل که در دام تو نیست
گر کرهٔ توسن فلك رام تو نیست ٭ دلتنگ مکن که این در ایام تو نیست

---

گر چرخ ترا خدمتی پیوند کند ٭ مپذیر ازو که آخرت پست کند
بگذار جهان را که ترا مست کند ٭ در گردن معشوق دگر دست کند

---

ای جان دل ریش رجهان بیش منه ٭ وی کاه ضعیف کوه بر خویش منه
کوته تر ازانست که پنداری عمر ٭ چندین عمل دراز در پیش منه

---

I drank deep of that spring of wisdom ... once he dropped a hint ... that there could not be anything more conducive for mental recreation than poetical compositions for a study of the facts of metaphysics and a survey of the subtleties of other people's work Thereby he implied that I might apply my mind to the compilation of an anthology of choice verses, the like of which has not been collected by any other scholar nor picked up by any other savant, because it is wearisome and boring to pore over varied calligraphies and different volumes ... In compliance with his wishes I have prepared this collection by drawing upon the springs of charming verses and a variety of works of great poets .. you would say that every qaṣīdā of this anthology is a bag of sugar ... to provide the syrup of diversion ... to the majestic assembly of the illustrious benefactor. The qasidas are divided into four catagories ... the quatrains are spread over eight chapters and miscellaneous fragments are divided in ten parts ... As fluency is to be observed in ghazals ... these are abridged in one part... If all the seventy-six chapters were to be dealt with here it would result in unnecessary redundance."

It begins with a list of poets, from whose diwans selections have been made. The names of the following poets have been mentioned in it :- Aṭhiru'ddīn Akhsikati Azraqi, Anwari, Adīb Ṣābir, Abu'l-ula, Awhadi, Asad Shehāb, Abu'l-Futūḥ, Ajwal Qarshi Burhān-i-Islām, Afḍalu'ddīn, Ashrafi Samarqandi, Bahāu'ddīn Marghistāni, Badru'ddīn Farahi, Ḥamīdu'ddīn, Ḥasan Ghaznavi, Khāqāni, Dehqāni 'Ali Shaṭranji, Daqīqi Raziu'ddīn Nishāpuri, Rashīdi Samarqandi, Rashīd Watwat, Jalālu'ddīn Rūmi. Zaki Kāshghari, Sulṭān 'Alāu'doīn Khwārzm Altāz, Sanāī, Suzāni, Sā'di, Ṣaifu'ddīn Isfarangi, Sadīd Awars Shamsu'ddīn Khala, Shamsu'l - Maali Qabūs, Shāhid Balkhi, Shamsu'ddīn Tabari, Zahīru'ddīn Sajzi, 'Unsuri, Abdu'l-Wāse Jabali, Imādi Ghaznavi, Izzu'ddīn Shirwani, Asjadi, Attar, 'Abdu'r Razzaq Iṣfahāni, 'Atīqi Tabrizi, Isma'il Warraq, 'Umar Khayyam, Futūḥi, Fakhru'ddīn Razi, Fakhru'ddīn Mubārak Shah, Fakhru'ddīn Khālidi, Ḥusām Nasafi, Qatran Tabrizi. Labibi, Majd Hamgar, Maḥmūd Warraq, Manjik Tirmizi, Mujir, Mukhtār Ghaznavi, Masūd Sad Salmān, Manuchehri, Damghani, Muizzi, Minuchehr Shast Galla, Naṣiru'ddīn Adīb, Nizāmi, Naṣir Khusrau, Naṣīru'ddīn Adīb, Humām, Humām Zaki Maraghi, Sirāju'ddīn Sistani, Sharafu'ddīn Muḥammad Faḍlu'llah Shafrawah,

زبدة الحکماء ... سیدالاشراف ..عین الامرا ... معین الدوله ... مجدالملت
و الدین شمس الاسلام و المسلمین انیس الملوك و الخواقین ... را در یافتم
و مدتی از آن گنج حکمت اقتباس می گرفت ... اشارت فرمود ...که
از مطالعهٔ حقایق معقولات و نظر دقایق محصولات مرتفرح دل را ملایم
تر از سخن منظوم نیست - باید که تالیف سازی و از اشعار مختاری
مجموعه ای پردازی که مانند آن فاضلی فراهم نیاورده باشد و کاملی
جمع نکرده، که خطوط مختلفهٔ مجلدات متفاوته ملالتی می آرد و طبع ر
کلالتی می افزاید - بحکم اشارت این مجموعه که .... دست انتخاب و
اختیار از عیون لطایف اشعار و متون دواوین کبار برگزیده ... گویی
هر قصیده ازین مجموعه تنگ شکر است . ..تا مجلس رفیع مولوی اجل
.... را شرهت سلوت پیش آرند . .. قصائد بر چهار اصل نهاده شد
....رباعیات بر هشت باب .... اقسام مقطعات بعشرهٔ کامله .... بجهت
آنکه در غزلیات سلاست نگاه باید داشت.... بر یك قسم اختصار
کرده شد .... اگر تمامی هفتاد و شش فصل را درینجا یاد کرد
شدی فصول دراز کشیدی» -

"Muḥammad biu Yaghmūr writes; The vicissitudes of life and the misfortunes of time brought this weak creature ( the writer of these lines ) to Tirmiz — the metropolis of great men ... in such a wretched condition that I had neither a knot ( pearlstring ) in the turban of happiness nor any cash in the purse of patience ... By a happy coincidence I attained the good fortune of reaching the exalted assembly of the model of sublimity and dignity .. the cream of wise men ... the chief of the nobles .. the lord of magnates .. the support of the kingdom ... the glory of religion and faith, the sun of Islam and Muslims, the companion of Kings and monarchs. For a time

## PART II

It will be convenient to divide the history of Indo-Persian literature into two distinct periods – the Pre-Mughal period and the Mughal period. The Pre-Mughal period may be further sub-divided into Pre-Delhi Sulṭanat and Delhi Sulṭanat. Saiyid 'Ali Hujweri known as Dāta Ganj Bakhsh ( d. 1072/3 ) flourished during the Pre-Delhi Sulṭanat period, while his Kashfu'l Maḥjūb is an exquisite exposition of Sufistic doctrines and may rightly be called the first major prose work in Persian and the first mystic work in Indo-Persian literature. Among the great poets of this period were Nukati ( d. after 1099 ) and Abu'l Faraj Rūni. But Masūd Sa'd Salmān ( d. 1121/22 ) has been regarded the greatest and most eminent poet of this period.

I have reeently come across the manuscript of a valuable Persian bayāz[1] , ( anthology ), which may throw a flood of light on the history of early Persian literature. It will not only introduce to us a number of poets who have been thrown into oblivion, but may also bring to light some of the hitherto unpublished compositions of some of the most celebrated Persian poets of Iran and India. This bayāz ( anthology ) compiled at Tirmiz by Muḥammad bin Yaghmūr was transcribed some time during the period intervening between Sā'di ( d. 1292/95 ) and Ḥafiz ( d 1388/89 ) The manuscript is in beautiful and bold naskh Unfortunately it is defective in the beginning as well as at the end, and some of its folios are also missing from the middle. However, it would be worth - while to quote a few lines from its introduction :—

• چنین گوید ... محمد بن یغمور که ... حوادث روزگار و نوایب
لیل و نهاراین ضعیف را بخطهٔ مدینة الرجال ترمذ ... رسانید ... در چنین
حال نه در دستارچهٔ خرسندی نقدی بود و نه در کیسهٔ شکیبائی نقدی
... از اتفاقات حسنه سعادت خدمت مجلس عالی قدوهٔ مجد و معالی ...

---

1. MS. No. 183, Govt. Oriental MSS. Library, Madras.

King of Tiham and his son, Kishwar Kusha, and his minister, the g of Kashmir, the King of Ceylone and his daughter, Mulk Ārā, ıanbar and Gulzār, the King of Qannauj and a sage.

Among other Persian works written in India and treating of genous stories are the Basātinu'l - Uns, Ṭūtī Nāmah, Chandayāna, at Nāmah, Lila-u-chaniser, Dilfarīb, Sūz-u-Gudāz, Bahār-i-Dānish, l-u-Sehba, Madhawanala and Kamakandala, Mika-u-Manohar, ang-i-'Ishq, Gul-i-Bakā'ulī, 'Ajāibu'l-Qiṣaṣ, Taṣwīr-i-Maḥabbat, ah-i-Sit-Basant, Mahyār-u-Chander-badan, Ḥikāyat - i - Nānakshāh, wish-u-Bādshāh, Sirāju'ṭ-Ṭarīq, Padmāvat-u-Manohar, Padmāvat-ifu'l-Mulūk, Laddhā Faqīr Mahrū-u-Abdul-Aziz, Narsi Brahman, shan-i-Ḥusn, Ḥikāyat-i-Kāshī Nāth Chitr-u-Kiran, Rāni Chandar n, Baḥr-i-Wiṣāl and Himal-u-Naqrai,

In addition to the above mentioned works of fiction, there are ve versions of Padmāvat, nine versions of Singhāsanbattīsī, twenty-versions of Hīr-u-Rānjhā, seven versions of Kāmrūp-u-Kāmlatā, n versions of Sassī - u - Punnū, three versions of Manohar - u - lhūmālati, two versions of Mirzā-u-Ṣāḥiban and three versions of ıī-u-Mahiwal in Indo - Persian liturature.

* * * * * *

Dr. 'Abdullāh has mentioned the name of Faiḍī (1547-1595/96) as one of the probable translators of the Kathāsaritsāgara, which does not seem to be credible.

"Another equally important work is Bluhar and Yuzasaf or Barlaam and Josaph or Josaphat, a Buddhist story, which went from India to Iran in the sixth or seventh century A. D. and was probably translated into Pahlavi. Later, it was translated into Syriac, Hebrew, Arabic, Ethiopiac, Greek, Latin and other languages. Prof Bapat says, "Barlaam in the story is Bhagawan and Josaph or Judasaph or Budasaph is Bodhisattva of the Budhists. They are even cannonised as saints and 7th November is observed as a day in their honour. No one seems to have taken the trouble to inquire who Barlaam and Josaph were. There are two Arabic versions which are free from every Christian dogma. One of these appears to be directly taken from Pahlavi. The other was printed in Safdarin Printing Press in Bombay. In this book, besides, the main story, there is a large number of parables which are taken directly from Indian sources".[1]

It was translated into Persian by Mullā Muḥammad Bāqir Majlisī ( d 1698/9 ) and forms a part of his book, 'Ainu'l - Ḥayāt. Recently I have come across a versified Persian version of this story written in India. S. Najaf 'Alī Faizabadi, teacher of Mīr Anīs ( 1802 - 1874 ), a great Urdu poet, had been perhaps, in the service of Jawāhir 'Alī Khān, the Household Secretary of Bahu Begum, the wife of Nawwāb Shujā'u'd - Dawlah of Oudh( 1753 -1775 ). He has versified the prose version of Mullā Muḥammad Bāqir Majlisī in 1675 completed under the name of Naẓm-i-Jawāhir The only MS. copy of this Mathnawī and other treatises by the same author are with Mr. Khurshīd Anwār, an advocate of Ranchi.

During my visit to Turkey I discovered the Manuscript of a hitherto unknown Mathnawī entitled Jalīsu'l - Mushtāq, composed by a poet named 'Alī and dedicated to Amīr Shiranshāh. It is a collection of the tales featuring such characters as a Chinese emperor, an ascetic,

---

1. India's Cultural Contacts with other countries and the Role of Buddhism in Establishing the same. ( Delhi University 1959 ) p. 9.

"That very day an order was issued that I shall translate and com-
ete the remainder of these Hiudu tales, part of which had been trans-
ted by the command of Zainu'l 'Abidin, King of Kashmir, and named
e Baḥru'l Asmār, of which the greater part had been left untranslated.
was entrusted to finish the last volume of that book, which was of the
ickness of sixty juz in the course of five months. At this time also one
ght he called into his private bed-chamber to the foot of the bed, and
the morning asked for stories out of each chapter and then said,
ince the first volume of the Baḥru'l Asmār, which Sulṭān Zainu'l
bidīn had translated, is in Arabic Persian and difficult to understand
you translate it afresh into ordinary language and take care of the
ugh copy of the book, which you have translated.' I performed the
minbose and heartily undertook the commission. I began to work
d after showing me a great deal of favour he presented me with 10,000
ikas in small change, and a horse. If God ( He is exalted ) will, I
pe to have this book finished in the course of the next two or three
onths, and that it will obtain me leave to go to my native country
hich is the grave ) "[1]

Badā'ūnī has not mentioned 'Abbāsī, nor has the latter men-
ned the former in regard to this Persian version, though both were
assigned by the same emperor. However, a number of points may
emerge from the statements of 'Abbāsī and Badā'ūnī. It seems that
the original name of the Kashmir version was Baḥru'l – Asmār. While
Badā'ūnī did not change the original name, 'Abbāsī Persianised the
name also by calling it Daryā-i-Asmār. Besides, according to Badā'ūnī,
the Kashmir version was incomplete and the emperor had asked him
to revise as well as supplement the incomplete translation. On the
other hand, 'Abbāsī mentioning the defect of the style and language has
not mentioned anything to show that the Kashmir version was not
complete. However, since the extant MS., is not complete, it may be
presumed that he had revised the incomplete copy. It may be that
'Abbāsī was assigned the task of revising, while Badā'ūnī was entrus-
ted with the job of supplementing as well as revising the incomplete
Kashmir version.

---

1. Muntakhabu't - Tawārīkh ( Vol. II, p. 15 – 16 ) translated by Lowe.

چیزها را با و ترجمه می فرمائیم بسیار خوب و خاطر خواه ما می نویسد،
نمی خواهیم که از ما جدا باشد - شیخ و دیگران تصدیق نمودند -
و همان روز حکم شد که بقیهٔ افسانهٔ هندی را که بفرمودهٔ سلطان
زین العابدین پادشاه کشمیر بعضی از آن ترجمه شده و بحرالاسمار نام نهاده
است و تا کثری مانده، ترجمه کرده تمام سازد و جلد اخیر آن کتاب ر
که بضخامت شصت جزو است در مدت پنج ماه با تمام رساند - و مقارن
این احوال شبی در خوابگاه خاصه نزدیك بپایهٔ تخت طلبیده تا بامداد
حکایات از هرباب پرسیده حکم فرمودند که چون جلد اول بحرالاسمار ک
سلطان زین العابدین ترجمه فرموده، فارسی قدیم غیر متعارف است
آنرا هم تو از سر نو بعبارتی مانوس بنویس و مسودهٔ این کتاب را خو
ترجمه کرده ای نگاهدار - زمین بوس نموده بدل جان قبول نمودم و شروع
در آن کردم - و بعد از التفات بسیار ده هزار تنکه مرادی انعام واسپ
بخشیدند - انشاء الله این کتاب بزودی و خوبی درین دوسه ماه مرتب و
پرداخته آید و رخصت وطن که ملاك آنست حاصل آید -[1]

‘Contemporaneously with these events he one day said to Abu’l 'aḍl in my presence ‘Although the guardianship of Ajmer suits so and o very well, yet since, whenever I give him anything to translate, he lways writes what is very pleasing to me, I do not want that he should e separated from me.’ The Shaikh and others confirmed His Majesty’s pinion of me.

---

. Muntakhabu’t Tawārikh Vol. II, pp. 401–2.

وجه دریافت خواص نیز مهجور گشته و بهر تقدیر نزد هر دو فرقه مفهوم
حکایاتش محجوب شده و غرض آمر که عبرت پذیری و تشحیذ خاطر
ست از آن برنیامده، کمترین جبهه سایان آستان عرش نهاد مصطفی بن
خالقداد بعبارت زود فهم روشن معنی رقم زده کلک بیان سازد، و
ترتیب نسخهٔ اصل را مرعی داشته آنچه زیاده از مفهوم و حکایت و محل
مقصود باشد بیندازد» ۔

"The object of the author of any book is to communicate his ideas primarily to those who speak that language. Hence, the purer the language is, the easier it will be for the people to understand it. This would be specially so, if the book is intended for the common man. The writer should, therefore, avoid the use of words from any other language, in order to facilitate comprehension. Some writers, however, waste ink and paper by introducing Arabic words in their Persian texts The Brihatkatha was translated by some one into Persian, at the instance of Sulṭān Zainu'l 'Abidīn, the well known ruler of Kashmir. But the translator had used Arabic words indiscriminatly, rendering the text incomprehensible for the common people. Its meaning could not be easily grasped by scholars also, because of its defective style. During the stay of His Imperial Majesty at Lahore, the royal command of the Shadow of God was issued to the humblest among the worshippers of the sky-like court, Muṣṭafā bin Khāliqdād, to rewrite it in simple and fluent language. The assignment also involved the deletion of irrelevant materials, while keeping the work intact".

Beside 'Abbāsi the work of revising and supplementing the Persian translation of the Kathāsaritsāgara was assigned to Mullā 'Abdu'l Qādir Badā'ūnī, the author of Muntakhabu't-Tawārīkh, also. Badā'ūni describing the events of the year 1595 writes :—

«مقارن این احوال روزی شیخ ابوالفضل را بحضور فقیر
فرمودند که اگرچه از فلانی خدمت اجمیر هم خوب می آید اما چون

'Abbāsī writing about the nature of his version says:—

«بهترین تکلم در روشن ترین مخاطبت اهل هر نفسی آن تواند بود
که بیان آن بعبارتی تمام عیار و کامل ادا نمایند، علی الخصوص چون
یکی از اهل لغت خواهد که معنی آن دیگری نماید ظاهر است که غرض
او جز افهام سخن باهل آن لغت نخواهد بود - و در این صورت
هر چند عبارت در همان لغت خالصتر، بفهم نزدیکتر، خاصه که سخن
از آن قسم باشد که بجهت عموم فایده آنرا عام فهم باید نوشت - و برین
تقدیر کاتب را واجب آید که عبارت را از آمیزش بلغت دیگر بطوری
که موجب خستگی بستگی و دور فهمی مضمون باشد احتراز نماید، بل
وظیفهٔ بلاغت را که استعارات آن نقاب چهرهٔ مقصود شود یا بدرازی
کشیده ذهن سامع را از دریافت مدلول پریشان سازد بکلی متروک و
مهجور فرماید - و العیاذ بالله که اغلاق سخن و پوشیدگی معنی ا
رهگذر نا سرگی عبارت و نادرستی عیار و نقصان ادا باشد، چنانکه
بعضی ناقص دانشان بجهت فریب عامیان الفاظ عربی و پارسی در
آورده نامنتظم ترتیب دهند و دوات و قلم را آزار داده رو سفیدی کا
را بی هیچ گناهی بسیاهی بدل کنند - بناء علی هذا در ایام آرام رایات
عالیه بدارالخلافت لاهور ... مثال لازم الامتثال حضرت الٰهی شاهنشاه
... صادر گشت که کتاب برهت کتها را که ... آنرا بامر سلطان
زین العابدین مشهور حاکم کشمیر شخصی بفارسی ترجمه کرده - و لیکن
چون مترجم بر قدر مقدور در امتزاج فارسی بعربی کوشیده و از فهم
عوام بغایت دور افتاده و بجهت نا سرگی عبارت و نقصان عیار

Sulṭān's early association with seculars like Shaikh Nūru'ddīn had le him revolt against the fanatic and narrow-minded theologians ministry consisted of a Budhist, a Brahmin and a Muslim. More- r, he invited all the Kashmiri Hindus living beyond Kashmir tc rn to their homeland and guaranteed complete religious freedom equality for them. In addition, he not only revived Hindu pilgri- ;es and repaired Hindu temples, but himself went as a pilgrim to du shrines and participated in Hindu festivals The Sulṭān used to y sacred Hindu books like Nilamatapurana, Yoga-Vasishtha and ι Govinda. Besides, he used to practise Yogā and perform *havans*. wrote treatises in Persian on fire-work and protechnics, and also a tise named Shikāyat. As a patron of art and letters he encouraged ι Hindu and Muslim scholars, and his court was enriched by musi- s and *artists, mystics and literary figures. like Maulānā* Kabīr, *Pandit* ιraja, Mullā Jamīl, Mullā Udi, Somabhatta and Rāmananda.

One of the chief contributions of Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn was the blishment of a translation bureau, through which a number of Sans- works were translated into Persian and vice-versa Mullā Aḥmad, court poet of the Sulṭān, translated the Mahābhārata, Dasavatra Rājatarangini into Persian while Shriwara began the Sanskrit slation of Jāmi's Yūsuf Zulaikha which was completed in 1505 er the name of Kathākautuka.

While much has been written on the scholarly contributions of ān Zainu'l 'Ābidīn it is surprising that nobody has studied in depth ery valuable Persian translation of the Kathāsaritsāgara rendered at instance of Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn, which perhaps, does not exist ιy. It is said that Mullā Aḥmad translated it into Persian, under title of Baḥru'l - Asmār. However, later this Arabicised version was 'ritten in simple Persian by Muṣṭafā Khāliqdād Abbāsī, at the inst- : of Emperor Akbar under the name of Daryā-i-Asmār 'Abbāsī's ion which was also lying in total oblivion, has been recently dis- ιred by me, and its only MS., that too an incomplete one, is to be ιd in the State Central Library, Hyderabad, (MS. No. 2642 ( Hist. ), ιs: 377, size: 11" × 6").

The earlier of these two versions as the Brihatkathāmanjarī (The Bower of the Great Stories) was rendered in 1037 by Kshamendra. It consists of 10 chapters with 7500 stanzas. The other Kashmir version, known as the Kathāsaritsāgara, containing about 22000 verses was made some time around 1081 by Somadeva. Of the two Kashmir versions, Kathāsaritasāgara is considered to be superior "in taste and style." [1] Besides, it "also contains.. a recast of the first three books of the Panchatantra which...had the same form in Somadeva's time as when they were translated into Pahlavi". [2]

The relation between the Kathāsaritsāgara and the Pahlavi version of the Panchatantra will become clear from the following words of Macdonell :—

> "The Kathāsaritsāgara also contains (Tarangas 60-64) a recast of the first three books of the Panchatantra, which books, had the same form in Somadava's time as when they were translated into Pahlavi". [3]

Besides, the two Kashmir versions of the Brihatkathā, there is also a Nepal version of its Sanskrit translations named "Brihatkathā's Lokasangraha (A Compendium of the Verses of the Brihatkathā). This version was rendered by Budhaswāmin in the 8th or 9th century but was discovered as late as in 1893 in Nepal. The incomplete MS. of this versions contains 4539 stanzas. It is, however, estimated that the original contained about 25000 stanzas. It may also be noted that this version differs considerably from its Kashmir counterparts. The Nepal versions may be nearer to the original, but the Kathāsaritsāgara is the best known of the three.

Sulṭān Zainu'l 'Ābidīn ascended the throne of Kashmir in 1420 and died in 1470 He was one of the greatest Kings of Kashmir and is known as Bud Shāh the (Great King). He was a great administrator and builder, scholar and poet, and patron of art and letters. He was catholic in his approach and secular in outlook.

1, Ibid , p 124.
2. Ibid., p. 377.
3. Ibid p. 377.

nchatantra, have discarded original names, which have been replaced their Persian equivalents. But the original names have been used thfully in Abbâsi translation.

Though the significance of the Panchatantra in the folk-literature of the world is now being increasingly recognized, there is another important collection of stories which has, as yet, not received adequate recognition. Known as the Kathâsaritsâgara (The Ocean of Story), it still awaits the genius of a Burzoe to bring out its intrinsic worth. This task has been rendered difficult because its earliest and original version, The Brihatkathâ ( The Great-Story ), has been lost to us. It is, however, known to have about 700,000 stanzas, and was probably composed by Gunadhy in the Paishachi Prakrit during the third or fourth century It is interesting to note that the Brihatkathâ and its different versions are closely related to the Panchatantra. Dâsgupta writes. "The various important recensions of the Panchatantra have been classified into four main groups, which represent diversity of tradition but all of which emanate fr m the lost original. The first is the lost Pahlavi version from which were derived the old Syriac and Arabic versions, and it was through this source that the Panchatantra, in a somewhat modified form, was introduced into the fable literature of Europe. The second is a lost North-Western recension, from which the text was incorporated into the two North-Western (Kashmirian) Sanskrit versions of Gunadhya's Brihatkathâ. The third is the common lost source of the Kashmirian version entitled Tantrokhyayika, and of the two Jain versions, namely the Simplicior Text ... and the much amplified ornatior Text, called Panchakhyana. The fourth is similarly the common lost source of the Southern Panchatantra, the Nepalese version and the Bengâlî Hitopadesha,"[1]

Three abridged Sanskrit translations of the Brihatkathâ were now available. Two of these versions were translated in Kashmir. The Kashmir versions include a number of indigenous stories not found in the third version. It is obvious that these tales were not a part of the original work.

---

1. A History of Sanskrit Literature, Vol. I, pp. 88–90.

Mustafa Khāliqdād 'Abbāsī with the instruction that it should be translated, without any omission in the same order, so that the variations between the original and the various translations may became evident. So, according to the enjoining command, the first draft was translated in a plain and simple language. On hearing this translation whatever order is given by His Imperial Majesty, the Divine Caliph, with regard to omission, and addition, order of discourse, supplementing of extra chapters, philosophies, parables, stories, rare verses and other things will be carried out with the blessing of His Imperial Majesty, according to my ability and capacity."[1] It clearly shows that Akbar was not fully satisfied with Abu'l Faḍl's 'Iyār-i-Dānish, which was rendered earlier than the Persian Panchakhyāna, at the instance of Akbar himself.

It is difficult to state with certainty what Sanskrit text formed the basis of the translation in Persian. It is well known that Akbar was deeply interested in the religions and philosonhies of India. He had invited Sanskrit Pandits and Yogis to his court, as also Jain learned men. The presence of the last at the court has a bearing on the Panchatantra problems. It appears likely that the manuscript in Akbar's library was Jaina work, as is borne out by the title of 'Abbāsī's translations, Panchakhyana.

One of the distinctive features of the Panchakhyana is that it contains twentyone additional stories not found in the earlier editions of the Panchatantra. Keith writes, "A second Jain version was undertaken to please a minister, Soma, by a monk, Purmabhadra, in 1199 A. D. The work is marked by the appearance of twenty one new stories, including a famous one of the greatest animal and ingratitude of man, while from the Mahābrata hints are taken for the story of the pious and the hunter. Purnabhadra's version appears to rest in part on our Tantrakhyayika, In part on the prototype of the Simplicitor rather than on that text, and in part on some other unknown versions."[2] Besides, all the Persian translations of the

---

1. Panchakhyana, f. 4.
2. A History of Sanskrit Literature, p. 261.

Anwār-i-Suhaylī by Khusro Daraī, Ray-u-Brahman or versified Kalīlah and Dimnah by Jalan Bakhsh Jamharī. Dr. Indu Shekhar has recently translated the Panchatantra, edited by Edgerton,[1]

Hitopadesha, is a Sanskrit version of the Panchatantra, written in Bangal by Nārāyana, who is thought to have lived between 800 and 1373 under the patronnge of Dhavadachandra. It was translated into Persian with the name of Nigār-i-Dūnish and Mufarriḥu'l-Qulūb [2]. The latter Persian version was translated into Urdu in 1802 by Bahādur 'Alī Ḥusainī with the name of Akhlāq-i-Hindi and into Dakhanī in 1764-5 by Shaikh Muḥammad Yaḥyā Badari.

However, it is surprising that none of the writers, scholars and cataloguers, so far as my knowledge goes, has mentioned a very valuable Persian translation which has remained in oblivion. A new Persian translation named Panchakhyāna of this Sanskrit work by Muṣṭafā Khāliqdād 'Abbāsī, at the instance of Emperor Akbar, has been recently discovered by me. The only manuscript copy of this translation exists in the National Museum, New Delhi. [3]

In his preface to the translation, Muṣṭafā Khāliqdād 'Abbāsī tates that there were already several translations in existence. But he Persian renderings were not approved by the Emperor, for either hey did not maintain the order of the stories of the original or ontained variations, additions and commissions, and therefore, departd from the original, or their language and style were burdened with Arabic words and phrases. Akbar, who had already arranged for ranslations of a number of Sanskrit works, found in his library a anskrit manuscript of the Panchatantra and ordered 'Abbāsī to render t into Persian, which could be easily understood by readers.

'Abbāsī writes that when Akbar saw the original book, he felt that since this book has been translated from language to language— aturally it has deviated from the original—so it is appropriate that he book be translated afresh, and the work was assigned to

---

1. University Press. Tehran, 1961.
2. Nawalkishore Press, Lucknow, 1890.
3. Ms. No. 62. 1005.

is unable to understand the content."[1] And that is why he was assigned the task of rewriting the book. But Sir Denison Ross writes, "It is a fact that Naṣrullah's text abounds in Arabic quotations, but otherwise the style and language are exceedingly simple, while Kāshifī's text furnished an example of that rhetorical hyperbole and exaggerated metaphor which, though giving such pleasure to those who enjoy linguistic gymnastics and furnishing an admirable text-book for students of Persian language, is wearisome in the extreme for those who merely wish to read the stories for their sake."[2]

Faqīr Muḥammad Goyā, Muḥammad 'Alī Khān Waḥshī and Jān Bihārī Lāl Rāzi translated the Anwār-i-Suhaylī into Urdu. These translations are known as Būstān - i - Ḥikmat, ( 1835 ) Ḍiyā - i - Ḥikmat ( 1885 ) and Arzhang-i-Rāzī (1872) respectively. Mirzā Mahdī of Gayā (1850) also translated it into Urdu. One of the translations is called Muntakhabu'l Laṭāif. In Dakhani it was translated by Muḥammad Ibrāhīm Bījāpūrī and published by Fort St. George, Madras in 1844.

Abu'l Faḍl abridged the Kalīlah and Dimnah with the name of 'Iyār-i-Dānish. He says, that he was told by Emperor Akbar that though the Anwār-i-Suhaylī is better suited to the people than the Kalīlah and Dimnah ( of Naṣrullah ), it is still not free from Arabic expressions and (rare) metaphors. So it should be rewritten in a simple style so that it might become more generally useful, rejecting some of the (rare) words and avoiding long winded phrases."[3] But Sir Denison Ross says, "This version ( the 'Iyār-i-Dānish ) has, however, never enjoyed the same popularity as the Anwār-i-Suhaylī "[4] Shaikh Ḥafīz-u'ddīn Aḥmad translated half of the 'Iyār-i-Dāmish and named it Khirad Afroz [5]

Other Persian versions of the Panchatantra are Jāwīd-i-Dānish, Akhlāq-i-Asāsī, Gulshan Ārā by Mirzā Iranpūr, Shakaristān or versified

---

1. Anwar-i-Suhaylī p. 6.
2. The Ocean of Story. Vol. V. p. xiv.
3. Iyar-i-Danish, p. 8
4. The Ocean of Story, Vol. V. p. xxv.
5. Majlis-i-Taraqqi-i-Adab, Lahore has published its critical edition.

been lost to us, while the Arabic version has been translated into forty languages, and gets the credit of making the book so widely popular. Māmūn (813—833) loved it so much that he had kept it in his treasury. The Bermecides also got it versified so that it could be easily memorized. Faḍl Ibn Sahl, before embracing Islam, had said that he enjoyed the recitation of the Qur'ān in the same measure as that of Kalīlah and Dimnah.

Abu'l Faḍl Muḥammad Bal'amī ( d. 940 ) translated Ibnu'l Muqaffa's Arabic version into Persian prose, at the instance of the Samanid King, Naṣr Ibn Aḥmad, (913—942) The same ruler asked Rudakī (d. 940-41) to versify it. The original manuscripts of these versions were illustrated by the Chinese painters. The author of the Shāhnāmah-i-Abū Manṣūrī writes :—

"So Amīr Sa'id Nasr bin Ahmad listened to its contents He took such a fancy of the book that he asked his minister, Khwaja Balami, to translate it from Arabic into Persian...After that he ordered Rudaki to render it into Persian verse. The manuscripts (of these Persian versions) were subsequently illustrated by Chinese artists."[1] Unfortunately Rudakī's version is non-extant.

Later, Naṣrullah bin Muḥammad bin Abdu'l Ḥamīd Munshī translated the Arabic Kalīla wa Dimnah of Ibnu'l Muqaffa' into Persian (completed in 1144) and brought out its most popular version.

In the thirteenth century Baha'uddīn Aḥmad Ṭūsī versified the Kalīlā wa Dimnah in the Mutaqārib metre. It was dedicated to 'Izzu'ddīn Kaykāūs, who succeeded his father Kay Khusrau, in 1244-45. It was probably composed in 1221.

Ḥusain Wā'iẓ Kāshifī ( d. 1504-5 ) revised the prose version of Naṣrullah under the title of Anwār-i-Suhaylī ( The Lights of Canopus ), which became known in Europe through the translations of Eastwick (1854) and Wallaston (1877 & 1894). The author of the Anwār-i-Suhaylī after praising Naṣrullah for his book, says, "Owing to the use of queer words and lines, the reader cannot appreciate the object of the book and

1. Khirad - afroz, p. 40

But the credit for its wide popularity goes to Burzoe, the Irani physician who was a courtier of the Sassanian King Khusro Anushirwa ( 331-379 ). Penzer writes, "The importance of the Pahlavī and its de cendant is twofold. In the first place the Pahlavī is one of the olde versions known, and must have been translated from a very ancie Sanskrit text agreeing closely with the first Sanskrit original. In t second place it is the descendants of this version which have become familiar to us under such names as the Fables of Pīlpay, Kalīlah an Dimnah, Lights of Canopus, the Morall Philosaphie of Done etc."[1]

Naushīrwān ordained that some of the chapters of this book t treated as guide to those who carried on the administration of his en pire; and this system continued till the end of the reign of Yazdge (632—651). One of the spies in reply to Hurmuz's (272—273) questic said that Bahrâm Chūbīn, Bahram the Javelin, ( 590—591 ) spends h leisure hours in reading this book.

This book has been translated into Pahlavi, Syriac, Hebre Latin, Spanish, Tibetan, Greek, English, Russian, French, Italia Slavanic, Turkish, German, Polish, Hungarian, Hindī, Bengālī, Guj ratī, Marāthī, Brij-Bhāshā, Tamil, Telegu, Malay, Japanese, Ethiopia Chelha, Maduresе, Paischachi Prakrit, Kaunada, Madi, Siames Laotic, Balanse and other languages.

Ibnu'l Muqaffa' the Arabic translator of its Pahlavi version, wa put to death in 757 at the instance of the Abbasid Caliph, Mansū (754—775). He was an Iranian and his original name was Rūzbal while that of his father was Dazbah. It is said that he did not accep Islam sincerely, And further, he added the chapter on Burzoe t create doubts in the minds of credulous Muslims, in order to attrac them to Maniism. In addition, he mentioned the principal tenets o Buddhism through Burzoe.

The Arabic version of Ibnu'l Muqaffa' called Kalīlah wa Dimnal is important, because the Pahlavi and the original Sanskrit versions have

---

1. Ibid Vol. V. p. 218.

# PART I

The cultural edifice of a country is built on the bed-rock of its myths and folk-tales. The cultural traditions of Iran and India are some of the richest in the world and are linked together, not only because the two belong essentially to the same stock, but also because both have shared the same sources of sustenance. They have an invaluable treasure of folk-tales inherited from ancient times. They have not only provided nourishment to the towns and villages of Asia, but have helped in enriching the storehouse of the world. The Panchatantra is generally known as Kalīla wa Dimnah in Arabic and Persian. Karataka and Damanaka are the names of the two jackals in the first chapter. However it constitutes the most important link in this chain stretching across the time, and is a significant heritage for the peoples of the world through Iran and India. The stories of the Panchatantra are eternal and immortal, and are deep-rooted in our social order. These stories alongwith the game of chess were conveyed to Iran from India and in course of time enriched the literature of the world. It has influenced the Arabian Nights, Luqman's Fables, Siyāsatnāmah of Nizāmu'l Mulk Ṭūsī, Chahār Maqālah, Qābūs Nāmah, Marzbān Nāmah, the Mathnawī of Maulānā Jalālu'ddīn Rūmī, Gulistān, Bahāristān, Khāristān and a number of other works in the east and the west.

Edgerton says "Few books in the literature of the world have enjoyed such great popularity over so wide an area. It has penetrated practically all the literatures of Europe and Southern and Western Asia. It is known to exist in over 200 versions and translations in about 60 different languages and dialects, spreading from Java on the south-east to Iceland on the south-west."[1]

Penzer writes, "India is indeed, the home of story telling It is from here that the Persians learnt the art, and passed it on to the Arabians. From the Middle East the tales found their way to Constantinople and Venice, and finally appeared in the pages of Boccacio, Chaucer and La Fontaine. It was not until Benfey wrote his famous introduction to the Panchatantra that we began to realise what a great debt the Western tales owed to the East."[2]

---

1. The Panchatantra, p. 3
2. The Ocean of Story, Introduction, pp. xxxiv—xxxv.

**Khuda Bakhsh Annual Lectures 1975**

*Khuda Bakhsh Annual Lectures*
*are delivered every year*
*by an eminent scholar of*
*Persian, Arabic or Islamic*
*Studies.*

*Mr. Qazi Abdul Wadood,*
*Dr. Md. Zubair Siddiqui,*
*Prof. A. A. A. Fyzee,*
*Dr. Nazir Ahmad*
*were the forerunners*
*in the series to which*
*Dr. S. A. H. Abidi*
*contributed in 1975.*

*Khuda Bakhsh Annual Lectures Series —5*

# NDIA'S RICH AND VALUABLE CONTRIBUTION TO PERSIAN LITERATURE N THE LIGHT OF SOME RECENT DISCOVERIES

*by*

Prof. S. A. H. ABIDI

**Khuda Bakhsh Annual Lectures 1975**

*Khuda Bakhsh Annual Lectures*
*are delivered every year*
*by an eminent scholar of*
*Persian, Arabic or Islamic*
*Studies.*

*Mr. Qazi Abdul Wadood,*
*Dr. Md. Zubair Siddiqui,*
*Prof. A. A. A. Fyzee,*
*Dr. Nazir Ahmad*
*were the forerunners*
*in the series to which*
*Dr. S. A. H. Abidi*
*contributed in 1975.*

*Khuda Bakhsh Annual Lectures Series—5*

# INDIA'S RICH AND VALUABLE CONTRIBUTION TO PERSIAN LITERATURE IN THE LIGHT OF SOME RECENT DISCOVERIES

*by*
**Prof. S. A. H. ABIDI**

than to ponder on the Quranic vision of human conflicts a given in the verse :

> "To every one of you we have appointed a right way and open path. If Allah had willed, He would have made you one community but that He may try you in what befalls you. So push forward in good work; unto Allah shall you move back all together and He will let you know of that whereon you are at variance". *V - 48.*

indicative of divine presence. Even the seemingly inanimate stones are considered susceptible to divine influences. This means that Nature embraces the so-called inanimate layer. It is creation as a whole. Man's creation assumes a different status. The human soul is considered as coming into being when God breathes of His spirit into the human body. This means that the soul has a non-temporal dimension and it explains why the ultra-orthodox Ibn Hanbal considered the soul neither created our uncreated. In all considerations of religious questions it is necessary not to expect any final clarification. What matters is only to make man alert to an area of sensibility which cannot be fully rationalised.

Muslims have been often tempted to take a very static view of religion, and have failed to recognise that what is the straight path need not necessarily be a strait path where it is not possible to accommodate more than one perspective. Mohammad Iqbal observes: "The teaching of the Quran that life is a process of progressive creation necessitates that each generation, guided but unhampered by the work of its predecessors, should be permitted to solve its own problems"; and "Equipped with penetrative thought and fresh experience the world of Islam should courageously proceed to the work of reconstruction before them. This work of reconstruction, however, has a far more serious aspect than mere adjustment in modern conditions of life". (pp. 168-169). But their pre-occupation with issues which are not of capital importance have made Muslims uncompromising not only in inter-religious but also in their inter-Islamic dialogue where different sectarian positions are at issue. It is therefore necessary to find out what the minimum requirement is which entitles one to a place in the Islamic fold. And when the Quran invited the people of the Book not to stick to differences, but to come closer together on the basis of what it common to them, shall we not follow the same spirit of reconcilation and understanding ? Now the bare requirement of Islam in its metaphysical dimension is to uphold belief in the Creator who has created what he has created not in vain but with a meaning, and the belief in the mystery of *Ghaib*, the unknown and unknowable. It is the vision of man's life which does not come to a close on this planet but has a future which transcends all earthly futures.

In a pluralistic and multi-religious society one cannot do better

'hough of course the concept of a person in its linguistic refe-
ence is modern, its inner significance has always been assumed in
heistically oriented religions. My personal consciousness is disturbed
nd distracted continuously and my attention shows continuous fluc-
uation. In cases of split personality we are confronted with the most
riking demonstration of this inadequacy; but in God the personal cons-
iousness must remain undisturbed by sleep and slumber, as the Quran
ys, and is secure from any eclipse of consciousness An acute German
inker G Simmel* made an interesting observation that a person or, in
is language "Personality" in the human frame-work realises its full
eaning only inadequetely and it is only in God as an idea that it can
nd its fulfilment.

Psychologists have concentrated most on consciousness and on its
wer levels which are subsumed under the unconscious. But there may
higher levels of consciousness and it is possible that with the eclipse
normal consciousness some other avenues are made available to us.
e do not enter into any speculation at this moment, we are only
terested in the dialogircal relationship in the context of Quranic
nsciousness. God addresses man and man turns towards Him.
e concept of 'turning towards' ( *Ruju'* ) plays a crucial role in the
ranic consciousness It is the condition without which man cannot
en himself to divine communication. Man is left alone but he has
e capacity to break through his isolation. God's transcendence and
is immanence refer to two different ontological levels. Man prays and
every act of prayer he transcends his human limitation Now what
interesting to note is that man is at the same time the vicegerent of
d on earth and also a rebel. But it must be clearly understood
at his vicegerenc is only potential. It is for man to rise to that
tus by his own surrender and by assimilating to himself the attri-
tes of God. He mav play the part of a rebel or work in consonance
th the divine plan when he is honoured with the title of a co-helper.
is means that he cannot claim vicegerency as a fact; he has to attain
by his own acts and deeds. The Quran assigns a special place to
ture. Nature is not degraded to a creation which has no significance.
ery seemingly insignificant phenomenon of nature is considered a
inter to the divine. The constant transition in Nature is held to be

---

G. Simmel : Philosophische Kultur Die Personlichkeit Gottes (p.211)

inferred from his outward behaviour; and how his end will be is still more uncertain. This intimate contact of man with God finds expression in personal prayer (*Du'a*) which is different from public worship as well as from the performance of the scheduled form of worship, even though they may be performed alone and in private. Associated with this is the place of *Zikr* (*remembrance*) in the Islamic Programme of piety. Now it is time that we should look a little closer on the nature of *du'a* as a personal call, which evokes God's response and consider *Zikr*, which is the remembrance of God, without being restricted to any time or place.

There are two questions which have been raised with regard to *du'a*, both in the Islamic and the non-Islamic context. ome writers have given no credit to what they call petitionary prayers. It is assumed first of all that these petitions must remain ineffective; and secondly that it is not compatible with a truly religious perception. The question is not whether these petitions can be answered or not. The fact however remains that whatever our petition may be, we do consider as a matter of faith that all that happens in this world receives its sanction from a transempirical source. It is the belief in the involvement of the unseen in the affairs of the world that entitles these petitionary prayers a place in the religious scheme of things. Secondly, in the Islamic context God askes man to call Him in moments of crises and distress and assures him of His answer. Again, within the context of Islam itself, the question about the possibility of our prayers being answered has been raised. If what is to come is already recorded in the Preserved Tablet, how can then our prayers make any difference ? Here it is necessary to distinguish between the providential record of the future and our own address to God. *Du'a* as such is a part of a dialogue though one of the partners of the dialogues, that is the divine partner, is not perceptible at the normal level. The classical example of this dialogical relationship is offered in the case of the prophet Moses as the result of which he is designated *Kalim* ( the interlocutor ). No wonder, the Jewish philosopher Martin Buber has made dialogue the basis of religious consciousness Anyhow, apart from dialogue as a mystic experience in which God and man are involved, it has also a profound significance at the level of normal religious sensitivity. I address to God as "thou" and expect to hear from Him a response as a person. I cannot think of Him a person on my own level but a person nevertheless in so far as I cannot translate His relation to me by any category other than that of a person.

ts accent and emphasis. We should in this context pay special attent- on to the individual and collective dimension of Islam. Whether we onsider ourselves a part of the historically-determined organization which we identify as Islam or whether we recognise Islam as God's ddress to an individual as an individual in his singularity, both aspects nd a place in the Quranic perspective. Let us first take the collective spect which is specially evident in its rituals and rites. The most strik- ng phenomenon is Hajj or a pilgrimage to Ka'ba as incombent on every Muslim who can afford. This has always remained a unifying factor which demonstrates in a signal way the brotherhood which cuts across ot only ethnic and racial divisions but also divisions created by wealth nd power From the importance given to the community, priority accor- ed to congregational prayers naturally follows. Again, the economic ieasures like that of *Zakat* are recommended for the welfare of the ommunity to promote economic justice. The prohibition against intoxi- ints has also the interest of the collectivity in view. And last but not ie least is the idea of a state which rules on the basis of equal oppor- inities for all, consultations among themselves and preservation of the fe and property of its citizens. But this is only one aspect of Islam. here is another aspect without which the collective dimension of the lamic religion cannot have any significance. We may call it the existen- al dimension through which my experience as an individual who is orn alone and forlorn, given to dread and cares and projected to death, articulated. Now this individual with his I-am-ness cannot be exha- ited in what he does in his collective configuration. Society and the ate can judge him only from his outward behaviour and from its ipact on his fellowmen and on his own surroundings. His intentions, s thoughts, his motives, good or bad, are completely hidden from us. iychologically he may not be himself aware of his hidden motives. his is why it is said in the Quran that God only knows what passes in e mind of man. And this hiddenness of his inner life from the outward e makes him easily misunderstood and misjudged. Now this individual counter with God is completely taken into account in the Quranic rspective. It is categorically declared that, "no one bears the burden another" and "one's sins are not transmitted to others". Man in his timacy is responsible to God in His ultimacy. This is why there are rtain forms of our response to the divine which are not covered by ual prayer, and it may happen that inspite of our compliance with the heduled prescriptions of Islamic Law, we may be still far from enjoying e divine favour. What man's station with God is can never be

him to the divine order in time, the call to be steadfast in times of troubles and disillusionment constitute a world of their own, apart from legal prescriptions and sanctions. The Islamic pattern of the criminal and the civil law in our considerations should be completely isolated from our metaphysical and theological understanding of the Islamic vision of this world and of the Hereafter. Naturally our consideration of the historical assessment of the figures who have been mentioned in the Quran calls for a separate approach. It is clear that legal injunctions do not demand any allegorical explanation. They stand as they are. But the question arises whether they are meant as fixed orders or commandments which should find their application regardless of the geographical and historical context for all times to come. Do they not allow any restriction in their application and do they not represent at least partially a continuation of the attitudes and modes of behaviour which are found in the Old Testament as well as in pre-Islamic Arab usage? It cannot be doubted that though moral values have a permanent content, their expressions reflecting the sensitivities of every epoch vary from period to period of history. Unfortunately we do not care to distinguish between different levels of reality; and the moment some satement is supposed to be vouchsafed by revelation, we think it is settled once for all and there is nothing to be thought about. The moment revelation is related to the world of action and history, it cannot but accomodate itself to the situation of the given time. The whole question boils down to applicability. Not that the revelation is invalidated, but its applicability demands adjustment and reshifting of emphasis in different ways. Islamic thought cannot be considered rigid and stereotyped but, what Mohd. Iqbal called, the principle of movement in Islam must be kept preserved. Islam cannot be called a structure which is given to us readymade but a complex of tendencies and guiding principles whose development cannot be considered closed and penned down in all its details once for all. It is for the Muslims to re-think what has already been thought and to re-examine what has already been examined. To consider every thing settled once for all and leave everything to revelation which is given once for all is to fall a prey to that fallacy which Kant called the fallacy of the 'idle reason"; in other words, reason should stir itself and not allow itself to sleep when it is the time to think.

This means Islam is also a process and a movement. Like every thing in this world, it is not a structure which resists any shift in

of secularism and western theological acrobatics ? Alas, the spectacle of contemporary Islam is not merely one of stagnation but actually of regression when compared to the creativity, vitality and capacity of positive absorption and transformation which Islam exhibited in its golden age, Contemporary Islam seems to lapse more and more into fundamentalist orthodoxy, a phenomenon not unknown also in other religions but with the crucial difference that at the other end of its spectrum Islam lacks all genuinely modernizing dynamism. The essentially unmodern, but at least in its intentions modernizing 'modernism' of earlier modernists, seems to have spent itself before reaching the point of take-off into real modernity. Much apparent self-assertion of Islam is the product not of a genuinely religious awareness but of anti-Western affects and, not infrequently, of lip-service to Islam by those who are far removed from religion but for whom Muslim identification is a convenient idiom for Arabism or for Third World Militancy in general". Further he continues: "And at the other end of the scale, Islam inevitably becomes the object of a complex and involuted anti-Islamism The challenge of modernity is mighty and the resources of Islam may be exhausted. Or are these resources still untapped and awaiting release ? Between resurgent literalist Fundamentalism, anti-Western affects, nationalism and secularism, Islam will either disintegrate or turn into *Jinsiyah*, unless it can reassert itself as a *din-Allah* for s modern age". (pp. 81-82).

Will Islam rise to the occasion and belie the worst fears of the sceptic ? Will it be able to spring a surprise and demonstrate to the world that it has not expended its energies and exhausted its potentialities but has the power to give expression to its ethos in novel forms.

The possibility of understanding Islam requires that it should be understood at different levels, which in fact means that in the understanding of the Quran the difference of levels and, in consequence, variations in our approaches should not be neglected. The way we should look upon the statements about God is bound to be different from our approach in our understanding the destiny of man, his vocation in this world and his future in the next. Second is the ideational complex which emerges in relation to legal and moral aspects. The purely moral foundation must be distinguished from legal prescriptions. The kind of life that man is asked to lead depends on his moral stand in his relation to fellow beings. The kind of behaviour one is expected to cultivate in trials and tribulations, the response that is required of

time, or the creation of time itself, philosophical enquiry cannot go beyond considering them as Ideas which do not constitute knowledge but which can have only a regulative significance. This was indeed the position of Kant. Nor can religion pretend to give us the idea of creation or of the beginning and the end of the world as objects of knowledge but only as concerns of faith which can be understood at different levels. That the world is created out of nothing by God's creative command, by the fiat of his will, or the world was created in six days, albeit the measure with which days of God are measured is quite different, are not facts subject to rational inquiry. They are in fact not intended to offer us cosmology in the philosophical and scientific sense but only to take us to the borders of intelligbility so as to make us aware of the limits under which we can think at all. This does not mean that the idea of creation is meaningless or that the cosmological elements have no content but only that they are given in a language which must be interpretated in such a way that these ideas are not secularised and forfiet all reference to the transcendent but only to serve as pointers to the transcendent. Again, when we move down from the metaphysical level to the level of everyday life and consider religion in its legislative function, we come to a totally different level of understanding. There is no question of symbols and signs, pictorial representation or symbolic interpretation. when we deal with the matter-of-fact world of everyday life. Laws are enacted and social norms of behaviour and conduct towards one another are regulated through religious prescriptions. Here again it is neccssary to distinguish between its moral value content and its purely legal aspect. The moral content has a permanent feature whereas legislative infra-struoture must not fail to adapt itself to circumstances which were not foreseen. Hence it is necessary to distinguish the legal aspects from the moral aspects. But it must not be forgotten that the Islamic laws have come into being under certain contingent conditions. To consider them in isolation from these historical conditions is arbitrary. The geographical and historical compulsions cannot be overlooked and it is their inability to appreciate situational compulsions that leads even perceptive critics to raise disturbing questions. Prof, Werblowsky's remarks in his valuable book *Byond Tradition and Modernity* deserve to be pondered upon :

"Will Islam as a religion be able to proclaim the *Shahada* in a modern and most modern age, testifying against both western notions

combat whatever appears modernistic. Modernism as such is a neutral concept and all that is modern need not be anathema to the Muslim consciousness. If one pushes the attitudes which are supposed to stand for pristine Islam to the extreme, one will find it impossible to communicate with the outside world. And the severence of a dialogue with people of one's own Age cannot but lead to disasterous consequences. Let it be noted that what is called modernism is also a historical phenomenon, and in times to come, the so called modernism of today might lose its distinctive features and will be considered an outmoded way of life; and it may also happen that modes of life which are outmoded today might be revived. Indeed we are supposed to have entered a post-modern era. There is no need for a Muslim to be allergic to social modes. He may freely identify first the values which he considers Islamic, and articulate them in consonance with the local and historical context. This is tantamount to saying that a religion which claims universal validity can preserve its universality only by delocalising its earliest expression. We are therefore to pursue in all seriousness a re-examination not only of our theoretical foundation but also of our in-built attitudes and perspectives. De-mythologisation has its own limits; and symbolical interpretations need not be pushed so far as to strip religion of its substance. But we must consider delocalisation of the original religious pattern as a necessity which cannot be dispensed with.

Islamic consciousness must be open to new perspectives which emerge now and again in the course of human thought, and it is far from necessary to react violently against anything which might appear at first sight incompatible with our traditional understanding of Islam. It means that the knowledge gained through philosophical reflection and scientific inquiry should not be allowed to go waste. "Our duty", as Muhammad Iqbal rightly points out, "is carefully to watch the process of human thought, and to maintain an independent critical attitude towards it". (Lectures, Preface). Man's mind brings new insights and these insights might help greatly in understanding the metaphysical issues with which religion is concerned. Philosophy and science can never be substitutes for faith but can serve a most useful purpose in throwing some light on the existential issues with which religious consciousness is concerned. Philosophy and Science have their own limitation and they cannot pretend to come with readymade solutions. When question arises about the creation of the world or its beginning in

hand we are told "What is this life on this world except a deception", and on the other we are informed that "God has not created this world in sport and in falsehood but in truth". This means that this world is far from being an illusion, is a platform for human action, an apportunity for man to show his worth as man. we are told, is pledged to his action This takes man to a totally different perspective of life. It does neither allow a quietist posture which builds indifference towards the world and its obligations, nor such an exclusive concern for this world that all that serves not the worldly interest is considered of no account This is how the way of life which Quran cultivates is built and promoted. The Quran leaves open different options. It depends on the different stations of man in this life, on his vocation and interest to find which side must dominate. Needless to say that though every man's life will have one dominant accent, it cannot but allow different and sometimes conflicting demands to prevail in accordance with one's own station in life.

Needless to say Islam with its origin in revelation is like any other revealed religion, a religion of varied accents and nuances. It is interesting to note that when these accents are magnified or overemphasised, they assume a form which is called heretical or heterodox. But ironically enough even the orthodoxy, if by that is meant simply the majority opinion in a given community, is formed by an exclusive emphasis on certain accents and the neglect of other accents. If, for example, the forgiveness of God is taken to its extreme form, it may also develop a kind of antinomian tendencies, when any grave offence and violations of religious injunctions do not count much and God's forgiveness and mercy shelter all deviations from morality. This is how a movement, which was once a force to be reckoned with, can be explained. On the other hand if God's power as a strict judge is emphasised as was done with the Kharijites, the concept of a sinner who commits a grave sin is identified with that of the infidel who is subject to all the consequences to which the infidel is exposed. The "orthodox" standpoint, though it attempts to take a middle position has not maintained its balance in many tricky situations which beset the history of Islam. Many a Sufi like Mansur al-Hallaj was put to death and in the name of faith many deviations which may not appear to us grave were severely condemned. This means that a Muslim who lives in a pluralistic world and who is exposed to the challenges from all quarters cannot adopt a rigid dogmatic posture in an absolute sense and support ancient credal formulations with all kinds of sophistry. Nor can we

methods with which the man of science is familiar. To him what is not relevant to his world loses all significance. Any such belief which seeks to justify itself on a non-rational basis does not mean anything to him. A totally different attitude towards religion, no less negative, seeks to eliminate religion on the ground that it is the means of exploitation; and in history religion has been used to lull to sleep the expropriated masses. And hence it is not an innocuous pastime which can be allowed to go its own way but a most destructive weapon which should be fought against. The difficulty with both of these attitudes is the one that ignores its own limitations and tries to judge beliefs which are not liable to be subjected by their own nature to any scientific screening, Theologians who try to vindicate their stand by recourse to the recent revolution in physics can only derive a negative benefit. They cannot serve to vindicate any theological position for the simple reason that theological positions themselves vary from religion to religion; and any justification of a position which is specific to some religions as, for example, any preconceived idea of the after-life, cannot seek any decisive confirmation from scientific theories. Theologians have therefore to work in two different ways. First of all they have to see that their conclusions are really the basic and integral part of their religious system and that what is basic is only a broad idea which leaves many possibilities. The accretions which accumulate latter can claim only a historical and psychological relevance.

The view which tries to combat religion for its nefarious influence on the welfare of the masses makes it clear that, when religions are identified with what their spokemen as a part of the Establishment have said about it in any given period of time, no other conclusion is possible. Islam has always advocated the equality of man before God, has not considered this world and its goods as vanities which should be shunned at all costs, and has not looked down upon human values in any way. The world given to us is the creation of a merciful God. Man is free to enjoy its fruits within the prescribed limits, and the difference of the sexes, nations and languages is considered the signs of God through which we can become aware of Him. Man is asked to think and reflect and to do good in this life so that he may flourish in this life as well as enjoy a status in the life to come. The goods ( *hasanat* ) of this world are appreciated with only one reservation and that is they should not be considered as ends in themselves and should not be allowed to possess the human mind in such a way that what is transitory and passing becomes the ultimate end and man becomes negligent of the eternal. On the one

who bring Law (*sharia*) are distinguished from the prophets (*nabi*) who do not bring Law (*sharia*) and serve only as divine teachers. It is further assumed that the law changes from prophet to prophet, though the beliefs do not change. Here it is not my purpose to go into the question of the changeability or the adjustability of the Islamic law, a question which may be left to the jurists to decide. One cannot help feeling nevertheless that the status of *din* as constituted of beliefs which are quickened with faith (*iman*) is different from the status of the law which is subservient to *din*. Independent of the law there grows a tradition which in course of time may become an essential part of religion, and specific features of the religious life of Muslims may show independent development. Islam in different countries under the impact of different social conditions may yield to customs evoking vehement protests from one group and finding acceptance by another. To the puritanically minded, it may seem a grave innovation, even bordering on *shirk* in some cases to see the Muslim life showing non-Islamic influences. But unless these customs and usages blatantly betray Islam, it will be highly unrealistic to insist upon Muslim mode of life and social appearance to be completely modelled on the patterns of life which were peculiar to the companions of the Prophet. Today justifiably enough we are much worried to maintain our indentities as Muslims. But it must not be forgotten that Muslims in different conditions have also what may be called a subordinate indentity which distinguishes the Muslims of one country from another; and by the very fact that Muslims speak different languages, have different patterns of thought and different historical precedents, they developed an identity of their own of which Islam may be a dominant factor but which cannot be considered an exclusive determinant. At one time the resurgence of national consciousness was so great that Islam as much as it was identified wtth its Arab expression was put to a great test. In nations with highly developed national consciousness a resentment grew against their exploitation, be it linguistically, economically or politically, in the name of Islam. The history of Islamic people even today offers instructive examples of how the neglect of national and ethnic factors and the resentment born of it leads people to politieal alienation. It is therefore necessary to distinguish the negative factors which affect Islam and the factors which affect all religious attitudes. First among the factors which affect religion negatively is the non-verifiability of its beliefs. It is difficult for one who is nurtured in the purely scientific tradition to commit himself to a belief which cannot be sustained by

specifically exposed. The problem of a personal God, the God whom we address as 'Thou' and who proclaims Himself as 'I' is the concern of all theistically-oriented religious perspectives. It is the common feature of Semitic religiosity, Judaic, Christian and Islamic, to affirm a being who in the modern terminology is called the person. The concept of person, though of Greek origin, assumed a specifically religious dimension outside the Greek thought. Hence it is better if we do not speak so much of a person as a self who is conceived in analogy to the human self and attributed with the characteristics which are human, though in relation to God these qualities and attributes assume absolute significance. If God is called powerful or merciful or loving. He is considered as all-loving, all-merciful and stripped of finitude. Hence it is open to the charge of anthropomorphism. In other words all attempts to conceive God have been considered the projection of human self in the image of God. This is the whole thrust of the critique which is initiated by Feuerbach and followed in principle by Marx. It is not so much man who is created in the image of God as God who is created in the image of man. Hence the charge of anthropomorphism is directed not only against the Islamic perspective as such but against all theistically-oriented perspectives. However religions which have not developed any of the personalistic conceptions of God may not be subject to this charge; but, as religions, they no doubt entertain the idea of the supersensible and envisage the possibility of salvation in transcending the limitations of time and change. Indeed the whole idea of salvation may we called into question. Our attention is confined at present to the Islamic theistic perspective and hence we have to see whether this can be understood in a way which will not subject it to any tenable criticism. First of all there is the question of revelation, the transmission of God's message through an angelic medium. Again there is the question of the Law which the prophet as a legislator brings. Now the question may be pertinently asked whether '*Din*', which may be constituted of certain beliefs, such as the belief in the reckoning of men's deeds, has the same status with the Law which the prophet promulgates. These beliefs need not be construed as propositions to which the believer gives his assent. They become religiously relevant only when man's attitude to life is moulded through them, They are the part of his *Iman* or faith. *Din* is then constituted of beliefs and Faith. It is understood in the Islamic perspective that the prophet of Islam was not unique in being the prophet for the first time and that the few prophets mentioned in the Quran are exceeded far by the prophets who are not mentioned, and the prophets (*rasul*)

philosophical thought has not been taken into account in present-day Muslim polemics and apologetics. Philosophy, as now understood, has no pre-established position to which all philosophers must subscribe. Philosophy is an open enquiry and its conclusions are not conclusive. They are subject to corrections. Philosophy in its historical development is sustained by an imminent dialectic. However convinced the philosophers may be about the conclusions to which they had been led, there is no assurance that their conclusions will not be challenged anymore. Philosophy is now split into schools and trends and philosophers are free to adopt any position to which their own thinking might lead. Hence today no philosopher would necessarily subscribe to the doctrine that God's knowledge is confined to the particulars or that the world had no begining in time and that there is no personal immortality and that there is no resurrection. These questions lie outside the purview of philosophical enquiry as, to speak with Kant, they lie outside the sphere of possible experience. There is however no need to consider all metaphysical statements as nonsensical in as much as they are not verifiable or even falsifiable. It is for the theologians to develop their own ideas in consonance with their own level of understanding and try to see how far clarity can be brought out in questions which are not strictly subject to philosophical scrutiny but which nevertheless have a deep relevance for religious consciousness. What is primarily required is the necessity to leave room for more than one interpretation and answers which may seem apparently divergent from the classical answers need not involve a radical conflict with the accepted solutions and responses. This is especially true in questions like the freedom of will and predestination. There have been traditions which do not permit discussions on the nature of God and on free will. We cannot give any readymade solution to questions which will always disturb philosophical intellect and stir theological disputes and which continue to crop up anew whenever religious consciousness is agitated. But a new theology which is alert to the stand of the current discussion will not fail to take into account what has been said in recent thought and these recent approaches will stimulate religious thought to take a new look on questions of faith. Islam has one advantage in this respect. All its credal formulations are not official statements but only the declarations of recognised theologians. Hence they can not claim warrant in such a way that other alternative is excluded.

The challenges to which Islam has to respond include some which are common to all religions and there are some to which Islam is

estrangement between men. It is quite in keeping with this spirit that Quran calls the killing of an individual as the killing of the whole mankind, and the saving of one individual life from death as the saving of the whole of mankind. This shows clearly that the Quranic interest lies in what it calls helping God, which means to act in the spirit in which the creator created the world and brought order in what He created. Small wonder if whatever re-establishes harmony and order, be it the reconciliation of sworn enemies and the appearance of love between them, is taken as witness to the power and wisdom of God. Says the Quran, "If thou hast expended all that is in the earth, thou couldst not have attuned their hearts. Verily Allah is All-Might, All-Wisdom ( Quran, 8:63 ).

One of the problems which faces Islam today is how to dissociate itself from historical misconceptions. In the heyday of Islamic thought there was a bitter controversy going on between *Mutakallimin* on the one side and the "Philosophers" on the other. But it must not be forgotten that when al-Ghazzali raised the voice of protest in the name of orthodoxy against the philosophers he had to do with certain schools of philosophy as they developed under the impact of Greek thought. It is to the credit of Islamic theology that it did not deign to "baptise" Aristotle but stood very critical in relation to it. Greek thought has many features and is a many-sided phenomenon. There are in Plato, for example, wonderful insights which later found acceptance in the mystic circles. And it is the great merit of Aristotle that he formulated for the first time the problem of God. And Plato's ideas on immortality have a lasting significance. It is also to be noted that the Greek thought against which the Muslim theologians were fighting was not the pure Greek tradition but heavily-tinged with Neo-Platonism. The Greeks did not give any attention to the problem of human freedom and it is only through Christian influences that freedom which necessarily involves responsibility became crucial in ethical discussion. Hence the peripatetic philosophers like al-Kindi. al-Farabi, Ibn Sina and Ibn Rushd do not communicate an unadulterated Greek tradition but a Neo-Platonic version. This Muslim Aristotelianism had features which naturally provoked grear uneasiness in Muslim theology. Of these questions which troubled theological minds most was that of God's knowledge. Another issue which is also related to the first two basic questions was the problem of individual immortality. But unfortunately the changed climate of

We are now becoming more and more aware of man's historicity, thanks to the investigations of Dilthey, Heideggar, Jaspers and others. This means that man is a historical animal in a way in which other animals are not. He is conscious of his historicity. He is projected towards the future and the future moulds his present in a much more significant way than past does. Naturally in a purely religious context the future has also a meta-historical and a meta-temporal dimension. That we call here and now is considered in the context of a future which begins with the end of the space-time continuum and leads to reflections which are eschatoiogical. We are not indeed tempted to offer any speculations which go beyond the existential situations in which we are placed. The analysis of our existence will however remain very inadequate if we do not take into account the undisputed fact of the influence of the eschatological ideas on the believer's behaviour. Whether we accept future as future or whether what we call future has no meaning except in terms of the past makes great difference to us. The Quranic vision of man in his historicity, its description of religion in terms of history, requires ideas which transcend history, Following Kant we may as well call these ideas limiting concepts ( Grenz Begriffe ). In as much as the believer is in the world he is expected neither to be absorbed in the world nor to negate it. The world is the platform for action and as a platform of action it has ethical significance and as creation it is metaphysically-rooted. The signs of God are mirrored and reflected in the world and the world cannot be treated with contempt but with respect. In the *Surah* which is entitled "Luqman" the legendary seer counsels his son to walk on earth warily and bear himself with modesty. This means the world itself both as a historical phenomenon and as nature manifesting itself on the level of plant and animal life is a repository of mysteries. Every particle is a pointer, every event is meaningful. And man who occupies a privileged position in the universe must remember that this privilege he cannot claim by right but only by his own behaviour and conduct which must be supported by God's grace. The world as it is, can tempt man to forget himself, to forget his vocation and mission and even to rebel against God. What is this revolt ? This is nothing but alienation from his Source as a result of which he tries to "unmake" what God has made, to create disorder where God has established order, in short, to do all that which runs counter to the immanent teleology of the universe. It is, in other words, what the Quran calls *'fitna'* (mischief) which is sinister in consequences, which tries to bring about

held that he was not a Muslim, others maintained that he occupies a position between the faithful and the infidel. There was no unanimity among different schools of *Kalam* and each wing of the conflicting schools could seek support from tradition. But more serious were the differences in their understanding of the attributes of God which had a bodily reference If God sits on the throne and if a movement in space is attributed to God what should we make of it? While the Hanbalites and the Zahirites held to the letter of the Quran, other schools had to take recourse to interpretation in such a way as to eliminate the idea of bodily involvement. But even the literalists were forced to take a position which reduced the difference between them and their rivals. The literalists did not attribute to God a body like ours but only that the Quranic utterances should be taken as they are without asking how. They are unintelligible in human terms and they are to be taken amodally. In other words our discourse about God takes us to a totally different dimension and our words have a reference which defies human intelligibility. Seen deeper this means that whether they involve bodily references of psychic attribution, their meaning can not be sought in human terms or in terms of human intelligibility. If God is wroth His wrath has only an analogical character. It does not involve any disturbance in the Divine conciousness; and when it is said that He is pleased, it does not mean any transition in God's consciousness from one state to another.

With other great Semitic religions like Christianity and judaism, Islam is a religion with deep historical consciousness. First of all it places itself in the continuity of prophetic revelation, though the message is considered the last and the final one it does not really break the continuity. The Islamic revelation is embedded in history. Unfortunately in the average consciousness of a Muslim it is only the last word of God which he generally considers in isolation from the rest. The Quran refers to the prophets of old with great respect and considers the message of the last prophet as affiliated to the Abrahamic *Din.* The prophets of the old are held before the prophet of Islam as models and the Quran warns against any discrimination between them, though it is conceded that the prophets may have grades and ranks and they may have a heirarchy of their own. Bnt apart from this they all belong to a fraternity and any rejection of one amounts to the rejection of Islam as much. No one can miss the historical orientation of the Quranic revelation.

have already been envisaged and all their solutions have been determined before hand. The idea of perfection is to be understood in a more dynamic sense; it means perfection as the power of adaptability and the capacity to respond to all changing situations and historical challenges by the Quranic directives and principles. It does not refer to particulars as particulars are unpredictable. It does not mean that we have no space left for us to accommodate ourselves in the flux of history. Religion is a historical phenomenon, however metahistorical its roots and dynamism may be. History is change and process. This is not to deny that history has a metahistorical dimension and might in the last resort be determined by the inscrutable forces beyond the human Ken. Whilst the metaphysical dimension stands by itself and whilst it will be fatal to religion to reduce it to its historical determinants and consider them as decisive, we have to admit that even our understanding of this metahistorical aspect and the peculiar symbols and parables through which it finds expression requires both the psychological and historical conditions of a given epoch and people. Even the metaphysical and metahistorical dimension of a religion without which religion *per se* cannot be conceived, demands historical infra-structure. If we cannot grant to any credal interpretation, however deeply rooted in the sacred tradition any finality, how much more pressing will be the need of re-interpretation for what is eminently historical. No one doubts the value of tradition and it has to be respected at all costs. But in any reconstruction of Islamic thought it cannot be taken in its customary presentation without any reference to the situations which evoked it. The nature of the case is such that from the very earliest times traditions have been variously interpreted and the leading schools have diverged from one another even on issues which to those who stand outside the fold might appear to be of no material significance. It may be the principles on the basis of which these divergences have taken place might be concerned with concerns of crucial importance. The major schism in Islam has also been due to the divergences of interpretations and to their acceptance and non-acceptance of different traditions and to their appeal to different criteria of judgement. As we know from the theological debates that rocked Islam and which divided the theologians, the place of the sinner who has committed a grave sin figured prominently.[1] While the Kharijite

---

1. See Izutsu's work : The concept of Belief in Islamic Theology, New York 1980.

which always lurks and which has found deep resonance in history. That the national and local profile of a culture should not be submerged in the so-called universalism; that every local nuance should be respected and every national expression should be allowed its own freedom so long as it does not deviate from the basic principles, is the conviction which should be held tenaciously. But Islam, with its claim to Divine revelation, with its proclamation of its message as of Supernational relevance, cannot remain bound by any passing phase of its history and has to reckon as much with historical conditions as with its essential and basic intentions. If it is true that Islam being a historical phenomenon, its way of life and its structure have to be explained with reference to its historical origin, it is no less true that it has a super-historical mission. It is neither an Arab phenomenon nor a non-Arab outgrowth. It has to find out what is subject to change and growth and what is not. Muslims cannot be bound by traditional interpretation and ways of thought which were meaningful in a certain period of history but have lost their relevance today, Western scholars often tend to explain Islam as a desert manifestation which suddenly sprouted in a far off corner of the world and soon lost its momentum. Muslims have become more and more chained to the past and over-awed by tradition; they refuse to see that there can be alternatives and different possibilities. All questions, economical and social, have a historical conditioning and require solutions in consonance with the shifting situations of history. We should not adopt any extreme course and think of solutions in terms of either-or. We should not blindly follow what passes as modern, or stick to tradition where it is not compatible with the changed situations. We should be equally averse to reject anything modern simply because it has no precedent in the past. We should not forget that our knowledge of the past is historically conditioned and transmitted in an indirect way to us, The understanding of Islam by our ancesters had no obligatory character; and, as long as we remian loyal to its me aphysical moorings and remain faithful to the religious spirit we need not feel guilty of any betrayal. There is no reason why we should stick to the solutions which were proffered to us by scholars whose memory of course we must dearly cherish but whose judgement we need not accept.

All that Islam is and can be is not exhausted in one stretch of time It is misunderstanding to think of the Quranic declaration that God has perfected Islam to mean that all concrete situations of life

Abdullah, a solitary orphan in the wilderness of Arabia, an Arab who broke through the narrow confines of his Arab origin and who taught his community to look beyond their ethnic loyalties and family allegiance. His call forced them to look to supra-national and supra-ethnic goals and to transcend their Arab affiliation. They made to realise that its Arab accent was only a historical necessity and nothing more. When occidental scholars write about the Prophet of Islam they forget that Muhammed is not only a historical figure but an experience which is always kept alive in the beliefs of the believers. As experience, he never ceases to work and influence the beliefs which again become the part of the living tradition. The so called facts which History gives are often too fragmentary to serve as faithful records of what happend. They are transmitted in the language and the imagination of the transmitters and interpreted today by worldly-orientated minds. They make sense only when they are looked with reference to the historical figure as he is experienced to day and who has assumed a meta-historical significance in the changing situations of the Muslim experience of history. Islam may be considered a living history, a present which is quickened with the past. Islam is both a fact, a haunting presence, and at the same time a requirement, a challenge. The critics of Islam speak glibly of challenges that Islam has to face but Islam itself appeared as a challenge which the world had to face. That the Word of God should be ruled effectively in life, that history should not move erratically but should be controlled and guided by Islamic norms and values is the conviction which permeates the Islamic outlook. Islam stands for wholeness, for a life which drifts not in stereotyped patterns but which moves creatively. It is wrong to think of creativity and traditionalism as excluding one another. Islam's history shows that when traditionalism and creativity exclude and mutually negate, the Islamic accent is lost. Islam is not uniformity. Is is not indifferent to historical requirements and negligent of empirical demands. Islamic history shows that at all moments Islam was confronted with two significant challenges. One is the threat which comes of the view that the Islamic pattern through which Islamic spirit can be expressed is fixed once for all and any other pattern is the betayal of Islam. The other is the inability to distinguish between what matters and what does not matter. The peripheral issues assume the form of dogmatic exclusiveness; and, when the Islamic and non-Islamic values are discriminated on this basis Islam loses it creativity. This is a danger

## Islam : Problems and Prospects

Islam is nothing if not a global manifestation and all attempts to localize Islam or to understand it from a parochial and regional angle are doomed to fail. Consequently every attempt to see Islam from the standpoint of a particular culture and consider the challenges that face Islam in a specified geographical area and in a certain historical milieu is apt to be very misleading. Most of the Western scholars are prone to consider Islam as an Arab phenomenon, and, to the Arabs it might even appear as self-evident to see in Islam the manifestation of Arab genius and to respond to it in terms of its own ethnic conditions. Nor can we ignore the inveterate proclivity of Muslims, be they Arabs, or non-Arabs to consider all that makes for progress already latent in Islam's first manifestation in the primitive conditions of the desert, and to almost identify what is non-Islamic with what is non-Arab. It is equally amazing to see the Muslims of non-Arab areas essaying hard to find in their current problems a recapitulation of their early history of Islam on the Arab soil and to ignore the problems which have a new dimension. No one can deny the Arab origin of Islam, and, the neglect of the historical conditioning of religion is apt to confuse what is universally relevant with what is historically conditioned. There is another danger to which a study of religions might become an easy prey. The idea of historical conditioning might seem to involve the elimination and exclusion of universality and to transform the religion whose message transcends national and ethnic barrier into a marvel of national genius. The prophet of Islam might then appear as a national hero who forged unity in the warring Arab tribes and who, even according to one resourcefnl writer, used religious myths to a minimum for fostering economic and social goals. On the other hand a fundamentalist approach has gained ground and it is thought that the first expression of Islam is its exhaustive expression and its first politico-social manifestation is the final one and its later manifestation in history can be judged by the patterns which were already set and new patterns can claim legitimacy only so far as they approximate to their primitive manifestation. But all these one-sided and exclussive views can hardly be expected to do justice to the rich and inexhaustible phenomenon which we call Islam and whose foundation was laid by that charismatic genius Muhammad bin

told, "what is this world but the play and deception." How are we to understand these seemingly contradictory postures. We have first to take into account the world as the totality of creation. It is not as if to pass away time that God created the world. The world as creation is always oriented towards God. Every particle of the world has a significance of its own, though we may not be aware of its significance. In the second declaration of the world as play and deception it really refers to the human world where we do not know whether what we consider success does not really portend failure, whether the persons whom we regard as friends will not betray us in the long run, whether those who are nearest and dearest to us would not finally let us down, and whether all the gains that we have earned would not finally disappear in smoke. This is the essence of the Quranic approach to the world at different levels. What amounts to total denunciation is with reference to worldliness, our constant occupation with the world to the exclusion of all that does not belong to mundane interest. This means again that the Quranic attitudes have a reference which is relative to a given context, and, the moment we lose contact with the context, we are apt to misunderstand the spirit of the Quran. This means again that the Quranic vision of the world has different frames of reference and the trouble arises when we ascribe to historical contingencies an absolute character and eternalise the temporal.

—:0:—

of the world as a human world inhabited by human persons; third, our understanding of the world as worldliness. As regards the world as nature it is not degraded to a secondary status, explained away as illusion. It is the creation of God and, as creation of God, it is full of mysteries and pointers. In fact, man's attention is directed towards God through the contemplation of Nature and through the marvels that it holds. Even the seemingly insignificant happenings in nature, the sprouting of leaves, rains which infuse life into the soil, the constant transition of seasons, are given attention. Nay, even the aesthetic aspect of nature is no less taken into account. The shepherds returning from the fields bring delight to the eyes. In other words, nature in all its phases is appreciated as God's work. Nature includes also animal life and animals though given seemingly subordinate role, enjoy a place in the divine order. What is more, it is said categorically, "There is not an animal on the earth, nor a flying creature flying on two wings but they are peoples like unto you." (VI, 38)

As regards the world which is considered in the context of social relationship between man and man, in other words, the human world occupies a privileged place, as no doubt it is to the human world that the message is addressed. This means that man in his dealings with other human beings occupies special attention. Men are distinguished between those who respond to the call of God and those who do not. In other words the human kind is distinguished by the fact that all its actions are liable to be questioned and man stands responsible to what he does. God and man stand in a special relationship. Again, there is the problem of the worldliness, the Quranic attitude to worldly values as secular ends. Strictly speaking, there is nothing exclusively secular in the Quranic perspective and everything is related to God directly or indirectly. But we may distinguish for conceptual clarification, the goals which are God-oriented from the goals which are allowed to man for his relaxation. Any occupation with leisure, any distraction which allows man to while away time, any sport or entertainment with which he occupies himself have a place of their own. These activities can be questioned only when they violate any basic principle. In fact it is necessary not to take an all too rigid a view with regard to what we may consider from purely puritanic stand-point as not worthy of occupation. The Quran is explicit on the question whether the world was created for nothing or whether it has a purpose of its own: "We have not created the world in sport, nor in falsehood but in truth". But at the same time we are

but they work at a different level. Man is tuned to the world unseen while remaining himself in the world given to him. The whole spirit of the Quran and Islam is to infuse the air of other-worldliness in man's worldly involvement, The congregational *Surah* hints at it in a very subtle way. The believer is asked not to get distracted by the noise and din of the world, but to gather himself for prayer, on completing which he can go his own way seeking the bounty of Allah. Thus Islam swings in a constant movement between this world and that. When the wordly goods are considered gratuitous favours, they assume an other-worldly dimension. Both, the scheduled prayer and the frequent remembrance of God, have their function to serve. The scheduled prayers are meant to ward man from neglect whereas the remembrance of God is meant to sustain his contact with God without interruption. No doubt in one sense God is with us, whether we think of Him or not, but in another sense His being with us assume a deeper meaning when we are aware of it. Man's consciousness of His presence transforms his life and as the Quran says, from Allah we are and unto Allah we move back. The Quranic world perspective is highly significant. The Quran does not enjoin a way of life which few can follow but envisages different grades in which our response to God can be understood. Corresponding to this graded response the station of man is also marked in the life hereafter. If there are persons who remember God in the watches of the night, who seek His forgiveness in the early morning, whose hearts quake at the mention of the word of God, there are still others who could only faintly approximate to the high station. Hence in the life hereafter three categories are mentioned, the one to the left who have fulfilled their mission in life, the one to the right who have responded to the call of God to the best of their abliities and the outstrippers ( *ahiqun-al-sabiqun*) who have attained a high station by their excessive zeal in their compliance with God's will this means that even those who have erred cannot have the same status. The worst of those who have erred and those who are assigned the lowest rank in God's judgement, are the *Munafiqun*, the hypocrites and dissemblers with deceptive appearances.

Now we shall see what the Quranic attitude is towards the world as it is with all evils and goods, the world as it is lived by the human person. In other words, let us look a little closer at the Quranic world consciousness. First we must make a few useful distinctions. One is our understanding of the world as nature; second, our understanding

orientation towards God, the awakening in man of God's consciousness and in considering God as the one without whose guidance man cannot prosper. We cannot fare well in this world unless we fare well with God. God is man's constant frame of reference Between two poles of Muslim religiosity, the legislative and the God-oriented behaviour, the life of a Muslim must develop. Now in seemingly exterior commands about his own scheduled worship and about his dealings with others, a deep i wards reli iosity is involved. For example, the prayer five times a day might appear a mechanical routine not only to outsiders but also to Muslims who have been alieniated from their source. The same prayer indeed can be performed as a stereotyped routine without any relation to its content and meaning and it can be performed as a deep religious experience when the performer feels himself standing before God in His presence. On being asked what righteousness (*Ihsan*) is, the Prophet is said to have declared: "Serving Allah as if He were before thy eyes: For if thou seest Him not, He seeth thee".[1] Every word and every verse which he recite, he feels them in their depth. Not only the scheduled prayer but even the different ways in which God is named can provoke deep religious experience in some, while to others they cannot be more than sounds signifying nothing. Hence the name of God is more often than not repeated 'in vain'. The words 'Allah-o Akbar', God is greater, when they rang through the mouths of those who really believed in them, shook the world to its foundation; and the same words when they are repeated in a different context create nothing but mischief. This means that the seeming externality of the Quranic attitudes depends on those through whom the uranic message and mission are proclaimed. The Quranic attitude leaves no doubt in this regard. If the change in the direction of the prayer is announced, it is clearly declared that what matters is piety and it does not matter much which way you turn; and with no less force it is declared that "withersoever you turn there is the visage of God". The same holds good for animal sacrifice. Though animal sacrifice has a place in Islamic ritualism, it is clearly declared that what reaches God is not the blood and the flesh but the piety of the believer. This means that so called external practices receive their value from the experiential and existential content. The same consideration is applied to other practices like that of fasting. They do not aim at discipline in a proper sense

---

1 **A.J. Wensinck : The Muslim Creed, p. 23**

'creature'. In other words, it is man's creatureliness which finds expression through this idea. And interestingly enough he has made relevant references to Islam in this context. Naturally he speaks as a Christian theologian, but the point is that he goes to the core of the problem. Otto's references to St. Paul are relevant enough to make us understand that the idea of predestination which is imputed to Islam is not an exclusively Islamic prerogative but is a constituent of religious consciousness as such. St. Paul says of God that "he hath mercy on whom he will, and whom he will he hardeneth". (Paul, Romans, 9, 18). And again referring to those who question God's will he says: "Nay but, O man; who art thou that repliest against God? Shall the thing formed say to him that formed it, why did't thou make me thus?" (Paul, Romans, 9, 20). This is the rsason why the *Mu'tazilah* went one way and their opponents went another. The *Mu'tazilah*, who have been called rationalists in Islam, insisted on the unity and justice of God and they were called men of unity and justice. For them any punishment which one does not deserve by his action is unjust, and God being just does not inflict on man an unjust punishment. In other words He cannot act unjustly. The *Asha'i ah*, on the other hand, thought that this would amount to an interference in God's power and they maintained that God has power to reward the wicked and to punish the just. But the question is to distinguish between what He does hypothetically and what He does factually. Hence what is needed is not to offer solution but to maintain balance in conflicting positions and to allow both the thesis and the anti-thesis some justification and not to exclude the one at the expense of the other. These questions are really challenges to human thought and we know that they have not fared better when the perspective completely changed and when the approach to these problems lost all contact with religion and completely rational solutions were attempted. A man like Kant considers freedom an Idea of the practical reason and does not ascribe to it more than a regulative significance.

The Quranic moments can be considered at different levels, though unfortunately the level which is at the lowest is given often questionable priority. No wonder then in the Western account of Islam the legislative aspect invites most attention. In other words the *Shari'ah* both in its civil and penal aspects seems to characterise Islam exhaustively. Needless to say that the juristic dimension is not the exclusive concern of the Quran. What it is most concerned with is

again there are different options open and only one option is excluded and this is to say that the world beyond cannot be held to be a replica of this world. The theological reconstruction should aim at semantic clarification.. But apart from this there are metaphysical problems in the strict sense which defy rational penetration and in consequence do not allow any solution about which consensus can be attained The problem which calls for deeper study in the Islamic context relates to the freedom of man. Traditionally the freedom of will is presented in a way which is tantamount to denying it and the advocates of different conflicting views resort to the Quranic verses in their support The problem of the freedom of will is closely linked with that of predestination, and there are, no doubt, Quranic verses which seem to support the predestination of man. But, again, there are verses which speak clearly for the freedom of man. The whole concept of reckoning is based on human responsibility and accountability and man's ability to do good and evil. The Quran of course is not a philosophical treatise but a revealed scripture which can only be understood if we are sensitive enough to take into account the dialectical structure of its perspective. The thesis and anti-thesis are not resolved but are allowed to remain open for man to reflect upon and to acknowledge that freedom and determinism are part and parcel of human reality. That I am not all in all, that my intentions and their fulfilment are not bound together with necessity but that a gulf lies between the idea and its fulfilment, is to be recognised. The Quran insists, on the one hand, that man is pledged to his actions, that God does not allow any oppression against him, and that He is all just and the best of all judges *(Khair al-Hakimin)*. On the other hand it seems as if man is completely in the hands of God. He leads astray whomso He wills and leads to truth whomso He wills. This means that man has different dimensions and God's dealings with man can be understood in two ways: in a rational way when we insist on man's freedom, and in an irrational way when we recognise man's complete dependence on God's will.

Rudolf Otto, with his acute observations on the idea of predestination, has indeed cleared some misunderstandings.[1] He has justly pointed out that this idea of predestination is primarily based on religious intuition and has its roots in one's awareness of being a

1. Rudolf Otto: The Idea of the Holy, Engl. Trans. New York, 1958, p 90.

In the history of Muslim theological thought, however, such intriguing problems like freedom of will, predestination, the attributes of God, different positions have evoked different responses. Whilst the *Asha'irah* position has been considered 'orthodox' the *Mu'tazilah* position has been held suspect. Even the *Asha'irah* position has not found favour with the so called ultra-orthodox Hanbalites who find any deviation from the literarist interpretation condemnable and prefer to impute to God all corporeal attributes as they are, but without asking how, amodally. In fact it is necessary now not to be misled by history and not to think that Islamic thought has been closed once for all, but to rethink and reformulate; the old disputes and the controversies which have no relevance today need to be shelved in the interest of the genuine philosophical and theological awareness.

What are then the main philosophical issues which all theistically-oriented religions as Islam have to deal with. The main thrust of the Quranic revelation is centered on the presence of God, His unity and attributes. It is for the theology of the future to consider the problem of God in the context of the recent debates. It must not be forgotten that for authentic religious consciousness God is not a problem at all, and when it becomes a part of a creed it is almost blasphemous to talk of God as a problem. The Quranic revelation of course tries to awaken the consciousness of God through certain lines of thought which appear as arguments. But they are not arguments in any sense of traditional logic. Suffice it to say here that though God can not be considered a problem for faith, it is to be considered a problem when doubts assail the believer. It is only in one's confrontation with the non-believer or the sceptic that the problem arises and the *Kalam* has to take it into account. Again. the revelation speaks a language which smacks of anthropomorphism and it is to be made clear how far analogical statements can be made about God. Thus the old controversy about the relation between God's essence and His attributes is to be reconsidered, as well as the old problem of the nature of creation, the place of suffering and evil, in short the problem of theodicy. The other problem that haunts mankind is the problem of posthumous existence. Here again different options are open and for each option verses of the Quran and the traditions may be forwarded. Assuming that there is a life beyond, what kind of a life it could be. The Quranic descriptions might be deemed by some to be very sensuous and as such not compatible with the world which is supposed to transcend the senses completely. Here

awareness, and when music and poetry conjoin, they become effective even more. No wonder that in Sufi circles music and poetry played a major role and there is great truth in Schopenhauer's assingning to music above all the function of delivering man from the anguish of desires and of the will to live. This means that apart from morality there are also other avenues through which the unconditional can be hinted at, though certainly in moral conciousness it comes to conceptual clarity. In our Islamic experience the recitation of the Quran subserves a role which is akin to artistic experience, albeit by its very nature it has not that ambiguity which always haunts art where the transition from the sensible to the super-sensible may not find unambiguous response. A poem of Hafiz, for instance, can be interpretated in both ways and controversies continue to persist whether a piece of poetry should be interpretated only allegorically or mystically; whereas in the Quran even the most mundane references have a religious orientation.

Now it is for the Muslims not to make their interpretations so rigid as to exclude all possibilities and to allow only one explanation as legitimate. It may be noted that in Islam there is no orthodoxy and apart from the basic tenets which are considered by all as part and parcel of Islamic conciousness, there is no authoritative formulation of the creed, *Aqidah*, through Councils as happened with the Christian Church. The statements included in the creeds[1] have more or less a personal note and as such attributed to Muslim divines like Abu Hanifa and Nasafi. They can not claim finality.

The theses embodied in the creeds which have been influencial in Sunni Islam as that of *Fiqh Akbar* in its different versions and the *Wasiyyat* Abu Hanifa do not so much breathe the spirit of Islam as reflect the intellectual milieu of the time and the sectarian conflicts. These creeds not only cover theses of theological relevance as for example the definition of faith, the uncreatedness of the Word of God or predestination but also make much of questions which cannot be considered by any stretch of im gination to be constituent of the Islamic cosnciousness. They are as much concerned with the relative precedence of the companions of the Prophet as with the possibility of the vision of God in the Hereafter. All levels of thoughts, from the metaphysical to the ritualistic, are jumbled together. It is to be observed that the metaphysically-loaded parts of the creed do not leave any room for flexibility.

1. A.J. Wensinck : The Muslim Creed, 1965.

are discriminated from the bad deeds, or the '*Kursi*' or '*Arsh*' which is the throne of God. All these references indicate a symbolical connotation which can only be understood in their trans-empirical reference and any attempt to translate them in the secular terms distorts the original intention. Again there are graphic descriptions of Heaven and Hell and Judgement which also require an interpretation in conformity with one's own level of understanding. They do not refer to facts as given in our finite experience but to totally different conditions where the requirements of this world do not obtain. To say this is not to deny the world beyond, but only to say that it cannot be translated in finite terms, in terms of time and space as known to us. Hence the only way through which they may be made accessible to us is through analogy The Christian schoolmen, specially St. Thomas, rightly emphasised the role of analogy in our understanding of God and His attributes, as God's being is not what we understand of being in our experience. This is the main thrust of his concept of *analogia entis*. Muslim theologians in their discussion of attributes have also hinted at the difficulties which follow if we ascribe to God attributes and if we do not ascribe to Him any attribute; and they also took great pains to distinguish between what they call *tashbih* and *tanzih*, between imputing to God any human attributes analogically and denying all human attributes unconditionally. This is indeed a problem which troubles all theistic thinking.

Whether we resort to metaphorical or symbolical interpretation or whether we introduce analogy to explain the transcendental data, and try to suppress the temptation to impute to God and the transcendental world attributes which are borrowed from our own experience univocally, these explanations have their limits and they cannot convey any information or knowledge which is not empirically accessible to us. Our categories of thought are applicable only to possible experience and lose their validity beyond. If the literarist's explanation fails, it does not mean that the facts and superfacts, which they refer to, have lost their meaning. Religion has rightly made use of different means to convey its meaning and, of them, art has been the most effective. Poetry, Music and painting and every expression of art do not simply entertain us; they enable us to transcend the senses through the senses. Hence it is not only through our consciousness of the categorical obligation in the moral situation that we confront the super-sensible. Music, above all, can rouse in us this super-sensible

historical nature involving names transmitted through religious tradi tion as that of Abraham and the sacrifice of his son, the founding o *Ka'ba* and various incidents in which prophets of yore are involved They are of course not metahistorical in the sense in which the for mer examples certainly are. But they are not historical in the sens in which history which unrolls before our eyes is. The ambiguit and doubts about them are not born by lack of evidence, by conflict ing accounts relating to them, but by lack of understanding for th purpose they are meant to serve. They are not used to serve a historical purpose but a metahistorical, however clearly embedded in human history they may appear to be. Consequently any charge of deviation from history has no sense; it is the tradition which must count, and, in the Islamic context, it is the Muslim tradition which must be given the last say.

But the situation becomes different so far as empirical sciences are concerned, and so far as they treat empirical data. No one will question the occasional references to natural events on the basis of their non-conformity with the knowledge which is gained through the empirical data. Current pre-scientific ideas are used to serve a purpose other than the scientific: whether the Heavens are seven or whether the account of the creation of the world has any scientific legitimacy, is not the question; they have relevance only in a symbolic frame of reference. In questions of scientific knowledge, tradition can not decide and the 'facts' that they refer to in the Quranic context have no empirical significance but transcendental indication. "The days" referred to have no place in our temporal scheme but allude to a different order of time. Hence religious hermeneutics should reassess the semantic equipment of a given time. If God is referred to as placing His hands on the believers in the historical pact which was concluded, what is intended is conveyed through a language which on the face of it does not require any literary interpretation. When in ordinary commerce we do not accept such expressions in the literal sense, there is no need to question any interpretation as deviation from literary usage Metaphorical expressions are part and parcel of all languages. But apart from metaphorical expressions we meet with symbols which demand no conceptual interpretation but assume sensitivity to religious language in its symbolical function. This is the case, for example, with the Book in which man's deeds are recorded or with the Prescribed Tablet or with the Balance in which the deeds are weighed and the good deeds

and they may give expression to two different perspectives and approaches. We can not opt for the one as against the other on historical grounds. In neither case it is history. History does not begin with Adam but only with his children and Adam as a metahistorical figure has nothing to fear from evolutionary or other scientific or pseudo-scientific theories. His is a metahistorical figure and only through faith can we understand what he is. The whole trouble begins when we try to apply human criteria based on our empirical experience to situations which completely transcend this experience. Hence even in situations which involve history we must understand what this history is. It does not claim to be a record given by the contemporary witnesses but only records which are transmitted through revelation. We can dispute these records only when we have other records which carry the warrant of unimpeachable testimony. It has taken quite a long time for man to understand that scientific allusions in religious scriptures have nothing in common with our own scientific knowledge, and if they seem at any moment to be justified by new scientific knowledge this can not be taken as an instance through which the religious truths can be verified. The astronomical picture of the universe has changed, the biological picture of man is constantly subject to change, while what religion presents has an existential relevance which cannot be affected by the shifting situations of scientific knowledge. If Islam speaks of creation or if it speaks of the Fall of Adam and his temptation by Satan or the Covenant which has been made in pre-eternity, they are just symbols to mark God's dealings with man in a language which is itself a challenge to human understanding. Its sense must vary according to one's own level of insight. There is no question of rejecting them outright as having lost their relevance with the development of scientific knowledge; they stand unaffected in the religious perspective. They are not intended to give us information but only to awaken religious consciousness to mysteries which defy rational clarification. Their seeming ambiguity is itself a significant part of the religious situation.

Now, we have to deal with different levels of understanding corresponding to different levels of reality. On the one hand there is reference to the metahistorical situations which on the face of them clearly speak of their non-historical origin. We can count among them the 'incidents' to which we referred, like that of man's covenant of pre-eternity. On the lower level there are events of seemingl

narration is the conception of a primitive state in which man is practically unrelated to his environment and consequently does not feel the sting of human wants, the birth of which alone marks the beginning of human culture.[1] No de-mythologisation can be illowed to strip religion of its mystery and of its transcendental refe-ence. The historical critique which has been so much in vogue has ts own limitations. This is very much clear in the Christian context. Any hope to present the figure of Christ in a much more satisfactory vay through history and in a way which would replace the Christ of aith has failed. We can of course learn much from history which is upported by archaeology, and empirical sciences can throw much ight on the persons and the incidents which figure in the scriptures. lut history as recorded in the scriptures has a totally different funcon. It is not meant as an end in itself but is used to serve another urpose: to awaken man's consciousness of the divine involvement ı history, to show man in different situations both in his submission ) the Will of God, his *Islam*, and more often than not in his betrayal f the divine purpose, his *Kufr*, and has a consequence in his being ıbjected to penalties which follow from his betrayal. No doubt ·eat credit must be given to historical research in its attempts to ıravel many problems. But, as it often happens, historical research ınnot take us beyond vague probabilities and the results are consntly questioned by new findings. It is, therefore, quite understandable hy Muslims have not responded enthusiastically to the so-called igher Criticism. It is also clear why any departure in the Quran om the anecdotes and stories which are common to the Bible and e Quran does not allow any negative assessment. If it is a departure, is not a departure from any events which we know to have happened r certain, but only from the text which can not itself claim to be an thentic historical record. Ibrahim, Ishaq or Ismail as they appear in the ıran must be taken in the Quranic context without any attempt to duce them into Biblical figures The figures in the Quran appear a meaningful context: they have a Quranic relevance and they should understood with reference to the traditions which are prevalant a given religion. There is no question of history in either case. classical example is the birth of Adam as the first man and his Fall e to temptation. The way the Bible relates this story and the way Quran takes it into account shows many interesting differences

---

'he Reconstruction of Religious Thought in Islam, Delhi, 1974, pp.84-85

Now the great problem which besets Islamic consciousness is its equivocal response to modern challenge. Religion as such is confronted with negative forces and Islam is no exception. But the negative forces, if closely examined, may not be completely negative or destructive. However our response to these forces is generally no less negative No trouble is taken to detect their true significance. One has to know primarily the main thrust of these forces, whether they have developed on some misunderstanding of the religious position or whether they are hostile to a specific religious position or whether they are uncompromisingly anti-religious, no matter what the level of religious position might be. This is specially true about eschatological problems, the nature of heaven and hell, the account of creation, the question of the final reckoning of man before God. Now the whole problem lies in knowing whether these accounts are to be taken in their rigid literary understanding or whether they make use of the human language to convey realities which cannot be expressed except through an idiom with which we are familiar. Semantic clarification will avert much misunderstanding. Now, here, there are two attitudes which are generally prevalent. In recent Christian theology the problem of demythologisation has been much discussed. In our own context this approach may be discerned in the views of Sir Syed Ahmad Khan and, in a more philosophical cloak, in the Lectures of Mohd. Iqbal. But the whole problem lies to distinguish two different attitudes. On the one hand we can say that the so-called myths and legends of religion refer to secular and worldly realities; on the other hand we may affirm that these myths do not refer to worldly realities at all but to transcendental realities which are given expressions in terms with which we are familiar and which represent the scientific and intellectual level of the period in which the Quranic revelation took place. Hence the picturesque and graphic description of Heaven and Hell, of the temptation of Satan, of the primordial covenant (*Mithaq*) between man and God do refer to realities but of such nature that we cannot have any intellectual grasp except to divise their significance according to our own level of understanding On the other hand Sir Syed Ahmad Khan and Iqbal no less completely ignore their transcendental character and de-mythologise them in a way which if carried out consistently would strip revelation of all its content Commenting on the Fall of man in the Quranic narrative, Iqbal writes: "I am, therefore, inclined to think that the '*Jannat*' in the Quranic

Though it deals with perennial issues, its answers show constant shift and its response varies from school to school and from philosopher to philosopher. Muslim thought is not exhausted in what our forefathers thought, be they philosophers or theologians, and the stigma which has been attached to the philosophical tradition through historical conditions should be removed. It is necessary for the rejuvenation of thought to reasses the situation and understand what the problems are. In every period of man's intellectual history philosophical and theological thought developed its own language, and the terms used in the earlier context changed their meaning; and the problems which once had assumed great importance and provoked violent controversies have lost much of their relevance. Muslim thought cannot afford to ignore the problems which have developed in sister religions and cannot formulate its answers in its own terms unless it takes into consideration the answers given by the theologians of the affiliated traditions. Christian theologians like St. Thomas did take into account the contributions of Avicenna and Averroes though their response was different and may have been even negative. But we have to evolve our response in consonance with our own tradition. The theological issues, as that of the nature of God, the nature of soul, the problem of immortality, and the problem of freedom, when they are tackled in the light of reason, can show much common ground and credal differences do not affect their solutions in as decisive a way as one might assume in the beginning. It is of course natural that our response would evolve an eminently Islamic accent and it would lead to a formulation of the problems which fit in the old scheme of thought. On this plane theologians can seek clarification from philosophical reflection. Whether it is theology or philosophy, the solution is the product of the finite human mind; and with whatever pretence the theologian might claim divine guidance still he can falter in interpretation and cannot hope to afford a world view which cannot be disputed theologically from within the confines of his own framework. The history of theological thought in Islam bears this out completely. And though one school of the Kalām is considered orthodox and the other does not enjoy this respectability, there is no reason to think that any one side has full justification and the opposite view has no basis. Unfortunately history can be abused and the old feuds may be considered decided one way or the other by taking into account considerations which have nothing to do with intellectual integrity.

thought is active, be it at the level of philosophy, theology or mysticism, it creates a new language in consonance with the new developments of thought. But if theological thought has come to a standstill and speaks in the old formulae or through borrowed patterns of alien origin, it might easily lead in consequence to misunderstandings. It is also to be noted that even philosophical tradition does not remain stagnant and the concept of philosophy has changed in history. When Muslim theologians speak in denunciation of philosophy even today they have only the idea of philosophy against which al-Ghazzali took cudgels. But philosophy, as we understand today, is not a commitment to any pre-established position but an open enquiry into the nature of being, of knowledge and of religion. The positions are not marked out from the beginning. But the old preconceptions about philosophy still persist and the variety and diversity of philosophical perspectives are completely overlooked The relation between philosophy and theology has always been a subject of debate, though their relation cannot be equated with the relation between reason and faith.

With regard to the relation between theology and philosophy Immanuel Kant made a very pertinent observation. Kant was of course thinking of Christian theology but his observations are equally valid for Muslim theology. He observed that the view according to which philosophy is the handmaid of theology can be accepted provided we know whether she is the handmaid who goes before the Queen with the torch in hand showing the light or whether she is the one who goes behind holding the aprons. Philosophical thought has therefore a very important role to play in the clarification of concepts and in the formulation of problems though, of course, it can never serve as a substitute for faith.

Hence it is necessary to respond to the intellectual situation as it is and not to offer combat to forces which are long dead. Modern philosophical and theological perspectives owe much to the Greek heritage but they do not depend on it and corresponding to the changes in the scientific knowledge shifts in the philosophical posture also take place. We still cling to old preconceptions and react to philosophy in the same way in which al-Gazzali and his followers reacted. We do not require any new **Tahafah** now but to examine carefully whatever comes in the name of philosophy. Philosophy is not a body of knowledge which is fixed once for all.

favoured the anti-religious stand and reduced religion to an alternative which could easily be dispensed with and which was not respectable enough to gain adherence in the scientifically-minded world, there were other developments which shook the complacancy of the scientifically-oriented thought. It was first of all in physics that the old vision of a mechanistically-determined universe lost ground, and a rigid determinism was shattered in favour of a statistical view of casuality, and the concept of matter lost its classically-conceived substantiality. It is worthwhile to refer to the statement of an eminent scientist who himself took an active part in the reassesment of the basic concepts in physics. Werner Heisenberg observes : "Our attitude toward concepts like mind or the human soul or life or God will be different from that of the nineteenth century, because these concepts belong to the natural language and have therefore immediate connection with reality. It is true that we will also realize that these concepts are not well defined in the scientific sense and that their application may lead to various contradictions. For the time being we may have to take the concepts, unanalysed as they are ; but still we know they touch reality. It may be useful in this connection to remember that even in the most precise part of science, in mathematics, we cannot avoid using concepts that involve contradictions. For instance, it is well known that the concept of infinity leads to contradictions that have been analysed, but it would be practically impossible to construct the main parts of mathematics without this concept "[1] This raises grave doubts about the ability of the scientist even to provide a picture of the universe which would satisfy religious consciousness. But these developments at least favoured a view of the universe which was till now necessarily supposed to be incompatible with the scientific spirit. Nonetheless, to see and discover what religion is, one has still to go to religions and to religious persons in whom religion finds expression. Now when we come to Islam as a religious manifestation we have first to take into account the unfortunate fact that Muslim theology has not risen to the occasion and Muslim thought still moves in patterns which have been marked out for it at a time when Islamic theology crystallised itself in response to challenges which took shape from the impact of Greek thought. The crisis to which Muslim thought is subject today must be understood at different levels. The issues of *al-Kalam* as they were debated within the confines of the *Mu'tazilah* and *Asha'irah* perspectives need to be reformulated and given expression in a different language. Whenever

1. Werner Heisenberg : Physics and Philosophy, London, 1958, p. 172.

the political sphere also the pattern of the state as it emerged in the early days of Islam calls for careful study. But historical conditions change and what we know of city life today is different from what we learn of city in ancient times. The world population has increased enormously and democracy as understood by the Greeks has been completely transformed in modern conditions. Hence it is not advisable to overstress Islamic socialism because all these movements have different connotations at different times. Now Muslims who visualise a glorious future for their community mostly see it in terms of power and dream of a world when all Muslims should be united for a common cause. The world as we know it however shows a great cleavage between what is and what ought to be; between what is desirable and what is realisable. Unless we are realistic enough to know the limitations under which we labour in the conditions of history, we are apt to lose our balance and fritter our energies for ends which are not realisable in the given conditions.

Islam cannot be considered in isolation from the crisis of religious consciousness as a whole. Islam is not a regional or national manifestation but a world phenomenon and every ripple which disturbs man in the world cannot leave Islam unaffected. Whatever affects the developed nations which are subject to Christian influence affects no less violently the Muslim minds. In the recent past, man's commitment to religion has been challenged from varied sources. First it was the theory of evolution which challenged the theory of creation as it is understood under the influence of the Hebrew tradition. Earlier it was the displacement of the Ptolemic view of the universe, with man as its centre, by the Copernican revolution which made man a puny member of a vast universe. And no less disturbing was the influence which emanated from certain theories in psychology and psychopathology; and, under the influence of Freud; religion was considered nothing but an illusion born of repressed wishes. And further the situation was complicated by the so called Higher Criticism which tried to examine the Biblical data through historical evolution. Thus religion was subjected to a multipronged assault; and there came in addition the challenge from the Marxist interpretation of history which does not recognise any other determinents of history save the economical. But, inspite of the tremendous prestige of science and scientific methodology, the religious situation was not completely shaken. Religion survived all these assaults. Though its impact on the youth and its influence in terms of numbers might have decreased, it is still a force to be reckoned with. Side by side with developments which

Hence what is more important is the commitment to the creed and still more significant is the personal realisation. The state can look only to the externals, to discipline and regulation of life. It has no means by which it can judge what passes within the consciousness of man. It cannot intrude into individual privacy. While this emphasis on the state and the political dimension of life and the regulation of social conduct by religious norms cannot be ignored, Islam reaches beyond its external manifestation and its attention is not confined to this world but extends to the world which it envisages as transcending the limitation of time and space as we know them. Hence it often happens that the political quest for power becomes dominant and, if circumstances favour, it can become aggressive and militant. But the modern man in affluent societies, where economic growth and social comforts have reached their maximum limit, still seems dissatisfied and seeks his satisfaction often in oxotic experiences and as a consequence he develops strong reaction against his own past. Psychiatrists tell us that the modern man, which means for them the man of the West, has lost his zest for life, because the institution which made his life meaningful has lost for him any relevance, and the institution was religion. Dr. Frankl's observations deserve careful attention :

"Man's primary concern is to find and fulfil meaning and purpose in life. Today, however, ever more patients relate the feeling of a profound meaninglessness or, as one could call it in contradiction to Maslaw's peak experience—an 'abyss-experience'. In logotherapy, this inner void is referred to as the 'existential vacuum'. In cases in which it results in a neurosis, this is termed in logotherapy a 'noogenic' neurosis in contradiction to the psychogenic neurosis which is the neurosis in the conventional sense of the word."[1] With the loss of religious commitment man has lost his moorings, and the existentialist therapy tries to restore meaning to him, and once he sees meaning in life he finds his full recovery. This means that Islam has a relevance in more than one dimension and any one dimentional approach to religion brings in its wake a betrayal of its original thrust.

The Muslim revivalist movements try to develop a one-dimensional consciousness. Often the mystic heritage is ignored. What is emphasised is the economic and the political dimension. No doubt the Islamic approach to economic problems deserves our attention and in

1. E. Frankl Universitas: Logotherapy and Existential Analysis, English edition, 1967, pp. 77-78.

from time to time by men of deep religious concern who can inform religion with life, religion soon becomes petrified and its value lies only in its social dimension which brings members of a community together and gives them a sense of identity. Our young men and women are subject to influences which are hostile and when our sources of inspiration are foreign we learn our own culture and tradition through the eyes of strangers; and what we learn from our own sources seems insipid and lifeless as against the breezes which blow from outside. In these conditions the younger generation, disillusioned with its own past, grows either actively hostile or at the most indifferent. This is really the situation in which we as Muslims stand today.

It is clear that the Muslim mind cannot be expected to respond to the challenges of the modern world in a uniform way. The present day world, especially in developing countries, is extremely politicised and existential questions are eclipsed by political considerations. When we think of the future of Islam and of Muslims we think it in terms of power politics and in terms of political future as a dominant factor in the power game. There is no doubt that politics and religion are linked in Islam and the concept of a Muslim state as a world state has dominated the imagination of Muslims. But it should not also be forgotten that power has never enjoyed the first priority and the state is never considered an end in itself.

It is encouraging to note that some of our eminent Muslim scholars have rightly questioned the exclusive emphasis which is given in some quarters to the Divine sovereignty at the expense of His other attributes. Maulana Abul Hasan Ali Nadvi's critical assessment of Maulana Maudoodi's understanding of Islam may serve as an interesting example. "That the relation of God and man finds its most characteristic expression in the relationship of the sovereign to His subjects, or of command and obedience, does not give justice to the man-God relationship".[1] It is, as Abul Hassan Ali Nadvi points out, much more. "However natural a corollary it might be of one's commitment to Islam, it is only a part and for that a limited one, of God's relationship with man, not the whole of it. It is much more subtle, more comprehensive, deeper and delicate".[1]

---

1. The understanding and Interpretation of *Din* in our Times, Lucknow, 1978, p. 54

# Islam and Modern Challenges

The religous situation in its global perspective presents a very confused picture. It is obvious in one respect that man's commitment to religion has slackened in the last few decades and a process of secularisation has set in. The reasons are many. One of the most obvious is the mechanisation of life with the advancement in science and technology. The tremendous advancement in technology and the new social conditions created by it have shifted man's attention from the perennial problems of human existence and made him more conscious of his earth-rootedness. Even philosophy of the West, which in spite of its secular and rational stance was nourished in religious pathos, has become alienated from its tradition and the link with theological issues has been snapped in the recent past. There was a time when philosophers who did not recognise theological assumptions and even undertook to subject the traditional proofs of the existence of God always retained interest in metaphysical questions. It is even said of Hegal by his critics that he was above all a theologian and remained always a theologian. Kant's aim was not to demolish metaphysics as such but to demarcate the bounds of discursive reason and rational knowledge. However, in the recent past even when philosophers take their sustenance from the religious tradition and speak a language which is reminiscent of Christian experience, they remain earth-bound with a vengeance. This is specially true of the philosophy of Martin Heidegger. Again in the realm of practice great changes have occurred in consciousness of values. Life has been commercialised at all levels. Success has become a new idol which man worships And the brutal exploitation of developing nations by the Western powers has evoked a sharp reaction among the masses in the developing countries and, as a result, strong leftist ideologies have found a favourable soil for their propagation. Naturally the leftist perspective has always taken a rejectionist stand in relation to religion. Religion has been understood to be an opiate to the masses which is used as a means for exploitation by the rich as against the poor. This again means that dissatisfaction with religion has primarily developed in the economic context and, as the Church often associated itself with the Establishment, with remarkable exceptions of course, the ire of the revolutionaries turns with a fury against religion itself. Apart from these factors it is also to be noted that if religion is not sustained

if it provokes others to give a better perspective I will remain satisfied.

I am thankful to Dr. Abid Raza Bedar, Director Khuda Bakhsh Oriental Public Library, without whose initiative I could not have undertaken the responsibility of giving these Lectures. I really do not know how far I have been able to justify his choice for the honour that has been conferred on me. I am also thankful to Mr. S. Riaz Ali Perwaz of the Institute of History of Medicine and Medical Research for his effective help in the preparation of the manuscript

SYED VAHIDUDDIN

# PREFACE

The Muslim world is in a state of turmoil. Though the Oil boom has made some of the Islamic countries richest in the world, they have yet to realise that this phenomenal afluence cannot be a lasting asset. Needless to say that wealth always brings in its wake serious risks. It creates complacency and, in countries where there is a feudal set-up, it fosters the tendency to suppress with all their might any attempt, however well motivated, to change the status quo. And it is also assumed that economic prosperity is sufficient unto itself and the temptation is strong to look down upon the fellow-believers who are wallowing in abject misery in other countries. Theological stagnation is perpetuated and there is no effort worth the name to re-think what their forefathers had thought in a given situation of history. Any deviation from the familiar pattern of Islamic living is denounced as innovation, and, instead of promoting ecumenic tendency only the school of thought to which one is committed is given theological credence and all differences are looked upon with suspicion. Hence when my friend Dr. Abid Raza Bedar invited me to deliver Khuda Bakhsh Memorial Lectures, I took this opportunity to speak to myself what I have been thinking all the time. Whatever I have written on Islam I consider more as a confession than an objective and adequate estimate of Islamic thought and experience. I have always felt that Islamic thought cannot be reduced into a monolithic structure but allows different options and alternatives in interpretation not only on a metaphysical level but also in relation to social problems and challenges. I hope all that I have written will be taken for what it is worth, and

**Khuda Bakhsh Annual Lectures, 1979 - 80.**

*Khuda Bakhsh Annual Lectures*
*are delivered every year*
*by some eminent scholar of*
*Persian, Arabic or Islamic*
*Studies.*

*Mr. Q. A. Wadood,*
*Dr. Md. Zubair Siddiqi,*
*Prof. A. A. A. Fyzee,*
*Prof. Nazir Ahmad,*
*Dr. S. A. H. Abidi,*
*Prof. S. H. Askari,*
*Dr. Hashim Amir Ali,*
*Prof. S. Maqbool Ahmad,*
*Dr. Bruce B. Lawrence,*
*were the forerunners*
*in the series to which*

*Prof. S. Vahiduddin*
*contributed in 1980.*

*Printed by* **Hindustan Printing Works, Rampur — 1983.**

*Khuda Bakhsh Annual Lectures Series—10*

# MUSLIM THOUGHT

*In a Changing World*

*by*

Prof. S. VAHIDUDDIN

Head, Department of Comparative Religion, Indian Institute of Islamic Studies, *formerly* Professor of Philosophy, Usmania and Delhi Universities.

Khuda Bakhsh Oriental Public Library

PATNA

College and Professor Emiratus, Nalanda Medical College Patna. For details *see* p. 264 of this Journal.

* Mr. Syed Ali Abbas (b. 1911) educated at Patna University, entered in Indian Police Service (IPS) in 1936. For details *see* p. 265 of this Journal.

* Mr. Hasan Ahamad Qadri (b. 1923) educated at Nadwatul Ulama, ( Lucknow ), Madrasa Hamidiya, (Darbhanga) and Shamsul Huda (Patna) For details *see* p. 268 of this Journal.

* Mr. Syed Ahmad Ali Azad (b. 1907) educated at Jamia, one of the leaders of Jamia Movement. Died in 1976. For details *see* p. 269 of this Journal.

* Dr. Rashid al-Wahidi (b. 1942) Fazil from Deoband, M.A. and Ph. D. from Delhi University. Working as Lecturer in Jamia since 1973. For details *see* p. 272 of this Journal.

* Mr. Sadanand Mandal (b. 1926). Graduated in Agriculture from Sabor, (Bhagalpur). Working as Incharge of Gardening in Raj Bhawan, Patna. For details *see* p. 273 of this Journal.

* Hm Ashraf Karim (b. 1923) Fazil from Shamsul Huda, Patna. Formerly principal, Govt. Tibbi College, Patna For details *see* p. 276 of this Journal.

* Mr Shahid Ram Nagri ( b. 1927 ), formerly editor of 'Al-Kalam', Patna. Working as Chief Editor of 'Naqeeb' of Imarat-i-Shariyah, Bihar. For details *see* p. 277 of this Journal.

* Mr. Mahboobur Rahman Akmal Yazdani (b. 1929) educated at Jamia, M. A. from Agra University, working in Deedar Bakhsh High School, Purnea. For details *see* p. 281 of this Journal.

* Mr. Shah Manzar Husain (b. 1924 *Approx*) A Science graduate from Aligarh. For details *see* p. 299 of this Journal.

* For others *see* Journal 1, 12, 19 & 20

* Mr. S. Bahauddin Ahmad (b. 1911) formerly District and Session Judge, Bihar, and Member Bihar Public Service Commission, Patna. For details *see* p. 224 of this Journal.

* Mr. Sayeed Ansari (b. 1904) educated at Kashi Yidyapith Banaras and Jamia Millia Aligarh; graduated in Education from Columbia University, New York. For details *see* p. 226 of this Journal.

* Hm. Abdul Ahad (b. 1912), Fazil in Tibb and Surgery from Tibbiya College, Delhi. Formerly Dy. Director, Public Health Department (Unani). For delails *see* p. 233 of this Journal.

* Mr. Oneil De (b. 1919) educated at Patna University, formerly Associate Secretary, Bihar Academy of Music, Dance & Drama (1955-1960). For details *see* p. 239 of this Journal.

* Hm. Zillur Rahman (b. 1940), educated at Nadwatul Ulama, Lucknow and Ajmal Khan Tibbiya College, Aligarh. Working as Head, Deptt. of Ilmul Adviya, Ajmal Khan Tibbiya College Aligarh. For details *see* p. 245 of this Journal.

* Mr. Naqi Ahmad Irshad (b. 1920) grandson of Shad Azimabadi, M. A. (History). Formerly ADM and Joint Secretary, Bihar. Retired in 1979. For details *see* p. 249 of this Journal.

* M. Abdul Hai Betab Siddiqi, (b. 1927) Fazil from Shamsul Hoda, Patna, one of the freedom fighters, worked as journalist and thereafter Joined Raja Ram Mohan Roy Seminary as teacher. For details *see* P. 253 of this Journal.

* Mr. Syed Mohammad Ahmad (b. 1935), Graduated in Agriculture from Ranchi University and obtained diploma in Tea from Tocolai (Assam). For details *see* p. 257 of this Journal.

* Mr. S. Shah Riyazur Rahman (b. 1921), educated at Patna University Formerly Member, Patna Municipal Corporation. For details *see* p. 260 of this Journal.

* Mr. Anwar Kareem ( b. 1916 ), M. Sc. from Aligarh (1939); appointed as Deputy Collector in 1941 and promoted to the senior scale of IAS. For Details *see* p. 216 of this Journal.

* Dr. Masoodul Haq (b. 1901) Graduated from Patna Medical College, formerly Head, Deptt. of Anatomy, Patna Medical

## Our Contributors

* Prof. S. Vahiduddin (b. 1909) educated at Osmania University, Hyderabad & Marburg University, Germany; formerly Professor & Head, Deptt. of Philosophy, Osmania & Delhi Universities. Since 1973, working as Research Professor in the Institute of History of Medicine, New Delhi, and as Head of the Deptt. of Philosophy of Religions in the Indian Institute of Islamic Studies, New Delhi.

  Author of more than 25 books on Philosophy, Mysticism and Comparative Religion as also on Iqbal, Hafiz and Goethe. His doctoral thesis on "Experience of Value", written in German Language was published in 1937.

* Dr. Barakat Ahamad (b. 1919), M. A. from Sydney, Ph. D. from American University, Beruit & D. Litt from Tehran University; formerly Indian High Commissioner/representative to various contries. For details *see* p. 154 of this Journal.

* Mr. Hasnain Syed (b. 1917) Graduated from Jamia Millia, was president of Students' Union, Jamia College and Editor of its organ 'Jauhar'. For details *see* p. 174 of this Journal.

* Dr. Riyazur Rahman Sherwani (b. 1924), specialised in Arabic from University of Cairo. Ph. D. ( Arabic Literature ) from Aligarh. Since 1983 working as Professor of Arabic, Kashmir University. For details *see* p. 187 of this Journal.

* Mr. Ishtiaq Mohammad Khan ( b. 1931 ) Graduated from Muslim University, Aligarh, set music to the song of Aligarh. Presently warden of Jafar Sulaiman Muslim Students Hostel, Bombay. For details *see* p. 206 of this Journal.

* Mr. Amanullah Khan Sherwani (b. 1926) educated at Muslim University, Aligarh and Birmingham University (Britain). For details *see* p. 214 of this Journal.

* Dr. S. Abdul Majeed Shams (b. 1897 *Approx*) M.A. from Aligarh, Ph. D. from London. Formerly Principal College of Commerce, Patna. Died in 1983. For details *see* p. 224.

CONTENTS

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journ specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urc languages, covering meaningful research based on the materi preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, c having any concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian an Urdu.

3. Notes and Addenda, by way of corrections and additions t any information published in this Journal or in any publicatio of the Library e. g. Catalogues, will be a regular feature of th Journal.

**Rs. 45.00 per copy**
Annual subscription Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : 12.00 Dollars
Europe : 8.00 Pounds
U.S.A. & Other Countries : 24.00 Dollars

*Printers* : Patna Litho Press, Patna-4 ——————and
Hindustan Printing Works, Rampur (U. P.)

*Publisher* : Mahboob Hussain, for Khuda Bakhsh O. P. Library, Patna.

*Editor* : Dr. A. R. Bedar

# KHUDA BAKHSH LIBRARY

# JOURNAL

No. 21-22-23

1982

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA - 800 004
( INDIA )

21-22-23